رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا

علمی خطبات

حصہ اول

خطابات

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مرتب

محمد سعید پالن پوری

استاذ جامعۃ الانور دیوبند

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : علمی خطبات حصہ اول

خطابات : حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم دیوبند

مرتب : محمد سعید پالن پوری استاذ جامعۃ الانور دیوبند
08057477475

طباعت : محرم الحرام ۱۴۳۱ھ مطابق جنوری ۲۰۱۰ء

کمپیوٹر کتابت : روشن کمپیوٹرز، محلّہ اندرون کوٹلہ دیوبند

کاتب : مولوی حسن احمد پالن پوری
M.09997658227

مطبوعہ : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرس، دریا گنج نئی دہلی 110002

ناشر

مکتبہ حجاز دیوبند

اردو بازار نزد جامع مسجد دیوبند

09358914948-09997866990

فہرست مضامین

④ اصلی سلفی اور آج کے سلفی

⑤ روزے اور زکوٰۃ کے ضروری مسائل

⑥ روزوں کے تعلق سے رمضان کی تخصیص

⑦ نمازِ عید سے پہلے خطاب

⑧ ختم نبوت کا بیان

⑨ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں

⑩ اسلام میں پورے پورے آجاؤ، شیطان کی پیروی مت کرو

⑪ دنیا کی زندگی کس مقصد کے لئے ہے؟

⑫ قیامت کے دن ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا

⑬ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے

⑭ آخرت کی نعمتیں دنیا کی چیزوں سے بدرجہا بہتر ہیں

⑮ آخرت کی نعمتیں کن لوگوں کو ملیں گی؟

⑯ نیکیوں کا پورا اجر آخرت میں ملے گا

مسائل

فہرست مضامین

⑥ مسجد میں باتیں نہ کرنا اور تکبیر شروع ہونے پر نماز کے لئے کھڑا ہونا

⑦ دس دن میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟

⑧ سعودیہ کے چاند کا مسئلہ

⑨ اصلاح معاشرہ کے لئے ضروری احکام

⑲ جھگڑا کھڑا کرنے والی چھ باتیں

(تمسخر کرنا، طعنہ دینا، برا لقب رکھنا، بدگمانی کرنا، ٹوہ میں لگنا، غیبت کرنا)

⑳ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو واقعات

ستارہ پرستوں اور صنم پرستوں سے گفتگو

مسائل

افادات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتب

یہ علمی خطبات کا حصہ دوم ہے، حصہ اول کی قارئین کرام نے غیر معمولی پذیرائی کی، ہر طرف سے حصہ دوم کے لئے مسلسل تقاضا ہوتا رہا، مگر میں اپنے تدریسی مشاغل کی وجہ سے جلد یہ حصہ تیار نہ کرسکا، اس لئے قائین عظام سے معذرت خواہ ہوں۔

علمی خطبات کا یہ سلسلہ اس حصہ پر پورا کیا جارہا ہے، تقاریر ابھی اور بھی جمع ہیں، مگر وہ کسی اور نام سے شائع ہونگی۔ والد ماجد مدظلہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک ہی نام سے بہت حصے آجاتے ہیں تو قارئین کی دلچسپی گھٹ جاتی ہے، اس لئے طے کیا گیا ہے کہ آئندہ تقاریر کا نام الگ رکھا جائے گا۔ پس قارئین اس سلسلہ کے اگلے حصہ کا انتظار نہ فرمائیں۔

تقریر کے ضمن میں بعض قیمتی مسائل اور افادات آتے ہیں، مگر ان کا تقریر کے موضوع سے گہرا تعلق نہیں ہوتا، خطاب میں تو چونکہ مقرر نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اس لئے ایسی قدرے غیر متعلق باتیں بھی لطف دیتی ہیں، مگر جب خطاب کتابی شکل میں سامنے آئے تو یہ بے تعلقی بدمزگی پیدا کرتی ہے، اس لئے ایسی باتیں ہم نے تقریر سے الگ کرلی ہیں، اور آخر میں مسائل وافادات کے عنوان سے درج کی ہیں، اس سے تقریر مسلسل ہوگئی ہے، اور مسائل وافادات کو الگ عناوین کے تحت لینے سے ان شاء اللہ قارئین کرام کیلئے استفادہ میں سہولت ہوگی۔

پہلے حصہ کی طرح یہ حصہ بھی والد محترم کی نظر ثانی کے بعد شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اس حصہ کو بھی حصہ اول کی طرح قبول فرمائیں، اور قارئین دلچسپی کے ساتھ اس سے بھی فائدہ اٹھائیں (آمین)

کتبہ

محمد سعید پالن پوری

خادم جامعۃ الشیخ محمد انور شاہؒ دیوبند۔ ۲۰/۴/۲۰۱۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اللہ جل شانہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے اور انھیں گمراہی سے بچانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا، جس کی آخری کڑی فخر کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ آپؐ نے اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچایا اور بندوں کا رشتہ معبودِ حقیقی سے جوڑا، آپؐ کے بعد علمائے کرام پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی، انھوں نے بھی ہر زمانہ میں اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا، کتاب وحکمت کی تعلیم کے ساتھ وعظ وارشاد سے بھی تزکیۂ نفوس فرمایا۔ اور العلماء ورثة الأنبياء کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کردیا۔

انہی عظیم المرتبت علماء میں سے ایک تابندہ شخصیت: محدث جلیل، متکلم اسلام، شارح حجۃ اللہ البالغہ، فقیہ النفس حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کی ہے۔ جن کے مواعظ کی یہ پہلی جلد بنام 'علمی خطبات' ہدیۂ ناظرین کی جارہی ہے، حضرت موصوف کو حق تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے اور کمالات سے نوازا ہے، آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ اور نفیس ہے، مزاج میں استقلال واعتدال ہے، حق وباطل اور صواب وخطا کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت رکھتے ہیں اور حقائق ومعارف میں یکتائے زمانہ ہیں، چونکہ حضرت والا نے شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی مایۂ ناز تصنیف 'حجۃ اللہ البالغہ' کی شرح لکھی ہے، جس کا نام 'رحمۃ اللہ الواسعہ' ہے (یہ شرح پانچ جلدوں میں مطبوعہ اور مقبول خاص وعام ہے) اور ایشیاء کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں پندرہ بیس سال تک اس کا کامیاب درس

دیا ہے، اس لئے حکمت شرعیہ سے آپ کو خاص مناسبت ہے، چنانچہ موصوف کا ہر درس، ہر تقریر اور ہر تحریر علمی نکات ولطائف اور اسرار وحکم سے لبریز ہوتی ہے۔ موصوف آیاتِ قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے رازہائے سربستہ سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے جیسے علوم وفنون کا ایک بحرِ ذخار موجزن ہے، خداوند قدوس نے آپ کو رسوخ فی العلم کے ساتھ مرتب گفتگو کا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے، جس کی نظیر نہ صرف ہم عصروں میں بلکہ زمانہ ماضی میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ آپ کی ہر تقریر اور ہر تحریر حسن ترتیب اور مشکل کو آسان بنانے میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور گنجینۂ علم وحکمت ہوتی ہے۔

آپ کے سحر آفریں، علم وحکمت سے لبریز، لاجواب اور بے مثال خطابات کو عوام وخواص بہت دلچسپی اور شوق سے سنتے ہیں، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان موصوف مخصوص افہام وتفہیم اور حکیمانہ اسلوب بیان کی وجہ سے خاص طور پر مقبول ہیں۔ بظاہر تقریر میں نہ جوش وخروش ہوتا ہے، نہ پُر تکلف انداز بیان، نہ خطیبانہ ادائیں، مگر خطابات اس قدر مؤثر اور مسحور کن ہوتے ہیں کہ سامعین سراپا گوش بن جاتے ہیں اور اہل علم عش عش کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

حضرت والا مدظلہ باہر کے اسفار تقریباً تین دہائیوں سے کررہے ہیں، سب سے پہلے بولٹن (برطانیہ) کا سفر فرمایا، اس سفر کے محرک جناب مولانا قاری یعقوب صاحب نانجی زید مجدہم بنے۔ قاری صاحب دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں۔ اور بولٹن کی مسجد طیبہ کے امام تھے، قاری صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ آپ رمضان میں ہمارے یہاں تشریف لائیں۔ والد صاحب نے جواب دیا: میں آکر کیا کروں گا؟ میں مقرر نہیں ہوں، مدرس ہوں، اور مدرس کی باتیں عام مسلمانوں کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں ہوتیں، قاری صاحب نے جواب دیا: ہم نے رمضان المبارک میں تقریر کی درخواست نہیں کی تھی، صرف تشریف لانے اور ساتھ رہنے کی استدعاء کی ہے۔ اب والد صاحب کے لئے انکار کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلا سفر برطانیہ کا اس وقت کیا جب برطانیہ کی ایمبیسی بھی ہندوستان میں نہیں تھی، ویزا ہیتھرو ایرپورٹ پر ملتا تھا۔

جب والد صاحب بولٹن پہنچے تو لوگوں نے تقریر کے لئے اصرار کیا، چنانچہ آپ نے اپنے تدریسی انداز پر تقریر شروع کی، لوگوں نے اس کو بہت دلچسپی سے سنا اور عصر کے بعد جب کہ گرمیوں میں دو گھنٹے کا وقت ہوتا تھا، لوگ روزہ کی حالت میں بہت دلچسپی سے تقریر سنتے تھے، پھر کئی سال تک بولٹن ہی جانا ہوا۔ اور تقریروں کا سلسلہ جاری رہا، اس زمانہ کی زیادہ تر تقریریں محفوظ نہیں۔

اور شہر لندن میں حضرت والا کے ایک پرانے شاگرد جناب مولانا اسماعیل صاحب سیدات زید مجدہم ہیں، جو اسٹامفورہیل کی مسجد قبا کے امام تھے، واپسی میں حضرت والا ان کے گھر ایک دن قیام فرماتے تھے، انھوں نے درخواست کی کہ ایک رمضان حضرت والا ان کی مسجد میں قیام فرمائیں۔ پہلے تو حضرت والا نے انکار کیا اور فرمایا: بولٹن والے کسی قیمت پر اجازت نہیں دیں گے۔ آپ چاہیں تو ان سے بات کر دیکھیں، چنانچہ مسجد قبا والوں نے بولٹن والوں سے بات کی اور باہم مشورہ سے یہ طے پایا کہ حضرت والا ایک سال بولٹن میں رہیں اور ایک سال لندن میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ اسی طرح پروگرام چلتا رہا۔

لندن کی مسجد قبا میں غیر مقلدین اور خلافت کمیٹی والے چھائے ہوئے تھے، وہ پورے رمضان پمفلٹ تقسیم کرتے تھے، اور مسجد میں اور مسجد کے باہر ہنگامہ کرتے تھے، چنانچہ حضرت والا نے یکم رمضان سے تقریر شروع فرمائی کہ اسلام میں گمراہ فرقے کیسے وجود میں آئے؟ اور ان کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اِس زمانہ میں گمراہ فرقے کون کونسے ہیں؟ اور ان کے خیالات کیا ہیں؟ یہ تقریر رمضان المبارک کی پہلی رات سے شروع ہوئی تھی اور ستائیسوں رات میں پوری ہوئی، روزانہ تراویح کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیان ہوتا تھا، پورے رمضان مسلسل یہی موضوع چلتا رہا اور لوگ گہری دلچسپی سے سنتے رہے، مگر افسوس کہ یہ تقریر محفوظ نہیں۔

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ اس مسجد سے دونوں فتنے فرو ہوئے، اور کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ حضرت والا سے آکر دوبدو گفتگو کرے، بس ایک مرتبہ خلافت کمیٹی والوں نے گفتگو کے لئے وقت لیا، حضرت نے وقت دیدیا، وہ رات بارہ بجے آئے جب حضرت والا تقریر سے

فارغ ہو چکے تھے، حضرت نے ان کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا، اور ناشتہ کرایا، ناشتہ سے فارغ ہوکر جب بیٹھے تو ایک نوجوان نے سوال کیا: حکومت اسلامیہ قائم کرنے کا کیا حکم ہے؟ حضرت والا نے جواب دیا: فرض ہے! وہ یہ جواب سن کر خاموش ہوگئے، پھر کافی دیر کے بعد ان میں سے ایک بولا: جب فرض ہے تو آپ ہمارے کاز میں کیوں شریک نہیں ہوتے؟ والد صاحب نے فرمایا: آپ نے درمیان میں ایک سوال چھوڑ دیا، وہ کہنے لگے: وہ کیا ہے؟ والد صاحب نے فرمایا: اب پوچھو کہ کہاں؟ یعنی حکومت اسلامیہ قائم کرنا کہاں فرض ہے؟ وہ کہنے لگے: ہاں! یہ سوال رہ گیا، والد صاحب نے فرمایا: جہاں اس کے امکانات ہیں وہاں اس کی سعی فرض ہے، جیسے مسلمانوں کے ممالک: مصر، عراق، ایران، ترکی، اردن، بنگلہ دیش، پاکستان وغیرہ ہیں وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کا امکان ہے، آپ حضرات کو چاہئے کہ وہاں جاکر محنت کریں۔ وہ کہنے لگے: وہاں تو گردن اڑتی ہے، والد ماجد نے فرمایا: پھر یہاں برطانیہ میں جو مسلمانوں کو سکون کا سانس لینے کا موقع ملا ہوا ہے، جہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کا فی الحال کوئی امکان نہیں، یہاں آپ حضرات ہنگامہ آرائی کرکے مسلمانوں کا سکون کیوں برباد کرتے ہیں؟ وہ یہ جواب سن کر خاموش ہوگئے، اور ایسے گئے کہ مسجد قبا سے یہ فتنہ بھی گیا۔

کئی سال تک اسی طرح سلسلہ چلتا رہا، پھر ٹورنٹو (کناڈا) میں حضرت والا کے ایک پرانے شاگرد مولانا ابراہیم صاحب شاجی ہیں، انھوں نے والد صاحب کو لکھا کہ ایک رمضان حضرت والا وہاں بھی گذاریں، والد صاحب نے جواب دیا: لندن اور بولٹن والوں سے بات کرو۔ انھوں نے مولانا اسماعیل سیدات صاحب سے بات کی، اور ان کو باصرار راضی کرلیا، چنانچہ کئی سال پہلے آپ ٹورنٹو تشریف لے گئے، اس وقت ٹورنٹو میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، اور مسجدیں بھی دو ایک تھیں۔ چنانچہ آپ نے مولانا سید عبدالحق صاحب کے گھر میں قیام فرمایا۔ اور مصلے مصلے جاکر تراویح کے بعد وعظ کہا، الحمدللہ! اس کے بہت اچھے اثرات ظاہر ہوئے، پھر مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور مسجدیں بھی بنتی گئیں، اور تھورن کلف میں مسجد دارالسلام کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد حضرت والا نے مسجد میں قیام فرمایا، اب طریقہ یہ رہا

کہ ایک سال لندن میں، اور ایک سال ٹورنٹو میں قیام فرماتے تھے، اور لوگوں کی وعظ ونصیحت کے ذریعہ تربیت فرماتے تھے۔

پھر امریکہ کے شہر شکاگو اور نیویارک کے احباب نے درخواست کی کہ آپ ایک رمضان وہاں بھی گذاریں، آپ نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ ٹورنٹو اور لندن والوں سے بات کرو، انھوں نے بات کی اور منظوری مل گئی۔ چنانچہ ایک سال امریکہ میں رمضان گذارنے کا سلسلہ شروع ہوا، امریکہ میں کسی خاص جگہ رہنے کے بجائے مختلف علاقوں کا دورہ فرماتے ہیں اور جگہ جگہ اصلاحی بیانات ہوتے ہیں، لوگ آپ کے وعظ میں جوق درجوق بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوتے ہیں، خاص طور پر علماء کا رجوع بہت زیادہ ہوتا ہے، جہاں بھی حضرت تشریف لے جاتے ہیں علماء آپ کے وعظ میں اہتمام سے شرکت کرتے ہیں، اور آپ کے مواعظ علمیہ سے خوب استفادہ کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

تدریس وتقریر میں جوڑ نہیں، جو تدریس میں کامیاب ہوتا ہے وہ تقریر میں ناکام رہتا ہے، اور جو تقریر میں ید طولی رکھتا ہے اس کا درس پھیکا پڑ جاتا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تدریس کا انداز برہانی ہوتا ہے اور تقریر کا خطابی، برہانی یعنی دلائل سے مضبوط بیان، اور خطابی یعنی دلوں کو چھو لینے والا انداز، چاہے کہی ہوئی باتیں کمزور ہی کیوں نہ ہوں، درس میں کمزور باتیں نہیں چلتیں، مضبوط باتیں ہی تدریس میں جان ڈالتی ہیں، اور خطاب میں اگر مضبوط باتیں بیان کی جائیں تو بیان میں جوش پیدا نہیں ہوتا اس لئے خطاب میں خطابی باتیں ضروری ہوتی ہیں۔

غرض: دونوں خوبیوں کو جمع کرنا ضدین کو جمع کرنا ہے، پھر اگر تدریس غالب آجاتی ہے تو عوامی خطاب میں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے۔ اور خطابی انداز غالب آجاتا ہے تو مختصر المعانی کے درس میں بھی سیرت النبی کا مزہ آتا ہے۔

حضرت والد صاحب مدظلہ پر تدریس کا انداز غالب ہے، وہ ہمیشہ برہانی باتیں بیان کرتے ہیں، کبھی کوئی کچی بات نہیں کہتے، آپ کی تمام تقریریں آپ کو علمی مواد سے بھرپور

ملیں گی، اور ایسی دقیق باتیں آپ کو ان خطابات میں ملیں گی جو آپ نے بہت کم کتابوں میں پڑھی ہونگی، اس لئے ہم نے ان خطبات کا نام 'علمی خطبات' رکھا ہے، یعنی حکم وحکمت سے لبریز تقریریں، قارئین کرام کو بھی یہ تقریریں اسی نقطۂ نظر سے پڑھنی چاہئیں۔

اور تدریس اور علمی انداز خطاب اگرچہ خشک ہوتا ہے، مگر حضرت والا کے بیانات خشک نہیں، کیونکہ حضرت والا اپنے بیان میں دو باتوں کا خاص اہتمام فرماتے ہیں:

ایک: مشکل مضمون: آپ دو تین بار بیان کرتے ہیں، کبھی بلفظہ مکرر بیان کرتے ہیں اور کبھی بالفاظ دیگر مضمون دوہراتے ہیں، نبی ﷺ کا بھی یہی طریقہ تھا، بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ (کبھی) کلام کو تین مرتبہ دوہراتے تھے تاکہ آپ کی بات اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ حضرت والد صاحب بھی اس سنت پر عمل کرتے ہیں اس لئے دقیق علمی مضامین بھی قابل فہم بن جاتے ہیں۔

دوم: دورانِ تقریر آپ لطائف وحکایات بیان فرماتے ہیں، جب لوگوں کے ذہن بوجھل ہوجاتے ہیں تو آپ فوراً کوئی ایسا واقعہ سناتے ہیں کہ لوگ ہنس پڑیں اور ذہن اگلی بات سننے کے لئے تازہ ہوجائے، مگر واقعات برائے واقعات نہیں ہوتے، ان سے بھی استدلال فرماتے ہیں، اس لئے لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔

مگر جب ہم نے آپ کے خطابات کتابی شکل میں مرتب کئے تو تکرار حذف کردی ہے، کیونکہ گفتگو میں تو یہ بات لطف دیتی ہے مگر تحریر میں بدمزگی پیدا کرتی ہے، البتہ واقعات باقی رکھے ہیں، کیونکہ ان سے بیان میں استدلال کیا گیا ہے، اس طرح بیانات کتابی شکل میں بھی لطف سے خالی نہیں۔

❁ ❁ ❁

کئی سال سے احباب حضرت والا مدظلہ کی تمام تقریریں ریکارڈ کرتے رہے ہیں، پہلے کیسیٹیں تیار کرتے تھے، اور والد صاحب کو اس درخواست کے ساتھ دیتے تھے کہ آپ ان کو مرتب کراکر کتابی شکل دیں، والد صاحب وہ لاکر ہمیں دیدیتے تھے، اور ہم نے ان میں کوئی ترتیب ملحوظ نہیں رکھی، ساری چیزیں جمع کرتے رہے، اب ہمیں کچھ اندازہ نہیں کہ کونسی تقریر

کہاں کی ہے،اور کب کی ہے؟اور یہ بات جاننی ضروری بھی نہیں،آم کھانے سے مطلب پیڑ گننے سے کیا فائدہ!چنانچہ اس پہلے حصہ میں مختلف زمانوں کی تقریریں ہیں،بعض بہت پرانی ہیں اور بعض گذشتہ رمضان کی تازہ تقریریں ہیں۔

* * *

رمضان المبارک میں حضرت والا کا معمول یہ رہتا ہے کہ تراویح کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تقریر فرماتے ہیں، پھر ناشتہ ہوتا ہے، پھر مسائل کی مجلس ہوتی ہے،لوگ مختلف سوالات پوچھتے ہیں،اور والد صاحب شرح وبسط کے ساتھ جواب دیتے ہیں، یہ بھی احباب ٹیپ کرتے رہے ہیں،مگر وہ علاحدہ نہیں،تقریروں کے ساتھ ہی ہیں،اور عصر کی نماز کے بعد حدیث شریف کی کوئی کتاب پڑھنے کا معمول رہتا ہے، عام طور پر امام نووی رحمہ اللہ کی ریاض الصالحین سامنے رکھ کر مختلف حدیثیں پڑھتے ہیں اور ان کی تشریح کرتے ہیں، یہ حصہ بھی علاحدہ نہیں،کیسٹوں میں ایک ساتھ ہے، چنانچہ اس پہلے حصہ میں سولہ تقریریں ہیں، اور آخر میں مسائل کا تھوڑا سا حصہ ہے، آئندہ حصوں میں ہم کوشش کریں گے کہ مسائل کا حصہ زیادہ رکھیں تا کہ قارئین کو اس سے بھی فائدہ پہنچے۔

* * *

یورپ اور امریکہ میں بے شمار گمراہ فرقے پائے جاتے ہیں، والد صاحب کا مزاج کسی فرقہ کے خلاف تقریر کرنے کا نہیں ہے، لیکن جب سوال ہوتا ہے تو کھل کر بیان فرماتے ہیں، نہ لاگ لپیٹ سے کام لیتے ہیں، نہ سخت زبان استعمال کرتے ہیں اور نہ ان فرقوں کی رعایت کرتے ہیں، علمی انداز میں جو ان کی گمراہیاں ہیں ان کو سمجھاتے ہیں، چنانچہ وہ حضرات بھی بیانات میں شریک ہوتے ہیں اور بہت غور سے سنتے ہیں، پھر چاہے ان کی اصلاح نہ ہو، مگر جو لوگ ان کی باتوں سے متأثر ہوتے ہیں وہ سنبھل جاتے ہیں۔

ان فرقوں میں سے اکثر تو اپنے آپ کو 'اہل السنہ والجماعہ' سے الگ رکھتے ہیں، لیکن دو فرقے: غیر مقلدین اور مودودی: لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم بھی اہل حق اور اہل السنہ والجماعہ میں شامل ہیں، جبکہ حقیقت ایسی نہیں۔ آپ کو ان تقریروں میں

اس کی پوری تفصیل ملے گی کہ غیر مقلدین کا اہل السنہ والجماعہ کے ساتھ اصولی اختلاف ہے، اور اصول میں اختلاف کے ساتھ دو جماعتیں ہم مسلک نہیں ہوسکتیں، اور مودودی جماعت کی جو فکری بے راہ روی ہے اور ان کے مزاج میں جو اعتزال ہے: حضرت والا نے اس کو بھی نیویارک کی ایک تقریر میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے، مگر وہ تقریر اس حصہ میں نہیں آسکی۔ان شاءاللہ آئندہ کسی حصہ میں آئے گی۔

* * *

مطالعہ کا طریقہ: جب کوئی نئی کتاب ہاتھ میں آئے اور جن کے پاس فرصت کم ہو، وہ پوری کتاب بالاستیعاب نہ پڑھ سکتے ہوں یا انہیں اس کی ضرورت نہ ہو تو پھر مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ فہرست مضامین دیکھ لی جائے جو عنوانات کام کے نظر آئیں وہ کھول کر پڑھ لئے جائیں، ساری کتاب پڑھنی ضروری نہیں، اس لئے تمام تقریروں میں عنوانات لگادیئے گئے ہیں، ان عنوانات سے پوری کتاب کے مضامین ایک نظر میں سامنے آجائیں گے۔

* * *

عرصۂ دراز سے ملک وبیرون ملک میں پھیلے ہوئے حضرت اقدس مدظلہ کے ہزاروں تلامذہ اور خدام کے دلوں میں یہ آرزو رہ رہ کر انگڑائی لے رہی تھی کہ حضرت کے مواعظ مرتب ہو کر شائع ہوں، تا کہ آنے والی نسلیں تا قیامت آپ کے فیوض سے مستفیض ہوتی رہیں، چنانچہ راقم الحروف نے ۹۷-۱۹۹۶ء میں جبکہ میں جامعہ اشرفیہ راندیر سورت (گجرات) میں مدرس تھا، حضرت والد ماجد مدظلہ کی چند تقاریر کیسٹوں کی مدد سے مرتب کی تھیں، مگر راقم الحروف کی شدید خواہش تھی کہ حضرت والا کی نظر ثانی کے بعد ہی وہ مواعظ شائع ہوں، مگر حضرت والا اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے نظر ثانی نہیں فرما سکے، اور بات آج کل پر ٹلتی رہی، اسی دوران میرے چھوٹے بھائی عزیزم مولانا مفتی محمد سعید صاحب زید مجدہ (استاذ جامعۃ الامام انور شاہ دیوبند) نے بھی والد صاحب کی بہت سی تقاریر مرتب کیں۔آج احقر کے جسم کا رواں رواں منعم حقیقی، رب کریم کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہے کہ اللہ نے حضرت والا کے ہزاروں محبین ومتوسلین کی اور راقم الحروف اور برادر عزیز

کی دیرینہ خواہش پوری فرمائی اور ہمیں حضرت اقدس مدظلہ کے مواعظ کی پہلی جلد حضرت کی نظر ثانی کے بعد ہدیۂ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اس عظیم نعمت پر رب کریم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اس مجموعہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت اقدس مدظلہ نے اس کا ایک ایک لفظ بامعان نظر پڑھا ہے، اور حک وفک کر کے اس کو قابل اشاعت بنایا ہے، ورنہ ہمیں اپنی کم علمی، بے مائیگی، بے بضاعتی اور ناتجربہ کاری کا پورا احساس ہے، یہ عظیم علمی کارنامہ ہماری بساط سے یقیناً بالاتر تھا، صرف حضرت والا کی عنایت نے اس کو قابل اشاعت بنایا ہے۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر کسی جگہ کوئی غلطی ہوگئی ہو تو درگذر فرمائیں اور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ اس کی اصلاح کردی جائے۔ **وما توفیقی إلا باللہ علیه توکلت وإلیه أنیب، وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آله وصحبه أجمعین۔**

کتبہٗ
حسین احمد عفا اللہ عنہ پالن پوری
ابن
حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری
۲۰؍ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ

۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ مسنونہ کے مضامین

إنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ: نَحْمَدُهُ، وَنَسْتَعِيْنُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحمداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ.[أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ، مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ رَشَدَ وَاهْتَدَىٰ، وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَلاَ يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهُ، وَلاَ يَضُرُّ اللّٰهَ شَيْئًا](۱)

خطبۂ مسنونہ میں بہت قیمتی مضامین ہیں:

بزرگو اور بھائیو! یہ جو میں نے خطبہ پڑھا ہے، یہ نبی کریم ﷺ کا خطبہ ہے، اس خطبہ میں بہت قیمتی مضامین ہیں، جو مؤمن کی نگاہ کے سامنے رہنے چاہئیں، کبھی اوجھل نہیں ہونے چاہئیں، مگر ہم لوگ عربی نہیں جانتے، اس لئے سمجھتے ہیں کہ صرف برکت کے لئے کچھ پڑھا جارہا ہے، بلکہ بعض تو ٹیپ ہی اس وقت کھولتے ہیں جب خطبہ ختم ہوجاتا ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج آپ کو اس کے مضامین کے بارے میں کچھ بتاؤں اور یہ خطبہ آپ کو سمجھاؤں۔

قولہ: إنَّ الحمدَ للّٰہ : تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں:

بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے سوا کسی کی کوئی تعریف نہیں، اگر ہے تو وہ

(۱) بین القوسین عبارت خطبہ مسنونہ سے زائد ہے ۱۲

بھی اللہ کی دَین ہے، کیونکہ کوئی چیز فی حد ذاتہ قابل تعریف نہیں، جو بھی چیز دنیا میں قابل تعریف ہے: وہ اللہ کے اُس کو قابل تعریف بنانے کی وجہ سے ہے، جیسے کوئی شخص خوبصورت ہے، اس کا ناک نقشہ ایسا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہیں، تو ایسا حسین ناک نقشہ اس نے خود تھوڑئے بنایا ہے، یا اس کے ماں باپ نے تھوڑئے بنایا ہے، بلکہ اللہ نے بنایا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ﴾: واقعہ یہ ہے کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا، اور ہم نے تمہارا ناک نقشہ بنایا [الاعراف ۱۱]

پس ہم جو کہتے ہیں کہ فلاں بڑا خوبصورت ہے تو اس کو خوبصورت اللہ نے بنایا ہے، یا ہم جو کہتے ہیں کہ تاج محل بڑا شاندار ہے تو وہ اینٹ پتھر کی تعریف نہیں، کاریگر کی تعریف ہے، اور کاریگر کو ماہر اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، پس یہ تعریف بھی اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔

ان مثالوں سے یہ بات سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ کائنات میں کوئی چیز فی حد ذاتہ قابل تعریف نہیں، جو بھی چیز قابل تعریف ہے وہ اللہ کے اُس کو ایسا بنانے کی وجہ سے ہے۔ اس لئے فرمایا: إِنَّ الحمدَ للّٰہِ: بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے علاوہ تعریفوں کے لائق کوئی نہیں!

اللہ تعالیٰ کی تعریف:

جب سبھی تعریفیں اللہ کے لئے ہیں تو اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اللہ کی تعریف کریں، اس لئے اگلا جملہ ہے: نَحْمَدُهُ: ہم اللہ کی تعریف کرتے ہیں۔ حمد کے معنی ہیں: خوبیوں کے ساتھ کسی کو متصف کرنا، ہم اللہ تعالیٰ کے لئے تمام خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں، خوبیاں ان کی خانہ زاد ہیں، کسی سے انھوں نے مستعار نہیں لیں، اور کوئی خوبی ایسی نہیں جو ان میں نہ ہو، اور دوسروں کی خوبیاں مستعار ہیں، اللہ نے دی ہیں۔ اس بات کا ہم اقرار کرتے ہیں۔

اللہ سے مدد طلبی:

قولہ: ونستعینہ: اور ہم اللہ تعالیٰ سے مدد کرتے ہیں امور غیر عادیہ (جن کے اسباب

مخفی ہیں) میں تو اللہ کے علاوہ سے مطلب کرنا جائز ہی نہیں، اور امور عادیہ (روز مرہ کے کاموں) میں اگرچہ جائز ہے، مگر حدیث میں ہے کہ تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، پس بندے کو ہر حال میں اللہ ہی سے مدد طلب کرنی چاہئے۔ اور مقرر جو باتیں بیان کرے گا ان میں بھی اللہ ہی کی مدد درکار ہے، ان کی مدد کے بغیر ہم کچھ بیان نہیں کر سکتے، انہی کی توفیق سے جو کچھ بیان ہوگا: ہوگا، ورنہ کچھ نہیں!

کوتاہیوں کی معافی:

قولہ: وَنَسْتَغْفِرُهُ: اور ہم اللہ سے معافی چاہتے ہیں۔ کس بات کی؟ کوتاہی کیا ہوئی ہے؟ کوتاہی اللہ کی تعریف کرنے میں ہوئی ہے، ہم جو اللہ کی تعریف کر رہے ہیں تو ہم اللہ کی تعریف کما حقہ (جیسا تعریف کا حق ہے) نہیں کر سکتے، یہ ہماری کوتاہی ہے، اس کوتاہی پر ہم اللہ سے معافی مانگتے ہیں کہ خدایا! ہم تیری تعریف کا جو حق ادا نہیں کر پا رہے ہیں یہ ہماری کوتاہی ہے، پس آپ ہماری اس کوتاہی کو معاف فرما دیں۔

سورۂ ذاریات میں اللہ کے اچھے بندوں کا تذکرہ آیا ہے اور ان کے کام بیان کئے گئے ہیں، فرمایا: بیشک متقی لوگ باغات میں اور چشموں میں ہونگے، اور ان کے رب نے ان کو جو کچھ عطا فرمایا ہے اس کو لے رہے ہونگے، یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد ان کو ان کے پروردگار جو نعمتیں دیں گے، ان نعمتوں کو وہ لینے والے ہوں گے، وہ لوگ اس سے پہلے نیکوکار تھے، یعنی وہ دنیا میں نیک کام کر کے آئے ہیں، اس کے صلہ میں یہ جنت اور اس کی نعمتیں ملی ہیں۔ وہ نیک کام کیا ہیں جو وہ دنیا میں کر کے آئے ہیں؟ وہ لوگ جب دنیا میں تھے تو رات کا بہت تھوڑا حصہ سوتے تھے، اور رات کا بڑا حصہ اللہ کی عبادت میں، تہجد میں، نمازوں میں اور ذکر و تلاوت میں گذارتے تھے ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ اور آخر شب میں وہ استغفار کرتے تھے [آیات ۱۵-۱۸]

مجھے ان آیات کا یہی مضمون سنانا ہے کہ اللہ کے اچھے بندے، پرہیز گار بندے، اللہ کی بندگی کر کے، اللہ کی تعریف کر کے غرور و تکبر میں مبتلا نہیں ہوتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ساری کائنات اللہ کی بندگی اور تعریف میں لگ جائے تو بھی اللہ کی مجد و ثنا کا کروڑواں حصہ

بھی ادا نہیں کرسکتی۔ اس کوتاہی پر معافی مانگی جا رہی ہے۔

علاوہ ازیں: ہر بندہ خطا کار، گنہ گار ہے، ہر وقت ہم سے خطائیں ہوتی رہتی ہیں، اس لئے بھی استغفار جاری رہنا چاہئے، کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے، چنانچہ خطبہ میں حمد کے بعد استغفار کا مضمون آیا ہے۔

آدمی کا نفس برا ہوجائے تو پھر خیر نہیں!

قولہ: ونعوذ باللہ من شرور أنفسنا: اور پناہ چاہتے ہیں ہم اپنے نفسوں کی برائیوں سے۔ جب نفس میں برائیاں پیدا ہوجائیں تو پھر خیر نہیں، اوپر اوپر کی برائیوں تک تو بات بن جاتی ہے، آدمی توبہ تلا کر کے زندگی سنوار لیتا ہے، لیکن جب نفس کھوٹا ہوجاتا ہے تو پھر انسان کی خیر نہیں، اس لئے فرمایا: ہم پناہ چاہتے ہیں اپنے نفسوں کی برائیوں سے یعنی ہمارے نفس برے نہ ہوجائیں، ہاتھ سے برائی ہوجائے تو آدمی کہتا ہے: ارے رے! یہ مجھ سے کیا ہوگیا! اس لئے اس گناہ کا دھلنا آسان ہے، لیکن اگر دل نے گناہ کا ارادہ کیا، اور دل کے کہنے سے ہاتھ نے گناہ کیا تو پھر اس گناہ کا دھلنا بہت مشکل ہے۔

یاد کرو موسیٰ علیہ السلام کا وہ قصہ جو قرآن کریم میں آیا ہے جب انھوں نے ایک قبطی کو مکّا مارا تھا تو وہ اللہ جانے کہاں لگ گیا کہ وہ تو پانی مانگنے بھی نہیں رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو مکّا مارا تھا وہ ہاتھ کا عمل تھا، اس ہاتھ کے پیچھے دل کا ارادہ نہیں تھا۔ دل کا حال کیا تھا؟ ﴿قَالَ: هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾: آپؑ نے فوراً کہا: یہ حرکت شیطان نے مجھ سے کرادی! معلوم ہوا کہ دل کے تقاضہ سے اور مار ڈالنے کے ارادے سے مکّا نہیں مارا تھا، بلکہ وہ ایک اتفاقی امر تھا، تنبیہ مقصود تھی، مگر وہ مر گیا۔

ایک دوسری جگہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿رَبِّ إِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ فَغَفَرَلَهٗ﴾: اے میرے پروردگار! میں نے اپنا نقصان کرلیا، میں نے گناہ کرلیا، آپ میرا گناہ معاف فرمائیں۔ پس اللہ نے ان کا گناہ معاف کردیا۔ دیکھو! گناہ فوراً دھل گیا اور کام بن گیا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ صرف ہاتھ کا عمل تھا، اِس کے پیچھے دل کا ارادہ نہیں تھا، اور اگر

کوئی دل کے کہنے پر یہ کام کرے مثلاً دل کے تقاضہ سے کسی کو گولی مارے، یا چاقو گھونپے تو پوری زندگی گذر جائے گی مگر توبہ کی توفیق نہیں ہوگی۔

بہرحال جب دل کھوٹا ہوجاتا ہے تو پھر معاملہ بڑا سنگین ہوجاتا ہے اور جب دل صحیح ہوتا ہے اور اعضاء سے گناہ ہوجاتا ہے تو معاملہ سنگین نہیں ہوتا، کیونکہ اس صورت میں انسان کو توبہ کی توفیق مل جاتی ہے، اور توبہ سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔

بخیلی فطری امر ہے، مگر دل کا بخل بری چیز ہے:

اس کی نظیر: ہر آدمی بخیل ہوتا ہے، اللہ نے بخل (چیز کو روکنا) ہر انسان کی فطرت میں رکھا ہے، ایک چھ مہینے کے بچے کو آپ روپیہ دکھائیں وہ فوراً ہاتھ بڑھائے گا، اور لے لیگا، اس کے بعد آپ مانگیں تو نہیں دے گا، زبردستی کریں گے تو رونے لگے گا، یہی بخل ہے، حالانکہ وہ جانتا بھی نہیں کہ روپیہ کس کام کا ہے، مگر جو چیز فطرت میں ہوتی ہے وہ بچپن ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، گھر میں سے حضرات حسنین میں سے ایک نکلا، وہ نانا ابا کی طرف بڑھا، لمبا کرتہ پہن رکھا تھا، اور چلنا ٹھیک سے سیکھا نہیں تھا، اس لئے وہ کبھی گرتا تھا، کبھی اٹھتا تھا، جب حضورؐ نے کئی مرتبہ اس کو گرتے اٹھتے دیکھا تو آپ منبر سے اترے، اور بچہ کو گود میں لے لیا، اور فرمایا: إنکم لَتُبَخِّلُوْنَ وتُجَبِّنُوْنَ وَتُجَهِّلُوْنَ وإنکم لَمِنْ رَیْحَانِ اللّٰهِ: بیشک تم بخیل بنادیتے ہو، اور بزدل بنادیتے ہو، اور جاہل رکھتے ہو، مگر تم ہو اللہ کا پھول! (ترمذی حدیث ۱۹۰۷)

بچوں کی وجہ سے آدمی پیسہ پیسہ جوڑ کر رکھتا ہے، لڑائی کا وقت آتا ہے تو چارپائی کے نیچے گھستا ہے اور علم حاصل کرنے کے لئے بھی نہیں نکل سکتا، کیونکہ بچوں کے لئے کمانا ہے، مگر اولاد سے محبت فطری امر ہے، وہ اللہ کا پھول ہیں، آدمی ان کو سونگھتا ہے!

بہرحال بخل انسان کی فطرت میں ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں، لیکن اگر دل بخیل ہوجائے تو معاملہ بہت خراب ہوجاتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾: جو لوگ دل کی بخیلی سے بچائے گئے وہی کامیاب

ہونے والے ہیں۔ آدمی بخل سے بالکل پاک ہوجائے ناممکن ہے، کیونکہ بخیلی انسان کی فطرت میں ہے، اس کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ظاہر ہونگے، اور اس میں کوئی خرابی بھی نہیں، خرابی اُس بخل میں ہے جس کا اثر دل تک پہنچ جائے اور دل بخیل ہوجائے۔

اسی طرح اگر انسان سے اوپر اوپر برائیاں صادر ہوں: تو کوئی بات نہیں! توبہ کی توفیق مل جاتی ہے، لیکن اگر نفس کھوٹا ہوجائے تو پھر انسان کی خیر نہیں، اس لئے خطبہ میں نفس کی برائیوں سے پناہ چاہی گئی ہے۔

برے اعمال سے پناہ طلبی:

قولہ: ومن سیئات أعمالنا: اور پناہ چاہتے ہیں، ہم اپنے کاموں کی برائیوں سے۔ یعنی برے کاموں سے ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ خدایا! برے کاموں سے ہمیں بچا اور اچھے کاموں کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ برے کام بہرحال برے ہیں، چاہے دل کے تقاضے سے نہ ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو مکا مارا تھا: وہ دل کے تقاضے سے نہیں تھا، پھر بھی آپ نے معافی طلب کی۔

جسے اللہ ہدایت دے: اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا

قولہ: مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ: جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیں، راہِ راست پر لے آئیں اسے دنیا کی کوئی طاقت گمراہ نہیں کرسکتی، قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ان جادوگروں کا قصہ ہے، جنھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کیا تھا، جب اللہ نے انھیں ہدایت بخشی، اور وہ مسلمان ہوگئے تو فرعون نے اگرچہ پہلے تو بڑے بڑے وعدے کئے تھے کہ اگر تم میدان جیت جاؤ گے تو یہ دونگا، وہ دونگا، اور دربارِ خاص کا منبر بنالوں گا، لیکن جب وہ مسلمان ہوگئے تو فرعون نے دھمکیاں دینی شروع کیں، اور صرف دی ہی نہیں ان پر عمل بھی کیا۔ اس نے کہا: ﴿لَأُقَطِّعَنَّ أَیْدِیَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِنْ خِلَافٍ﴾: میں تمہارا ایک ہاتھ اور ایک پیر الٹی جانب سے کاٹوں گا ﴿وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِیْ جُذُوْعِ النَّخْلِ﴾: اور میں تمہیں درختوں کے تنوں میں سولی دوں گا۔ اور فرعون نے ایسا کیا بھی، مگر ایک بھی جادوگر ایمان

سے نہیں ہٹا، ایمان کی حالت میں انھوں نے جان دیدی اور انھوں نے فرعون سے صاف کہہ دیا: جو تیرا جی چاہے کرلے، ہم تو اپنے خدا کے ہوگئے! اور خدا سے دعا کی: اے اللہ! ہم پر صبر ریڑھ دے، اگر آپ ہم پر صبر نہیں ریڑھیں گے تو ہم ثابت قدم نہیں رہ سکیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان بندوں پر صبر کا دریا بہادیا، اور وہ خوش خوش سولی پر چڑھ گئے اور جان دیدی، مگر ایک بندہ بھی اپنے ایمان سے نہیں ڈگمگایا، کیونکہ اللہ نے انہیں ہدایت بخشی تھی اور جس کو اللہ ہدایت بخشیں اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

اسی طرح کا ایک قصہ سورۂ بروج میں آیا ہے، قصہ یہ ہے کہ کچھ لوگ ایمان لائے، اُس وقت کے بادشاہ نے ان کو ایمان سے پھیرنے کے لئے بڑی بڑی خندقیں کھدوائیں، اور ان میں لکڑیاں بھر کے آگ جلوائی اور اس آگ پر بڑے بڑے کڑھاؤ رکھ کر اس میں تیل گرم کیا، پھر ایک ایک مؤمن کو لایا جاتا اور اس سے کہا جاتا کہ ایمان چھوڑ دے ورنہ آگ میں ڈال دیا جائے گا، کسی نے ایمان نہیں چھوڑا، سب نے آگ میں ڈالا جانا منظور کرلیا۔

اس موقعہ پر ایک عورت لائی گئی، جس کی گود میں بچہ تھا، اس سے بھی یہی کہا گیا، اس نے ایمان چھوڑنے سے انکار کردیا، پولیس نے اس کی گود سے بچہ لے کر کڑھاؤ میں ڈالدیا۔ ماں کے دل کی کیفیت اس وقت کیا ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بے صبری کا مظاہرہ نہ کردے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کو زبان دی، وہ تیل کے کڑھاؤ میں سے بولا: ماں! گھبرامت، میں بہت مزے میں ہوں، تو بھی آ میرے ساتھ!

غور کرو اس عورت کا ایمان اس بچہ کے ذریعہ کس نے بچایا؟ اللہ نے بچایا، جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت دیتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اس ایمان کو چھین نہیں سکتی۔

اور ایک ایمان ملتا ہے باپ دادا سے، نسلوں سے ایمان چلا آرہا ہے، یہ ایمان اتنا کمزور ہوتا ہے کہ ایک خوف کی آندھی آتی ہے تو کتنے ہی اس کی نذر ہوجاتے ہیں، مرتد ہوجاتے ہیں، دنیا کا کچھ نفع نظر آتا ہے تو ایمان چھوڑ دیتے ہیں، روز ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ یہ ایمان میراث میں ملا ہے، نسل در نسل

چلا آرہا ہے، وہ اللہ سے مانگا ہوا ایمان نہیں ہے، اس لئے اس کا حال ضعیف ہوتا ہے، وہ حالات کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

نومسلموں کا حال مسلمانوں سے بہتر!

اس کے برخلاف بعض غیر مسلم وہ ہوتے ہیں جو سچے دل سے مسلمان ہوتے ہیں، مطالعہ کرکے مسلمان ہوتے ہیں، یہ پکے مسلمان ہوتے ہیں، ان کو کوئی آفت اور کوئی نقصان ایمان سے ڈگمگا نہیں سکتا۔

ایک غیر مسلم طالب علم کا واقعہ ہے: وہ مسلمانوں کی صحبت سے مسلمان ہوا، ایمان قبول کرنے سے پہلے وہ ڈاڑھی مونڈاتا تھا، لیکن ایمان لانے کے بعد اس نے ڈاڑھی چھوڑ دی، اس کے جو مسلمان ساتھی تھے وہ سب ڈاڑھی مونڈواتے تھے، انھوں نے اس نومسلم کو سمجھایا کہ اسلام میں ڈاڑھی رکھنا کچھ ایسا ضروری نہیں، بغیر ڈاڑھی کے بھی بہت مسلمان ہیں، ڈاڑھی سنت ہے، کوئی فرض یا واجب نہیں۔ اُس نومسلم نے جواب دیا: دیکھو بھائی! میں نہیں جانتا کہ ڈاڑھی اسلام میں سنت ہے، واجب ہے یا فرض ہے، میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ہمارے آقا جو اللہ کے پاس سے دین لائے ہیں اور انھوں نے ہمیں دین پہنچایا ہے، ان کی ڈاڑھی تھی اور انھوں نے امت کو ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے، اور جو ماتحت فوجی ہوتا ہے اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے کمانڈر کے احکام میں سے بعض کو ضروری اور بعض کو غیر ضروری قرار دے، کمانڈر جو بھی حکم دے، ماتحت کا کام ہے اس کو بجالانا، ہمارے کمانڈر آقائے دوجہاں ہیں، انھوں نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے، اس لئے ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس پر عمل کریں، اور اس چکر میں نہ پڑیں کہ یہ حکم کس درجہ کا ہے؟

یہ ہے ایمان کی مضبوطی، یہ اللہ کا بخشا ہوا ایمان ہے، اور دوسرے طالب عالم چونکہ ان کے ماں باپ مسلمان تھے اس لئے وہ بھی مسلمان تھے، اس لئے اُس کے اور ان کے ایمان میں فرق تھا اُس کے پاس اللہ کا بخشا ہوا ایمان تھا، اور اِن کے پاس موروثی ایمان تھا۔

بہر حال جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ کتنے

ہی تھپیڑے آئیں، آفتیں اور مصیبتیں نازل ہوں: وہ ایمان کو ہلا نہیں سکتیں، بلکہ جتنی مصیبتیں آتی ہیں اتنا ایمان پختہ ہوتا ہے، اس لئے فرمایا: مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ : جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیں اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

جسے اللہ گمراہ کریں اسے کوئی راہ دکھانے والا نہیں!

اور جس کو اللہ تعالیٰ بچلا دیں، راستہ سے بھٹکا دیں، اس کو کوئی راستہ دکھلانے والا نہیں۔ اسی کو قرآنِ کریم میں جگہ جگہ کہا ہے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾: اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی، مہر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دل میں ہدایت داخل نہیں ہوسکتی، کہیں فرمایا ہے: ﴿طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾: اللہ نے ان کے دلوں پر چھاپ ماردی! چھاپ مارنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اب اس دل کے اندر ہدایت داخل نہیں ہوسکتی، ان کے دل اُس صراحی کے مانند ہوجاتے ہیں جو اوندھی ہو، اس صراحی میں کوئی آدمی پانی نہیں بھر سکتا، جتنا پانی ڈالو گے باہر نکل آئے گا، گمراہ لوگوں کا دل بھی ایسا ہی ہوجاتا ہے، کوئی خیر کی بات قبول نہیں کرتا، کتنا بھی اسے سمجھایا جائے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اللہ نے اسے راستہ سے بھٹکا دیا، اب اس کو کوئی دوسرا ہدایت نہیں دے سکتا۔

ہدایت وضلالت میں بندے کی مشیت کا دخل ہوتا ہے:

اور اُس پہلے کو اللہ نے ہدایت کیوں دی؟ اس نے چاہی اس لئے اللہ نے ہدایت دی، اور اس دوسرے کو اللہ نے راستہ سے کیوں بھٹکایا؟ اس نے بھٹکنا چاہا اس لئے اللہ نے بھٹکا دیا اللہ زبردستی کسی کو راستہ سے نہیں بھٹکاتے اور زبردستی کسی کو راستہ پر بھی نہیں لاتے، بندہ ہدایت چاہے خواہ کسی درجے میں چاہے تو اللہ تعالیٰ راہ دکھاتے ہیں، اور اگر بندہ گمراہی چاہے تو اللہ تعالیٰ راستہ سے بھٹکا دیتے ہیں، لیکن جب کسی کو اللہ نے ہدایت دیدی تو اب دوسری کوئی طاقت اسے بھٹکا نہیں سکتی اور جس کے دل پر اللہ نے مہر کردی اب اس کے دل کو کوئی کھول نہیں سکتا۔ قرآن کریم میں ہے: ﴿فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ، وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ﴾:

جس کو اللہ تعالیٰ راہِ راست دکھلانا چاہتے ہیں: اس کے دل کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں، اب اس کو اسلام کی ہر بات اچھی لگنے لگتی ہے، اور جس کو اللہ گمراہ کرنا چاہتے ہیں: اس کے دل کو تنگ کر دیتے ہیں، اور بہت تنگ کر دیتے ہیں، اور دل کو ایسا بھینچ دیتے ہیں کہ گویا آسمان کی طرف اٹھا چلا جا رہا ہے۔ اب وہ ہدایت کی آوازیں نہیں سنتا۔

ایک موقعہ پر یہودیوں نے کہا تھا: ﴿قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾: ہمارے دل پیک ہیں یعنی ہم تورات پر عمل کرنے والے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان ہے اور اس ایمان کے ساتھ ہمارے دل پیک ہوگئے ہیں، اب باہر کے برے اثرات اندر داخل نہیں ہو سکتے، گویا اسلام کو انھوں نے برے اثرات سے تعبیر کیا، اللہ نے فرمایا: پیک تو ہوگئے ہیں مگر اندر گندگی بھری ہوئی ہے، وہ گندگی پر پیک ہوگئے ہیں، اب خیر کی کوئی بات اندر نہیں جا سکتی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بَلْ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ﴾: بلکہ تم پر اللہ نے لعنت کی ہے، لعنت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ تمہارے دل شر کو لے کر پیک ہوگئے ہیں، اب کوئی خیر کی بات تمہارے دلوں میں نہیں پہنچ سکتی۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّكَ لَاتَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾: آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، جب اس کا دل پیک ہوگیا تو اب حضورؐ کے بس میں بھی اس کو ہدایت دینا نہیں۔ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ ہے: ﴿أَفَأَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ أَوْ تَهْدِيْ الْعُمْيَ﴾: کیا آپ بہرے کو سنا سکتے ہیں یا اندھے کو راہ دکھا سکتے ہیں؟ کتنا بھی چلاؤ بہرا سن نہیں سکتا اور اندھے کو راہ دکھانے کی لاکھ کوشش کرو وہ دیکھ نہیں سکتا۔

بات کا خلاصہ: یہ ہے کہ آدمی اگر کھلے دل سے ہدایت چاہے، راہِ راست پر آنا چاہے تو اللہ کی بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں، ان کی بارگاہ سے نعمتیں لٹائی جاتی ہیں، لیکن کوئی لینے کے لئے آئے بھی تو، زبردستی نعمتِ ہدایت نہیں دی جاتی، اس لئے میرے بھائیو! دلوں کو کھولو، اور اللہ کی طرف متوجہ ہوؤ، اللہ کے دین کی باتیں سنو، پڑھو اور مطالعہ کرو، اور یہ جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی سب کچھ نہیں ہے، آگے ایک دوسری زندگی بھی آ رہی ہے، جو اصل زندگی ہے،

اس کی تیاری کے لئے یہ دنیا کی زندگی ہے اس لئے ہدایت چاہو، اگر اللہ نے ہدایت دیدی تو پھر ان شاء اللہ کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور اگر اللہ کی طرف سے ہدایت کے فیصلے نہ ہوئے تو پھر کوئی دوسرا ہدایت کی راہ پر نہیں ڈال سکتا۔

توحید و رسالت کی گواہی:

قوله: أشهد أن لا إلٰه إلا الله، وحده لاشريك له، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله: أشهد کہا نشهد نہیں کہا، اب تک جمع کے صیغے تھے، سب کی طرف سے کہا جا رہا تھا، نحمدهٗ، ونستغفره اور نعوذ بالله، مگر اب جو الفاظ آئیں گے وہ ایک آدمی کے لئے ہیں، حضورؐ نے واحد متکلم کے صیغے استعمال فرمائے ہیں، لہٰذا آپ کو بھی اس میں شریک ہونا ہے، اب سننے والوں کو چاہئے کہ وہ بھی کہیں: میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلے ہی معبود ہیں، ان کا کوئی ساجھی نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اپنی رسالت کی گواہی دینا ضروری تھا:

خود حضورؐ کہہ رہے ہیں: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، کیونکہ حضورؐ کی دو حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت ہے: اللہ کا بندہ ہونے کی، اور دوسری حیثیت ہے: اللہ کا رسول ہونے کی۔ آپؐ نے اللہ کا جو پیغام اللہ سے حاصل کر کے انسانوں کو پہنچایا ہے وہ اپنے آپ کو بھی پہنچایا ہے، نمازیں اگر دوسروں پر فرض تھیں تو حضور پر بھی فرض تھیں، بلکہ کہتے ہیں: حضور پر تہجد کی نماز بھی فرض تھی، روزے دوسروں پر فرض تھے تو حضورؐ پر بھی فرض تھے، جتنی عبادتیں دوسروں پر فرض تھیں وہ سب حضورؐ پر بھی فرض تھیں، کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو دوسروں پر فرض ہو اور حضورؐ پر فرض نہ ہو۔

ایسا تو ہے کہ حضورؐ پر امت کے مقابلے میں کچھ زائد احکام ہیں، اور معاملات میں حضورؐ کی کچھ خصوصیات ہیں، جیسے امتی زیادہ سے زیادہ چار بیویاں ایک ساتھ رکھ سکتا ہے، مگر حضورؐ کے لئے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی، اور معاملات میں ایسی خصوصیات کی کچھ وجہیں ہوتی ہیں،

لیکن جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو جتنی عبادتیں امت پر ہیں اتنی ہی انبیاء پر بھی ہیں۔

انبیاء پر زکوٰۃ فرض کیوں نہیں؟

اور اگر کوئی کہے کہ انبیاء پر زکوٰۃ فرض نہیں، پس یکسانیت کہاں رہی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ زکوٰۃ ان پر بھی فرض تھی، اگر ان کے پاس مال ہوتا تو وہ بھی اس فریضہ کو ادا کرتے۔ سورۂ مریم (آیت ۳۱) میں ہے: ﴿وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا﴾: عیسیٰؑ نے کہا: اللہ نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جب تک میں (دنیا میں) زندہ رہوں۔ مگر کسی نبی کے پاس کبھی مال اکٹھا ہی نہیں ہوا، صبح آتا تو شام خرچ ہو جاتا پس زکوٰۃ کیسے فرض ہوتی؟

اور اگر کوئی کہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام تو بادشاہ تھے، پس ان پر تو زکوٰۃ فرض ہونی چاہئے تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام تک کیوں جاتے ہو، ہمارے آقا ﷺ بھی تو بادشاہ تھے، اسلامی حکومت کے سربراہ تھے اور آپؐ کے فاقوں کا حال معلوم ہے، پس جب اس بادشاہ کا یہ حال تھا تو ان بادشاہوں کا یہ حال کیوں نہیں ہو سکتا؟ وہ بھی انبیاء تھے اور یہ بھی نبی ہیں۔

اور انبیاء ہی نہیں امت میں بھی ایسے گذرے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے ہی تھے، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ سو سال پورے ہونے پر خلیفہ ہوئے ہیں وہ بھی ایسے ہی تھے اور ماضی قریب میں مغل بادشاہ حضرت عالمگیر رحمہ اللہ گذرے ہیں جنھوں نے غیر منقسمہ ہندوستان پر چون سال حکومت کی ہے: ان کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا ہے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، وہ قرآن لکھ کر فروخت کرتے تھے اور گھر کا خرچ چلاتے تھے، وہ حکومت کے خزانے کو پبلک کی پراپرٹی سمجھتے تھے۔

عبدیت اور رسالت کا اجتماع:

خیر حضورؐ خود فرما رہے ہیں: أشهد أن محمداً عبده ورسوله: میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہی آپؐ کا مقام و مرتبہ ہے، اس مقام سے آپؐ

کو اوپر اٹھانا بھی جائز نہیں اور نیچے گرانا بھی جائز نہیں، حضورؐ نے ایک موقعہ پر فرمایا تھا: جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں مبالغہ کیا اور ان کو اللہ کی حدود میں داخل کر دیا: تم میری شان میں ایسا مبالغہ نہ کیجئو۔

حضورؐ کا مقام ہے: اللہ کا بندہ ہونا، اس سے اوپر اٹھانا اور خدائی صفات حضور میں ماننا کہ اللہ نے تمام علم غیب آپؐ کو دیدیا ہے، اور حضورؐ ہر جگہ اللہ کی طرح حاضر و ناظر ہیں، اور حضورؐ کو کائنات میں ہر طرح تصرف کا اختیار ہے: اس میں اگرچہ حضورؐ کا اعزاز ہے، آپؐ کی قدر افزائی ہے، لیکن اللہ کی شان میں گستاخی ہے، ایک بندے کو جو اللہ کا بندہ ہے: اٹھا کر اللہ کے برابر کر دینا اور خدائی صفات اس میں مان لینا اللہ کی شان میں بڑی گستاخی ہے، یہ اللہ کی توہین کرنا ہے۔ اس لئے حضورؐ ہی نہیں ہر نبی کا خواہ وہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں، موسیٰ علیہ السلام ہوں یا عزیر علیہ السلام ہوں: سب کا مقام یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں، مگر ماوشما جیسے بندے نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے رسول بھی ہیں، نبی بھی ہیں، یہ دو چیزیں جمع ہو کر جو لیول بنتا ہے وہ آپؐ کا مقام و مرتبہ ہے۔

سابقہ ادیان اگرچہ برحق تھے مگر اب منسوخ ہیں:

قوله: ﴿أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ﴾: اللہ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دین حق کے ساتھ بھیجا، درانحالیکہ آپؐ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ہیں، قیامت کے سامنے۔

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب یہی دین دین حق ہے، اس کے علاوہ اب کوئی دوسرا دین برحق نہیں۔ حضورؐ کی تشریف آوری سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے ہیں، اور اپنے ساتھ دین لائے ہیں: وہ دین اگرچہ برحق تھے، آدم علیہ السلام کے ذریعہ اللہ نے جو دین بھیجا تھا وہ اُس وقت برحق تھا، اسی دین کی اتباع میں نجات تھی، پھر جب نوح علیہ السلام تشریف لائے اور اللہ نے ان کے ذریعہ دین بھیجا تو اس وقت وہی دین برحق تھا۔ اور اسی کی اتباع میں نجات تھی، اور اس سے پہلے والا دین منسوخ ہو گیا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ آیا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا، پھر عیسیٰ علیہ

السلام کا زمانہ آیا اور ہر پیغمبر کے ذریعہ اللہ نے دین بھیجا تو یہ سب ادیان اپنے اپنے وقت میں برحق تھے مگر سب ایک دوسرے سے منسوخ ہوتے رہے۔

پس اگر کوئی کہے کہ کیا پہلے والے ادیان برحق نہیں تھے جو منسوخ کئے گئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ برحق دین تھے! مگر اپنے زمانہ میں برحق تھے جیسے ملک کا ایک قانون ہوتا ہے، وہ ایک زمانہ تک چلتا ہے، پھر ملک کے حالات بدلتے ہیں تو پارلیمنٹ دوسرا قانون بناتی ہے، اور پچھلا قانون منسوخ کردیتی ہے۔ اب یہ جو نیا قانون بنا ہے یہی ملک کا دستور ہے، اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ اب کوئی کہے کہ وہ پچھلا دستور بھی تو اس ملک کا دستور تھا اس کے مطابق فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب یہ ہے کہ بیشک وہ ملک کا دستور تھا، لیکن اب اس کے مطابق فیصلہ نہیں ہوگا، اب جو نیا قانون بنا ہے اس کے مطابق فیصلہ ہوگا، پھر جب حالات بدلیں گے تو دوسرا نیا قانون بنے گا اور یہ قانون بھی منسوخ ہوجائے گا۔

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ جب حضور ﷺ کی تشریف آوری ہوئی، اور اللہ نے حضور کو نئے دین کے ساتھ بھیجا تو اب دین حق یہی ہے اور اس سے پہلے والے ادیان منسوخ ہوگئے، اب ان کی اتباع میں نجات نہیں۔ یہ مضمون قرآنِ کریم کے شروع میں آیا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾: اس آیت میں دو مضمون ہیں:

حضورؐ خاتم النّبیین ہیں:

اللہ کی جتنی کتابیں ہیں، اور جتنے انبیاء ورسول آئے ہیں سب پر ایمان لانا ضروری ہے، اگر کسی ایک نبی کا بھی یا کسی ایک کتاب کا بھی کوئی انکار کرے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا، چاہے وہ کتاب یا نبی ماضی کا ہو یا مستقبل کا، جیسے نوح علیہ السلام کی امت کے لئے گذرے ہوئے تمام نبیوں پر اور ان کی وحیوں پر بھی ایمان لانا ضروری تھا، اور آگے آنے والے نبیوں پر اور ان پر نازل ہونے والی وحیوں پر بھی ایمان لانا ضروری تھا، کیونکہ یہ سب انبیاء ایک سلسلہ کی کڑی ہیں، اور سب وحیاں ایک سرچشمہ سے نکلی ہیں۔ اُدھر کے نبی اور کتابیں بھی اللہ کی بھیجی ہوئی ہیں اور ادھر کے نبی اور کتابیں بھی اللہ تعالیٰ بھیجیں گے، پس سب کو ماننا ضروری ہے۔

پہلا مضمون یہ ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَیْكَ﴾: اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس وحی پر جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے ﴿وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾: اور اس وحی پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے، اس آیت میں بعد کی وحی کا تذکرہ نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، اگر حضورؐ کے بعد بھی کوئی نبی آنے والا ہوتا تو ایمان کے لئے بعد میں آنے والے انبیاء کی وحی پر بھی ایمان لانا ضروری ہوتا، لیکن ایسا نہیں فرمایا۔ پس معلوم ہوا کہ حضورؐ خاتم النّبیین ہیں۔ حضورؐ نبوت کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نیا نبی اور نئی کتاب آنے والی نہیں۔

نجات کے لئے گذشتہ نبیوں کے ساتھ حضورؐ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے:

دوسرا مضمون: اس آیت میں یہ ہے کہ حضورؐ کی تشریف آوری کے بعد جب تک آدمی گذشتہ نبیوں اور وحیوں کے ساتھ حضورؐ پر اور حضورؐ پر اتری ہوئی وحی کو نہیں مانے گا: مؤمن نہیں ہوسکتا، پس حضور سے پہلے کی جو امتیں ہیں، جیسے یہود ونصاریٰ، اب ان کی نجات پچھلے دینوں کے ماننے میں نہیں وہ تمام ادیان اپنے اپنے زمانہ میں صحیح تھے، مگر اب ان کے ماننے میں نجات نہیں، نجات صرف اس دین کے ماننے میں ہے جس کو لے کر حضورؐ بھیجے گئے ہیں، کیونکہ اب دین حق یہی ہے۔

کیا نجات کے لئے صرف عقیدۂ توحید کافی ہے؟ (ایک اہم آیت کی تفسیر)

اور یہ مضمون میں نے خاص طور پر اس لئے عرض کیا ہے کہ ان ملکوں میں بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ قرآنِ کریم (سورۃ البقرۃ آیت ۶۲) میں ہے: ﴿إِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئِیْنَ: مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾: بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور یہودی اور عیسائی اور فرقہ صابئین (ان سب میں سے) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر، اور روزِ قیامت پر، اور اس نے نیک عمل کیا ہو، تو ان کے لئے ان کا حق الخدمت ہے ان کے پروردگار کے پاس، اور (وہاں) ان کے لئے کسی طرح کا اندیشہ نہیں، اور نہ وہ مغموم ہونگے۔

اوراسی مضمون کی آیت سورۃ المائدہ (آیت ۶۹) میں بھی آئی ہے: ان آیتوں سے وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت میں نجات کے لئے حضورؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں، اگر کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے، توحید کا قائل ہے اوراپنے نبی کو مانتا ہے، اوراُس نبی کے ذریعہ جوشریعت آئی ہے اس پر عمل کرتا ہے تو وہ آخرت میں نجات پائے گا، نجات کے لئے حضورؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ یہ آیت کا غلط مطلب ہے، صحیح مطلب سمجھنے کے لئے پہلے مسلمانوں کے حالات پر نظر ڈالیں:

جنت کسی کے باپ کی جاگیر نہیں!

آج ہمارے حالات یہ ہیں کہ جس کا بھی نام مسلمانوں کے رجسٹر میں لکھا گیا ہے: وہ سمجھتا ہے کہ جنت میرے باپ کی جاگیر ہے۔ اور یہ غلط فہمی صرف اس امت میں نہیں ہے، پچھلی امتوں میں بھی تھی، قرآن کریم نے جگہ جگہ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: نام سے کچھ نہیں ہوتا، کام سے سب کچھ ہوتا ہے، سورۂ جمعہ میں ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوْا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَاراً﴾: ان لوگوں کی حالت جن پر تورات لادی گئی، یعنی یہود ونصاری جن کو زبردستی تورات دی گئی، نہ چاہنے کے باوجود ان کو تورات پر عمل کا مکلّف کیا گیا پھر انھوں نے اس کو نہیں اٹھایا یعنی اس پر عمل نہیں کیا، کہلاتے تو وہ یہودی اور نصرانی تھے مگر تورات پر عمل نہیں کرتے تھے، جیسے آج کل بہت سے مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مگر قرآن وحدیث پر عمل نہیں کرتے، ان کی مثال اس گدھے جیسی ہے جس پر دینی کتابیں لادی گئی ہوں، ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِ اللّٰهِ﴾: بہت بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا۔ اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے کی دو شکلیں ہیں، ایک کافر جیسا جھٹلانا، یعنی آیتوں کو سرے سے ماننا ہی نہیں، اور ایک جھٹلانا یہ ہے کہ کہلاتا ہے یہودی مگر تورات پر عمل نہیں کرتا، کہلاتا ہے عیسائی مگر تورات وانجیل پر عمل نہیں کرتا، کہلاتا ہے صابی، مگر اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتا، کہلاتا ہے مسلمان مگر قرآن وحدیث پر عمل نہیں کرتا، یہ بھی اللہ کی آیتوں کو عملاً جھٹلانا ہے، ان لوگوں کی یہ مثال ہے۔

یہ مثال کسے سنائی گئی ہے؟ مسلمانوں کو سنائی گئی ہے، اس امت کو سنائی گئی ہے، مگر چونکہ جس وقت قرآنِ کریم نازل ہورہا تھا: اس وقت امت میں اس کا مصداق نہیں پایا گیا تھا، ایسے نانہجار مسلمان اس وقت موجود نہیں تھے، بعد میں ان کا وجود ہونے والا تھا، اور ایسی صورت میں قرآن کریم کا طریقہ یہ ہے کہ وہ یہود ونصاری کی مثال بیان کرتا ہے، گفتہ آید در حدیثِ دیگراں کے طور پر اس امت کو آگے آنے والا بگاڑ سمجھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہود کی یہ مثال بھی اس امت کو سنائی گئی ہے۔

آیت سے مجھے بتانا یہ ہے کہ پچھلی امتوں کے جو احوال ہوئے تھے اسی طرح کے احوال اس امت کے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس صورت حال کو اس طرح کی آیتوں سے بار بار سمجھایا گیا ہے کہ دیکھو اللہ کے یہاں جو جنت ہے وہ کسی نام کے ساتھ وابستہ نہیں، بلکہ صحیح ایمان اور نیک اعمال کے ساتھ وابستہ ہے، جب دور تھا یہودیوں کا تو جو شخص موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا، ان کی کتاب تورات کے مطابق زندگی گذارتا تھا، اس کے لئے کوئی خطرہ کی بات نہیں تھی، اور اگر وہ نام کا یہودی تھا، تورات پر اس کا عمل نہیں تھا تو اس کے لئے ضروری نہیں کہ چونکہ وہ یہودی ہے اس لئے ضرور جنت میں جائے۔

اسی طرح جب دور تھا عیسائیوں کا تو ان کے لئے بھی یہی ضابطہ تھا کہ صرف عیسائی کہلانے پر نجات نہیں تھی، مؤمن ہو، عیسیٰؑ پر ایمان رکھتا ہو، ان کی کتاب پر عمل کرتا ہو تو اس کے لئے آخرت میں کوئی خطرہ نہیں۔

اسی طرح صابئین کا دور آیا تو اس میں بھی یہی بات تھی، پھر جب اس امت کا دور آیا تو اس کے لئے بھی یہی بات ہے۔ یہی مضمون اس آیت میں ہے کہ خواہ مسلمان ہوں، یہودی ہوں، صابئین ہوں یا عیسائی ہوں سب کے لئے اپنے اپنے زمانہ میں ایک ہی ضابطہ رہا ہے۔

وہ ضابطہ کیا ہے؟ جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر، اور اس نے اعمالِ صالحہ کیئے: وہ ناجی ہوگا، محض نام کی وجہ سے نجات نہیں ہوگی۔

رسول پر ایمان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ نجات کے لئے جس طرح خدا کو ماننا ضروری ہے، رسولوں کو ماننا بھی ضروری ہے، پھر آیت میں صرف ﴿مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ﴾ کیوں کہا ﴿وَرَسُوْلِہٖ﴾ کیوں نہیں بڑھایا؟

جواب: اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: آیت میں مذکورہ امتیں الگ الگ زمانوں کی ہیں، پس جب یہ امتیں الگ الگ زمانوں کی ہیں تو کونسے رسول کا تذکرہ کریں گے؟ ایک زمانہ کے لوگ ہوتے تو کہا جاتا: فلاں رسول پر ایمان لائے، یہ تو الگ الگ زمانوں کی امتیں ہیں، ان کے نبی بھی الگ الگ ہیں، اس لئے نبی کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ فرمایا: ﴿مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الآخِرِ﴾: جو ایمان لایا اللہ پر اور قیامت کے دن پر ﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾: اور اس نے نیک کام کئے، نیک کام وہی ہیں جو اللہ نے نبیوں کے ذریعہ انسانوں کو بتائے ہیں، لہٰذا تمام امتوں کے پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانوں میں جو اپنی امتوں کو نیک کام بتائے ہیں ان پر عمل کرے تو اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ یہودی اللہ پر ایمان لائے، اپنے نبی پر ایمان لائے، اپنے نبی کی کتاب پر عمل کر کے نیک کام کرے تو ان کے لئے کوئی خطرہ نہیں، صابئین کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے، عیسائیوں کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے اور اس امت کے لئے بھی یہی ضابطہ ہے۔

دوسری وجہ: عمل صالح پر ابھارنی والی چیزیں: اللہ پر ایمان لانا اور آخرت کا ڈر ہیں۔ رسول پر ایمان لانا اس کا خاص محرک نہیں، بلکہ جب اس محبت میں غلو ہوتا ہے تو بدعقیدگی اور بے عملی پیدا ہوتی ہے۔ بریلویوں میں جو بدعقیدگی اور بے عملی پائی جاتی ہے اس کا سبب حب نبوی میں افراط اور غلو ہی تو ہے۔ ان کا ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ہم محبوب کی امت ہیں، اس لئے ہم تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔

پس جو لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ مسلمان خواہ نام کے مسلمان ہوں، مرتے ہی جنت میں جائیں گے، وہ یہ غلط فہمی دور کر لیں۔ آیت کریمہ کا صحیح مطلب یہی ہے، نجات کے لئے صرف توحید کافی ہے: یہ آیت کا مطلب ہرگز نہیں۔

حضورؐ کی دو ذمہ داریاں:

حضورؐ کی ڈیوٹی اور فریضہ کیا ہے؟ فرمایا: ﴿بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾: جو لوگ بات قبول کر لیں، آپؐ ان کو خوشخبری سنانے والے ہیں اور جو بات قبول نہ کریں ان کو نتائج اعمال سے ڈرانے والے ہیں کہ جس راستہ پر تم جا رہے ہو اس کے ختم پر جہنم کا گڑھا ہے، پھر ان کی مرضی ہے وہ بات سمجھیں یا نہ سمجھیں، چلتے رہیں یا راستہ بدلیں۔ نبی کا کام صرف ڈرانا ہے، لوگوں کو زبردستی دین حق پر لے آنا نبی کا کام نہیں، یہ تو اللہ کے اختیار کی بات ہے، اور جنھوں نے بات سمجھ لی اور راستہ بدل دیا ان کو خوش خبری سنائیں کہ تمہارے ایمان اور عمل صالح کا بدلہ آخرت میں جنت کی شکل میں ملے گا اور جنت میں یہ یہ نعمتیں ملیں گی۔

ایمان اور اعمال صالحہ کا بدلہ اس دنیا میں نہیں:

بعض لوگ دنیا ہی میں ایمان اور عمل صالح کے بدلہ کے امیدوار رہتے ہیں، اس سلسلے میں جاننا چاہئے کہ اس کا بدلہ اس دنیا میں نہیں، حدیث میں ہے کہ ایک صاحب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں اگر میں ایمان لے آؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: جنت ملے گی! انھوں نے کہا: یا رسول اللہ! ہاتھ بڑھائیے! حضورؐ نے ہاتھ لمبا کیا، انھوں نے بیعت اسلام کی۔

اس حدیث میں حضورؐ نے دنیا کی کوئی خوش خبری نہیں سنائی کہ تم ایمان لے آؤ گے تو ہم رہنے کے لئے تمہیں گھر دیں گے، پہننے کے لئے کپڑے دیں گے، لاکھ دو لاکھ روپے دیں گے، تم کو بڑا بنا دیں گے، نہیں! کچھ بھی نہیں، جو کچھ دنیا میں مل جائے وہ اللہ کا کرم ہے، جس کی قسمت میں اللہ نے جو لکھا ہے وہ ملے گا اور جو تم ایمان لا رہے ہو اس کے بدلے میں جنت ملے گی۔ بشیراً کا یہی مطلب ہے۔

اور اگر کوئی نبی کی بات نہیں مانتا، من مانی زندگی گذارتا ہے تو انبیاء اس کو سزا سے ڈرانے والے ہیں اور وہ سزا کسی کو نظر نہیں آتی، کیونکہ وہ آگے آ رہی ہے، انبیاء اس کی خبر دے رہے ہیں، اسی کا نام انذار ہے، جو چیزیں سامنے ہوں ان سے کیا ڈارنا؟ سامنے شیر

کھڑا ہے اس سے ڈرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک چیز ہے جو آگے آرہی ہے، وہ دکھتی نہیں مگر یقیناً آنے والی ہے اس کی پہلے سے خبر دینے کا نام إنذار (ڈرانا) ہے۔

تو انبیاء یہ بتاتے ہیں کہ دیکھو اگر میری بات نہیں مانو گے تو دنیا تو کسی طرح گذر جائے گی لیکن مرتے ہی یہ ہوگا وہ ہوگا، یہ جو قرآن وحدیث نے خبریں دی ہیں یہ سب انذار ہے اور انبیاء کا کام انذار تک محدود ہے، کسی کو زبردستی ایمان کے دائرہ میں لے آنا ان کے اختیار میں نہیں، اسی لئے فرمایا: ﴿أَرْسَلَهُ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَنَذِيْرًا﴾: اللہ نے حضورؐ کو دین حق کے ساتھ بھیجا، درانحالیکہ آپؐ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ہیں۔

قیامت کے سامنے حضورؐ کو بھیجنے کا مطلب:

قولہ: بين يَدَيِ الساعة: اللہ نے حضورؐ کو قیامت کے سامنے بھیجا ہے۔ بین یدی کے معنی ہیں: سامنے، جمعہ کے دن جب امام منبر پر بیٹھتا ہے تو دوسری اذان **بين يدى الإمام** ہوتی ہے، یعنی امام کے سامنے ہوتی ہے، اس کا مطلب بعض اذان دینے والے یہ سمجھتے ہیں کہ امام منبر پر بیٹھا ہو تو اس کے منہ کے قریب جاکر اذان دی جائے تاکہ منہ سے تھوک نکلے تو امام پر گرے۔ امام کے سامنے کا یہ مطلب نہیں ہے، امام کے سامنے کا مطلب یہ ہے کہ مؤذن دائیں بائیں نہ ہو، بالکل سامنے ہو اور مسجد سے باہر بھی نہ ہو، کیونکہ پھر امام کو مؤذن نظر نہیں آئے گا جبکہ یہ اذان امام کے سامنے ہے۔ تو یہاں بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

اور قیامت کے سامنے حضور کو بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، اس درمیان کوئی اور نبی تشریف لانے والے نہیں، اب حضورؐ ہی کا لایا ہوا دین قیامت تک چلے گا۔

قرآن ہی کی حفاظت کی ذمہ داری کیوں لی؟

اور اسی لئے پچھلی کسی کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے نہیں لی اور حضورؐ پر جو کتاب اتاری اس کی حفاظت کی ذمہ داری لی، کیونکہ اگر قرآن محفوظ نہیں رہے گا تو حضورؐ کا لایا ہوا دین باقی نہیں رہے گا۔ اور جب حضور کا لایا ہوا دین باقی نہ رہا تو ہدایت کا چراغ گل

ہوگیا، لوگ اندھیرے میں رہ جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی دارو گیر کیسے کریں گے؟ قیامت تک روشنی پھیلی رہنی چاہئے، پھر لوگ آنکھیں موندلیں، اور روشنی نہ دیکھیں تو یہ ان کا قصور ہے، لیکن روشنی چہار سو پھیلی رہنی چاہئے، اور وہ روشنی قرآن اور حدیثیں ہیں، ان کا وجود قیامت تک بعینہٖ باقی رہنا چاہئے، صحابہ کے سامنے بھی یہی قرآن اور یہی حدیثیں تھیں، کوئی نئی چیز نہیں تھی، آج بھی ہمارے سامنے یہی قرآن اور یہی حدیثیں ہیں، اور قیامت تک تمام مسلمانوں کے سامنے یہی دو چیزیں رہیں گی۔

میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے: کا مطلب

بہر حال حضورؐ اور قیامت کے درمیان کسی نبی کا فاصلہ نہیں، حضور ﷺ خاتم النّبیین ہیں، یہ مضمون حضورؐ نے ایک دوسری حدیث میں مثال دے کر سمجھایا ہے، فرمایا: **بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ**: میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، اور آپؐ نے دو انگلیوں (سبابہ اور وسطی) کو ملایا۔ ان دو انگلیوں کو ملانے کا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جیسے یہ انگلی اِس انگلی کے ساتھ ملی ہوئی ہے اسی طرح میں اور قیامت ملے ہوئے ہیں، میرے اور قیامت کے درمیان کسی اور نبی، کسی اور کتاب، کسی اور دین کا فصل نہیں، جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فصل نہیں۔

دوسرا مطلب: علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ بیچ کی انگلی بڑی ہے، اور تھوڑی آگے ہے، اور دوسری انگلی تھوڑی چھوٹی ہے اور پیچھے ہے، پس حضورؐ قیامت سے اتنا پہلے بھیجے گئے ہیں۔ جب چھوٹی انگلی بڑی انگلی کے برابر ہوجائے گی تو قیامت آجائے گی۔

نزولِ عیسیٰ علیہ السلام سے اعتراض کا جواب:

یہاں کوئی سوال کرسکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو دجال کے زمانہ میں اتریں گے، پھر آپؐ خاتم النّبیین کہاں رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے تشریف لانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ نئے نبی نہیں ہیں، وہ تو پچھلے دور کے نبی ہیں، جب آپؐ کے دور میں تشریف لائیں گے تو انجیل وتورات

پر عمل نہیں کریں گے، لوگوں کی تورات وانجیل کے مطابق راہ نمائی نہیں کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو قرآن وحدیث سکھلائیں گے، قرآنِ کریم میں دو جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے کہ ہم ان کو چار چیزیں سکھلائیں گے: قرآن، حدیث، تورات اور انجیل ﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ﴾: پس تورات وانجیل تو ان کے زمانہ میں تھیں لیکن قرآن وحدیث تو اس زمانہ میں نہیں تھیں، پھر اللہ کب سکھلائیں گے؟ جب قیامت کے قریب آپؑ اتریں گے اس وقت یہ دونوں چیزیں سکھلائیں گے، پھر حضرت عیسیٰؑ ان دونوں کے مطابق خود بھی عمل کریں گے اور امت محمدیہ کی بھی راہ نمائی کریں گے، لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کے تشریف لانے سے حضورؐ کے خاتم النّبیین ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں اگر کوئی نیا نبی آتا، خواہ کسی نوعیت کا آتا اور کامل نیا دین لے کر آتا یا جزوی طور پر نیا دین لے کر آتا تو خلل پڑتا، لیکن ایسا نہیں ہوگا۔

حضرت عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟

یہاں بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر عیسیٰؑ ہی کو قیامت سے پہلے کیوں اتارا جائے گا؟ پھر دوسرا سوال یہ بھی کرتے ہیں کہ حضورؐ سے پہلے تو کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء گذرے ہیں، ان میں سے صرف عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا؟ اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟ ان سے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کو یہودیوں نے آرے سے چیر کر شہید کیا، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے انبیاء کو یہودیوں نے قتل کیا، پس اللہ نے کسی اور نبی کو کیوں نہیں اٹھایا، عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا؟

ختم نبوت کی تین صورتیں:

اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ حضورؐ تین طرح سے خاتم النّبیین ہیں:

ایک: اس طرح کہ تمام نبیوں کے دنیا میں آجانے کے بعد آخر میں نبی ﷺ تشریف لائے ہیں، اس کا نام: ختم نبوت زمانی ہے، یعنی زمانہ کے اعتبار سے آپؐ سب سے آخر میں آئے ہیں۔ اور اس کو سب مسلمان جانتے ہیں، اس لئے اس کی زیادہ وضاحت

کی ضرورت نہیں۔

دوسری: اس طرح کہ آپؐ وصفِ نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہیں، اور دوسرے تمام انبیاء آپؐ کے فیض سے انبیاء بنے ہیں، یعنی سلسلۂ نبوت آپؐ پر منتہی ہوتا ہے، جیسے سورج کی روشنی ذاتی ہے، کسی اور جگہ سے مستفاد نہیں، اور زمین اور چاند کی روشنی عرضی ہے، سورج سے مستفاد ہے۔ اسی طرح آپ آفتابِ نبوت ہیں، اور دوسرے انبیاء چاند تارے ہیں، ان کو نبوت آپؐ کے فیض سے ملی ہے، اس کا نام 'ختم نبوت رتبی' ہے۔

اس کی دلیل کیا ہے؟ دلیل یہ ہے کہ پچھلے نبیوں میں سے کسی ایک نبی کو حضورؐ کے زمانہ میں اتارا جائے جو خود نبی ہوتے ہوئے بھی حضورؐ کے دین پر عمل کریں۔ اور دوسروں کی اس کے مطابق راہ نمائی کریں، اس سے ان کا حضورؐ کے ماتحت ہونا معلوم ہوگا، اگر پچھلا کوئی نبی نہ آئے تو یہ صرف کہنے کی بات ہوگی کہ حضورؐ پہلے والے سب نبیوں کے لئے بھی خاتم ہیں، اور اب جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اتار کر عملی طور پر یہ دکھایا جائے گا تو ثابت ہوجائے گا کہ حضورؐ مستقبل کی طرح ماضی کے بھی خاتم النّبیین ہیں۔

چنانچہ ایک سلسلۂ بیان میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا لَمَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِيْ: اگر موسیٰ علیہ السلام آج زندہ ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے بغیر چارہ نہیں تھا، یعنی پچھلا کوئی بھی نبی ہو: موسیٰؑ ہوں، عیسیٰؑ ہوں، نوحؑ ہوں، ابراہیمؑ ہوں اگر وہ حضورؐ کے زمانہ میں آئیں تو حضور ہی کی اتباع کریں گے، کیونکہ حضورؐ خاتم النّبیین ہیں، یہی بات ظاہر کرنے کے لئے اور ساری دنیا کو دکھانے کے لئے ایک نبی کو قیامت کے قریب اتارا جائے گا اور بتایا جائے گا کہ دیکھو یہ اپنی نبوت موقوف کر کے حضور کی اتباع کر رہے ہیں۔ اور سورۂ آل عمران (آیت ۸۱) میں جو میثاق مذکور ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔

اس پر سوال ہوگا کہ یہ کام تو کسی بھی نبی کو اتار کر لیا جاسکتا ہے، جتنے انبیاء قتل کئے گئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی دشمن سے بچا کر اٹھالیا جاتا اور قیامت کے قریب اتارا جاتا تو مقصد حاصل ہوجاتا، خاص طور پر عیسیٰؑ ہی کو کیوں اٹھایا گیا اور انہی کو کیوں اتارا جائے گا؟

مسیح ہدایت اور مسیح ضلالت:

اس کو سمجھنے کے لئے ایک دوسرا مضمون سمجھنا ضروری ہے: وہ یہ ہے کہ مسیح دو ہیں: ایک: مسیح ہدایت ہیں، اور ایک: مسیح ضلالت، مسیح ہدایت: حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور مسیح ضلالت: کانا دجال ہے، مَسِیْحٌ: فعیلٌ کا وزن ہے جو اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسم مفعول کے معنی میں بھی، مسیح بمعنی ماسح کے معنی ہیں: ہاتھ پھیرنے والا۔ حضرت عیسیٰؑ مسیح اس لئے ہیں کہ وہ ہر طرح کے بیماروں پر ہاتھ پھیرتے تھے اور ان کے ہاتھ پھیرنے سے اللہ تعالیٰ شفا بخشتے تھے۔ اور مسیح بمعنی ممسوح کی معنی ہیں: ہاتھ پھیرا ہوا۔ کانا دجال مسیح اس لئے ہے کہ اس کی ایک آنکھ چوپٹ ہوگی، گویا وہاں کسی نے ہاتھ پھیر دیا ہے، اور وہ جگہ مٹ گئی ہے اور آنکھ نہیں رہی!

اور ہر نبی نے اپنی امت کو بتایا ہے کہ شیطان انسانوں کا کھلا دشمن ہے، وہ یہ مشن لے کر چل رہا ہے کہ انسانوں کو صحیح راستہ پر نہ چلنے دے۔ اور شیطان چھوٹے بڑے بہت ہیں، ایک بڑا شیطان بالکل شروع میں ہے اور ایک بڑا شیطان بالکل آخر میں ہے، اگلے بڑے شیطان کا نام: عَزَازِیْل ہے، اور اس کا لقب: ابلیس ہے، یعنی اللہ کی رحمت سے قطعی مایوس۔ اور آخری شیطان کا نام مسیح دجال ہے، یعنی کانا چارسوبیس۔ یہ کب آئے گا؟ اس کا ٹائم اور زمانہ نہیں بتایا گیا، پچھلے تمام نبیوں نے بھی اپنی امت کو اس کے فتنہ سے خبر دار کیا ہے اور حضورؐ نے بھی خبر دار کیا ہے اور اب تو اس کا حضورؐ کی امت میں آنا طے ہے کیونکہ اب قیامت تک دوسری کوئی امت نہیں۔

بہر حال جہاں انبیائے نبی اسرائیل نے مسیح ضلالت کے فتنہ سے آگاہ کیا ہے، وہیں مسیح ہدایت کی خوش خبری بھی دی ہے، پس گویا پچھلی کتابوں میں مسیح ہدایت کا بھی تذکرہ تھا اور مسیح ضلالت کا بھی، اس لئے جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور انھوں نے کہا کہ میں وہ مسیح ہدایت ہوں جس کی خبر فلاں پیغمبر نے دی ہے، فلاں نے دی ہے، فلاں نے دی ہے، تو یہودیوں نے نہیں مانا اور کہا کہ تم مسیح ہدایت نہیں بلکہ مسیح ضلالت ہو، اور اسی بناء پر تمام یہودیوں نے ان کی مخالفت کی، علاوہ بارہ حواریوں کے، اور مسیح ضلالت سمجھنے کی وجہ سے

انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کا پلان بنایا، اور اپنے گمان میں مار بھی ڈالا۔ اب وہ مسیح ہدایت کا انتظار کر رہے ہیں، آج بھی یہودیوں میں جو پڑھے لکھے ہیں ان سے قریب ہو کر معلوم کریں تو وہ بتائیں گے کہ مسیح ہدایت آنے والے ہیں اور جن کو ہم نے قتل کیا ہے: وہ مسیح ضلالت تھا۔ چنانچہ جب کانا دجال ظاہر ہوگا تو حدیثوں میں ہے کہ سب سے پہلے یہودی اس کا اتباع کریں گے، کیونکہ وہ مسیح ہدایت کے انتظار میں ہیں اور جس کو انھوں نے قتل کیا تھا وہ تو ان کے خیال میں کانا دجال تھا، پس اب جو مسیح آئے گا وہ مسیح ہدایت ہوگا، اس لئے وہ دوڑ کر کانے دجال کی پیروی کریں گے اور سب سے زیادہ متابعت کرنے والے یہودی ہوں گے اور وہ ساری دنیا کو یہ یقین دلانا چاہیں گے کہ یہ مسیح ہدایت ہیں، اور جو پہلے مسیح آیا تھا وہ مسیح ضلالت تھا۔

بتاؤ اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا کہ یہ کانا دجال مسیح ہدایت نہیں ہے، بلکہ مسیح ضلالت ہے؟ اس کی صورت بس یہی ہے کہ جو مسیح ہدایت ہیں وہ بھی اسی زمانہ میں اتریں اور دونوں مسیح ایک ساتھ اکٹھا ہوں اور جو جس کو ختم کرے وہ مسیح ہدایت ہے اور جو مر جائے وہ مسیح ضلالت ہے، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لا کر علی الاعلان کانے دجال کو قتل کریں گے اور معاملہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جائے گا کہ مسیح ہدایت یہ ہیں، اور یہ جو کمبخت مارا گیا یہ مسیح ضلالت کانا دجال تھا۔ یہ ہے وہ مقصد جو حضرت عیسیٰؑ ہی کو اتارنے سے پورا ہو سکتا ہے، کسی اور نبی کے اتارنے سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

اصل مضمون تو میں یہ بیان کر رہا تھا کہ بین یدی الساعة میں اعلان ہے کہ حضورؐ قیامت سے پہلے آئے ہیں اور حضور اور قیامت کے بیچ میں کوئی نبی نہیں، اور حضور خاتم النّبیین ہیں تین طرح سے: ایک خاتم النّبیین زمانی ہیں یعنی حضور سب نبیوں کے آخر میں آئے ہیں۔ دوم: خاتم النّبیین رُتَبِیْ ہیں یعنی سب انبیاء آپؐ کے فیض سے نبی بنے ہیں، پس مرتبہ آپؐ کا سب سے بڑا ہے۔

سوم: خاتم النّبیین مکانی ہیں یعنی اللہ کی کائنات میں جو بے شمار مخلوقات ہیں، ان میں سے جو بھی مکلّف مخلوق ہے وہاں نبوت کا سلسلہ جاری ہے، اور اللہ کی کتابیں وہاں ضرور

نازل ہوتی ہیں، اور وہاں بھی انبیاء اور ان کے خاتم ہیں، مگر وہ بھی سب آپ ؐ کے فیض سے انبیاء اور خاتم انبیاء ہیں، اصل وصفِ نبوت کے ساتھ آپ ؐ متصف ہیں، اور آپ ؐ کی بعثت ہماری اس زمین میں ہوئی ہے، اور یہ زمین تمام زمینوں سے اشرف و افضل ہے۔ اس لئے اس زمین کا خاتم ہی اصل خاتم ہے، اور دوسری زمینوں کے خاتم اس زمین کے خاتم کے فیض سے خاتم ہیں یہی ختم نبوت مکانی ہے۔

قادیانی دھوکہ:

آپ کے ان ملکوں میں قادیانی ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ وہ کسی کو گمراہ کریں، اس لئے قادیانی جو کہتے ہیں وہ بھی سنتے چلو، وہ کہتے ہیں: حضور ؐ سے پہلے نبوت دو طرح کی تھی، تشریعی اور غیر تشریعی۔ تشریعی یعنی نیا قانون لانے والا نبی، جیسے موسیٰ علیہ السلام تشریعی نبی ہیں، پھر آگے جتنے انبیاء بنی اسرائیل ہوئے ہیں وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے، بلکہ موسیٰ علیہ السلام ہی کی شریعت کی خدمت کرتے ہیں، پس وہ غیر تشریعی انبیاء ہیں۔ قادیانی کہتے ہیں کہ حضور ؐ ان دونوں قسموں کے لئے خاتم ہیں یعنی اب حضور ؐ کے بعد نہ کوئی تشریعی نبی آسکتا ہے نہ غیر تشریعی، البتہ حضور ؐ کے بعد نبوت کی ایک تیسری قسم شروع ہوئی ہے اور وہ ہے: امتی نبی، یعنی حضور کی امت کا ایک فرد حضور کی اتباع میں اتنا کمال پیدا کرلے کہ اللہ اسے نبوت سے سرفراز کردیں، اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارا مرزا ایسا ہی نبی تھا۔ اب آپ ختم نبوت سے متعلق قرآن کی جو بھی آیت پیش کریں گے یا جو بھی حدیث پیش کریں گے: وہ فوراً کہہ دیں گے کہ جو نبوت کی دو قسمیں ختم ہوگئیں ہیں، ان کے بارے میں یہ آیتیں اور یہ حدیثیں ہیں، امتی نبی کے بارے میں یہ نہیں ہیں، لہٰذا ان کو کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان سے تین باتیں پوچھو:

پہلی بات: ان سے یہ پوچھو کہ یہ جو تیسری قسم حضور ؐ کے بعد شروع ہوئی ہے وہ کونسی آیت یا حدیث سے ثابت ہے؟ وہ بغلیں جھانکیں گے۔ وہ قیامت کی صبح تک کوئی آیت یا حدیث پیش نہیں کرسکتے۔ لہٰذا ان کو ختم نبوت کی دلیل مت دو، وہ تو ماننے والے نہیں، انہی سے دلیل کا مطالبہ کرو۔

دوسری بات: ان سے یہ پوچھو کہ تیرا مرزا کب پیدا ہوا؟ وہ بتائے گا: فلاں سن میں! وہ کب نبی بنا؟ وہ بتائے گا: فلاں سن میں، ان سے پوچھو: اس کے زمانے تک حضور ؐ سے کتنا فاصلہ ہوگیا؟ وہ بتائے گا: تیرہ سو سال کا! اب پوچھو تیرہ سو سال میں کوئی اور امتی نبی بنا؟ وہ کہے گا: نہیں! پہلا امتی نبی میرا مرزا ہے، تو آپ اس سے کہیں کہ ان تیرہ سو سال میں کوئی ایسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو حضور کی پیروی میں کمال پیدا کرتی، ابوبکرؓ نے کمال پیدا نہیں کیا، عمرؓ نے نہیں کیا، عثمانؓ نے نہیں کیا، علیؓ نے نہیں کیا، صرف تیرے مرزا ہی نے کمال پیدا کیا؟

تیسری بات: اس سے یہ پوچھو کہ تیرے مرزا کے بعد قیامت کتنی دور ہے؟ وہ کہے گا: معلوم نہیں، مگر بہت دور ہے! اب پوچھو: قیامت تک امتی نبی کتنے آئیں گے؟ وہ کہے گا: اب کوئی نہیں پیدا ہوگا، میرا مرزا ہی آخری امتی نبی ہے۔

پس میرے بھائیو! جھگڑا یہ ہوا کہ خاتم النبیین سرکار مدینہ ہیں یا یہ مرزا غلام احمد قادیانی؟ ساری امت کہتی ہے: خاتم النبیین سرکارِ مدینہ ہیں، اور یہ قادیانی کہتا ہے: نہیں وہ خاتم النبیین نہیں ہیں، خاتم النبیین مرزا ہے، کیونکہ اس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔

ایک اور دھوکہ: کہ نبوت رحمت ہے: اس کو جاری رہنا چاہئے

قادیانی نادان مسلمانوں سے پوچھتے ہیں: نبوت رحمت ہے یا زحمت؟ کون کہے گا کہ زحمت ہے؟ سب جواب دیں گے: رحمت ہے؟ اب قادیانی کہے گا: رحمت پر بین (پابندی) لگنی چاہئے یا وہ جاری رہنی چاہئے؟ ہر شخص اس کا جواب یہی دے گا کہ رحمت جاری رہنی چاہئے، اب وہ کہے گا کہ آپ ﷺ کے بعد بھی نبوت جاری ہے، کیونکہ وہ رحمت ہے، اور مرزا قادیانی نبی ہے، پس اس کو مانو۔

اس کا جواب: یہ ہے کہ بارش بھی رحمت ہے، پس اگر وہ ہر وقت برستی رہے تو رحمت ہوگی یا عذاب؟ اصل بات یہ ہے کہ رحمت: اس وقت تک رحمت ہے: جب بوقت حاجت ہو اور بقدر حاجت ہو، ورنہ وہ عذاب ہے۔ بارش موقعہ پر برسے اور بقدر ضرورت برسے تو رحمت ہے، ناوقت برسے یا برستی ہی رہے تو وہ طوفانِ نوح بن جائے گی، اور رحمت نہیں رہے گی۔

اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ جب گذشتہ نبی کا دین باقی نہ رہے، اور دنیا میں اندھیرا چھا

جائے، اور دوسرا نبی آئے اور وہ ہدایت کی روشنی دکھائے تو یہ نبوت رحمت ہے۔ مگر نبی ﷺ کے بعد تو یہ صورت نہیں، قرآن وسنت بحالہ باقی ہیں، ان میں زبر زیر کا فرق نہیں آیا۔ ان کے سوتے خشک نہیں ہوئے، اب نیا نبی خواہ وہ کیسا ہی ہو، آکر کیا کرے گا؟ سوائے اس کے کہ آپؐ کے دین کو بگاڑے، اور جہاد کو منسوخ کر کے اپنے آقا برطانیہ کو خوش کرے: اور کیا کرے گا؟ ایسی جھوٹی نبوت رحمت نہیں بلکہ زحمت ہے، بلکہ بہت بڑا فتنہ ہے۔

قادیانیوں کے تذکرے کی ضرورت:

اس طرح وہ دھوکہ دے کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور ہمیں ان کا تذکرہ کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ وہ ہم میں گھستے ہیں۔

دیکھو ہمارا یہ محلّہ ہے اس میں شیعہ بھی ہیں ہمیں ان کا تذکرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمیں ان سے کوئی پریشانی نہیں، وہ الگ ہیں ہم الگ ہیں، وہ جو کرتے ہیں کرتے ہیں، ہمیں ان سے نہ کچھ لینا ہے نہ دینا، لیکن قادیانیوں کا تذکرہ ہمیں اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں گھستے ہیں اور کہتے ہیں کہ جیسے حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی ایسے ہی ہم احمدی، پس جب تم حنفی سے شافعی ہو جاؤ تو کوئی حرج نہیں۔ شافعی سے حنبلی ہو جاؤ تو کوئی حرج نہیں، اسی طرح اگر تم احمدی ہو جاؤ تو کیا حرج ہے؟ اور لو ایک لاکھ ڈالر، اور جو حسین خوبصورت لڑکی چاہو اس سے تمہارا نکاح کئے دیتے ہیں۔

اس طرح زر اور زن کا لالچ دیتے ہیں اور مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔

بہر حال بین یدی الساعة کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے حضور کو دین حق کے ساتھ قیامت سے پہلے بھیجا ہے اور حضور اور قیامت کے درمیان کسی طرح کا کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، نہ تشریعی، نہ غیر تشریعی، نہ امتی!

اطاعت کامیابی کی کنجی ہے:

قوله: ومن يطع الله ورسوله فقد رَشَد واهْتَدى: اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، ان کے احکام کو مانتا ہے، وہ یقیناً راہ راست پر آ گیا اور اس نے

ہدایت پالی، صرف مسلمان نام ہونے سے یا اپنے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے سے کہ میں مسلمان ہوں: ہدایت اور کامیابی نہیں مل سکتی، اللہ اور اس کے رسول نے جو احکام دیئے ہیں ان کی اطاعت کرو تو ہی ہدایت اور کامیابی سے ہم کنار ہو سکتے ہو، یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

اللہ و رسول کی نافرمانی اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنا ہے:

قوله: وَمَنْ يَّعْصِهِمَا فَلَا يَضُرُّ إِلَّا نَفْسَهُ: اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ ضرر نہیں پہنچاتا مگر اپنے آپ کو، اللہ کی نافرمانی رسول کی نافرمانی ہے اور رسول کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے، رسول نے کوئی حکم اپنی طرف سے نہیں دیا، رسول کے دیئے ہوئے احکام اللہ کے احکام ہیں، لہٰذا ایک کی نافرمانی نہیں ہو سکتی، جہاں بھی نافرمانی ہوگی دونوں کی ہوگی، اور جو شخص دونوں کی نافرمانی کرتا ہے وہ جان لے کہ اس سے اللہ کی شان میں کچھ کمی نہیں آئے گی۔ اس سے رسول کی عزت میں کیا کمی آئے گی؟ تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ ایک حدیث قدسی میں ہے: اگر تمام آسمانوں کی مخلوقات، تمام زمینوں کی مخلوقات، تمام جنات اور تمام انسان مجتمع ہو جائیں بد بخت سے بد بخت انسان کے دل پر تو اللہ کی شان میں ذرہ بھر کمی نہیں آسکتی، اور اگر سب مجتمع ہو جائیں بڑے سے بڑے پرہیزگار کے دل پر تو اللہ کی شان میں ذرہ بھر زیادتی نہیں ہو سکتی، لہٰذا جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتا، وہ اپنا ہی بگاڑتا ہے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے، وہ یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لے۔ وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين۔

۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ کریم متقیوں کے لئے راہ نما کتاب ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿الٓمٓ، ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَیْبَ فِیْهِ، هُدًى لِلْمُتَّقِیْنَ﴾

بزرگانِ محترم! برادرانِ اسلام! اور معزز بھائیو! اللہ جل شانہ کا شکر ہے: اس نے ہمیں ایک مرتبہ اور جمع کیا۔ اب ہم مہینہ بھر ایک ساتھ رہیں گے، اور اللہ جو کچھ کہنے کی توفیق عطا فرمائے گا: کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہماری زندگی کے سانس بڑھائے اور یہ مبارک موقعہ عنایت فرمایا کہ ہم مل بیٹھیں، دین کے تعلق سے کچھ باتیں کریں، مؤمن کی زندگی بڑی قیمتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے: بہترین شخص وہ ہے جس کی زندگی لمبی ہو اور نیک کاموں کی توفیق ملے، یہ خوش نصیبی ہے انسان کی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رمضان سے ہمکنار فرمایا ہے، دعا کریں: وہ ہمیں ماہِ مبارک میں نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائیں۔

سورۂ فاتحہ کسی پارے کا جزء نہیں

میں نے جو آیتِ کریمہ پڑھی ہے، یہ پہلے پارے کی پہلی آیت ہے، اور الحمد شریف کسی پارے کا جزء نہیں، تمام پاروں سے الگ ہے، پارے ﴿الٓمٓ، ذٰلِكَ الْكِتَابُ﴾ سے شروع ہوتے ہیں، اور یہ پارے اللہ کے یہاں سے نازل نہیں ہوئے، لوگوں نے بنائے ہیں، جیسے لوگوں کی سہولت کے لئے قرآن میں رکوع لگائے گئے ہیں، اور لوگوں کی سہولت ہی کے لئے ہر پارہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح لوگوں کی سہولت کے لئے

قرآنِ کریم کو تیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

لفظ پارہ فارسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں: ٹکڑا۔ ایک چیز کے چند ٹکڑے کئے جائیں تو وہ پارے کہلاتے ہیں۔ اور الحمد شریف پورے قرآنِ کریم کا تعارف ہے، اس لئے اگر اس کو کسی پارے میں شامل کریں گے تو وہ اس پارے کا تعارف ہو جائے گا، باقی انتیس پاروں سے اس کا تعلق باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے الحمد شریف کو الگ رکھا گیا ہے اور باقی قرآن کے تیس پارے کئے گئے ہیں۔

قرآن میں کہیں انگلی رکھنے کی جگہ نہیں

غرض پہلا پارہ یہاں سے شروع ہو رہا ہے یہ اس کی پہلی آیت ہے، اس میں قرآنِ کریم کا تعارف ہے، فرمایا: ﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَارَیْبَ فِیْهِ﴾ اس کتاب میں کوئی شک کی بات نہیں، کسی کو کوئی شک ہو تو پیش کرے، کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بھینگے کو ایک چیز دو نظر آتی ہیں۔ بھینگے کی آنکھ میں قصور ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کو ایک چیز دو نظر آتی ہیں۔ اسی طرح کبھی ذائقہ خراب ہو جاتا ہے تو میٹھی چیز کڑوی معلوم ہوتی ہے، اور کڑوی میٹھی، یہ حقیقت میں ذائقہ کا فساد ہے، اسی طرح کبھی عقل میں فتور آ جاتا ہے، عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں، اگر آنکھوں پر لال چشمہ پہن لیا جائے تو ہر چیز لال نظر آئے گی۔ ایسے ہی دماغ پر چھلکے چڑھ جاتے ہیں اور عقل خالص باقی نہیں رہتی تو بعض لوگوں کو قرآن کی کسی بات پر اعتراض ہوتا ہے کہ یہ اللہ نے کیا فرما دیا؟ پس اگر کسی کو ایسا اشکال پیش آئے تو حضور کے زمانے میں، حضور ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ اس کو سمجھائیں، اور اس کا اشکال دور کریں۔ اور اب یہ ذمہ داری حضور کے وارثین کی ہے، کسی کو ایسا اشکال پیش آئے تو علماء کے سامنے لائے، وہ صحیح بات سمجھائیں گے۔

ایک صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ ہیں، وہ مشہور سخی حاتم طائی کے لڑکے ہیں، حاتم کا تو اسلام سے پہلے انتقال ہو گیا تھا، مگر اس کے یہ لڑکے مسلمان ہوئے ہیں، وہ پہلے عیسائی تھے۔ وہ فرماتے ہیں: جب میں مسلمان ہوا، اور میں نے قرآنِ کریم پڑھا

تو مجھے سورۂ توبہ کی ایک آیت میں اشکال پیش آیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہود ونصاری نے اپنے علماء کو اور اپنے بزرگوں کو رب بنالیا ہے: ﴿اِتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ جب میں نے یہ آیت پڑھی تو مجھے اشکال ہوا کہ یہود ونصاری اپنے بزرگوں کو اور علماء کو خدا نہیں مانتے۔ چنانچہ میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں قرآن میں یہ آیت پڑھتا ہوں جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ عیسائی اور یہودی اپنے علماء کو اور اپنے بزرگوں کو خدا اور رب نہیں مانتے۔ پھر اس آیتِ کریمہ کا کیا مطلب ہے؟ حضور نے فرمایا: کیا ایسا نہیں ہے کہ جب وہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا اعلان کرتے ہیں لوگ وہ اس کو مان لیتے ہیں؟ حضرت عدی نے کہا: یارسول اللہ! ایسا تو ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: یہی ان کو رب بنانا ہے، کیونکہ کسی چیز کو حلال کرنا: یہ اللہ کا اختیار ہے، نبیوں کو بھی یہ اختیار نہیں دیا گیا۔ پھر بزرگوں کے پاس اور علماء کے پاس یہ اختیار کہاں سے آگیا! ان کو یہ اختیار دینا اور ان کی بات مان لینا یہی ان کو خدا بنانا ہے

غرض صحابہ کرام کو اگر قرآنِ کریم کی کسی آیت میں اشکال پیش آتا تھا تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اپنا اشکال پیش کرتے تھے، حضور ان کو سمجھاتے تھے اور ان کا اشکال دور کرتے تھے، کیونکہ قرآن کی شان: ﴿لَارَيْبَ فِيْهِ﴾ ہے، قرآن میں شک کی کوئی بات نہیں، قرآن میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں کوئی انگلی رکھ سکے اور کہہ سکے کہ یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

اور اب جبکہ حضور اکرم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، اور قیامت تک لمبا زمانہ ہے، اور زمانہ الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ حالات میں تبدیلی آتی ہے، ان بدلے ہوئے حالات میں اگر کسی مسلمان کے ذہن میں کوئی بات آئے تو آسکتی ہے، جب صحابہ کے ذہن میں ایسی باتیں آتی تھیں تو آج مسلمانوں کے ذہن میں بھی آسکتی ہیں، ان کو چاہئے کہ وہ اپنا اشکال علماء کے سامنے لائیں، وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ حضور اپنے زمانے میں ایسی باتیں حل کرتے تھے، آج ان کو حل کرنے کی ذمہ داری علماء کی ہے۔

قرآنِ کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے

قرآنِ کریم اس لئے آیا ہے کہ سب انسانوں کی اور خاص طور پر ان انسانوں کی جو متقی ہیں راہ نمائی کرے۔ متقی کسے کہتے ہیں: آگے کی دو آیتوں میں اس کا بیان ہے۔ ہمارے ذہنوں میں متقی کا ایک خاص مفہوم بیٹھ گیا ہے، جب ہم لفظ متقی سنتے ہیں تو وہی مفہوم ذہن میں آتا ہے یعنی دودھ کا دُھلا ہوا، اعلی درجہ کا پرہیزگار! مگر یہاں کیا مراد ہے؟ اس کو قرآن خود بیان کرتا ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾: یہاں تک متقی کا بیان ہے۔ میں اس آیت کے سب اجزاء کو سمجھاؤں گا تو بات لمبی ہو جائے گی، اور آج بات لمبی کرنے کا ارادہ نہیں۔ آپ حضرات تھکے ہوئے ہیں، پہلی تراویح میں عادت نہ ہونے کی وجہ سے لوگ تھک جاتے ہیں۔

متقی کون ہے؟

ہر سچا پکا مسلمان متقی ہے یعنی جو منافق نہیں وہ متقی ہے۔ وہ متقی کیسے ہو گیا؟ ہوسکتا ہے وہ برائیاں کرتا ہو، اور کچھ ضروری اعمال نہ کرتا ہو۔ جواب یہ ہے کہ وہ مایؤل (آئندہ کے حالات) کے اعتبار سے متقی ہے۔ اگر آج برا ہے مگر ایمان میں کھرا ہے، اور لائن پر لگا ہوا ہے تو ایک نہ ایک دن وہ متقی ہو جائے گا، مگر وہ متقی کب ہوگا؟ جب قرآن سے راہ نمائی حاصل کرے، قرآن کو سامنے رکھ کر اس کے احکام پر چلے تو وہ ایک نہ ایک دن متقی ہو جائے گا، اور اگر قرآن سے اس نے روشنی حاصل نہیں کی تو پھر وہ اندھیریوں میں بھٹکتا پھرے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہم طالب علم کو ''مولوی'' کہتے ہیں، کیونکہ وہ آگے چل کر مولوی بننے والا ہے، مگر مولوی کب بنے گا؟ جب وہ محنت سے پڑھے گا، ورنہ موالی (یار دوست) بنے گا۔ غرض آیت میں متقی سے فی الحال متقی مراد نہیں، آگے چل کر جو متقی بنے گا وہ بھی مراد ہے، پس یہ آیت ہمارے لئے بھی ہے، ہم بھی اگر متقی بننا چاہتے ہیں تو قرآن کو سامنے رکھ کر متقی بن سکتے ہیں۔

ماہِ رمضان کے روزے کیوں فرض ہیں؟

سورۂ بقرہ کی آیت (۱۸۳) میں روزوں کا مقصد تقوی بیان کیا گیا ہے، ارشادِ پاک ہے:
﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾: اے ایمان والو! تم پر (بھی) روزے فرض کئے گئے، جس طرح تم سے پہلے والی امتوں پر روزے فرض کئے گئے تھے تاکہ تم (روزوں کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ، تقوی مؤمن کی آخری آرزو ہے، اور روزوں سے نفس کا گھوڑا قابو میں آتا ہے، پھر وہ گھوڑا قرآن کی ہدایت پر چلے گا تو ضرور منزلِ مقصود تک پہنچے گا۔

یہ تو متقی کے وہ معنی ہیں جس میں کوئی اشکال نہیں۔ اس کو بالقوہ متقی کہتے ہیں، یعنی جس میں پرہیزگاری کی صلاحیت ہے، اور یہ صلاحیت ہر سچے پکے مسلمان میں ہے، اور ایسا ہی شخص قرآن سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس لئے اس کی تخصیص کر کے فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾: یہ قرآن متقیوں کے لئے راہ نما ہے۔ ورنہ قرآن تو سبھی انسانوں کے لئے راہ نما ہے، سورۃ البقرۃ (آیت ۱۸۵) میں صراحت ہے: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ قرآن سب انسانوں کے لئے راہ نما کتاب ہے۔ البتہ اس صورت میں ذرا سا سوال باقی رہے گا کہ جب قرآن سب لوگوں کے لئے راہ نما ہے تو اس آیت میں متقیوں کی تخصیص کیوں کی؟ یعنی جن میں پرہیزگار بننے کی صلاحیت ہے انہیں کو خاص کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہی لوگ حقیقت میں قرآن کی راہنمائی سے فائدہ اٹھائیں گے، اس لئے ان کو خاص کیا۔

لیکن اگر متقی سے باکمال لوگ مراد لئے جائیں یعنی بالفعل متقی مراد لئے جائیں تو پھر تخصیص کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ مقامِ تعریف ہے اور ایسے موقع پر اہم چیز بیان کی جاتی ہے۔ جیسے ملک کے صدر کو سپاس نامہ دیا جائے تو ملک کی اہم چیزیں سپاس نامے میں لکھی جاتی ہیں۔ اور جب ملک کی تاریخ لکھیں گے تو سبھی چیزیں بیان کریں گے، اسی طرح قرآن کے شروع میں چونکہ قرآن کی تعریف کی جارہی ہے اس لئے متقیوں کی تخصیص کی کہ بڑے لوگ بھی قرآن کی ہدایت کے محتاج ہیں، انبیاء اور اولیاء بھی اس کی راہ نمائی کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتے، پس بہ دیگراں چہ رسد! اور آگے چونکہ اظہارِ حقیقت کا موقع تھا اس لئے

وہاں فرمایا کہ قرآن سب لوگوں کے لئے راہ نما کتاب ہے۔

رمضان میں قرآنِ کریم سے تعلق بڑھاؤ

آج ہی امام صاحب نے فرضوں میں یہ آیتِ کریمہ پڑھی ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ﴾ رمضان کے روزے اللہ نے کیوں لازم کئے ہیں؟ رمضان کے روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ اس ماہ میں قرآنِ کریم اتارا گیا ہے۔ کسی خاص دن میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو اس دن کو یادگار بنایا جاتا ہے۔ اس مبارک مہینے میں بھی نزولِ قرآن کا واقعہ پیش آیا ہے، اس لئے نزولِ قرآن کی وجہ سے اس ماہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی ہے، اور رمضان کے روزے اور رات میں نوافل رکھے گئے ہیں تاکہ قرآن کا حق ادا ہو، اس لئے اس مبارک مہینے میں مؤمن کا قرآنِ کریم سے تعلق بے حد بڑھ جانا چاہئے۔

عربوں اور عجمیوں میں فرق

عربوں میں اور ہم عجمیوں میں کئی فرق ہیں: وہ نفلیں کم پڑھتے ہیں، مگر فرض سولی پر بھی پڑھتے ہیں۔ یہ ان کی خوبی ہے، اور ہم نفلیں خوب پڑھتے ہیں مگر فرض جانے دیتے ہیں، وہ فرض کبھی نہیں جانے دیتے، جب فرض کا وقت آتا ہے تو فوراً مصلّٰی بچھاتے ہیں اور فرض ادا کرتے ہیں، یہ ان کی خوبی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر پانچ منٹ بھی نماز میں دیر ہوتی ہے تو وہ فوراً قرآن اٹھاتے ہیں اور تلاوت شروع کردیتے ہیں۔ آپ حرم شریف میں جا کر دیکھیں: جو عرب ہوگا وہ اگر نماز شروع ہونے میں پانچ منٹ بھی باقی ہونگے تو فوراً قرآن اٹھائے گا اور تلاوت شروع کردے گا۔ ہمارے اندر بڑی کمی ہے، پندرہ منٹ نماز میں باقی ہوتے ہیں تو ہم یا تو اونگھتے رہتے ہیں یا باتیں کرتے ہیں، قرآن کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ ہمارے اندر کمی ہے، کیا قرآن صرف عربوں کے لئے آیا ہے؟ نہیں، ہمارے لئے بھی آیا ہے، کیا وہی صرف مسلمان ہیں؟ نہیں ہم بھی مسلمان ہیں، پھر ہمارا قرآنِ کریم سے تعلق کمزور کیوں ہے؟ ہم

بھی مسلمان ہیں، قرآنِ کریم ہماری ہدایت کے لئے بھی آیا ہے، بلکہ عرب کم محتاج ہیں، ہم زیادہ محتاج ہیں، ہم عربی نہیں جانتے، ہمیں ڈبل محنت کرنی پڑے گی، تب ہم قرآنِ کریم سمجھیں گے۔

میرے بھائیو! کہنا یہ ہے کہ اس مبارک مہینے میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ قرآن پڑھے، جس کو پانچ منٹ کا وقت بھی مل جائے فوراً قرآن اٹھائے اور پڑھنا شروع کردے، سمجھنے کی بھی کوشش کرے، لیکن اگر صرف الفاظ پڑھے تب بھی اس کا ثواب ملے گا۔

قرآن کا ایک ادب:

قرآن کی طرف پیٹھ نہیں کرنی چاہئے، جو پیچھے (دوسری صف میں) بیٹھا ہے وہ اگلے کی پشت کی طرف قرآن نہ رکھے بلکہ اس طرح بیٹھے کہ آگے جو دو بیٹھے ہیں ان کے بیچ کے مقابل قرآن رکھ کر پڑھے تو قرآن کی بے ادبی نہیں ہوگی۔

﴿و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين﴾

۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث اور سنت میں فرق

مسائل میں ہر حدیث حجت نہیں

وہ حدیث حجت ہے جو سنت (معمول بہا) ہے

[یہ دو تقریریں ایک ساتھ مرتب کی گئی ہیں، پہلی تقریر ٹورنٹو (کناڈا) کی 'مدینہ مسجد' میں کی گئی ہے اور دوسری مسجد دار السلام میں]

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ﴾ وقال النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ.

بزرگو اور بھائیو! آج آپ کو ایک مسئلہ سمجھانا ہے، تقریریں تو آپ رمضان بھر سنتے رہے ہیں! مسئلہ یہ ہے کہ حدیث اور سنت میں کیا فرق ہے؟ ایک فرقہ خود کو اہلِ قرآن کہتا ہے، دوسرا خود کو اہلِ حدیث کہتا ہے، اور ہم خود کو اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں۔ پس قرآن اور حدیث میں کیا فرق ہے؟ یہ تو ہر کوئی جانتا ہے، لیکن حدیث اور سنت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق لوگ نہیں جانتے، بلکہ لوگوں میں غلط فہمی ہے یا غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے کہ حدیث اور سنت ایک ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، اس لئے یہ اہم مضمون آج سمجھانا ہے۔

حدیث اور سنت میں فرق:

حدیث اور سنت دونوں ایک دوسرے سے بالکل جدا تو نہیں ہیں، یعنی دونوں میں تباین کی نسبت نہیں ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں میں تساوی کی نسبت ہو، بلکہ حدیث اور سنت میں عموم وخصوص من وجہٍ کی نسبت ہے، اور جہاں یہ نسبت ہوتی ہے وہاں دو چیزیں کبھی

الگ الگ ہوجاتی ہیں، اور کبھی اکٹھا ہوجاتی ہیں، جیسے سفید اور جانور میں یہی نسبت ہے، اس لئے کبھی دونوں اکٹھا ہونگے، اور کبھی الگ، سفید کپڑا: سفید ہے، مگر جانور نہیں، کالی بھینس: جانور ہے، مگر سفید نہیں، اور سفید بیل: سفید بھی ہے اور جانور بھی، حدیث اور سنت کے درمیان بھی یہی نسبت ہے، اس لئے کبھی حدیث الگ ہوجاتی ہے، وہ سنت نہیں ہوتی، اور کبھی سنت الگ ہوجاتی ہے، وہ حدیث نہیں ہوتی، اور کبھی دونوں جمع ہوجاتے ہیں، وہ حدیث بھی ہوتی ہے اور سنت بھی۔

حدیث کی تعریف:

حدیث: چار چیزوں کا نام ہے:

۱- نبی پاک ﷺ نے زندگی میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے: وہ سب حدیث ہے۔

۲- آپؐ نے زندگی میں جو بھی کام کیا ہے: وہ حدیث ہے۔

۳- آپ ﷺ نے جن باتوں کو برقرار رکھا ہے: وہ بھی حدیث ہے۔ یعنی کسی مسلمان نے کوئی کام کیا، نبی پاک ﷺ نے اس کو دیکھا، یا وہ آپؐ کے علم میں آیا اور آپؐ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی بلکہ اس کو برقرار رکھا، اس کی تائید فرمائی تو یہ بھی حدیث ہے۔

۴- نبی پاک ﷺ کی صفات یعنی ذاتی حالات بھی حدیث ہیں۔

ان چار چیزوں کا نام حدیث ہے۔ اب ہر ایک کی مثال لیں:

قولی حدیث کی مثال:

بخاری کی پہلی حدیث ہے: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ: عمل کا نیت سے موازنہ کیا ہوا ہے، عمل نیت کے موافق ہوتا ہے، عبادت کی نیت ہے تو ثواب ملے گا، اور عبادت کی نیت نہیں ہے تو وہ محض عمل ہے، اس پر ثواب کچھ نہیں ملے گا۔

حدیث کا تعلق عبادات سے ہے:

یہاں کچھ لوگ پوچھتے ہیں: ایک شخص اس لئے چوری کرتا ہے کہ وہ غریبوں کی مدد کرے، یا لوگ پوچھتے ہیں کہ پیسہ گھر میں تو رکھا نہیں جاسکتا، بینک میں رکھنا ضروری ہے،

پس اگر کوئی بینک میں کھاتہ کھلواتا ہے اور کرنٹ اکاونٹ کے بجائے سیونگ اکاونٹ کھلواتا ہے تاکہ جو بینک سے انٹرسٹ ملے اس کو ثواب کی نیت کے بغیر غریبوں کو دیدے تو یہ اچھی نیتیں ہیں۔ اور حدیث میں ہے: **إنما الأعمال بالنية**: اعمال نیت کے موافق ہوتے ہیں، پس یہ جو بینک سے سود لے کر غریبوں کو دے رہا ہے یا غریبوں کی مدد کی نیت سے چوری کررہا ہے: اس کو ثواب ملنا چاہئے، اور یہ کام جائز ہونے چاہئیں؟

میں اُسے جواب دیتا ہوں کہ غریبوں کے لئے آپ کو دبلا ہونے کی ضرورت نہیں، غریبوں کے خدا آپ نہیں، غریبوں کا خدا کوئی اور ہے، اور وہی ان کا رازق ہے۔

اور مذکورہ حدیث کا دائرہ عبادات تک ہے، معاصی اس کے دائرہ میں نہیں۔ عبادات میں اگر عبادت کی نیت ہے تو ثواب ملے گا اور اگر عبادت کی نیت نہیں ہے تو ثواب نہیں ملے گا۔

اور حدیث کا دائرہ عبادات تک ہے: اس کی دلیل اگلا جملہ ہے: وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوىٰ: ہر انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، مگر ابھی بات کلیر (واضح) نہیں ہوئی، اس لئے نبی ﷺ نے ہجرت کی مثال دے کر مضمون واضح فرمایا:

ہجرت دور اول میں فرض تھی، اور بہت بڑی عبادت تھی، قرآن وحدیث میں اس کے بے شمار فضائل آئے ہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: تین بندے ہجرت کرتے ہیں، وطن چھوڑ کر مدینہ آتے ہیں:

ایک کیوں آیا ہے؟ اس لئے کہ وہ سچے دل سے مسلمان ہوا ہے، اور اسلام کا درخت ابھی نونہال ہے، اس کی آبیاری کی ضرورت ہے، اس لئے وہ مدینہ آیا ہے تاکہ دعوت وجہاد میں شریک ہو، دین سیکھے، اور ہر طرح دین کی خدمت کرے۔

دوسرا کیوں آیا ہے؟ وہ اس لئے آیا ہے کہ اس کی گاؤں میں پرچون کی دوکان تھی، اب گاؤں کے لوگ مسلمان ہو کر ہجرت کرکے مدینہ جارہے ہیں، اور گاؤں کی آبادی گھٹ رہی ہے، اس لئے دوکان پھیکی پڑرہی ہے، اس لئے اس نے سوچا کہ مدینہ منورہ کی آبادی بڑھ رہی ہے، پس میں مدینہ چلا جاؤں اور وہاں دوکان کھولوں تو دوکان خوب چلے گی۔ چنانچہ وہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلا آیا۔

اور تیسرا کیوں آیا ہے؟ وہ ایک خاص عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے، مگر وہ عورت ہجرت کر کے مدینہ جا چکی ہے، اب وہ سوچتا ہے کہ اگر میں وطن میں رہا تو نکاح نہیں ہوسکتا، چلو میں بھی مدینہ پہنچ جاؤں، اور اس عورت سے راہ ورسم پیدا کروں اور نکاح کرلوں، چنانچہ وہ بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ گیا۔

نبی ﷺ نے فرمایا: پہلا شخص جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہجرت کی ہے اس کی ہجرت مقبول ہے اور دینی عمل ہے، قرآن وحدیث میں اسی کے فضائل آئے ہیں، اور دوسرے اور تیسرے بندوں کو ہجرت کا کوئی ثواب نہیں ملے گا، ان کی ہجرت دینی عمل نہیں ہے۔

پس اگر حدیث کا سیاق پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حدیث کا دائرہ عبادات تک ہے، معاصی اس کے دائرے میں نہیں۔

فعلی حدیث کی مثال:

جب مسجد نبوی میں منبر رکھا گیا تو نبی ﷺ نے منبر پر چڑھ کر نماز پڑھائی، سجدہ نیچے کر کے اگلی رکعت میں منبر پر چڑھ جاتے تھے، پھر سلام پھیرنے کے بعد ارشاد فرمایا: صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ: آپ لوگوں نے جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، اسی طرح نماز پڑھو۔ یہ جو آپؐ نے نماز پڑھ کر دکھائی ہے، یہ فعلی حدیث ہے۔

تقریر نبوی کی مثال:

مکہ میں تو پتھروں کے علاوہ کچھ نہیں، البتہ اسّی کلومیٹر پر طائف ہے، وہاں کھیت ہیں، باغات ہیں، اور ساڑھے چار سو کلومیٹر پر مدینہ منورہ ہے، وہاں بھی باغات اور کھیت ہیں۔ جب نبی ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو مدینہ میں بیع سلم (بدھنی بیع) کا رواج تھا۔ ابھی کھجور پر پھول بھی نہیں آئے ہوتے تھے کہ کھجوریں بیچ دیتے تھے، بھاؤ طے ہوجاتا تھا، مدت طے ہوجاتی تھی، قیمت تاجر اسی وقت دیدیتا تھا، اور باغ والا وقتِ مقررہ پر کھجوریں دیتا تھا، اس کو بیع سلم کہتے ہیں۔ شریعت کے اصول سے یہ بیع صحیح نہیں، کیونکہ مبیع کا وجود نہیں، جبکہ صحتِ بیع کے لئے مبیع کا وجود ضروری ہے، اور مبیع: بائع کی ملکیت میں اور بائع

کے قبضہ میں ہونا بھی ضروری ہے، نیز اس کا مقدور التسلیم ہونا بھی ضروری ہے، جبھی بیع درست ہوگی، ورنہ نہیں۔ اور کھجوروں کی بیع سلم میں ابھی درختوں پر پھول بھی نہیں آئے، جب کھجوروں کا وجود ہی نہیں تو ملکیت کا کیا سوال؟ اور جب ملکیت نہیں تو قبضہ کا کیا سوال؟ اس لئے شریعت کی اصول سے یہ بیع باطل ہے۔

جب نبی ﷺ کے علم میں یہ بیع آئی تو آپؐ نے صحابہ کو اس بیع سے منع نہیں کیا، بلکہ فرمایا: مَنْ أَسْلَمَ مِنْكُمْ فَلْيُسْلِمْ فِيْ كَيْلٍ مَعْلُوْمٍ أَوْ وَزْنٍ مَّعْلُوْمٍ إِلٰى أَجَلٍ مَّعْلُوْمٍ: جب تم سلم کرو تو تمام تفصیلات طے کرلو، پیمانہ یا وزن طے کرلو اور مدت بھی طے کرلو تاکہ آئندہ کوئی نزاع نہ ہو، غرض: حضورؐ نے شرائط تو بڑھائیں، مگر سلم سے منع نہیں کیا۔ پس یہ حدیث بن گئی، اور اس کا نام تقریری حدیث ہے۔

بیع سلم کے جواز کی حکمت:

جب اسلام کے اصول سے بیع سلم صحیح نہیں: تو پھر حضورؐ نے اس کو کیوں برقرار رکھا اس کا جواب یہ ہے کہ بیع سلم میں اگرچہ بائع کے پاس مبیع نہیں ہوتی، مگر مارکیٹ میں ہوتی ہے، پس جب مارکیٹ میں مبیع موجود ہے تو اگر اس کے باغ میں مبیع (کھجوریں) نہ بھی پیدا ہوگی تو وہ مقررہ وقت پر مارکیٹ سے خرید کر دیدے گا۔ چنانچہ خاص جگہ کی پیداوار کی سلم میں شرط لگانا درست نہیں، غرض مارکیٹ میں مبیع کے وجود کو بائع کی ملکیت میں موجود مان لیا گیا ہے، اور یہ ایک طرح کا حیلہ ہے۔

اور یہ حیلہ اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں عظیم فائدہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی سرمایے کے بغیر بڑے سے بڑا کاروبار کھڑا کرسکتا ہے۔

مثال کے طور پر: ایک شخص کو بنیان بنانے کا کارخانہ قائم کرنا ہے، اس کے لئے لاکھوں روپیوں کی مشینوں کی ضرورت ہوگی، مگر سرمایہ اس کے پاس نہیں ہے، البتہ لوگوں میں اس کا اعتبار ہے، اس نے دوکانداروں سے معاملہ کیا، اس نمبر کا سوت، یہ سائز وغیرہ تمام تفصیلات طے کیں اور قیمت بھی طے کی اور کہا: چھ مہینے کے بعد سپلائی کروں گا اور ہر مہینہ ایک ہزار پیس دوں گا۔ چنانچہ کسی نے دس ہزار پیس خریدے، کسی نے پچاس ہزار، اور اس نے سب سے

پیسے اسی وقت لے لئے، سلم میں ثمن مجلس عقد ہی میں دینا ہوتا ہے۔ پندرہ لاکھ جمع ہوگئے۔ وہ مشینیں لایا، کارخانہ کھڑا کیا اور پروڈکشن شروع ہوگیا، اور مقررہ وقت پر سپلائی شروع کردی۔ سال دو سال میں سب کے پاس مال پہنچ گیا اور اس کا کارخانہ فری ہوگیا۔ یہ بیع سلم کا فائدہ ہے۔ اس لئے شریعت نے اس کو برقرار رکھا ہے، اور آج مشینی دور میں بے شمار چیزوں کا سلم ہوسکتا ہے، ہر وہ چیز جس کی جملہ تفصیلات طے ہوسکتی ہوں، اور اس کا مارکیٹ میں وجود ہو: اس کی بیع سلم درست ہے۔

اوصاف نبوی کی مثال:

نبی پاک ﷺ کے ذاتی حالات اوصاف کہلاتے ہیں، مثلاً: آپؐ کے بال ایسے تھے: نہ بالکل سیدھے تھے، نہ بالکل گھونگھریالے، درمیانی کیفیت لئے ہوئے تھے، سیدھے تھے، مگر کچھ گھونگھریالا پن تھا، دندانِ مبارک ایسے تھے: سامنے کے اوپر کے دانتوں میں ذرا کشادگی تھی، جب آپؐ گفتگو فرماتے تو ان کے درمیان سے ایک نور سا نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ سب حدیثیں ہیں۔

سنت کے معنی:

سُنَّة: کے لغوی معنی ہیں: راستہ (الطریق) اور یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، احادیث میں بھی آیا ہے اور فقہ میں بھی، اور تینوں جگہ معنی الگ الگ ہیں، قرآن میں ہے: ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾: تم اللہ کی سنت کو بدلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔ اور حدیث میں ہے: تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ: میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں: لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: جب تک تم ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو گے: ہرگز گمراہ نہیں ہوؤ گے، وہ دو چیزیں کیا ہیں: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ: اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ۔ اور فقہ میں: سنت مؤکدہ اور سنتِ غیر مؤکدہ کی اصطلاحیں ہیں۔ غرض تینوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اور تینوں جگہ معنی الگ الگ ہیں۔

فقہ میں سنت: احکام کا ایک درجہ ہے، واجب سے نیچے اور مندوب سے اوپر: ما كان

في مشروعيته دون الواجب وفوق المندوب پھر فقہاء نے اس کی دو قسمیں کی ہیں: سنت مؤکدہ اور غیر مؤکدہ۔

قرآنِ کریم میں سنت کے معنی ہیں: اشیائے عالم میں رکھی ہوئی صلاحتیوں پر مسببات کا متفرع ہونا۔ اس کی تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ ایک پورا باب اسی کے لئے قائم کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب میں صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، چنانچہ اسباب سے مسببات پیدا ہوتے ہیں، یہی اللہ کی سنت ہے، جیسے کھجور کی گٹھلی بوئیں گے تو خاص قسم کے پتے نکلیں گے خاص طرح کے پھول آئیں گے، خاص طرح کے پھل آئیں گے، یہی سنت الٰہی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کھجور کی گٹھلی بوئیں اور گیہوں کا پودا نکلے، اللہ سب کچھ کر سکتے ہیں، مگر اللہ نے صلاحیت ایسی ہی ودیعت فرمائی ہے۔ آپ املی کی گٹھلی بوئیں: املی ہی کا درخت اُگے گا یہ اللہ کی سنت ہے اور اللہ کی یہ سنت بدلتی نہیں ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً﴾: اللہ نے جس چیز میں جو صلاحیت رکھی ہے وہی صلاحیت بروئے کار آتی ہے۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ اللہ نے آگ میں جلانے کی صلاحیت رکھی ہے، مگر آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا!

جواب: یہ ہے کہ یہ خرقِ عادت ہے، اللہ تعالیٰ اسباب کی صلاحیت کے خلاف بھی کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہوجائے کہ اسباب: اسباب ہیں، خدا نہیں، خدا ان کے اوپر ہے، اور اسباب کی لگام خدا کے ہاتھ میں ہے، جب تک وہ چاہیں گے اسباب کام کریں گے اور جب وہ نہیں چاہیں گے آگ نہیں جلائے گی۔

غرض: اللہ نے کائنات کی چیزوں میں جو صلاحیتیں امانت رکھی ہیں، اور ان صلاحیتوں سے جو مسببات وجود میں آتے ہیں: اس کا نام قرآن میں سنت اللہ ہے۔

اور حدیث میں سنت: کے معنی ہیں: الطريقة المسلوكة في الدين: یعنی دینی راہ، وہ راستہ جس پر مسلمانوں کو چلنا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ أَدْعُوْا إِلَى اللّٰهِ﴾: کہئے: یہ میرا راستہ ہے، میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میرا راستہ: یعنی حضور

ﷺ کا راستہ۔ اسی کے لئے حدیثوں میں لفظ سنت آیا ہے، یہ حدیثیں آگے آرہی ہیں۔

نسخ شریعتوں میں ہوتا ہے، دین میں نہیں ہوتا

اور نسخ شریعتوں میں ہوتا ہے، بعد کی شریعت سابقہ شریعت کو منسوخ کرتی ہے، البتہ دین تمام نبیوں کا ایک ہے، کیونکہ دین عقائد کا نام ہے اور عقائد بدلتے نہیں، اللہ ایک ہیں: ہیں، اللہ صفاتِ کمالیہ کے ساتھ متصف ہیں: ہیں، اللہ نقائص سے پاک ہیں: ہیں۔ ان میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ ملائکہ واقعی مخلوق ہیں، قیامت آنی ہے، مرکر دوبارہ زندہ ہونا ہے: یہ سب عقائد ہیں، جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، اس لئے قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾: آدم علیہ السلام سے خاتم النّبیین ﷺ تک دین ایک ہے، یہی دین ہمیشہ نازل ہوا ہے، اسی پر جینا ہے اور اسی کو لے کر آخرت میں جانا ہے۔

لیکن شریعتیں مختلف رہی ہیں، کیونکہ ان میں قوموں کے حالات کا لحاظ کیا گیا ہے، جیسے آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا، کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ اور کوئی عورت نہیں تھی، پس اگر بہن سے نکاح جائز نہیں ہوگا تو نسلِ انسانی کیسے چلے گی؟ پھر جب عورتیں بہت ہوگئیں تو نوح علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح حرام کردیا گیا۔

بہرحال شریعتوں میں چونکہ زمانے اور لوگوں کے احوال کا لحاظ کیا گیا ہے اس لئے شریعتوں میں نسخ ہوا ہے، آدم علیہ السلام کی شریعت نوح علیہ السلام کی شریعت سے منسوخ ہوئی، پھر نوح علیہ السلام کی شریعت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت سے منسوخ ہوئی، پھر اُن کی شریعت موسیٰؑ کی شریعت سے منسوخ ہوئی، پھر ان کی شریعت عیسیٰؑ کی شریعت سے منسوخ ہوئی، آخر میں ہمارے نبی ﷺ کی شریعت سے باقی تمام شریعتیں منسوخ ہوئیں۔

شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے:

اور شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے، یعنی پہلے ایک حکم آتا ہے پھر وہ حکم بدل جاتا ہے، اور دوسرا حکم آتا ہے۔ ایسا نسخ ہماری شریعت میں بھی ہوا ہے، اور اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی آیت ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾: ہم ایک حکم ہٹا کر دوسرا حکم جو بھیجتے ہیں تو وہ دوسرا حکم پہلے حکم کے مانند ہوتا ہے یا اس سے بہتر ہوتا ہے۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں بھی نسخ ہوا ہے اور حدیثوں میں بھی نسخ ہوا ہے۔

سوال: شریعت میں نسخ کیوں ہوتا ہے؟

جواب: ایک مریض حکیم کے پاس جاتا ہے، اور کہتا ہے: مجھے یہ ہورہا ہے۔ حکیم نسخہ لکھتا ہے اور کہتا ہے: پندرہ دن یہ نسخہ پی کر آؤ۔ دوبارہ آیا، نبض دیکھی، احوال پوچھے، نسخہ نے ٹھیک کام کیا ہے، مگر حکیم نسخہ بدل دیتا ہے، دوسرا نسخہ لکھتا ہے اور کہتا ہے: جاؤ یہ پندرہ دن پی کر آؤ، اس نے پیا اور تیسری مرتبہ آیا، احوال بتائے، نبض دکھائی، اِس نسخہ نے بھی ٹھیک کام کیا ہے، مگر حکیم وہ نسخہ چھوڑ کر تیسرا نسخہ لکھتا ہے، اور کہتا ہے: اب یہ نسخہ شفا ہونے تک پیتے رہو۔

اب کوئی کہے کہ حکیم پاگل ہے! پہلے ہی سے یہ آخری نسخہ کیوں نہیں لکھا! حکیم پاگل نہیں، جنابِ عالی پاگل ہیں، حکیم نے پہلا نسخہ مُنْضِج لکھا تھا یعنی جسم کے اندر جو فاسد مواد تھا اس کو پکایا، پھر دوسرا نسخہ مسہل لکھا، اب دست آئے اور فاسد مادہ نکل گیا، پھر تیسرا نسخہ بیماری کا علاج لکھا، اب اس کو پینے سے شفا ہوگی، جب تک فاسد مادے کو نکالیں گے نہیں یہ تیسرا نسخہ کام نہیں کرے گا۔

دوسری مثال: آپ تانبے کا برتن لے کر قلعی گر کے پاس جاتے ہیں، وہ پہلے برتن کو بھٹی پر رکھتا ہے، اس میں پانی ڈالتا ہے، پانی میں تیزاب ڈالتا ہے، اور چمٹے سے روئی پکڑ کر برتن کو صاف کرتا ہے، پھر اس کو سکھاتا ہے، پھر دوسرے وقت برتن کو آگ پر رکھتا ہے، جب وہ گرم ہوجاتا ہے تو دو چار جگہ قلعی لگا کر، نوشادر بسی ہوئی روئی پھیرتا ہے تو برتن چمک جاتا ہے۔ اگر قلعی گر برتن کے میل کو چھڑائے بغیر قلعی کرے تو قلعی نہیں کھلے گی۔

یہ مثالیں ہیں، اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح احکام بھیجتے ہیں، جیسے شراب چار مرحلوں میں حرام کی ہے۔

شراب چار مرحلوں میں حرام ہوئی ہے:

پہلے مرحلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی آیت اتاری کہ اس نے لمحۂ فکریہ پیدا کردیا۔ سورۂ نحل میں آیت ہے: ﴿وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾: انگوروں اور کھجوروں کے پھلوں سے تم سَکر بناتے ہو، سَکر: کھجور کی شراب کو کہتے

ہیں، اور رزق حسن بناتے ہو، اور انگور سے جو شراب بنتی ہے، جس کو عربی میں خمر کہتے ہیں، اس کا تذکرہ چھوڑ دیا، خمر کا تذکرہ کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے صحابہ کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا کیا، اور انھوں نے اس سلسلہ میں سوال کیا تو ایک عرصہ کے بعد دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾: لوگ آپؐ سے خمر اور سٹے کے بارے میں پوچھتے ہیں؟ آپؐ ان سے کہیں: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کئی فائدے ہیں، اگر ان میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو لوگ سٹّہ کیوں کھیلتے اور شراب کیوں پیتے! لیکن دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے: ﴿وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾: اور دونوں میں جو خرابی ہے وہ ان کے فائدوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس سے ذہن بنا کہ خرابی اگرچہ ایک ہے، لیکن وہ سو فائدوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ سنار کی سو اور لوہار کی ایک والی بات ہے۔

یہ ذہن بنانے کے بعد تیسری آیت نازل کی کہ نماز کے اوقات میں شراب نہ پیو، دوسرے اوقات میں پی سکتے ہو: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَقْرَبُوْا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ﴾: نشہ کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ، جب نشہ اتر جائے اور تم جو کچھ منہ سے بول رہے ہو اس کو سمجھنے لگو تب نماز پڑھو۔

اب ظہر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے شراب بند کرنی پڑے گی، ظہر کے بعد بھی نہیں پی سکتے، کیونکہ آگے عصر آرہی ہے، عصر کے بعد بھی نہیں پی سکتے، اس لئے کہ آگے مغرب آرہی ہے، مغرب کے بعد بھی نہیں پی سکتے، اس لئے کہ آگے عشاء آرہی ہے۔ اب پینے کے دو ہی وقت بچے، ایک: عشاء کے بعد فجر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک۔ مگر رات میں کون پیتا ہے؟ اور رات میں اٹھ کر بھی کون پیتا ہے؟ دوسرا وقت ہے: فجر کی نماز کے بعد سے ظہر سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے تک۔ لیکن اس وقت اگر کوئی پیئے گا تو جوب (کام) اور شوپ (دوکان) پر کون جائے گا؟ یہ تو کمائی کا وقت ہے، اس وقت میں اگر پی کر پڑجائے گا تو کام کیسے چلے گا؟ لیکن پھر بھی ان دو وقتوں میں پینے کی گنجائش رہی، گویا چوبیس گھنٹوں میں سے آدھا وقت کاٹ دیا۔

ایک عرصے تک اسی طرح چلتا رہا پھر آخری حکم آیا: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! خمر اور

سٹہ دونوں گندگیاں ہیں، اور شیطانی چرخہ ہیں، شیطان ان کے ذریعہ تمہیں اپنے چکر میں پھنساتا ہے، پس تم ان دونوں سے بچو تاکہ تم کامیاب ہو: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾: چار چیزیں شیطانی چرخہ ہیں: خمر (انگوری شراب) جوا، بت اور فال کے تیر، ان سے بچو، اگر کامیابی چاہتے ہو۔ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ نے صحابہ کو سنائی تو لوگوں نے شراب نالیوں میں بہادی، گھروں میں شراب کا ایک قطرہ بھی نہ رہا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: اگر اللہ تعالیٰ پہلے ہی مرحلہ میں یہ آخری آیت نازل فرماتے تو لوگ کہتے: ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے! اس لئے ذہن سازی کر کے حرمت کا حکم نازل کیا، چنانچہ لوگوں کے لئے عمل کرنا آسان ہوگیا، اور انھوں نے مٹکے اٹھا کر پھینک دیئے۔ مجھے بتلانا یہ ہے کہ ایک شریعت کے اندر بھی نسخ ہوتا ہے، بعض احکام بالکل اٹھادیئے جاتے ہیں، اور بعض احکام میں تبدیلی کردی جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو:

قرآنِ کریم میں سے جو آیتیں مکمل طور پر منسوخ کردی گئی ہیں: وہ اللہ نے اٹھالی ہیں، یا بھلادی ہیں۔ نسخ کی دو شکلیں ہوتی تھیں: ایک: اللہ تعالیٰ منسوخ آیت اٹھالیتے تھے، دوسری: منسوخ آیت بھلادیتے تھے، حضور اور صحابہ سب اس کو بھول جاتے تھے ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى إِلَّا مَاشَاءَ اللّٰهُ﴾: ہم آپؐ کو قرآن پڑھائیں گے، آپؐ اس کا کوئی حرف بھولیں گے نہیں، مگر جس کو منسوخ کرنا ہوتا ہے اس کو اللہ بھلادیتے ہیں۔

آج جو قرآن موجود ہے اس میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، ہاں ایسی آیات ہیں جو بعض احوال میں معمول بہا ہیں، اور بعض احوال میں منسوخ۔ جیسے مؤلفۃ القلوب کے حصے والی آیت موجود ہے، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو موقوف کردیا ہے، منسوخ نہیں کیا، چنانچہ اگر کبھی حالات خراب ہوجائیں، اور دورِ اول جیسے حالات پیدا ہوجائیں تو زمانے کا امیر المؤمنین اس کو پھر جاری کرسکتا ہے، البتہ مفتی صاحب جاری نہیں کرسکتے، مجتہد نہیں کرسکتا، زمانے کے امیر المؤمنین نے موقوف کیا ہے تو زمانے کا

امیر المؤمنین ہی اس کو جاری کرسکتا ہے۔

ایسی اور بھی آیتیں ہیں، جیسے قرآن میں ہے کہ جب موت کا وقت قریب آئے تو والدین کے لئے اور رشتہ داروں کے لئے وصیت کرو۔ اب یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ میراث کے احکام اللہ نے نازل کردیئے ہیں، مگر اب بھی ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ وصیت ضروری ہوجائے، جیسے کسی کو ڈر ہو کہ اس کے بعد بعض ورثاء سب ترکے پر قبضہ کرلیں گے، ماں باپ کو کچھ نہیں دیں گے، یا بعض بیٹے قبضہ کرلیں گے اور بعض کو کچھ نہیں دیں گے تو ایسی صورت میں شریعت کے احکام کے مطابق وصیت نامہ لکھ کر کورٹ میں رجسٹر کرانا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں اس آیت پر عمل ہوگا۔

بہرحال قرآنِ کریم میں تو ایسی کوئی آیت نہیں جو اپنے تمام مواد میں منسوخ ہو، ایسی آیتیں یا تو اللہ نے اٹھالی ہیں یا بھلادی ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں منسوخ حدیثیں بھی ہیں:

لیکن حدیثوں کی ایسی صورت نہیں ہے، پہلے دور کے جو احکام تھے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، اور بعد میں جو احکام آئے وہ بھی حدیث کی کتابوں میں ہیں۔ پس پہلی قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں، سنت نہیں، اور دوسری قسم کی روایتیں حدیث بھی ہیں اور سنت بھی۔

وہ روایتیں جو صرف حدیث ہیں، سنت نہیں

پہلا مادۂ افتراق: تین قسم کی روایتیں صرف حدیث ہیں، سنت نہیں:

ایک: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، وہ سنت نہیں ہیں، مسلمانوں کو ان پر نہیں چلنا، بعد میں جو ناسخ احادیث آئی ہیں مسلمانوں کو ان پر چلنا ہے، جیسے حدیث ہے: تَوَضَّئُوْا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ: آگ پر پکی ہوئی چیز کھائی تو وضو ٹوٹ گئی، یہ اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث ہے، مگر بعد میں یہ حکم نہیں رہا، بعد میں نبی ﷺ، خلفائے راشدین اور سب صحابہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھاتے تھے، اور وضو کئے بغیر نماز پڑھتے تھے، اس لئے حدیث توضؤا ممامست النار سنت نہیں۔

دوسری مثال: پہلے نماز میں آپس میں باتیں کرتے تھے۔ پہلے طریقہ یہ تھا کہ مسبوق

اپنی چھٹی ہوئی نماز پہلے پڑھتا تھا، پھر جماعت میں شامل ہوتا تھا۔ وہ آکر نمازی سے پوچھتا کہ کتنی رکعتیں ہوگئیں؟ وہ بتاتا کہ دو ہوگئیں، وہ تکبیر تحریمہ کہہ کر چھٹی ہوئی رکعتیں پڑھ کر جماعت میں شامل ہوتا۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ دیر سے آئے، ان کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ نبی ﷺ الگ نماز پڑھ رہے ہوں اور وہ اپنی چھٹی ہوئی نماز پڑھیں۔ چنانچہ وہ نیت باندھ کر نماز میں شامل ہوگئے، جب حضور ﷺ نے سلام پھیرا تو وہ اپنی باقی نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے، حضورؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور آپؐ نے حضرت معاذ کو نماز پڑھتے دیکھا، نماز کے بعد ان سے پوچھا، انھوں نے جواب دیا: یارسول اللہ! مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں آپؐ سے الگ نماز پڑھوں، اس لئے میں آپؐ کی نماز میں شامل ہوگیا، اور اب میں نے باقی نماز پوری کی، آپؐ نے فرمایا: إِنَّ مُعَاذًا سَنَّ لَكُمْ سُنَّةً فَاتَّبِعُوْهَا: معاذ نے تمہارے لئے ایک طریقہ رائج کیا ہے، پس تم اس طریقہ کی پیروی کرو، چنانچہ اس دن سے مسبوق کی نماز کا طریقہ بدل گیا۔

غرض: اسلام کے دورِ اول میں نماز میں اس قسم کی ضروری باتیں جائز تھیں، پھر بعد میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾: کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیت اتری تو: نُهِيْنَا عَنِ الْكَلَامِ، وَأُمِرْنَا بِالسُّكُوْتِ: ہمیں نماز میں کلام کرنے سے روک دیا گیا اور چپ رہنے کا حکم دیا گیا۔

غرض: اس دور کی یہ حدیثیں کہ نمازی نماز میں باتیں کرتے تھے: حدیثیں ہیں، اور حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، مگر وہ سنت نہیں ہیں، مگر اہل حدیث ان پر عمل کرتے ہیں حرم شریف میں آپ کو یہ منظر دیکھنے کو ملے گا کہ ایک عرب شیخ نماز پڑھ رہا ہوگا، موبائل کی گھنٹی بجے گی، وہ جیب سے موبائل نکالے گا، بٹن دبا کر نمبر دیکھے گا، پھر کہے گا: أنا في الصلوة: میں نماز پڑھ رہا ہوں، پھر موبائل جیب میں رکھ لے گا اور نماز پڑھتا رہے گا اور اگر اس سے کچھ کہا جائے تو وہ یہ حدیث پیش کرے گا کہ صحابہ بھی نماز میں باتیں کرتے تھے: میں کیوں نہیں کرسکتا؟

بہرحال اس طرح کی حدیثیں منسوخ ہوگئی ہیں، مگر وہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، پس وہ سنت نہیں ہیں، سنت وہ حکم ہے جو بعد میں آیا ہے، اسی پر مسلمانوں کو چلنا ہے۔

بعد کا حکم کیا ہے؟ حضرت معاویہ بن حکم سُلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ نئے مسلمان ہوئے تھے اور آپؐ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، نماز میں کوئی چھینکا، اس نے اگرچہ الحمدللہ نہیں کہا تھا مگر حضرت معاویہؓ نے کہا: یرحمك الله! اللہ تجھ پر رحم کرے! ساتھ والے نے ران پر ہاتھ مارا، اُن کو غصہ آیا، اور کہا: میں اُس کو دعا دے رہا ہوں اور تو مجھے منع کر رہا ہے! خیر نماز پوری ہوئی، نبی ﷺ نے ان کو بلا کر فرمایا: إِنَّ هٰذِهِ الصَّلٰوةَ لَايَصْلُحُ فِيْهَا شَيْئٌ مِنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيْحُ وَالتَّكْبِيْرُ وَالتَّحْمِيْدُ وَقِرَاءَةُ الْقُرْآنِ: نماز میں لوگوں کی باتوں کی قطعاً گنجائش نہیں، نماز: قراءتِ قرآن، تسبیح، تکبیر اور تحمید کا نام ہے، پس یہی سنت ہے، کلام والی حدیثیں سنت نہیں، کیونکہ وہ منسوخ ہیں۔

وہ حدیثیں جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں:

دوسری قسم: وہ حدیثیں ہیں جو نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، وہ اگرچہ حدیثیں ہیں، مگر سنت نہیں، جیسے نبی ﷺ کے لئے نکاح کے باب میں چار کی قید نہیں تھی، چنانچہ نبی ﷺ کے نکاح میں نو بیویاں جمع ہوئی ہیں، جب حضور کا یہ فعل ہے تو حدیث ہوئی، مگر سنت نہیں، امت کو جس راستہ پر چلنا ہے وہ یہ ہے کہ چار ہی بیویاں ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔ اور حضور کا فعل حضور کے ساتھ خاص ہے۔ سورۂ احزاب میں ایک لمبی آیت ہے: ﴿يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ﴾: اس میں آگے ہے: ﴿خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾: یہ حکم خاص آپؐ کے لئے ہے، مؤمنین کے لئے نہیں ہے: ﴿قَدْ عَلِمْنَا مَافَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْ أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾: امت کے لئے ان کی بیویوں اور باندیوں کے سلسلے میں جو احکام ہیں وہ ہمیں معلوم ہیں، وہ ہم نے مقرر کئے ہیں، چنانچہ سورۂ نساء کے شروع میں ہے: ﴿فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾: پس نکاح کرو تم ان عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے، امت کے لئے یہی حکم ہے۔

نکاح میں حضورؐ کے لئے غیر محدود اور امت کے لئے محدود تعداد کیوں؟

اور نبی ﷺ کے لئے غیر محدود نکاح کی اجازت کیوں تھی؟ اور امت کے لئے چار کی

تعداد کیوں مقرر کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت جو ایک سے زیادہ نکاح کرے گی وہ اپنی ضرورت سے کرے گی، یا عورت کی ضرورت سے۔ عورت کی ضرورت سے: یعنی اس کی کفالت کے لئے، جنگیں ہوتی ہیں، حادثات پیش آتے ہیں، اور حادثات زیادہ تر مردوں کو پیش آتے ہیں، اور جب مسلسل جنگیں ہوتی ہیں تو بہت سی عورتیں بے سہارا رہ جاتی ہیں، اور بے شمار عورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ہوگی تو مفاسد کا دروازہ کھل جائے گا، اور عورتیں بھوک مری کا شکار ہونگی، یا حکومت کو ان کی کفالت کرنی پڑے گی، کیونکہ عورتوں کے ذمے شریعت نے کمانا نہیں رکھا۔

اللہ نے عورتوں پر بھاری ذمہ داری نہیں رکھی!

کیونکہ عورتیں صنف نازک ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر کوئی بھاری ذمہ داری نہیں رکھی، جیسے کما کر کھانا: بھاری ذمہ داری ہے، چنانچہ جب تک عورت کی شادی نہیں ہوتی: باپ کے ذمہ اس کا خرچہ ہے، شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہے، بیوہ ہوگئی تو دوسرا نکاح کر لے، اور اگر بوڑھی ہوگئی کہ دوسرے شوہر کے قابل نہیں رہی تو اولاد کے ذمہ اس کا خرچہ ہے، اور اولاد نہیں ہے تو ذی رحم محرم کے ذمہ اس کا خرچہ ہے اور اگر وہ بھی نہیں ہے تو اسٹیٹ (حکومت) کے ذمہ اس کا خرچہ ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے زندگی کے آخر میں فرمایا تھا: اگر میں ایک سال زندہ رہا: تو عراق کی بیوہ عورتیں عمر کے علاوہ کسی کی محتاج نہیں رہیں گی، معلوم نہیں آپؓ کے ذہن میں کیا پلان تھا! اس فرمانے کے تین دن بعد آپؓ شہید کر دیئے گئے۔ اور آج تک وہ نظام نہیں بن سکا۔

اس سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کے ذمہ عورتوں کا خرچہ ہے، عورتوں کے ذمہ کمانا نہیں ہے، کیونکہ کما کر کھانا ایک بھاری ذمہ داری ہے۔ ایسے اور بھی مسئلے ہیں، مثلاً: عورتوں کو نبوت کی ذمہ داری نہیں سونپی گئی، کبھی کوئی عورت نبی یا رسول نہیں بنائی گئی، کیونکہ نبوت کا کام بھاری ذمہ داری ہے۔

اسی طرح جہاد عورتوں کے ذمہ نہیں رکھا، کیونکہ میدانِ جنگ میں پتے پانی ہوتے ہیں،

حتی کہ نفیر عام ہوجائے، اور ہر شخص پر جہاد فرض ہوجائے تب بھی عورتوں پر جہاد فرض نہیں۔

اسی طرح حکومت چلانا بھی بھاری ذمہ داری ہے، عورت اپنی وضع (نسوانی حالت) باقی رکھتے ہوئے حکومت نہیں چلاسکتی، قتل کے مقدمہ میں عورت کی گواہی معتبر نہیں، کیونکہ گواہی اس وقت دی جاسکتی ہے جب قتل کو گواہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، اور عورت قتل کے موقعہ پر باہوش نہیں رہ سکتی، اور قتل کا مشاہدہ نہیں کرسکتی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ کوئی بھی بھاری ذمہ داری عورتوں پر نہیں رکھی گئی، انہی بھاری ذمہ داریوں میں سے کما کر کھانا بھی ہے۔ پس اگر کسی جنگ کے نتیجہ میں عورتیں بہت ہوگئیں اور مرد کم رہ گئے تو بیواؤں کا کیا ہوگا؟ ان کی کفالت کا مسئلہ پیدا ہوگا، اور حکومت ان کا بوجھ اٹھائے اس سے بہتر یہ ہے کہ مرد ان سے شادی کرلیں، کیونکہ عورت کو صرف روزی روٹی کی ضرورت نہیں ہوتی، عورت کی ایک نفسانی ضرورت بھی ہے جو نکاح ہی سے پوری ہوسکتی ہے۔

اسی لئے مرد اتنی ہی عورتیں کرسکتا ہے جن کی نفسانی ضرورت پوری کرسکے، اور یہ بات اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ایک مرد کتنی عورتوں کی ضرورت پوری کرسکتا ہے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جمہور کا خیال کرکے چار کی تعداد مقرر کردی۔

تعدد ازدواج مرد کی بھی ضرورت ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیوی کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتی ہے کہ شوہر کا اس سے ملنا شوہر کے لئے یا بیوی کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے، اور ہر مہینے عورت کو حیض آتا ہے، اور ممکن ہے شوہر قوی الشہوت ہو، اور وہ اتنے دنوں صبر نہ کرسکے، اور حمل کے زمانے میں دو تین مہینے ایسے گذرتے ہیں کہ بیوی کا شوہر کی طرف میلان نہیں رہتا، ایسی حالت میں بیوی سے ملنے میں کیا مزہ! پھر بعض مرد نارمل خواہش والے ہوتے ہیں، اور بعض قوی الشہوت، ان کا ایک بیوی سے کام نہیں چلتا، پس ایسی صورت میں مرد کیا کرے گا؟ اگر ایک ہی بیوی ہوگی تو مرد ناجائز تعلقات قائم کرے گا۔ اور جن اقوام کے نزدیک تعدد ازدواج جائز نہیں، وہ لوگ معذور بیوی سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس کو قتل کردیتے ہیں، اسلام نے بیوی کو قتل سے بچانے کے لئے نکاح ثانی کی اجازت دی، اور زنا اسلام میں سخت ترین تعزیری جرم ہے، شادی شدہ زنا کرتا ہے

تو سنگسار کیا جاتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے جائز موقع فراہم کیا جائے۔

غرض: مرد کو اجازت دی ہے، مگر اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ سب بیویوں کے ساتھ انصاف کرسکے، اگر کوئی انصاف نہ کرسکے تو دوسری تیسری بیوی کرنا جائز نہیں، سورۂ نساء میں ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾: اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم چند بیویوں کے ساتھ انصاف نہیں کرسکو گے تو ایک بیوی رکھو، اور اگر ایک کے بھی حقوق ادا نہ کرسکو تو باندیوں سے کام چلاؤ، ایک آزاد عورت سے بھی نکاح مت کرو، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت انصاف کی شرط کے ساتھ ہے۔

بہر حال امت جو نکاح کرے گی وہ اپنی ضرورت سے کرے گی، اور ایک آدمی کتنی بیویوں کے حقوق ادا کرسکتا ہے: یہ بات اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے: اس لئے ان کے لئے چار کی تعداد مقرر کردی۔

اور حضور ﷺ نے جتنے نکاح کئے ہیں ان میں سے دو کے علاوہ کوئی نکاح اپنی ضرورت سے نہیں کیا۔ جب آپؐ کی عمر مبارک پچیس سال کی تھی تب آپؐ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ یہ نکاح آپؐ نے اپنی ضرورت سے کیا تھا، پھر جب ان کا انتقال ہوگیا تو گھریلو ضرورت سے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ اس کے بعد ایک نکاح (حضرت عائشہؓ سے) اللہ نے اور کرایا، مگر وہ بیوی صاحبہ گھر میں نہیں آئیں، یہ نکاح ایک خواب کی بنا پر ہوا تھا، بخاری میں روایت ہے کہ آپؐ نے خواب دیکھا، فرشتہ ایک ریشمی کپڑا لایا، اور آپؐ سے کہا: یارسول اللہ! اس کو کھولیے، آپؐ نے کھولا تو اس میں حضرت عائشہؓ نظر آئیں۔ یہ خواب آپؐ نے دو تین مرتبہ دیکھا۔

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے اور اس کی بھی تعبیر ہوتی ہے:

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے، اور جیسے ہمارے خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے نبی کے خواب کی بھی تعبیر ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو حکم ملا تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کریں: وہ حکم خواب کے ذریعہ ملا تھا، انھوں نے خواب دیکھا تھا کہ وہ اپنے بیٹے اسماعیلؑ کی قربانی کررہے ہیں۔ خواب حضرت ابراہیمؑ کی سمجھ میں نہیں آیا، کیونکہ بیٹے کی قربانی کرنے کا

رواج نہیں تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے سو اونٹوں کی قربانی کر کے غریبوں میں ان کا گوشت بانٹا، کیونکہ ایک جان کی دیت سو اونٹ ہوتی ہے، چند دن بعد پھر وہی خواب دیکھا، اب بھی سمجھ میں نہیں آیا، پھر سو اونٹ کی قربانی کر کے غریبوں میں ان کا گوشت بانٹا، چند دن کے بعد پھر وہی خواب دیکھا، اب حضرت سمجھے کہ اس خواب کی تعبیر نہیں ہے، بیٹے ہی کی قربانی مقصود ہے، چنانچہ آپؑ بیت المقدس سے سفر کر کے مکہ مکرمہ پہنچے، اور بیٹے سے کہا: ﴿إِنِّیْ أَرَی فِي الْمَنَامِ: أَنِّیْ أَذْبَحُكَ﴾ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں: ﴿فَانْظُرْ مَاذَا تَرىٰ﴾: پس بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کہا: ﴿یا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِیْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ﴾: ابا جان! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجئے، میں ذبح ہونے کے لئے تیار ہوں، آپ مجھے اگر اللہ نے چاہا تو برداشت کرنے والوں میں سے پائیں گے یعنی میں ہمت کر کے ذبح ہونے کی تکلیف برداشت کرلوں گا۔ غور کریں: اسماعیل علیہ السلام نے کہا ہے: ﴿افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ خواب بھی امر ہے۔

ایسے ہی حضور ﷺ کو جو خواب دکھایا گیا تھا اس میں فرشتہ نے اگرچہ صرف اتنا کہا تھا کہ **هذه زوجتك**: یہ آپؐ کی اہلیہ ہیں، مگر وہ امر (حکم) تھا، چنانچہ حضورؐ نے فرمایا: **إن كان من الله يُمْضِهِ**: اگر یہ بات اللہ کی طرف سے طے ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی کوئی شکل کریں گے۔

اُدھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے طور پر سوچ رہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا نکاح حضور ﷺ سے کر دیں، کیونکہ حضرت سودہؓ زیادہ دنوں کی مہمان نہیں تھیں، اس لئے چند سالوں کے بعد جب وہ نہیں رہیں گی یا بوڑھی ہو کر شوہر کے کام کی نہیں رہیں گی تو عائشہ بالغ ہو کر حضور کا گھر سنبھال لیں گی۔

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے پیش کش کی، اور آپؐ چونکہ کئی مرتبہ خواب دیکھ چکے تھے، اس لئے ان کی پیش کش منظور کرلی، یوں آپؐ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہو گیا۔ حضورؐ نے یہ نکاح اپنی ضرورت سے نہیں کیا تھا۔

اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کنواریوں میں سے صرف حضرت عائشہؓ سے حضورؐ نے

نکاح فرمایا ہے، اِن کے علاوہ کسی کنواری لڑکی سے حضور نے نکاح نہیں کیا، اور اس نکاح کے فوائد بعد میں ظاہر ہوئے، انھوں نے آدھا دین حضور سے اخذ کیا۔

پھر ہجرت کا زمانہ آ گیا، ہجرت کے دو سال بعد تک حضرت سودہؓ ہی آپؐ کے گھر کو سنبھالے رہیں، پھر جب حضرت عائشہؓ بالغ ہو گئیں تو وہ رخصت ہو کر آپؐ کے گھر میں آ گئیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی، اور زندگی کے صرف آٹھ سال باقی رہ گئے تھے، انہی آخری آٹھ سالوں میں آپؐ نے باقی نکاح کئے ہیں، پس اگر کسی کے پاس معمولی عقل بھی ہے تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ شوق کا زمانہ نہیں، بلکہ کسی مصلحت سے آپؐ نے یہ نکاح کئے ہیں۔

وہ مصلحت کیا تھی؟ تین مصلحتوں سے آپؐ نے یہ نکاح کئے ہیں: سیاسی، ملّی اور شخصی (۱)

غرض: جب مذکورہ مصلحتیں تھیں تو حد کیسے مقرر کی جاتی؟ اور نبی معصوم ہوتا ہے، اس لئے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ آپؐ کسی بیوی صاحبہ کی حق تلفی کریں گے، اس لئے نکاح کے باب میں آپؐ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔

غیر مقلدوں کے نزدیک نکاح میں کوئی تحدید نہیں!

یہ مثال میں نے اس لئے دی ہے کہ جب آپ ﷺ کا یہ عمل ہے اور آپؐ کے نکاح میں چار سے زیادہ ازواج جمع ہوئی ہیں تو یہ حدیث ہوئی، چنانچہ اہل حدیث اس حدیث پر عمل کرتے ہیں، ان کے نزدیک امت کے لئے بھی نکاح کے باب میں کوئی تحدید نہیں، نواب صدیق حسن خان صاحب بھوپالی کے لڑکے نواب نور الحسن خان صاحب نے **عَرْف الجادی** میں یہ مسئلہ صراحۃً لکھا ہے، حالانکہ یہ حدیث سنت نہیں ہے، امت کا اجماع ہے کہ امت کے لئے چار سے زیادہ بیویاں جمع کرنا جائز نہیں۔

اصل مضمون یہ چل رہا تھا کہ تین قسم کی حدیثیں ہیں، جو سنت نہیں ہیں، ان میں سے دو کا بیان ہو چکا: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، اور وہ حدیثیں جو نبی پاک ﷺ کے ساتھ خاص ہیں: حدیثیں ہیں، مگر سنت نہیں۔ اب تیسری قسم بیان کرتا ہوں۔

(۱) تینوں مصلحتوں کی تفصیل اسی حصہ میں کسی اور تقریر میں آچکی ہے اس لئے یہاں سے حذف کی ہے۔

تیسری قسم: نبی ﷺ نے کسی مصلحت سے کوئی بات فرمائی یا کوئی عمل کیا تو وہ حدیث ہے مگر سنت نہیں، اس کی پانچ مثالیں سنیں، اور اتنی مثالیں اس لئے پیش کر رہا ہوں کہ یہ مسائل سمجھنے ضروری ہیں۔

مغرب سے پہلے نفلیں پڑھنا سنت نہیں

پہلی مثال: بخاری شریف میں ایک باب ہے: **باب الصلاة قبل المغرب** (کتاب التہجد باب ۳۵ حدیث ۱۱۸۳): نبیؐ نے فرمایا مغرب سے پہلے نفلیں پڑھو، یہ بات دو مرتبہ فرمائی، پھر تیسری مرتبہ: لِمَنْ شاء بڑھایا یعنی مغرب سے پہلے کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، راوی کہتے ہیں: آپؐ نے لمن شاء اس لئے بڑھایا کہ لوگ اس کو سنت نہ بنالیں: كراهيةَ أَنْ يَّتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً: اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ لوگ اس نماز کو سنت بنالیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث اور سنت الگ الگ چیزیں ہیں، اور ارشاد پاک: صَلُّوا قبلَ صلاةِ المغرب مسئلہ سمجھانے کے لئے ہے۔ عصر کے فرض پڑھنے کے بعد جو نفلوں کی ممانعت ہے وہ غروبِ شمس تک ہے، سورج چھپتے ہی کراہیت ختم ہو جاتی ہے، اب کوئی نفلیں پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے، مگر اس وقت میں نفلیں پڑھنا سنت نہیں، نبی ﷺ نے مغرب سے پہلے کبھی نفلیں نہیں پڑھیں، چاروں خلفاء نے بھی نہیں پڑھیں۔

اور اگر کوئی کہے کہ جب مغرب کی اذان ہوتی تھی تو صحابہ ستونوں کی آڑ لے کر نفل پڑھتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دور مابعد کا واقعہ ہے، اور صحابہ کے عمل سے جواز ثابت ہوتا ہے، اور یہ جواز تو خود حضورؐ کے ارشاد سے بھی ثابت ہوتا ہے، اور جواز میں کوئی کلام نہیں، اگر مغرب کے فرضوں میں تاخیر نہ ہو، اور کوئی نفلیں پڑھے تو بلا شبہ جائز ہے مثلاً: رمضان میں اذان کے دس منٹ کے بعد نماز کھڑی ہوتی ہے، پس کوئی کھجور سے افطار کر کے نفلیں پڑھے: تو پڑھے، لیکن اگر اس کو سنت بنالیا جائے تو پھر پورے سال پندرہ منٹ کے بعد مغرب کی نماز کھڑی ہوگی، جو سنت کے خلاف ہے، مغرب کی نماز میں جلدی کرنا مطلوب ہے۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سنت نہیں:

دوسری مثال: نبی ﷺ نے زندگی میں ایک مرتبہ ایک قوم کی کوڑی پر کھڑے ہو کر

پیشاب فرمایا: یہ حدیث ہے، مگر سنت نہیں، یہ دینی طریقہ نہیں، آپؐ ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب فرماتے تھے، اور وہی سنت ہے۔

پھر حضورؐ نے کھڑے ہو کر پیشاب کیوں فرمایا؟ مسئلہ کی وضاحت کے لئے۔ کبھی انسان کو ایسی مجبوری پیش آتی ہیں کہ بیٹھ نہیں سکتا، مثلاً کوڑی ہے، گندگی کی جگہ ہے، ایسی مجبوری میں کھڑے ہو کر پیشاب کرنا جائز ہے، یا کسی بیماری کی وجہ سے بیٹھ نہیں سکتا: تب بھی یہی حکم ہے۔ بیل کی طرح کھڑے کھڑے موتنا سنت کے خلاف ہے، یہ غیروں کا طریقہ ہے۔

پھر سنت کیا ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: **مَنْ حَدَّثَكُمْ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ يَبُوْلُ قَائِمًا فَلَا تُصَدِّقُوْهُ، مَاكَانَ يَبُوْلُ إِلَّا قَاعِدًا**: اگر تم سے کوئی بیان کرے کہ آپؐ کی عادت شریفہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی تھی تو ہرگز اس کی بات نہ ماننا، آپؐ ہمیشہ بیٹھ کر ہی پیشاب فرمایا کرتے تھے۔

ایک لطیفہ:

نیویارک کی ایک مسجد میں ایک غیر مقلد حدیث کی تعلیم کر رہا تھا، اس نے یہی کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی روایت بیان کی، اور کہا: کھڑے ہو کر پیشاب کرنا سنت ہے، اس حدیث سے یہ بات صراحۃً ثابت ہوتی ہے۔ مجمع میں سے ایک شخص نے سوال کیا: یہ سنت صرف مردوں کے لئے ہے یا عورتوں کے لئے بھی ہے؟ بس اس کی سٹّی گم ہوگئی!

حیض کے زمانے میں بیوی کو ساتھ لٹانا سنت نہیں:

تیسری مثال: ایک مرتبہ نبی ﷺ نے حیض کے زمانہ میں حضرت عائشہؓ سے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔ یہ مسئلہ کا بیان تھا، سنت نہیں ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ آپؐ اور حضرت عائشہؓ ساتھ لیٹے ہوئے تھے، رات میں حضرت عائشہؓ کا حیض شروع ہوا، وہ چپکے سے کھڑی ہوگئیں، ایسے موقعہ پر عورتیں روئی لنگوٹ وغیرہ باندھتی ہیں، آپؐ کی آنکھ کھل گئی، آپؐ نے پوچھا: کیا ماہواری شروع ہوگئی؟ انھوں نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! آپؐ نے فرمایا: جو کپڑے باندھنے ہیں وہ باندھ لو، پھر لنگی پہن کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ، کیونکہ

رات آدھی ہوگئی ہے، گھر میں کوئی چراغ نہیں ہے، مسجد نبوی میں چراغ نہیں جلتا تھا: گھر میں چراغ کہاں سے آتا! اس لئے آپؐ نے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔

یہ زندگی میں ایک مرتبہ کا واقعہ ہے اور مسئلہ کا بیان ہے، سنت نہیں ہے۔ جب حضرت عائشہؓ یہ واقعہ بیان کرتیں تو ساتھ ہی یہ بھی کہتیں: وَأَيُّكُمْ يَمْلِكُ أَرَبَهُ: تم میں سے کون اپنی خواہش پر کنٹرول کرسکتا ہے؟ یعنی اس کو سنت سمجھ کر حالتِ حیض میں بیوی کو ساتھ نہ لٹاؤ، ورنہ گناہ میں مبتلا ہوجاؤ گے۔

حالتِ حیض میں بیوی سے کتنا قریب ہوسکتے ہیں؟

اور وہ مسئلہ کیا ہے، جس کی آپؐ نے اپنے عمل سے وضاحت فرمائی ہے؟ جواب: حیض کے بارے میں قرآنِ کریم میں آیت ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ، قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾: لوگ آپؐ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ بتلائیں کہ حیض کی حالت تکلیف دہ حالت ہے، اس گندگی کی حالت میں صحبت کرنا سوزاک کی بیماری پیدا کرتا ہے، اور اس زمانے میں صحبت کرنے سے بیوی کو بھی تکلیف ہوتی ہے، اس لئے حیض کی حالت میں عورتوں سے علاحدہ رہو، اور ان کے نزدیک مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں۔

اب اس کی وضاحت ضروری ہے کہ کتنا علاحدہ رہنا ضروری ہے، اور کتنا نزدیک جانا جائز ہے، اور کہاں تک جانے پر پابندی ہے؟ جب یہ آیت نازل ہوئی تو یہودیوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حیض کے زمانہ میں عورت کو علاحدہ کمرہ دیتے تھے، اس کے کمرے میں شوہر نہیں جاتا تھا، حائضہ کے ہاتھ کا پکا ہوا بھی کوئی نہیں کھاتا تھا، آج بھی یہود کا یہی طریقہ ہے، چنانچہ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپؐ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ یہود کی مخالفت کرو، پس کیا ہم حالتِ حیض میں بیوی سے صحبت نہ کریں؟ تاکہ ان کی پوری مخالفت ہوجائے، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں حکم دیا کہ حیض کے زمانے میں عورتوں سے علاحدہ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں: ان کے نزدیک مت جاؤ۔ اب اس اجمال کی وضاحت ضروری تھی، چنانچہ نبی ﷺ نے مختلف طرح سے اس آیت کی تفسیر بیان کی:

۱- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حالتِ حیض میں ہوتی تھیں اور آپؐ اور حضرت عائشہؓ ایک ہی پلیٹ میں کھاتے تھے، معلوم ہوا کہ اتنا قریب جاسکتے ہیں۔

۲- حضرت عائشہؓ نے گوشت کی بوٹی آدھی کھائی ہوتی تھی: باقی ان کے ہاتھ سے لے کر آپؐ نوش فرماتے تھے، معلوم ہوا کہ اتنا نزدیک جانا بھی جائز ہے، اُس بوٹی پر حضرت عائشہ کا لعاب لگا ہوا ہوتا تھا اور اس بوٹی کو آپ نوش فرماتے تھے، معلوم ہوا کہ حائضہ کا تھوک پاک ہے، اور جب تھوک پاک ہے تو پسینہ بھی پاک ہے۔

۳- آپؐ اعتکاف میں ہوتے تھے، مسجد میں بیٹھے ہوئے سر حجرے میں نکال دیتے تھے، حضرت عائشہؓ نیچے برتن رکھ کر سر مبارک دھوڈالتی تھیں، پھر بال خشک کرکے تیل ڈال کر کنگھا کردیتی تھیں اور وہ حالت حیض میں ہوتی تھیں، معلوم ہوا کہ بیوی حالتِ حیض میں شوہر کی یہ خدمت بھی کرسکتی ہے۔

۴- اور مذکورہ واقعہ میں حضور نے فرمایا: لنگی باندھ کر میرے ساتھ آکر لیٹ جاؤ، چنانچہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ حیض کے زمانہ میں ناف سے گھٹنے تک بدن کو کپڑے کی آڑ کے بغیر ہاتھ لگانا جائز نہیں، کیونکہ اس سے زیادہ نبی ﷺ نزدیک نہیں ہوئے۔

بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھنا سنت نہیں!

چوتھی مثال: ایک مرتبہ جب تکبیر ہوئی تو نبی ﷺ اپنی نواسی کو گود میں لئے ہوئے گھر سے تشریف لائے، اور اس بچی کو گود میں اٹھائے ہوئے پوری نماز پڑھائی: جب سجدہ کرتے تھے تو بچی کو نیچے بٹھا دیتے تھے، اگلی رکعت میں پھر اس کو گود میں لے لیتے تھے، آپؐ نے زندگی میں صرف ایک مرتبہ یہ عمل کیا ہے، اور یہ بھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا۔ کیا آپؐ کے گھروں میں اس بچی کو دس منٹ کے لئے کوئی رکھنے والا نہیں تھا؟ ضرور تھا، مگر آپؐ بالقصد بچی کو لے کر آئے تھے اور اس کے ساتھ نماز پڑھا کر دکھائی تھی، کیونکہ بعض دفعہ ایسے حالات پیش آتے ہیں: آدمی کبھی ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں بچہ کو بٹھا کر نماز پڑھے گا تو درندہ اس کو پھاڑ کھائے گا، یا اغوا کرنے والے اچک لے جائیں گے، ایسی صورت میں آدمی کیا کرے؟ بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے! نماز قضاء نہ کرے، اور کبھی گھر میں ایسا ہوتا ہے کہ بچہ کسی وجہ

سے ڈر جاتا ہے، ماں سے جدا نہیں ہوتا، جدا کرتی ہے تو روتا ہے، اور گھر میں کوئی دوسرا رکھنے والا نہیں: ایسی صورت میں کیا ماں نماز قضا کرے گی؟ نہیں! بچے کو گود میں اٹھا کر نماز پڑھے گی۔ مگر شرط یہ ہے کہ بچے کا بدن اور کپڑے پاک ہوں۔

غور کرو! حضور ﷺ نے ایک عمل کر کے ماؤں کے لئے کتنا بڑا راستہ کشادہ کر دیا! اب اگر کوئی کہے کہ یہ سنت ہے اور وہ چھوٹے بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے تو اس سے کہا جائے گا کہ یہ سنت نہیں ہے، یہ عمل تو مسئلہ کی وضاحت کیلئے کیا تھا، پس یہ حدیث ہے، سنت نہیں۔

ناسمجھ بچوں کو مسجد میں لانا ممنوع ہے:

یہاں (کناڈا، یوروپ اور امریکہ میں) لوگ چھوٹے بچوں کو مسجد میں لے کر آجاتے ہیں، اور چھوڑ دیتے ہیں، وہ صفوں میں دوڑتے پھرتے ہیں، اور لوگوں کی نماز خراب کرتے ہیں، حالانکہ ابن ماجہ وغیرہ میں حدیث ہے: جَنِّبُوْا مَسَاجِدَكُمْ صِبْيَانَكُمْ: اپنی مسجدوں کو اپنے (ناسمجھ) بچوں سے بچاؤ، جب تک بچے پاکی ناپاکی کو نہ سمجھیں اور مسجد کا احترام نہ جانیں: بچوں کو مسجد میں لانا منع ہے، لوگ یہ حدیث پیش کرتے ہیں، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ عمل مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، سنت نہیں تھا۔

سنت کی کسوٹی صحابہ کا عمل ہے:

سوال: ہم کیسے جانیں کہ حضورؐ نے یہ جو عمل کیا ہے، وہ مسئلہ نہیں ہے، مصلحت ہے، اس کے پہچاننے کے لئے کسوٹی کیا ہے؟ جواب: کسوٹی صحابہ کا عمل ہے، صحابہ نے اس پر عمل کیا ہے یا نہیں؟ اگر کیا ہے تو وہ سنت ہے، ورنہ وہ عمل کسی مصلحت سے ہے، آپؐ صحابہ کا پورا دور دیکھیں، کسی صحابی نے کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا اور ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ کسی صحابی نے حالتِ حیض میں بیوی کو ساتھ لٹایا ہو، اور کبھی بھی کسی صحابی نے بچے کو گود میں لے کر مسجد میں آکر نماز نہیں پڑھی ہو۔ صحابہ سے زیادہ سنتوں کا عاشق کون تھا؟ اگر یہ اعمال سنت ہوتے تو صحابہ ضرور ان پر عمل کرتے۔ پس یہ اس بات کی کسوٹی ہے کہ یہ حدیثیں: محض حدیثیں ہیں،

سنت نہیں ہیں۔ اور آپؐ کے یہ سب اعمال کسی مصلحت سے ہیں۔

زور سے آمین کہنا حنفیہ کے نزدیک سنت نہیں:

پانچویں مثال: اُنہی مصلحتوں میں سے ایک مصلحت: تعلیم امت بھی ہے، جب حضرت وائل بن حُجر رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیس دن ٹھہرے ہیں، اور ساٹھ جہری نمازیں آپؐ کے پیچھے پڑھی ہیں، ان میں سے تین نمازوں میں آپؐ نے زور سے آمین کہی ہے، یہ جہر حضرت وائل کی تعلیم کے لئے تھا، پس یہ بھی حدیث ہے، سنت نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت وائلؓ یمن کے نواب زادے تھے، جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ وہاں گورنر بنا کر بھیجے گئے، اور انھوں نے دعوت کا کام شروع کیا تو حضرت وائلؓ مسلمان ہوگئے، ایک تو وہ بڑے آدمی تھے، دوسرے وہ خود سمجھ دار تھے، حضرت معاذؓ نے ان کو مشورہ دیا کہ مدینہ جاؤ، اور حضور ﷺ سے ملو، حضورؐ تمہیں دیکھ کر خوش ہونگے، چنانچہ وہ یمن سے مدینہ آئے، جب تین دن کی مسافت پر رہ گئے تو وحی سے آپؐ کو اطلاع ملی، آپؐ نے صحابہ کو خوش خبری سنائی، چنانچہ سارا مدینہ منتظر تھا کہ کوئی نواب زادہ مسلمان ہو کر آرہا ہے، پھر جب وہ مدینہ پہنچے تو نبی ﷺ نے مسجد سے نکل کر ان کا استقبال کیا، اور ان کو خوش آمدید کہا، پھر ان کو اپنے ساتھ لائے، اور اپنی چادر بچھا کر اس پر بٹھایا۔

حضرت وائلؓ بیس دن حضورؐ کے پاس رہے ہیں، ان بیس دنوں میں آپؐ نے ان کے نماز پڑھنے کے لئے اپنے پیچھے پہلی صف میں جگہ متعین کردی تھی، وہ کہتے ہیں: جب نبی ﷺ نے پڑھا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾: تو آمین کہی، اور آمین کے ساتھ اپنی آواز کھینچی، یعنی زور سے آمین کہی، آگے روایت میں ہے: سَمِعْتُهُ وَأَنَا خَلْفَهُ: میں نے آپؐ کی آمین سنی، درانحالیکہ میں آپؐ کے پیچھے تھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کتنی زور سے آمین کہی ہوگی، آج کل زور سے آمین کہنے والے دو غلطیاں کرتے ہیں: ایک: چلا کر آمین کہتے ہیں، حالانکہ حضورؐ نے اتنی زور سے آمین کہی تھی کہ پہلی صف میں حضرت وائلؓ نے سن لی تھی، لوگ اسی حدیث کی بناء پر زور سے آمین کہتے ہیں، پس اتنی ہی آواز سے آمین کہیں۔ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ آمین کے الف کو کھینچتے ہیں، اللہ جانے وہ کونسا مد کرتے

ہیں، اس کو صرف ایک الف کے بقدر کھینچنا چاہئے۔

بہر حال میں یہ بتا رہا تھا کہ حضرت وائلؓ کہتے ہیں: حضور ﷺ نے آمین کہی اور میں نے پہلی صف میں سنی، اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ثلاثاً آمین کہی، ثلاثاً کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے تین دفعہ آمین کہی، مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ثلاثاً کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ تین نمازوں میں جہراً آمین کہی، بیس دن کی جہری نمازیں ساٹھ ہوتی ہیں، ان میں سے صرف تین نمازوں میں جہراً آمین کہی ہے، اور دُولابی کی **کتاب الاسماء والکُنیٰ** میں روایت ہے: حضرت وائلؓ کہتے ہیں: مَا أُرَاهُ إِلَّا لِيُعَلِّمَنَا: جہاں تک میرا خیال ہے آپؐ نے زور سے آمین مجھے سکھلانے کے لئے کہی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ آپؐ کا جہراً آمین کہنا ایک خاص مصلحت سے تھا، پس اس سے بھی صرف جواز ثابت ہوتا ہے، سنت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

بہر حال مضمون یہ چل رہا تھا کہ حدیث اور سنت میں عام خاص من وجہ کی نسبت ہے، اور جہاں یہ نسبت ہوتی ہے وہاں تین مادے ہوتے ہیں، ایک مادۂ افتراقی کا بیان ہو چکا کہ تین قسم کی روایتیں حدیثیں ہیں، سنت نہیں ہیں: ایک: وہ حدیثیں جو منسوخ ہیں، دوسری: وہ حدیثیں جو نبی پاک ﷺ کے ساتھ خاص ہیں، تیسری: وہ حدیثیں جن میں حضورؐ نے کوئی ارشاد فرمایا ہے یا کوئی عمل کیا ہے، کسی مصلحت سے یا کوئی مسئلہ سمجھانے کے لئے۔

خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم

دوسرا مادۂ افتراقی: اور کچھ چیزیں سنت ہیں، مگر حدیث نہیں، وہ خلفائے راشدین کی سنتیں ہیں، نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا، وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ: میری سنت مضبوط پکڑو، اور میرے بعد میرے جو جانشیں آئیں گے ان کی سنت مضبوط پکڑو۔

یہاں کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے نبی تو اللہ کے نبی ہیں، گفتۂ او گفتۂ اللہ بود، آپ کا فرمایا ہوا تو اللہ کا فرمایا ہوا ہے، مگر یہ خلفائے راشدین کون نبی ہیں کہ ان کی سنت کی پیروی کی جائے؟

اس لئے آگے فرمایا کہ ان کی سنت کی پیروی اس لئے ضروری ہے کہ وہ راشد ہوں گے، راشد کے معنی ہیں: راہ یاب، اور فرمایا: وہ مہدی ہونگے، مہدی کے معنی ہیں: ہدایت مآب، یعنی ہدایت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوگی۔

یہ بنیاد ہے ان کی سنت کی پیروی کرنے کی، اور ہم جو ائمہ کی تقلید (پیروی) کرتے ہیں اس کی بھی یہی بنیاد ہے، اور غلطی کا احتمال اگر ابوحنیفہ وشافعی میں ہے تو ابوبکر وعمر وعثمان وعلی میں بھی ہے، لیکن غلطی کے احتمال کے باوجود خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی ضروری ہے پس اسی بنیاد پر مجتہدین کی پیروی بھی ضروری ہے، ابوحنیفہؒ کی پیروی عالم دین ہونے کی وجہ سے ہے، قرآن وحدیث کا کامل علم رکھنے کی وجہ سے ہے، چنانچہ امام اعظم کا قول مذہب میں موجود ہوتا ہے، مگر دلائل سے وہ قوی نہیں ہوتا تو امام صاحب کا قول چھوڑ دیا جاتا ہے، اور صاحبین کے قول پر فتوی دیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ پیروی دلائل کی کی جاتی ہے، محض قول کی پیروی نہیں کی جاتی۔

پھر مذہبِ حنفی کیوں کہتے ہیں؟ جواب: یہ ایک رمزی نام ہے، ایک مکتب فکر کا نام ہے، معین شخص مراد نہیں، چنانچہ آج نئے مسائل میں مفتی صاحبان جو فتوے دیتے ہیں وہ بھی مذہبِ حنفی میں شامل ہوتے ہیں۔

بہر حال مجتہدین کی پیروی بھی اسی بنیاد پر ہے جس بنیاد پر خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کا حکم ہے۔

پھر فرمایا: تَمَسَّكُوْا بِهَا: بهما نہیں فرمایا، یعنی میرے خلفاء کی سنت کو مضبوط پکڑو، مفرد کی ضمیر ہے، اور ضمیر قریب مرجع کی طرف لوٹتی ہے، پس ھَا کا مرجع سنة الخلفاء ہے، کیونکہ حضور ﷺ کی سنت کو تو ہر مسلمان قبول کرے گا، وہ تو اللہ کے نبی ہیں، اور اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن خلفائے راشدین کی سنتوں کو غیر مقلد نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں: خلفائے راشدین کونسے انبیاء ہیں؟ اس لئے حضورؐ نے تاکید فرمائی کہ خلفائے راشدین کی سنتوں کو بھی مضبوط پکڑو، پھر مزید تاکید فرمائی: عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ: ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑو۔ خلفائے راشدین کی یہی سنتیں سنت ہیں، مگر حدیث نہیں ہیں۔

خلفائے راشدین کی سنتوں کو مضبوط پکڑنے کا حکم کیوں ہے؟

نبی پاک ﷺ کے زمانہ تک قومی حکومت (نیشنل گورنمنٹ) قائم ہوئی تھی، بین الاقوامی حکومت (انٹرنیشنل گورنمنٹ) قائم نہیں ہوئی تھی، چنانچہ نیشنل حکومت کے احکام حضور ﷺ نے بیان فرمائے، مگر انٹرنیشنل حکومت کے احکام بیان نہیں فرمائے۔ اگر ابھی وہ احکام بیان کئے جاتے تو وہ قبل از وقت ہوتے اور قبل از وقت بیان کئے ہوئے احکام سمجھ میں نہیں آتے، اور سمجھے بغیر یاد بھی نہیں رکھے جاسکتے۔

جیسے آج کل کلونک (قلم لگانے) کا مسئلہ چل رہا ہے، اگر حضورؐ اس کے احکام بیان کرتے تو صحابہ کیسے سمجھتے؟ آج مولوی بھی نہیں سمجھتے کہ کلونک کیا چیز ہے؟ اسی طرح اگر حضورؐ انٹرنیشنل حکومت کے احکام بیان فرماتے تو صحابہ کیسے سمجھتے؟ اور نہ سمجھتے تو یاد کیسے کرتے؟ اور امت تک کیسے پہنچاتے؟ کیونکہ مسئلہ وقت پر ہی سمجھ میں آتا ہے، اور وقت پر ہی بیان کیا جاتا ہے۔

انٹرنیشنل حکومت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قائم ہوئی، اور جب بین الاقوامی حکومت قائم ہوتی ہے تو ملک میں مختلف مذاہب اور مختلف قومیں آباد ہوجاتی ہیں، اور ملت بھی بہت وسیع ہوجاتی ہے، اس لئے ملک وملت کو منظم کرنے کے لئے جو احکام خلفائے راشدین نے جاری کئے ہیں ان کو مضبوط پکڑنا ضروری ہے، اور ان دو معاملوں کے علاوہ وضو، نماز اور روزے وغیرہ کے مسائل میں خلفائے راشدین کی رائیں امت کے دیگر مجتہدین کی رایوں کی طرح ہیں، ان میں ضروری نہیں کہ خلفائے راشدین کی جو رائیں ہیں: وہ سب لی جائیں، یہ بات بعد کے مجتہدین کے اختیار پر موقوف ہے۔

وہ روایتیں جو حدیثیں بھی ہیں اور سنت بھی:

اور مادۂ اجتماع: وہ سب روایتیں ہیں جو معمول بہا ہیں، وہ حدیث بھی ہیں اور سنت بھی، اور ایسی روایتیں بے شمار ہیں، پس ثابت ہوا کہ حدیث اور سنت ایک نہیں، دونوں میں فرق ہے۔ مگر ایک فرقہ جو خود کو اہل حدیث کہتا ہے، وہ کوئی بھی حدیث مل جائے: اس پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے، چنانچہ ان کے یہاں نکاح چار میں منحصر نہیں، آدمی

جتنے چاہے نکاح کرسکتا ہے، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ حضورؐ کے نکاح میں نو بیویاں تھیں۔ اور نبی ﷺ نے حضرت غیلان ثقفی کو جو حکم دیا تھا کہ چار سے زائد بیویوں کو الگ کرو: اس روایت کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ضعیف روایت ہے، اور غیر مقلدین کے نزدیک ضعیف روایت: موضوع روایت کے ہم پلّہ ہوتی ہے۔

ضعیف روایات موضوعات کے ہم پلہ نہیں:

حالانکہ ضعیف حدیث ہے اور موضوع تو حدیث ہی نہیں۔ موضوع: وہ بات ہے جو لوگوں نے گڑھ کر حضور کے نام لگائی ہے، جیسے: أَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِيْ: سب سے پہلے اللہ نے میرا نور پیدا کیا۔ یہ حدیث قطعاً باطل ہے۔ یہ حدیث زرقانی کی مواہب لدنیہ میں ہے، اور زرقانی نے مصنف عبدالرزاق کا حوالہ دیا ہے، یہ کتاب گیارہ جلدوں میں چھپ چکی ہے، میں نے گیارہ طلباء کو ایک ایک جلد دے کر بٹھایا کہ اس کا ایک ایک حرف پڑھو، اور تلاش کرو یہ حدیث کہاں ہے؟ مصنف عبدالرزاق میں طلباء کو یہ حدیث نہیں ملی، اور مواہب لدنیہ میں یہی ایک حوالہ ہے، اور عجلونی کی کشف الخفاء میں بھی یہ حدیث زرقانی ہی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اور کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اور سعید زَغلول نے موسوعہ اطراف الحدیث میں کشف الخفاء ہی کا حوالہ دیا ہے، رزقانی کا حوالہ نہیں دیا۔

یہ حدیث اس طرح ہے: آپؐ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں پیدا کرنے سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا، پس وہ نور اللہ کی قدرت سے جہاں اللہ نے چاہا گھومتا رہا، اور اس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم، نہ جنت، نہ جہنم، نہ فرشتے، نہ آسمان، نہ زمین، نہ دوزخ، نہ چاند، نہ جنات، نہ انسان۔ پھر جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو اس نور کے چار حصے کئے، پہلے جزء سے قلم، دوسرے جزء سے لوح، تیسرے سے عرش پیدا کیا، اور چوتھے حصہ کے پھر چار حصے کئے، پہلے حصہ سے حاملینِ عرش، دوسرے سے کرسی، تیسرے سے باقی فرشتے پیدا کئے، پھر چوتھے جزء کے چار حصے کئے، اول سے آسمان، ثانی سے زمینیں، ثالث سے جنت وجہنم پیدا کیں، پھر چوتھے حصہ کے چار حصے کئے، اول سے مؤمنین کی آنکھوں کی روشنی، دوم: سے ان کے دلوں کا نور

یعنی اللہ کی معرفت، سوم سے ان کی انسیت کا نور یعنی توحید: لا إله إلا الله: محمد رسول الله کو بنایا (ابھی حدیث اور بھی ہوگی، کشف الخفا میں اتنی ہی نقل کی ہے)

اس حدیث کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے، گھڑی ہوئی بات ہے، اور اس سے وحدت الوجود کے نظریہ کی تائید ہوتی ہے، ایسی حدیثیں موضوع کہلاتی ہیں، یہ حدیثیں نہیں، پس حدیث اور موضوع: متن کی صفتیں ہیں، جو بات نبی ﷺ نے فرمائی ہے: وہ حدیث ہے، اور جو لوگوں نے آپؐ کے نام لگائی ہے: وہ موضوع ہے۔

اور وہ حدیثیں جو حضورؐ ہی نے فرمائی ہیں، ان کی تین قسمیں ہیں: صحیح، حسن اور ضعیف۔ یہ متن کی صفتیں نہیں ہیں، بلکہ سند کی صفتیں ہیں، یعنی نبی پاک ﷺ سے وہ حدیثیں جو مصنّفین کتب تک پہنچی ہیں وہ کیسے راویوں کے توسط سے پہنچی ہیں؟ اگر سب راوی اعلیٰ درجہ کے ہیں تو وہ حدیث: صحیح ہے، اور اگر کوئی راوی خفیف الضبط ہے تو وہ حدیث: حسن ہے، اور اگر کوئی راوی کمزور ہے تو وہ حدیث ضعیف ہے۔

البانی صاحب کا کارنامہ:

اور جب سے حدیثیں کتابوں میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا ہے: صحیح، حسن اور ضعیف تینوں قسموں کو ایک ہی کتاب میں جمع کیا جاتا تھا، اور موضوع کے لئے الگ کتابیں لکھی جاتی تھیں، اور چونکہ سند کے اعتبار سے درجے ہوگئے ہیں، اس لئے فقہاء نے مسائل اخذ کرنے کے اعتبار سے بھی درجے قائم کئے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث بھی ہے اور حسن بھی تو فقہاء پہلے صحیح کو لیتے ہیں۔ اور اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث بھی ہے اور ضعیف بھی تو فقہاء صحیح کو لیتے ہیں، ضعیف کو نہیں لیتے۔ اسی طرح حسن اور ضعیف جمع ہوجائیں تو حسن کو لیں گے، ضعیف کو نہیں لیں گے، اور اگر کسی مسئلہ میں صرف ضعیف روایت ہو تو دیکھیں گے کہ ضعف کیسا ہے؟ محتمل یعنی قابل برداشت ہے تو چاروں فقہاء اس سے مسائل میں استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: جب مختلف سندوں سے کوئی حدیث آئے تو وہ حسن لغیرہ اور قابل استدلال ہوجاتی ہے، جیسے صلاۃ التسبیح کی کوئی حدیث صحیح نہیں، سب ضعیف ہیں، مگر گیارہ حدیثیں ہیں، پس سب مل کر حسن لغیرہ ہوجائیں گی، اور اس سے صلوۃ التسبیح کا استحباب ثابت ہوگا، چنانچہ دور اول

سے صلاۃ التسبیح مسلمان پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ اور اگر ضعف قابلِ برداشت نہ ہو، اور سند ایک ہی ہو تو فضائل اعمال میں وہ روایت معتبر ہے، مسائل اس سے ثابت نہیں کئے جاتے۔

بہر حال چاروں فقہاء کے نزدیک صحیح، حسن اور ضعیف: حدیثیں ہیں، اور اپنے اپنے درجے میں معمول بہا ہیں۔ اب ایک صاحب آتے ہیں: جناب ناصر الدین البانی صاحب، انھوں نے حدیث کی کتابوں میں سے پہلے ضعیف روایتوں کو الگ کیا، ضعیف ابی داؤد، ضعیف جامع صغیر، ضعیف مشکوٰۃ وغیرہ کتابیں لکھیں۔ پھر انھوں نے ان سب ضعیف حدیثوں کو موضوع حدیثوں کے ساتھ ملادیا، اور کئی جلدوں میں کتاب لکھی: **سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة وأثرها السيئ في الأمة**: یعنی ضعیف اور موضوع روایات کا مجموعہ جن سے امت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ اس طرح عرب ممالک کے نوجوانوں کا اور آپ کے یورپ اور امریکہ کے جوانوں کا ایک ذہن بنادیا کہ ضعیف حدیث: موضوع حدیث ہے، جب بھی کوئی حدیث ان کے خلاف پیش کی جائے گی تو فوراً کہیں گے: **هذا حديث ضعيف**، اور مراد لیں گے کہ یہ حدیث موضوع ہے، یہ حدیث ہی نہیں۔ یہ کارنامہ جناب عالی نے انجام دیا ہے، اور ساری امت کا ذہن خراب کردیا ہے، عرب ممالک میں اگرچہ البانی کی اس حرکت کے ازالہ کے لئے محنتیں ہورہی ہیں، مگر وہ کتابیں آپ کے ملکوں تک نہیں پہنچی ہیں، اس لئے یہاں البانی صاحب نے جوانوں کو جو زہر پلایا ہے اس کا ازالہ کرتے ہوئے دوسو سال لگیں گے۔

غرض صحیح بھی حدیث ہے، حسن بھی حدیث ہے اور ضعیف بھی حدیث ہے، مگر حجت سنت ہے، حدیث حجت نہیں، اسی طرح خلفائے راشدین نے ملک وملت کی تنظیم کے لئے جو طریقے رائج کئے ہیں وہ اگرچہ حدیثیں نہیں ہیں، مگر سنت ہیں، اور حجت ہیں۔ اب میں خلفائے راشدین کی سنتوں کی ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سنت:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو جزیرۃ العرب میں لوگ تین طرح کے تھے، ایک: مسیلمۂ کذاب کے ساتھی تھے، ان سے حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے لوہا

لیا، اور ان کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ دوسرے: مسلمان: جو بڑی تعداد میں تھے۔ تیسرے: وہ لوگ جو مسلمان تھے مگر انھوں نے کہا کہ ہم اپنی زکوتیں سنٹرل گورنمنٹ کو نہیں دیں گے، ہم اپنے قبیلہ کی زکوتیں وصول کر کے خود تقسیم کریں گے، یہ مانعینِ زکات کہلاتے ہیں، ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا: میں ان کے ساتھ جنگ کروں گا، حضرت عمرؓ نے کہا: یہ لوگ مسلمان ہیں، ان کے ساتھ جنگ کیسے جائز ہے! حدیث ہے: أُمِرْتُ أَنْ أقاتل الناس یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں، پھر جب انھوں نے کلمۂ اسلام پڑھ لیا تو انھوں نے ہم سے اپنی جانیں اور اپنے اموال محفوظ کر لئے، اب ان سے جنگ جائز نہیں، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: نہیں! میں ان سے جنگ کروں گا، اگر وہ نبی ﷺ کے زمانہ میں زکات میں رسّی دیتے تھے: وہ بھی نہیں دیں گے تو میں ان سے لڑونگا، اور ان کو مجبور کرونگا کہ وہ زکات مرکزی حکومت کو دیں۔ مگر پھر جنگ کی نوبت نہیں آئی، وہ لوگ قائل ہو گئے، اور انھوں نے سنٹرل گورنمنٹ کو زکوۃ بھیجنی شروع کر دی۔

اب مسئلہ طے ہو گیا کہ جو چیزیں شعائرِ اسلام سے ہیں، اگرچہ وہ سنت کے درجے کی چیزیں ہوں، اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت بالاتفاق ان شعائر کو ترک کر دے تو ان کے ساتھ جنگ کی جائے گی، اور ان کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ شعائر اسلام قائم کریں۔ جیسے ختنہ: اصح قول کے مطابق سنت ہے، لیکن اگر کسی علاقہ کے مسلمان طے کر لیں کہ وہ ختنہ نہیں کرائیں گے تو اسلامی حکومت ان کے ساتھ جنگ کرے گی اور ان کو ختنہ کرنے پر مجبور کرے گی۔ اسی طرح اذان سنت ہے لیکن اگر کسی علاقہ کے لوگ طے کر دیں کہ وہ اذان نہیں دیں گے تو حکومت ان کے ساتھ جنگ کرے گی اور ان کو اذان دینے پر مجبور کرے گی، یہ سب مسائل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس سنت سے طے ہوئے۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد خلیفہ نامزد کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے: وہ بھی آپؓ کی سنت ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنتیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنتیں تو بے شمار ہیں، انھوں نے بہت سے مسائل طے کئے

ہیں، تراویح کے ذریعہ ملت کی تنظیم کی ہے، اور ایک مجلس یا ایک لفظ سے دی ہوئی تین طلاقیں، جبکہ تاکید کی نیت نہ ہو: تین قرار دے کر چور دروازہ بند کر دیا ہے، یہ ملت کی تنظیم ہے۔ اور عراق جو لڑ کر فتح کیا گیا تھا اس کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم نہ کرنا اور ذمیوں پر جزیہ کی جو شرح مقرر کی ہے یہ سب ملک کی تنظیم ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سنتیں:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو زبردست کام کئے ہیں، ایک: جمعہ کی اذان بڑھائی ہے، یہ ملت کی تنظیم ہے۔ دوسرا: امت کو لغت قریش پر جمع کیا ہے، یہ بھی ملت کی تنظیم ہے۔

قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا تھا، پھر اسے متعدد طرح سے پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی، چنانچہ لوگ مختلف طرح سے پڑھتے بھی تھے اور مختلف طرح سے لکھتے بھی تھے، حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں میں اس سلسلہ میں اختلافات شروع ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کی جو اصل تحریریں تھیں وہ منگوائیں اور قریش کی زبان میں جو قرآن نازل ہوا تھا، اور جس کو نبی ﷺ نے لکھوایا تھا اور ملاحظہ بھی فرمایا تھا، اُس لغت میں متعدد قرآن تیار کرا کر پورے ملک میں پھیلا دیئے اور حکم دیا کہ اس کے علاوہ جو بھی قرآن لکھے گئے ہیں وہ مدینہ میں بھیج دیئے جائیں، آپؓ نے ان سب کو جلوا دیا۔ اور جو سات طرح سے قرآن پڑھنے کی اجازت تھی اس کو موقوف کر دیا، جیسے حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف کر دیا تھا، یہ حضرت عثمانؓ کی سنتیں ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سنت:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمان آپس میں لڑے، پہلی لڑائی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہوئی، اس جنگ میں حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں، اس لئے وہ جنگ جمل کہلاتی ہے، اس جنگ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہاریں، اور قیدی پکڑے گئے، حضرت عائشہ بھی قیدیوں میں تھیں، مالِ غنیمت بھی جمع ہوا، پس حضرت علیؓ کی فوج نے مطالبہ کیا کہ مالِ غنیمت تقسیم کیا جائے، حضرت علیؓ نے تقریر فرمائی، اور فرمایا: اگر مالِ غنیمت

تقسیم ہوگا تو قیدی بھی غلام باندی بنائے جائیں گے، پس تم میں سے کون منحوس ہے جو اپنی ماں حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اپنی باندی بنائے گا؟ بس سناٹا چھا گیا، اور مسئلہ طے ہوگیا کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑیں تو نہ مال: مالِ غنیمت ہوگا، اور نہ قیدی، غلام باندی بنائے جائیں گے۔ یہ حضرت علیؓ کی سنت ہے، اور یہ خلفائے راشدین کے وہ طریقے ہیں جو ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو حدیث شریف کی رو سے اپنانا ضروری ہے۔

حدیث یا سنت کا فیصلہ کون کرے گا؟

بہرحال حجت سنت ہے، حدیث حجت نہیں، اب رہا یہ سوال کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں حدیث سنت ہے، اور فلاں حدیث سنت نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا فیصلہ مجتہدین کریں گے، اور اس میں کبھی اختلاف بھی ہوجاتا ہے۔

مثلاً: تمام فقہاء متفق ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضوء نہیں ٹوٹتی، پس حدیث توضئوا مما مست النار: صرف حدیث ہے، سنت نہیں، اور تمام فقہاء متفق ہیں کہ مجامعت شروع ہوتے ہی غسل واجب ہوجاتا ہے، چاہے فراغت نہ ہوئی ہو، پس حدیث الماء من الماء صرف حدیث ہے، سنت نہیں۔

اور نماز میں رفع یدین کی بھی حدیثیں ہیں اور ترک رفع کی بھی۔ اب بڑے دو امام کہتے ہیں: رفع یدین کی حدیثیں منسوخ ہیں، اس لئے سنت ترک رفع ہے۔ اور دوسرے دو اماموں کا فیصلہ اس کے برعکس ہے، ایسا ہی اختلاف آمین بالجہر کی حدیث میں ہوا ہے۔ دو بڑے امام کہتے ہیں: آپؐ کا جہر حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی تعلیم کے لئے تھا، اس لئے سنت نہیں، اور دوسرے دو امام جہراً آمین کہنے کو سنت قرار دیتے ہیں۔ اور ایسے ہی اختلاف کی صورت میں تقلید کی ضرورت پیش آتی ہے۔

تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں ہے، اور ان میں تقلید کے بغیر چارہ نہیں:

اور ائمہ کی تقلید صرف تین قسم کے مسائل میں کی جاتی ہے، باقی ساری شریعت میں کسی کی تقلید نہیں کی جاتی، اللہ اور اس کے رسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے، اور ان تین قسم کے مسائل

میں تقلید کے علاوہ چارہ نہیں۔ اور وہ تین قسم کے مسائل فقہ کے بیس فیصد مسائل ہیں۔

وہ تین قسم کے مسائل یہ ہیں:

۱- کبھی نص فہمی میں اختلاف ہوجاتا ہے کہ اِس آیت کا اور اِس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ ایک امام کہتا ہے: یہ مطلب ہے، دوسرا کہتا ہے: یہ مطلب ہے، اور زبان کی رو سے دونوں مطلب ہوسکتے ہیں تو تقلید کے علاوہ چارہ نہیں رہتا۔

۲- کبھی ناسخ ومنسوخ متعین کرنے میں اختلاف ہوجاتا ہے، یعنی کونسی روایت مقدم ہے اور کونسی مؤخر: اس میں اختلاف ہوجاتا ہے۔

۳- کبھی مسئلہ استنباطی ہوتا ہے، نص کی تہ میں جاکر مسئلہ لانا ہوتا ہے، اور اس میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ سب کی مثالیں یہ ہیں:

نص فہمی میں اختلاف کی مثالیں:

پہلی مثال: قرآنِ کریم میں ہے: ﴿أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾: یا تم نے عورتوں سے قربت کی ہو۔ اس آیت میں وضوء توڑنے والی چیز کا ذکر ہے یا غسل توڑنے والی چیز کا؟ قرآنِ کریم میں لاَمَسَ: باب مفاعلہ سے ہے، لَمَسَ: مجرد نہیں ہے، لَمَسَ کے معنی ہیں: چھونا، اور لاَمَسَ کے معنی ہیں: دو شخصوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کو چھونا۔

امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس آیت میں موجباتِ غسل کا بیان ہے، لاَمَسَ باب مفاعلہ سے ہے، اور ایک ساتھ مرد عورت کو پکڑے اور عورت مرد کو پکڑے: ایسا کب ہوتا ہے؟ جب آدمی صحبت کرتا ہے اور فراغت کا وقت آتا ہے تو مرد بیوی کو پکڑتا ہے اور بیوی مرد کو، اور دونوں فارغ ہوتے ہیں۔ پس جب انزال ہوگیا تو غسل واجب ہوگیا۔ غرض امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ﴿لاَمَسْتُمُ النِّسَاءَ﴾ میں نواقض غسل کا بیان ہے۔

اور دوسرے تین اماموں کے نزدیک لاَمَسَ: لَمَسَ کے معنی میں ہے اور اس آیت میں نواقض وضوء کا بیان ہے، وہ کہتے ہیں: اگر باوضوء آدمی نے کسی عورت کو ہاتھ لگایا تو وضوء ٹوٹ گئی۔ اور عربی زبان کے قواعد سے دونوں معنی کی گنجائش ہے، ہر ایک کی بات معقول نظر آتی ہے، پس یہ نص فہمی کا اختلاف ہے۔

دوسری مثال: اسی آیت کا اگلا ٹکڑا ہے: ﴿أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ﴾: یا آیا ہو تم میں سے کوئی نشیبی جگہ سے (تو وضوء ٹوٹ جائے گی) اب فقہاء میں اختلاف ہوا، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا: جب آدمی نشیبی جگہ میں جاتا ہے تو انسان کے بدن سے ناپاکی نکلتی ہے، پس سر سے پیر تک کہیں سے بھی ناپاکی نکل کر بہہ جائے: تو وضوء ٹوٹ جائے گی۔ دوراہوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور تین اماموں نے کہا: نشیبی جگہ میں ناپاکی اگلی راہ سے یا دونوں راہوں سے نکلتی ہے، باقی جسم سے نہیں نکلتی، اس لئے انھوں نے طے کیا کہ سبیلین سے ناپاکی نکلے گی تو وضوء ٹوٹے گی، ورنہ نہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک قئی، نکسیر، پھوڑے پھنسی سے پیپ یا خون نکلنے سے وضوء نہیں ٹوٹتی۔

جب ایسا اختلاف ہو جائے تو ہم کیا کریں؟ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے، ایسی صورت میں تقلید کے علاوہ راستہ کیا ہے؟ ہمارے پاس اتنا علم نہیں کہ ہم خود فیصلہ کریں کہ آیت کا یہ مطلب ہے یا وہ۔

تیسری مثال: نبی پاک ﷺ نے فرمایا: صَلَاةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى، فَإِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِرَكْعَةٍ: رات کی نماز (تہجد کی نماز) دو دو، دو دو رکعتیں ہیں، پس جب تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ صبح صادق ہونے والی ہے تو ایک رکعت کے ذریعہ نماز کو طاق بناؤ۔

اس حدیث میں دو مسئلوں میں اختلاف ہوا ہے:

پہلا اختلافی مسئلہ: تہجد کی نماز میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرنا مسئلہ ہے یا یہ تہجد گذاروں کے لئے سہولت ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ تہجد گذاروں کے لئے ایک سہولت ہے، مسئلہ نہیں ہے۔

مسئلہ کیا ہے: مسئلہ اختلافی ہے کہ نفلوں میں دو پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے یا چار پر؟ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کہتے ہیں: خواہ رات کے نفل ہوں یا دن کے (اور سنت مؤکدہ بھی نفل ہیں) دو رکعتوں پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے، اور اگر کوئی ایک سلام سے چار پڑھے تو یہ بھی جائز ہے، البتہ دو رکعت پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے۔

اور امام مالکؒ فرماتے ہیں: رات میں ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھنا جائز ہی نہیں،

اور دن میں اولیٰ یہ ہے کہ دو پر سلام پھیرے، اور چار ایک سلام سے جائز ہیں۔

اور صاحبینؒ نے فرمایا کہ رات میں دو پر سلام پھیرنا اولیٰ ہے، اور دن میں چار نفلیں ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ نے فرمایا: رات کے نفل ہوں یا دن کے: چار ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے، اور دو پر سلام پھیرنا جائز ہے۔

اور امام اعظم کی دو دلیلیں ہیں:

ایک: دن میں بھی فرض نماز چار رکعتوں والی ہے (ظہر اور عصر) اور رات میں بھی فرض نماز چار رکعتوں والی ہے (عشاء) اور فرائض غیر اولیٰ ہیئت پر نہیں ہوسکتے، بہترین حالت پر ہی فرائض ہوتے ہیں۔ پس ایک سلام سے چار نفلیں پڑھنا اولیٰ ہے۔

دوسری دلیل: نبی ﷺ سے دن میں چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا ثابت ہے، حضور ظہر سے پہلے چار سنتیں ہمیشہ ایک سلام سے پڑھتے تھے، اور کبھی عصر سے پہلے بھی چار سنتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے، اور نبی کبھی مسئلہ کی وضاحت کے لئے تو غیر اولیٰ کام کرسکتا ہے، جیسے آپؐ نے ایک مرتبہ کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا، مگر نبی بالدوام یا بالاکثر غیر اولیٰ کام نہیں کرتا، اور حضورؐ نے دن میں چار سنتیں ہمیشہ یا اکثر ایک سلام سے پڑھی ہیں، اس لئے یہی افضل ہے، اور رات کے نفلوں کو دن کے نفلوں پر قیاس کریں گے، پس رات میں بھی چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور حضورؐ نے جو فرمایا ہے: صلاۃُ اللیل مثنیٰ مثنیٰ: امام اعظم رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ مسئلہ نہیں ہے، مصلحت ہے، یہ تہجد گذاروں کے لئے ایک سہولت ہے۔

صحابہ تہجد کی نماز بہت لمبی پڑھتے تھے، پس اگر چار کی نیت باندھیں گے تو تھک جائیں گے، اس لئے فرمایا: دو کی نیت باندھو اور لمبی پڑھو، پھر سلام پھیر کر ذرا ٹانگیں سیدھی کرو، اور ستالو، پھر اگلی دو کی نیت باندھو۔ اس طرح اگر کوئی رات بھر بھی نفلیں پڑھتا رہے تو تھکے گا نہیں۔

بہرحال حدیث کے پہلے ٹکڑے میں اختلاف ہوا ہے، امام اعظم کی رائے اور ہے، اور

صاحبین کی اور، اور دیگر ائمہ کی اور۔ اور سب حضرات اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں، پس ایسی صورت میں تقلید کے علاوہ راستہ کیا ہے؟

دوسرا اختلافی مسئلہ: حدیث کا اگلا ٹکڑا ہے: إِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِرَكْعَةٍ: جب تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ اب صبح ہونے والی ہے تو ایک رکعت کے ذریعہ نماز کو طاق بناؤ۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ تین امام کہتے ہیں: اب دو رکعتوں پر سلام پھیر دو، اور ایک رکعت علاحدہ پڑھو، ایک رکعت کے ذریعہ طاق بنانے کا یہی مطلب ہے، چنانچہ ان کے نزدیک دو پر سلام پھیرتے ہیں، اور ایک رکعت الگ سلام سے پڑھتے ہیں۔

اور احناف کہتے ہیں: اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں صبح کا اندیشہ لاحق ہو تو اب دو کی نیت مت باندھو، بلکہ تین کی نیت باندھو، اور دو کے ساتھ تیسری رکعت بھی ملاؤ، یہ آخری تین رکعتیں طاق ہوگئیں، اِس سے پہلے والی سب رکعتیں جفت تھیں۔

اور حنفیہ کے نزدیک اس حدیث کا یہ مطلب اس لئے ہے کہ نسائی شریف میں سند صحیح سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی ﷺ وتروں کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے[1] اس حدیث کی روشنی میں حنفیہ نے مذکورہ بالا حدیث کا مطلب سمجھا ہے۔

احناف کے نزدیک أوتر برکعة: ایک رکعت کے ذریعہ نماز طاق بناؤ کا یہی مطلب ہے کہ اس سے پہلے والی دو رکعتوں کو طاق بناؤ، غرض یہی حدیث حنفیہ کی بھی دلیل ہے اور تین اماموں کی بھی، اور اختلاف نص فہمی کا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے: جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے۔

روایات میں بھی اختلاف اور تطبیق میں بھی اختلاف:

دوسری قسم کے مسائل: کبھی روایات میں بھی تعارض ہوتا ہے، اور ان کی تطبیق میں بھی اختلاف ہوجاتا ہے، یعنی ناسخ ومنسوخ کی تعیین میں اختلاف ہوجاتا ہے، جیسے حدیث کی کتابوں میں رفع یدین کی روایات بھی ہیں اور عدم رفع کی بھی، یہ دونوں روایتیں ایک زمانہ کی نہیں ہوسکتیں۔ اب ان میں سے کونسی دورِ اول کی ہیں اور کونسی دور مابعد کی؟ یہ طے کرنے

میں ائمہ میں اختلاف ہوگیا، بڑے دو امام کہتے ہیں: رفع والی روایتیں دورِ اول کی ہیں، اور عدم رفع والی روایتیں بعد کی ہیں، اور چھوٹے دو امام کہتے ہیں: عدم رفع والی روایتیں دورِ اول کی ہیں اور رفع والی بعد کی۔ غرض ناسخ ومنسوخ طے کرنے میں اختلاف ہوگیا، پس ہم کیا کریں؟ یہی کہ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی تقلید کرے۔

اور بڑے دو اماموں کی دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین نے رفع یدین نہیں کیا۔ اگر رفع یدین نبی ﷺ کا آخری عمل ہوتا تو چاروں خلفاء رفع ضرور کرتے، ایسا ممکن نہیں کہ خلفاء آپؐ کے مصلیٰ پر کھڑے ہوتے ہی آپؐ کا عمل بدل دیں۔

استنباطی مسائل میں اختلاف:

تیسری قسم کے مسائل: استنباطی مسائل ہیں۔ موتی دریا کی تہ میں ہوتے ہیں، اوپر نہیں تیرتے، اور موتی ہر کوئی نہیں نکال سکتا، غواص (غوطہ خور) ہی نکال سکتا ہے۔ ایسے ہی استنباطی مسائل ہیں: جو قرآن وحدیث کی ظاہری سطح پر نہیں ہیں، بلکہ تہ میں ہیں: ان کو کون نکالے گا؟ مجتہدین امت نکالیں گے، مگر ان میں کبھی اختلاف ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں تقلید (پیروی) کے علاوہ راستہ کیا ہے؟ میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں:

آیتِ وضوء میں پانچ استنباطی مسائل اور ان میں اختلاف

قرآنِ کریم میں آیتِ وضوء ہے، اس آیت میں وضوء کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے: دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح وضوء کرتے ہیں، لیکن اس آیت میں پانچ استنباطی مسائل ہیں، جن میں اختلاف ہوا ہے:

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ وضوء میں نیت ضروری ہے یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ضروری ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک: ضروری نہیں، اور اس کی صرف نادر صورت ہے: ایک آدمی کھیت میں ہل چلا رہا تھا، بارش شروع ہوگئی اور وہ سر سے پیر تک بھیگ گیا، اب نماز کا وقت آگیا، تو کیا نماز پڑھنے کے لئے اُس کو وضوء کرنی پڑے گی یا وہ جو بھیگا ہے اس سے وضوء ہوگئی؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے وضوء نہیں ہوئی، اس لئے کہ اس نے نیت نہیں کی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں: اس کی وضوء ہوگئی۔

یا ایک آدمی جنبی تھا اور تالاب پر کھڑا تھا، اس کا دوست آیا اور دھکا دیدیا، وہ تالاب میں گر پڑا اور ڈوب کر نکل آیا، پس کیا اس کا غسل ہوگیا؟ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: نہیں ہوا، کیونکہ اس نے غسل کی نیت نہیں کی، اور دوسرے ائمہ کہتے ہیں: غسل ہوگیا۔ یہ مسئلہ آیت کے ظاہر میں نہیں ہے، یہ استنباطی مسئلہ ہے، اور اس میں اختلاف ہوا ہے، پس ہم کیا کریں؟ یہی نا کہ جس کو جس امام سے عقیدت ہو اس کی پیروی کرے۔

دوسرا مسئلہ: آیت میں وضوء کی جو ترتیب ہے وہ لازم ہے یا غیر لازم؟ یعنی اسی ترتیب سے وضوء کرنی ضروری ہے یا نہیں؟ ایک آدمی کھیت سے آیا، اس نے پہلے مٹی سے آلودہ پیر دھوئے، پھر چہرہ دھویا، پھر ہاتھ دھوئے اور مسح کیا، تو وضوء ہوئی یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وضوء نہیں ہوئی، کیونکہ وضوء میں ترتیب ضروری ہے، دوسرے ائمہ کہتے ہیں: وضوء ہوگئی، ترتیب سنت ہے، ضروری نہیں، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں جو واو ہے وہ ترتیب کے لئے ہے یا مطلق جمع کے لئے؟ اس میں اختلاف ہوا ہے، اور یہ استنباطی مسئلہ ہے، اس میں تقلید کے علاوہ چارہ کیا ہے؟

تیسرا مسئلہ: آیت وضوء میں إلى المرافق اور إلى الكعبين ہے، یعنی ہاتھوں کو کہنیوں تک اور پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ، اس ''تک'' کا کیا مطلب ہے؟ کہنیاں دھونی ہیں یا نہیں؟ ٹخنے دھونے ہیں یا نہیں؟ امام زفر رحمہ اللہ کہتے ہیں: نہیں ہونے، غایت: مغیا سے خارج ہے۔ باقی ائمہ کہتے ہیں: دھونے ہیں، غایت: مغیا میں داخل ہے۔ غرض إلى کے معنی متعین کرنے میں اختلاف ہوگیا۔

چوتھا مسئلہ: وضوء میں موالات شرط ہے یا نہیں؟ موالات کے معنی ہیں: ایک عضو خشک ہونے سے پہلے دوسرا عضو دھونا۔ کسی نے ایک عضو دھویا، پھر کسی سے باتیں کرنے لگا، اور دھویا ہوا عضو خشک ہوگیا، پھر اگلا عضو دھویا تو وضوء ہوئی یا نہیں؟ امام مالکؒ کہتے ہیں: وضوء نہیں ہوئی، موالات شرط ہے۔ باقی ائمہ کہتے ہیں: وضوء ہوگئی۔

پانچواں مسئلہ: وضوء میں پیر دھونے ہیں یا ان پر مسح کرنا ہے؟ شیعہ کہتے ہیں: پیروں پر مسح کرنا ہے، اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: پیر دھونے ہیں، اگر ان پر خفین نہ ہوں۔

شیعہ آیت کی جر والی قراءت سے استدلال کرتے ہیں، اور اہل السنہ فتح والی قراءت سے۔

میں یہ مثالیں اس کی دے رہا ہوں کہ جو استنباطی مسائل ہیں، جو نص کی تہ میں ہیں، ان مسائل میں غواصوں (ائمہ مجتہدین) کے درمیان اختلاف ہوئے ہیں، پس یہ تین قسم کے مسائل ہیں: ۱- نص فہمی کا اختلاف ۲- جہاں روایات میں تعارض ہو اور تطبیق میں بھی اختلاف ہو ۳- استنباطی مسائل، جن کے استنباط میں اختلاف ہوجائے تو ان تین قسم کے مسائل میں تقلید کرنی ضروری ہے، ان میں تقلید کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، اور یہ مسائل فقہ اسلامی کا بیس فیصد حصہ ہیں، باقی اسّی فیصد مسائل وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں صراحۃً آئے ہیں، ان میں کسی امام کی تقلید نہیں، ان میں اللہ ورسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام: میں نے خطبہ میں آیت پڑھی تھی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾: آپ کہئے: یہ میرا راستہ ہے۔ اسی راستہ کا نام سنت ہے، اور مشہور حدیث ہے کہ یہود کے اکہتر فرقے ہوئے، جو سب جہنم میں جائیں گے، اور عیسائیوں کے بہتر فرقے ہوئے، وہ بھی سب جہنم میں جائیں گے، اور میری امت کے تہتر فرقے ہوں گے، جن میں سے بہتر فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنت میں جائے گا، صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! وہ ایک فرقہ جو جنت میں جائے گا: کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ: وہ ایک فرقہ وہ ہے جو اس طریقہ پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ یہیں سے چار ائمہ کے متبعین کے لئے نام تجویز کیا گیا: اہل السنہ والجماعۃ: سنتِ نبوی اور جماعت مسلمین کے فیصلوں (اجماع) کو ماننے والے، جس راہ پر حضور ہیں اس کا نام سنت ہے، اور جس راہ پر صحابہ ہیں وہ جماعت مسلمین کے اجماعی مسائل ہیں۔

حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں:

حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ أُمَّتِيْ فَلَهٗ أَجْرُ كَذَا: جب امت میں بگاڑ آجائے: اس وقت جو میرے طریقے سے چمٹا رہے گا اس کو اتنا ثواب ملے گا۔ اور مشکوٰۃ میں باب ہے: باب الاعتصام بالكتاب والسنة: اس باب میں چھ روایتیں ہیں، سب میں سنت ہی کا لفظ ہے۔ اس لئے چار ائمہ کے ماننے والوں کا

مشترک نام: اہل السنہ والجماعۃ ہے۔ اور وہ جو چار ہوگئے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جیسے دیوبند، سہارن پور اور لکھنؤ سے فارغ ہونے والے طلبہ اگرچہ قاسمی، مظاہری اور ندوی کہلاتے ہیں، مگر وہ سب دیوبندی ہیں، اسی طرح حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اگرچہ جدا جدا نام ہیں، مگر وہ سب اہل السنہ والجماعۃ ہیں، اور ان کے درمیان جو اختلافات ہیں: وہ مسائل میں ہیں، اصول وعقائد میں کوئی اختلاف نہیں، اور مسائل کے اختلاف سے فرقے نہیں بنتے، فرقے عقائد میں اختلاف سے بنتے ہیں، اور وہ جو تہتر فرقوں والی حدیث ہے اس کا تعلق عقائد سے ہے، مسائل سے نہیں ہے۔ جب اصول وعقائد الگ ہوجاتے ہیں تو فرقوں کے نام الگ ہوجاتے ہیں، کوئی اہل حدیث کہلاتا ہے، کوئی اہل قرآن۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حدیث اور سنت ایک چیز ہے: وہ دھوکہ ہے۔ میرے بھائیو! اس دھوکہ میں مت آؤ، اہل قرآن بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں۔ یہ سب گمراہ فرقے ہیں، اور سنت اور حدیث ایک چیز نہیں ہیں، بلکہ ان میں وہ فرق ہے جو میں نے گوش گذار کیا، اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔

آپ کے ملک میں کچھ لوگ فتنہ پرداز ہیں، وہ آکر نوجوانوں کو پریشان کرتے ہیں اور کہتے ہیں: یہ حدیث ہے، یہ بخاری کی حدیث ہے، نوجوان پریشان ہوجاتے ہیں کہ اب ہم کیا کریں؟ اس لئے میں نے فرق سمجھایا کہ حدیث اور ہے اور سنت اور۔ اور سنت کو مضبوط پکڑنے کا حکم ہے، حدیث کو نہیں، وہ لوگ اہل حدیث ہوں تو ہوتے رہیں، ہم اہل السنہ والجماعۃ ہیں، پس ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

اجماع بھی حجت شرعیہ ہے!

اور اجماع بھی حجتِ شرعیہ ہے، اور اس کا استناد قرآن سے ثابت ہے، سورۃ النساء کی (آیت ۱۱۵) ہے کہ جو مسلمانوں کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر ہولیا: وہ جہنم رسید ہوگا۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی آیت سے اجماع کی حجیت پر استدلال کیا ہے، اس لئے اہل حق کے نام کا دوسرا جزء والجماعۃ ہے۔

ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا!

اور اہل حدیث (غیر مقلدین) اجماع کی حجیت کے قائل نہیں، عرف الجادی کے مقدمہ میں اس پر بحث ہے، مگر وہ صاف انکار نہیں کر سکتے، مسلمان ان کے منہ پر تھوکیں گے، اس لئے کہتے ہیں: ہم قطعی اجماع کو مانتے ہیں، ظنی اجماع کو نہیں مانتے!

تو کیا اجماع کا تذکرہ قرآنِ کریم میں ہوگا؟ قطعی ہونے کی اس کے علاوہ کیا صورت ہے؟ یا تواتر سے منقول ہوگا، درانحالیکہ کوئی حدیث متواتر ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، پھر جب خبر واحد جو مفید ظن ہے: حجت ہے تو اجماع جو اسی طرح مروی ہو: حجت کیوں نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا!

قیاس محض آلۂ استنباط ہے:

رہا قیاس تو وہ حجت بایں معنی ہے کہ وہ آلۂ استنباط ہے، وہ ایک ڈوئی ہے جس کے ذریعہ ڈیگوں سے کھانا نکالا جاتا ہے، اور ڈیگیں: قرآن، سنت اور اجماع امت ہیں۔ قیاس خود کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ آلۂ استنباط مسائل ہے، پس اگر قیاس معتبر نہیں تو یہ تین ڈیگیں بھی معتبر نہیں، ہاں وہ قیاس جس کا کوئی شرعی استناد نہ ہو: وہ حجت نہیں، وہ ابلیس کا قیاس ہے۔

آخری چیلنج!

اب آخر میں ایک چیلنج دیتا ہوں، اور قیامت کی صبح تک دیتا ہوں کہ کوئی ایسی حدیث لاؤ، چاہے وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو کہ نبی ﷺ نے حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ حدیثیں یاد کرنے کے اور ان کو روایت کرنے کے فضائل آئے ہیں، مگر ایسی ایک حدیث بھی نہیں ہے: جس میں حدیث کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہو۔ تمام حدیثوں میں سنت ہی کو مضبوط پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ **وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمین۔**

۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصلی سلفی اور آج کے سلفی

(یہ تقریر شوال ۱۴۳۰ھ میں ٹورنٹو (کناڈا) کی مسجد دار السلام میں کی گئی ہے)

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ، وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ، وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدہ ۳]

ترجمہ: آج کے دن (۱۰ھ میں عرفہ کے دن) میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا (قوت اور قواعد و احکام میں) اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کردیا، اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کرلیا یعنی اب قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا، اب اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہیں کیا جائے گا۔

دین کے دو حصے: عقائد اور اعمال

بزرگو اور بھائیو! جیسا کہ آپ جانتے ہیں: اللہ نے جو دین نازل فرمایا ہے اس کے دو حصے ہیں: عقائد اور اعمال، عام طور پر عقائد کو دین اور اعمال کو شریعت کہتے ہیں۔ اور آیتِ پاک میں یہی عام معنی مراد ہیں، مگر دونوں میں بڑا فرق ہے، اور وہ یہ ہے کہ دین بمعنی عقائد آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النّبیین ﷺ تک ایک رہا ہے، اور جب اب تک ایک رہا ہے تو قیامت تک آپ ؐ کے بعد بھی ایک ہی رہے گا، البتہ گذشتہ نبیوں کے زمانوں میں لوگوں نے دین میں اختلاف کیا اور اختلاف کرتے کرتے لوگ انبیاء کے دین سے بالکل ہٹ گئے، مگر نبی پاک ﷺ کے بعد اگرچہ عقائد میں اختلاف ہوگا، مگر امت مکمل دین سے ہٹ جائے ایسا نہیں ہوگا، قیامت تک امت میں مسلسل ایک طائفہ موجود رہے گا جو دین

حق پر برقرار رہے گا، ان کی مخالفت کرنے والے خواہ کتنی ہی مخالفت کریں ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچاسکیں گے۔ یہ مضمون ایک حدیث میں آیا ہے: لا تَزَالُ طائفةٌ من أمتي ظَاهِرِيْنَ على الحق، لاَيَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ:

پس پچھلی امتوں میں اور اس امت میں یہ فرق ہے کہ پچھلی امتیں اپنے انبیاء کے دین وعقائد سے ہٹیں اور مکمل طور پر ہٹ گئیں، ایک گروہ بھی صحیح عقیدہ پر باقی نہ رہا، اس وقت اللہ تعالیٰ دوسرا نبی مبعوث فرماتے تھے اور وہ ان کو صحیح دین وعقائد پر لاتا تھا، لیکن نبی پاک ﷺ آخری نبی ہیں، اب اگر تمام انسان عقائد حقہ سے ہٹ جائیں تو دنیا میں اندھیرا چھا جائے، اور روشنی دکھانے کے لئے کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، اس لئے اللہ نے اس کا انتظام یہ کیا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد بھی اگرچہ عقائد میں اختلاف ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوگا کہ پوری امت غلط عقائد پر پڑ جائے، بلکہ قیامت تک ایک جماعت صحیح عقائد پر رہے گی۔

البتہ شریعتوں (احکام) کا حال مختلف ہے، آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک نبیوں کی شریعتیں مختلف رہی ہیں، شریعت: اعمال کا نام ہے اور اعمال میں اختلاف رہا ہے، ایک نبی کی شریعت میں کچھ احکام ہوتے تھے، دوسرے نبی کی شریعت میں وہ منسوخ کئے جاتے تھے، اور دوسرے احکام آتے تھے، پس نبی پاک ﷺ کے بعد بھی احکام میں اختلاف ہوگا لیکن اس اختلاف میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ اختلاف تو شریعتوں میں بھی رہا ہے اور جب شریعتوں میں اختلاف رہا ہے تو حضورؐ کی امت میں بھی اعمال میں اختلاف ہوگا اور یہ اعمال میں اختلاف کوئی اہم بات نہیں، لیکن دین بمعنی عقائد میں اختلاف برداشت نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ دین آدمؑ سے آخری نبیؐ تک ایک ہی رہا ہے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف صرف ایک فیصد رہا ہے، قوموں کے مزاج اور زمانوں کے تقاضوں کا لحاظ کر کے کچھ احکام علاحدہ دیئے جاتے تھے۔

اور اس کی نظیر: ہماری شریعت میں مردوں اور عورتوں کے احکام کا اختلاف ہے، یہ اختلاف بھی ایک فیصد ہے، دین دونوں کے لئے ایک ہے، جو عقائد مردوں کے لئے ہیں: وہی عورتوں کے لئے بھی ہیں، اور جو احکام نوعی ہیں: وہ بھی یکساں ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج

وغیرہ دونوں کے لئے ضروری ہیں، البتہ صنفی احکام عورتوں کے لئے علاحدہ ہیں، ان کو ماہواری آتی ہے، ان کا بدن پر کشش بنایا گیا ہے، مردوں کو یہ عارضہ پیش نہیں آتا، اور نہ ان کا بدن پر کشش ہے، اس لئے حیض وغیرہ کے احکام عورتوں کے لئے ہیں، اور حجاب (پردہ) کا حکم بھی انہی کے لئے ہے۔ اور احکام کا یہ اختلاف ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔

عقائد میں اختلاف صحابہ کے بعد ہوا:

اس امت کا پہلا قافلہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا، ان کے زمانہ تک عقائد میں اختلاف نہیں ہوا، یہ اختلاف تابعین کے زمانہ سے شروع ہوا۔ اور اعمال میں اختلاف صحابہ کے زمانہ میں بھی ہوا ہے، نہ صرف صحابہ کے زمانہ میں بلکہ حضورؐ کی حیات میں صحابہ میں اختلاف ہوا ہے، مشہور واقعہ ہے: غزوۂ احزاب میں بنوقریظہ نے غداری کی تھی، نبی پاک ﷺ نے غزوۂ احزاب سے فارغ ہونے کے بعد صحابہ کو حکم دیا کہ فوراً تیاری کرو اور بنوقریظہ پر چڑھائی کرو اور عصر کی نماز وہاں جا کر پڑھو، چنانچہ صحابہ نے ضروری سامان لیا اور بنوقریظہ کی طرف روانہ ہو گئے، راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو صحابہ میں اختلاف ہوا، بعض نے کہا: ہمیں حضورؐ نے حکم دیا ہے کہ عصر کی نماز بنوقریظہ میں جا کر پڑھو، لہٰذا ہم عصر کی نماز وہیں پڑھیں گے، اور بعض نے کہا: حضور کے حکم کا منشا یہ تھا کہ فوراً بنوقریظہ پہنچو، عصر کی نماز قضا کرو: یہ حضورؐ کا منشا نہیں تھا، چنانچہ آدھوں نے عصر کی نماز پڑھی اور آدھوں نے نہیں پڑھی، پھر آگے چلے: مغرب کا وقت ہوا تو سب نے مغرب پڑھی، کیونکہ حضورؐ نے مغرب کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا تھا، پھر عشاء کے وقت لشکر بنوقریظہ پہنچا، وہاں جا کر جنھوں نے عصر نہیں پڑھی تھی انھوں نے عصر پڑھی، پھر سب نے عشاء پڑھی۔ نبی پاک ﷺ دوسرے دن صبح پہنچے، حضورؐ سے یہ واقعہ ذکر کیا گیا، حضورؐ نے دونوں جماعتوں میں سے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

اور حدیث ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، ہم تقدیر کے مسئلہ میں جھگڑ رہے تھے، پس آپؐ اس حد تک غضبناک ہوئے کہ رخ انور سرخ ہو گیا، گویا آپؐ کے دونوں رخساروں میں انار نچوڑ دیئے گئے ہیں، پس آپؐ نے فرمایا: ”کیا تمہیں اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ اور کیا میں اسی کے ساتھ تمہاری طرف بھیجا

گیا ہوں؟ وہ لوگ جو تم سے پہلے ہوئے وہ اسی وقت ہلاک ہوئے: جب انھوں نے اس معاملہ میں جھگڑا شروع کیا، میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ تقدیر میں مت جھگڑو“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگلے لوگوں نے جب تقدیر میں بحث و تکرار شروع کی تو ان میں فکری گمراہی رونما ہوئی، اور وہ جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے، یہی معاملہ دیگر عقائد کا ہے، جب ان میں نزاع شروع ہوگا تو ضرور کچھ لوگ صراطِ مستقیم سے ہٹ جائیں گے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی پاک ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کے درمیان احکام میں اختلاف ہوا ہے، لیکن عقائد میں اختلاف صحابہ کے زمانہ میں نہیں ہوا، عقائد کا اختلاف تابعین کے زمانہ سے شروع ہوا۔

صحابہ کے بعد اختلاف کی وجوہ:

اور وہ جو تہتر فرقوں والی حدیث ہے اس حدیث کے شروع میں حضورؐ نے سین استعمال کیا ہے۔ ستفترق امتی: عنقریب میری امت میں اختلاف ہوگا، اس سین میں اشارہ ہے کہ صحابہ کے زمانہ تک یہ اختلاف نہیں ہوگا، اس کے بعد یہ اختلاف ہوگا۔

اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی پہلی وجہ: یہ ہے کہ صحابہ حضورؐ کے شاگرد تھے، تبع تابعین: تابعین کے شاگرد تھے اور استاذ سے جتنا بُعد ہوتا جاتا ہے اثر کمزور پڑتا جاتا ہے، جیسے صحن میں کھڑے ہوئے شخص پر دھوپ براہ راست پڑتی ہے اور دھوپ میں کھڑے ہو کر، آئینے سے اس مسجد میں فوکس (عکس) ڈالیں اور دھوپ یہاں آئے تو دونوں دھوپوں میں بڑا فرق ہوگا، کیونکہ وہاں سورج کی دھوپ براہ راست آ رہی ہے اور یہاں بالواسطہ دھوپ آ رہی ہے، اس لئے اس میں کمزوری ہوگی، یا جیسے سورج نکل کر اپنی روشنی زمین پر براہِ راست ڈالتا ہے اور چاند پر بھی ڈالتا ہے، پھر چاند زمین پر روشنی ڈالتا ہے تو دونوں روشنیوں میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ صحابہ کی خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ ان کے معلم حضورؐ تھے، پھر آگے کمزوری آئی، کیونکہ معلم اول سے دوری ہوگئی اور معلم اول سے جتنی دوری ہوتی جائے گی فتنے شروع ہونگے۔ اسی لئے حدیثوں میں قیامت کے قریب فتنوں کی خبریں دی گئی ہیں، کیونکہ معلم

اول سے زمانہ دور ہو جائے گا۔

اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ کی بعثت دوہری ہے: آپؐ براہ راست کام کے اعتبار سے امیوں کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے، اور باقی دنیا کی طرف کام کے اعتبار سے صحابہ کے واسطے سے مبعوث فرمائے گئے تھے، اس طرح صحابہ بھی نیابۃً مبعوث ہیں، اور انھوں نے ہی آپؐ کے بعد ساری دنیا تک دین پہنچایا ہے، اس لئے جس طرح آپؐ معصوم ہیں: صحابہ محفوظ ہیں۔ اور عملی خرابی سے بڑی عقیدوں کی خرابی ہے، چنانچہ اللہ نے دونوں قسم کی خرابیوں سے صحابہ کی حفاظت فرمائی، یہ بہت تفصیل طلب مضمون ہے۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں مبحث سادس کے دوسرے باب میں یہ مضمون تفصیل سے بیان کیا ہے، اور میں نے رحمۃ اللہ الواسعہ کی دوسری جلد میں اس کی مفصل شرح کی ہے۔

قرونِ ثلاثہ زمانہ کے عرض میں ایک ساتھ ہیں:

صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور چوتھا دور زمانہ کے طول میں بھی ہیں اور چوڑائی میں بھی، زمانہ کی لمبائی کو تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ صحابہ کا دور ختم ہوا تو تابعین کا دور شروع ہوا، وہ ختم ہوا تو تبع تابعین کا دور شروع ہوا۔ اور زمانہ کی چوڑائی میں بھی یہ تینوں دور ساتھ ساتھ چلتے ہیں، کیونکہ صحابی وہ ہے جس نے حالتِ ایمان میں نبی پاک ﷺ کی زیارت کی ہے، اور ایمان ہی پر اس کی وفات ہوئی ہے، اور حضورؐ کے زمانے میں سارے جزیرۃ العرب میں اسلام پھیل گیا تھا، مگر جتنے لوگ مسلمان ہوئے تھے: سب نے حضورؐ کی زیارت نہیں کی تھی، جس کی قسمت میں یہ سعادت لکھی تھی اسی نے حضورؐ کی زیارت کی تھی، پھر مدینہ سے کوئی صحابی مثال کے طور پر سفر کرتے ہوئے کسی قبیلہ کے پاس سے گذرے یا زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے یا گورنر بن کر کسی قبیلہ میں گئے تو وہاں کے مسلمانوں نے صحابی کو دیکھا، پس وہ تابعی ہوگئے، یہ تابعی بھی حضور کے زمانہ میں موجود تھے، اور حضورؐ کے زمانہ میں بعض مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے کسی صحابی کو بھی نہیں دیکھا تھا، بلکہ ان لوگوں کو دیکھا تھا جنھوں نے کسی صحابی کو دیکھا ہے، پس یہ تبع تابعین ہوئے، پھر ایسے بھی مسلمان تھے جنھوں نے کبھی کسی تابعی کو بھی نہیں دیکھا

تھا، بلکہ تبع تابعین کو دیکھا تھا تو ان کا شمار چوتھے قرن میں ہوگا، کیونکہ حضورؐ نے تین ہی درجے قائم فرمائے ہیں: **خیر الناس قرنی، ثم الذین یَلُوْنَهُمْ، ثم الذین یلونهم**: بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر اس سے متصل زمانہ ہے، اور یہ متصل ہونا لمبائی بھی ہے اور چوڑائی میں بھی۔ پھر وہ لوگ ہیں جو ان سے متصل ہیں پس صحابہ، تابعین اور تبع تابعین خیر القرون ہیں اور چوتھے قرن کے لئے کوئی فضیلت نہیں۔

دو مکتبِ فکر: حجازی اور عراقی:

اور یہ تو آپ جان چکے ہیں کہ امت میں صحابہ کے زمانہ سے مسائل میں اختلاف چلا آرہا ہے، مگر ان کے زمانہ میں فقہی مکاتب فکر وجود میں نہیں آئے تھے، سب سے پہلی تقسیم جو امت میں ہوئی وہ یہ ہے کہ امت دو حصوں میں منقسم ہوئی، ایک: حجازی مکتبِ فکر وجود میں آیا اور دوسرا: عراقی مکتبِ فکر، اور اس تقسیم کی وجہ یہ ہوئی کہ حضورؐ کے بعد جو چار خلفاء ہوئے ہیں ان میں سے تین مدینہ میں رہے ہیں، اس وقت تمام علماء مدینہ میں اکٹھا تھے، پھر جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو وہ خلافت کو لے کر کوفہ (عراق) چلے گئے اور ان سے پہلے وہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھیج چکے تھے، اس لئے ان کے شاگرد وہاں پہلے سے موجود تھے، اب جب خلافت یہاں آئی تو سارے علماء اِدھر آگئے، اس طرح قدرتی طور پر دو مکتب فکر بن گئے، ایک: حجازی مکتب فکر: جو تین خلفاء اور ان کے زمانہ کے علماء سے بنا، اور ایک عراقی مکتب فکر: جو حضرت ابن مسعود، حضرت علی اور ان کے شاگردوں سے بنا، سب سے پہلی تقسیم امت میں یہی ہوئی ہے، اس سے پہلے مکاتب فکر کا اختلاف نہیں تھا، پوری امت ایک تھی اور جس کو کوئی مسئلہ پیش آتا: وہ جو بھی عالم ملتا اس سے پوچھ لیتا تھا، لیکن جب امت دو مکتب فکر میں بٹ گئی تو آہستہ آہستہ ایسا ہونے لگا کہ حجازی مکتب فکر کا جو ذہن رکھتے تھے وہ اپنے مکتبِ فکر کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے تھے، عراقی مکتب فکر کے عالم سے مسئلہ نہیں پوچھتے تھے، اور جو عراقی مکتب فکر کا ذہن رکھتے تھے وہ اپنے مکتب فکر کے عالم ہی سے مسئلہ پوچھتے تھے، دوسرے سے نہیں پوچھتے تھے، جیسے آج کل حنفی: حنفی عالم ہی سے مسئلہ پوچھتا ہے، شافعی، مالکی، حنبلی سے نہیں پوچھتا، اور شافعی: شافعی عالم ہی سے پوچھتا ہے، دوسروں سے نہیں

پوچھتا، کیونکہ اب چار مکاتبِ فکر الگ الگ ہوگئے ہیں، اور جب یہ الگ الگ ہوگئے تو یہ قدرتی بات ہے کہ آدمی اپنے مکتبِ فکر ہی کے علماء سے مسئلہ پوچھے گا۔ بہر حال امت میں سب سے پہلے یہ دو مکتبِ فکر وجود میں آئے، اور یہ تابعین کے زمانہ کی بات ہے۔

دونوں مکاتبِ فکر کا اصلی اور ذیلی کام:

حجازی مکتبِ فکر کا اصل کام حدیثیں روایت کرنا تھا اور وہ مسائل جو حدیث میں نہیں ہیں ان کے بارے میں اگر کوئی سوال کرتا تو وہ اس کے بھی جواب دیتے تھے، کیونکہ وہ مجتہد بھی تھے، آج اُس دور کی کتاب موطا مالک موجود ہے، اس میں ایک چوتھائی حدیثیں ہیں اور تین چوتھائی امام مالک کے اقوال ہیں، پس اصل کام ان کا حدیثیں روایت کرنا تھا اس لئے وہ محدثین فقہاء کہلائے۔ وہ درحقیقت محدث ہیں مگر مجتہد بھی ہیں، جو مسائل قرآن وحدیث میں صراحۃً نہیں ہیں ان کے بھی جواب دیتے ہیں۔

اور عراقی مکتبِ فکر کا اصل کام فقہ پر محنت کرنا تھا، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے جو خلافت مدینہ سے نکل کر عراق میں چلی گئی تھی وہ واپس نہیں آئی اور یہ قدرتی بات ہے کہ گورنمنٹ کو حدیثوں سے زیادہ پیش آمدہ معاملات میں احکامِ شرعیہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس مکتبِ فکر کے علماء کی اصل محنت مسائل پر ہوتی رہی، مگر مسائل کے لئے قرآن وحدیث کو جاننا ضروری ہے، ان کے بغیر مسائل کیسے نکلیں گے، پس وہ قرآن وحدیث بھی جانتے تھے مگر محنت ان کی مسائل پر ہوتی تھی، اس لئے وہ فقہاء محدثین کہلائے یعنی وہ درحقیقت فقہاء تھے، مگر محدث بھی تھے، کیونکہ قرآن وحدیث کے بغیر مسائل نہیں نکل سکتے۔

پھر مسائل طے کرنے میں فقہاء اتنے آگے بڑھ گئے کہ وہ زمانہ سے پانچ سو سال آگے سوچنے لگے کہ اگر یہ صورت پیش آئے تو یہ حکم ہے اور یہ صورت پیش آئے تو یہ حکم ہے، امام محمد رحمہ اللہ کی مبسوط میں ایسے فرضی سوالات، أَرَأَیْتَ (بتلایئے) کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں، ابھی صورتِ مسئلہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی کہ انھوں نے فرض کرلی اور اس کے احکام بیان کردیئے، تاکہ جب وہ صورت پیش آئے تو اس کے احکام پہلے سے معلوم ہوں، اسی لئے لوگوں نے ان کا نام: أَرَأَیْتِیُّوْن: رکھ دیا۔

اور حجازی مکتبِ فکر والے اس کو ناپسند کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، احکام کیوں بیان کرتے ہو؟ مگر فقہاء کے لئے ضروری تھا، وہ گورنمنٹ کی ضرورت سے کام کررہے تھے، پس جو بھی نیا واقعہ پیش آئے: گورنمنٹ کے پاس اس کا حل پہلے سے موجود ہونا چاہئے تھا، یوں وہ محدثین فقہاء بن گئے اور یہ فقہاء محدثین بن گئے۔

چار مکاتبِ فکر کیسے وجود میں آئے؟

اور یہ سلسلہ پیچھے سے چلا آرہا تھا لیکن پھر ایک وقت آیا کہ حجازی مکتبِ فکر میں رمزی نام امام مالک کا استعمال ہونے لگا اور وہ اس جماعت کے سرخیل بن گئے، پھر امام مالک کے شاگرد امام شافعی رحمہ اللہ آئے، پھر امام شافعی کے شاگرد امام احمد رحمہ اللہ آئے، اور تینوں میں مسائل میں اختلافات ہوئے، اس لئے حجازی مکتبِ فکر تقسیم ہوکر تین مکاتبِ فکر بن گیا، اور عراق میں جو مکتبِ فکر چلا آرہا تھا، اس سلسلہ میں آگے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ آئے، اس لئے رمزی نام ان کا استعمال ہوا، عراق میں اور بھی مجتہدین پیدا ہوئے ہیں، مگر یہ مکتبِ فکر تقسیم نہیں ہوا، امام اعظم کے دو شاگرد: امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ بہت بڑے مجتہد تھے، اتنے بڑے مجتہد کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ مکہ میں پیدا ہوئے، پہلے وہاں علم حاصل کیا، پھر امام مالک سے علم حاصل کرنے کے لئے مدینہ آئے، یہاں علم حاصل کرنے کے بعد ان کے استاذ امام مالک نے ان کو مشورہ دیا کہ تم عراق جاؤ اور امام ابویوسف سے پڑھو ـــــ امام اعظم کا انتقال ہوچکا تھا ـــــ امام شافعی رحمہ اللہ نادار تھے، چنانچہ راستہ کا سارا خرچ امام مالک نے دیا اور پڑھنے کے لئے امام ابویوسف کے پاس عراق بھیجا، جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ امام ابویوسف کا بھی انتقال ہوچکا ہے، اور ان کی جگہ امام محمد پڑھانے کے لئے بیٹھے ہیں، پس امام شافعیؒ نے ان سے پڑھا اور خود فرماتے ہیں: حملتُ عن محمد وِقْرَ بعیرٍ: اونٹ کے اوپر آدھا سامان اِدھر باندھتے ہیں اور آدھا اُدھر اور اونٹ زیادہ سے زیادہ چھ من پکّا اٹھاتا ہے، پس فرماتے ہیں: میں نے امام محمد رحمہ اللہ سے ایک اونٹ کا بوجھ اٹھایا ہے، یعنی چھ من کتابیں لکھی ہیں، اس زمانہ میں موٹے کاغذوں پر طلبہ لکھتے تھے، پھر وہ وطن واپس نہیں لوٹے بلکہ بغداد چلے گئے، وہاں امام احمدؒ

نے امام شافعیؒ سے پڑھا، پھر زندگی کے آخر میں امام شافعیؒ بغداد سے مصر چلے گئے اور وہاں دو سال حیات رہے، پھر حضرت کا مصر میں انتقال ہوا۔ بہر حال عراقی مکتبِ فکر ایک رہا، امام اعظم کے شاگرد مجتہد کے درجے کے تھے، مگر انھوں نے اپنے آپ کو امام ابوحنیفہ سے الگ نہیں کیا، چنانچہ امام ابو یوسف کے سارے اقوال فقہ حنفی میں شامل ہیں، امام محمد کے سارے اقوال بھی فقہ حنفی میں شامل ہیں، ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے شاگرد تھے وہ سب فقہ حنفی میں شامل رہے، بعد میں جو ہوئے وہ بھی فقہ حنفی میں شامل رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں مالکی، شافعی اور حنبلی ایک طرف ہیں اور صرف احناف ایک طرف ہیں، ان تین کے بقدر بلکہ اس سے بھی زائد دنیا میں صرف احناف ہیں۔

تابعین کے دور میں چار گمراہ فرقے وجود میں آئے:

میں نے کہا تھا کہ صحابہ کے دور تک عقائد میں اختلاف نہیں ہوا تھا، تابعین کے دور سے عقائد میں اختلاف شروع ہوا، اور سب سے پہلے چار گمراہ فرقے وجود میں آئے: معتزلہ، خوارج، شیعہ اور مرجئہ۔ اور ان کے وجود میں آنے کے عوامل الگ الگ ہیں، کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں حد سے آگے بڑھ گئے تو وہ شیعہ ہوگئے، کچھ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے اختلاف کیا تو وہ خوارج ہوگئے، اور کچھ نے اعمال کی حیثیت گھٹادی اور کہا کہ ایمان کے ساتھ کبائر مضر نہیں: وہ مرجئہ ہوگئے۔ اور کچھ نے عقل کو نقل سے اوپر کردیا تو وہ معتزلہ بن گئے، وہ کہتے ہیں: ہماری عقل میں قرآن وحدیث کی جو باتیں آئیں گی وہ ہم مانیں گے اور جو نہیں آئیں گی: ان کا اگر انکار ممکن ہوگا تو انکار کریں گے ورنہ تاویل کریں گے، مثلاً حدیث میں ہے کہ حجر اسود اللہ کا دایاں ہاتھ ہے، انھوں نے کہا: پتھر اللہ کا ہاتھ کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ انھوں نے اس حدیث کو ضعیف (ساقط الاعتبار) قرار دیا، پس جب بھی ایسی کوئی حدیث سامنے آئے گی تو معتزلہ کسی نہ کسی راوی کا کان پکڑ کر کہہ دیں گے: یہ راوی ضعیف ہے، اس لئے حدیث ضعیف ہے، حالانکہ کونسا انسان ایسا ہے جس میں کوئی کمزوری نہیں ہوتی، بلکہ نہیں ہوتی تو زبردستی پیدا کی جاتی ہے، چنانچہ جتنے بڑے رواۃ ہیں ان پر اور بھی سخت تنقیدیں ہوئی ہیں، ان بڑوں میں سے

ایک: امام بخاری رحمہ اللہ بھی ہیں ان کو حدیث میں مدلس، اور عقائد میں کافر قرار دیا گیا۔ اور نیشاپور سے باہر نکالا گیا، اور اپنے وطن بخاری پہنچے تو وہاں بھی ان کو نہیں رہنے دیا۔ پس کوئی چھوٹا راوی تو تنقید سے بچا ہوا ہوسکتا ہے، مگر بڑا کوئی نہیں بچا، پس حدیثوں کو ضعیف قرار دینا تو بہت آسان ہے۔ جیسے آج کل کے سلفیوں کے سامنے کوئی بھی حدیث ان کے مزعومات کے خلاف پیش کریں تو فوراً کہیں گے: هذا حديث ضعيف: یہ حدیث نکمّی ہے۔

بہر حال عقل کی سمائی میں نہ آنے والا مضمون اگر حدیثوں میں آیا ہے تو معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں، اور قرآن میں آیا ہے تو قرآن کا انکار نہیں کرسکتے، اس لئے وہ تاویل کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے، وہ نہیں ہے۔

بہر حال انھوں نے عقل کو اوپر کردیا اور نقل کو نیچے، یوں معتزلہ وجود میں آگئے۔

شیعوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں غلو کیا، انھوں نے کہا: تین خلفاء کی خلافت صحیح نہیں تھی، وہ غاصب تھے، حضرت علیؓ خلیفہ بلافصل ہیں، اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: چار خلفاء جس ترتیب سے ہوئے ہیں اسی ترتیب سے خلافتیں برحق ہیں۔

اور خوارج نے کہا: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں یعنی پنچایت بٹھانا جائز نہیں، اور حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ نے دو آدمیوں کی پنچایت بٹھائی اس لئے دونوں کافر ہوگئے۔

اس طرح یہ بھی ایک مسئلہ بنا کہ دو فریقوں کی لڑائی میں تیسرے کو حکم بنانا اور اُسے فیصلہ سونپنا جائز ہے یا نہیں؟ خوارج کہتے ہیں: جائز نہیں، قرآن میں ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: (یوسف ۴۰) اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں: جائز ہے، وہ کہتے ہیں: یہ آیت: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: حضورؐ پر نازل ہوئی ہے اور بنوقریظہ کے معاملہ میں حضور نے اور بنوقریظہ نے مل کر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو فیصلہ سونپا، پس کیا ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾: کا مطلب تم سمجھتے ہو یا حضور ﷺ؟

صفات متشابہات اور غیر متشابہات:

معتزلہ جب وجود میں آئے تو انھوں نے سب سے پہلے اللہ کی صفات کا مسئلہ چھیڑا۔

جاننا چاہئے کہ اللہ کی صفات دو طرح کی ہیں، ایک: وہ صفات ہیں جن کی مخلوق سے مشابہت نہیں، جیسے اللہ ایک ہیں، اس کی مخلوق سے کیا مشابہت؟ اللہ بے نیاز ہیں، اس کی مخلوق سے کیا مشابہت؟ دوسری: وہ صفات ہیں جو مخلوق سے مشابہت رکھتی ہیں، جیسے اللہ سنتے ہیں تو ہم بھی سنتے ہیں، اللہ دیکھتے ہیں تو ہم بھی دیکھتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ہے تو ہمارا بھی ہاتھ ہے، اللہ کا چہرہ ہے تو ہمارا بھی چہرہ ہے، اللہ کی پنڈلی ہے تو ہماری بھی پنڈلی ہے، اللہ رات کے آخری حصہ میں سمائے دنیا پر اترتے ہیں تو ہم بھی اوپر کی منزل سے نیچے اترتے ہیں۔ پس جو صفات مخلوق کے مشابہ نہیں ہیں وہ زیر بحث نہیں آئیں اور جو صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں وہ زیر بحث آئیں کہ ان صفات کا کیا مطلب ہے؟

صفات کے تعلق سے مختلف فرقے وجود میں آئے:

صفاتِ باری تعالیٰ میں اختلاف کی وجہ سے امت میں مختلف فرقے وجود میں آئے:

۱- معتزلہ نے صفات باری کا انکار کردیا، مگر صاف انکار نہیں کیا، بلکہ یہ کہا کہ اللہ کی صفات: اللہ کی ذات کا عین ہیں، صفات باری کا نہ الگ کوئی مفہوم ہے نہ وجود، اللہ کی ذات ہی ان کی صفات ہیں، اور آگے جو مسئلہ بیان کروں گا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ حادث ہے یا قدیم؟ اس کا مدار اسی صفات کے انکار پر ہے، جب معتزلہ کے نزدیک تمام صفات اللہ کا عین ہیں تو صفتِ کلام بھی ان کا عین ہے، اور قرآن دنیا میں موجود ہے، ہم اس کو پڑھتے لکھتے ہیں، پھر وہ اللہ کی صفت کیسے ہوسکتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے قرآن کو مخلوق مانا۔

۲- مُعَطِّلَة نے کہا: اللہ کی صفات متشابہات ہیں ہی نہیں، کیونکہ ان سے اللہ کا مخلوق کے مشابہ ہونا لازم آتا ہے، درانحالیکہ اللہ مخلوق کے مانند نہیں۔ غرض انھوں نے اللہ کو صفات سے معطل کردیا، صفات کی چھٹی کردی!

۳- مُجَسِّمَة نے کہا: اللہ کا بھی ہماری طرح جسم ہے، ہاتھ، پیر اور چہرہ وغیرہ ہیں۔

۴- مُشَبِّهَة نے کہا: اللہ کا جسم تو نہیں ہے، مگر اللہ کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں۔

۵- جمہور امت (اہل السنہ والجماعہ) نے کہا: اللہ کی جو صفتیں قرآن وحدیث میں آئی ہیں: وہ سب صفتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں، مگر وہ مخلوق کی صفات جیسی نہیں ہیں۔ پھر

اللہ کی یہ صفات کیسی ہیں؟ جمہور نے کہا: ہم ان کی کیفیت نہیں جانتے، بالاجمال اتنا جانتے ہیں کہ وہ صفات ہیں۔

خلفائے عباسیہ معتزلہ کے خیالات سے متاثر ہوئے:

پھر معتزلہ کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ خلافت عباسیہ ان کے اثر میں آگئی، آپ جانتے ہوں گے کہ ہارون رشید کا بیٹا مامون بڑا فلسفی تھا، اسی نے یونانیوں کا فلسفہ عربی میں ترجمہ کرایا ہے، وہاں سے امت میں عقلیت کا دور شروع ہوا اور سب سے پہلے مامون معتزلہ کے خیالات سے متاثر ہوا۔

صفتِ کلام کی بحث:

اللہ کی صفات بے شمار ہیں، ان میں سے ایک: صفتِ کلام ہے، سب سے پہلے وہ زیر بحث آئی، اور اسی وجہ سے علم العقائد کا نام علم الکلام پڑا، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾: اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کھل کر بات چیت کی، پس اللہ کے لئے صفتِ کلام ثابت ہوئی، یہ صفت زیر بحث آئی کیونکہ دوسری صفات کا پیکر محسوس نہیں تھا، جیسے اللہ سمیع ہیں تو سمیع کا کوئی پیکر نہیں، اللہ کے بصیر ہونے کا بھی کوئی پیکر محسوس نہیں، مگر اللہ کی صفتِ کلام کا پیکر محسوس قرآنِ کریم ہے، یہ قرآن جو اللہ کا کلام ہے زیر بحث آیا کہ قرآن جو آج دنیا میں موجود ہے وہ قدیم ہے یا حادث؟ معتزلہ نے کہا: یہ قرآن اگرچہ اللہ کا کلام ہے، مگر قدیم نہیں، حادث ہے، یعنی اللہ کی صفتِ کلام تو قدیم ہے مگر اس کا یہ پیکر قدیم نہیں، یہ مخلوق ہے اور حادث ہے۔ ان کے نزدیک صفتِ کلام کا مطلب ہے: کسی محل میں کلام پیدا کرنا، پس قرآن مخلوق (پیدا کیا ہوا) ہے، وہ قاری کی زبان پر پیدا کیا جاتا ہے۔

اور اہل السنہ والجماعہ نے کہا: قرآن چونکہ اللہ کی صفت کلام کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ قدیم اور غیر مخلوق ہے، اگر یہ حادث ہوگا تو اللہ کی صفتِ کلام حادث ہوگی اور اللہ کی صفت حادث نہیں ہوسکتی؟

بہ الفاظ دیگر:

یہ مشکل مسئلہ ہے، اس کو پھر تفصیل سے سمجھاتا ہوں: دو لفظ ہیں، ان کے معنی اچھی طرح

ذہن نشین کرلیں: ایک: پرتو ہے، جس کے معنی ہیں: اثر، سایہ، عکس۔ دوسرا: پیکرِ محسوس ہے، اس کے معنی ہیں: نظر آنے والی صورت۔

اور سب کا اتفاق ہے کہ سارا عالَم اللہ کی صفات کا پرتو ہے، یعنی اثر، سایہ اور عکس ہے، صفات محسوس نہیں ہوتیں بلکہ ان کا اثر اور عکس محسوس ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ رزاق ہیں، مگر ان کی صفت رزّاقیت نظر نہیں آتی، نظر رزق اور مرزوق آتے ہیں، اور یہ دونوں مخلوق ہیں، رزق بھی مخلوق ہے اور مرزوق بھی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ خالق ہیں، مگر ان کی صفت خلق نظر نہیں آتی، مخلوقات نظر آتی ہیں، جو نو پید ہیں، قدیم نہیں ہیں، یہی حال صفتِ کلام کے علاوہ تمام صفات کا ہے۔

اور صفتِ کلام میں اختلاف ہوا: معتزلہ کہتے ہیں: قرآنِ کریم بھی اللہ کی صفتِ کلام کا پرتو (اثر) ہے، اللہ تعالیٰ محل میں اپنا کلام پیدا کرتے ہیں، اور وہ مخلوق (نو پید) ہے، یہ اللہ کی صفتِ کلام کا پیکرِ محسوس (نظر آنے والی صورت) نہیں ہے، جو غیر مخلوق (قدیم) ہو۔

معتزلہ کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ایک غلط نظریہ قائم کر چکے ہیں، وہ صفات باری کو عین ذات مان چکے ہیں، یعنی صفات ذات سے زائد کچھ نہیں، اب وہ کیسے قرآن کو غیر مخلوق (قدیم) کہیں!

اور اہل السنہ والجماعہ کہتے ہیں کہ صفتِ کلام کا معاملہ دوسری صفات سے مختلف ہے، دیگر صفات کے تو پرتو موجود ہیں، مگر صفتِ کلام کا پیکرِ محسوس قرآنِ کریم موجود ہے، اس لئے وہ غیر مخلوق (قدیم) ہے، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن بھی پرتو ہوتا یعنی صفتِ کلام کا اثر ہوتا تو پھر اس کے ذریعہ تحدّی (چیلنج) کیسے واقع ہوتی؟ لوگ اللہ کی صفت کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اثرات کا مماثل تو بنا سکتے ہیں، وہ أحسن الخالقین ہیں، معلوم ہوا کہ کسی درجہ میں خالق اور بھی ہو سکتے ہیں، وہ أحکم الحاکمین ہیں، معلوم ہوا کہ کسی درجہ میں حاکم اور بھی ہو سکتے ہیں، مگر قرآن کا مماثل کوئی نہیں بنا سکتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآنِ کریم اللہ کی صفتِ کلام کا پرتو نہیں ہے، بلکہ پیکرِ محسوس ہے، اور اللہ کی کسی بھی صفت کا کوئی مماثل نہ بنا سکتا ہے، نہ لا سکتا ہے، پس ثابت ہوا کہ قرآنِ کریم اللہ کا کلام ہے اور قدیم ہے۔

اور امت میں غالباً سب سے پہلا جھگڑا معتزلہ اور اہل السنہ والجماعہ کے درمیان یہی ہوا

ہے، اس سے پہلے تک بات سادہ انداز میں چلی آرہی تھی کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ پرتو ہے یا پیکرِ محسوس؟ قدیم ہے یا حادث؟ یہ مسئلہ زیرِ بحث نہیں آیا تھا، مگر جب یہ مسئلہ چھڑا تو بڑا فتنہ برپا ہوا، مامون کے بعد معتصم آیا اس نے زبردستی مسلمانوں کو قائل کرنا چاہا کہ کہو: قرآن مخلوق ہے، اور سلف کے لاکھوں آدمیوں کو یہ بات نہ ماننے کی وجہ سے اس نے تہ تیغ کر دیا۔

یہ دور امام احمد رحمہ اللہ کا تھا۔ امام احمدؒ نے اہل السنہ کی طرف سے مردانہ وار اس فتنہ کا مقابلہ کیا، ان کو جیل جانا پڑا، بار بار کوڑے کھائے، مگر وہ مستقیم رہے، پھر معتصم کی بیوی جو اچھے خیالات کی تھی اس نے معتصم پر زور ڈالا، چنانچہ اس نے امام احمدؒ کو چھوڑ دیا، پھر معتصم کے بعد جو بادشاہ آئے وہ معتزلہ کے اثر میں نہیں تھے، اس لئے فتنہ فرو ہوا۔

اصل سلف اور بعد کے سلف میں اختلاف:

امام احمدؒ نے بس اتنا ہی فرمایا تھا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق (قدیم) ہے، اس کی کوئی تفصیل نہیں کی تھی، اور یہی سلف صالحین کا طریقہ تھا، ابھی بیان کروں گا کہ انھوں نے استواء علی العرش کی بھی تفصیل نہیں کی تھی، کیونکہ اللہ کی صفات کو پوری طرح سمجھنا ہماری بس کی بات نہیں، مگر امام احمدؒ کے بعد ان کے ماننے والوں میں غلو پیدا ہوا، اور انھوں نے بات آگے بڑھائی، انھوں نے کہا: قرآن اللہ کی صفتِ کلام ہے اور قدیم ہے، اور قاری جو پڑھتا ہے وہ بھی قدیم ہے، اور جس کاغذ پر قرآن لکھا ہوا ہے وہ کاغذ بھی قدیم ہے، روشنائی بھی قدیم ہے اور جلد بھی قدیم ہے۔ یہاں تک وہ لوگ پہنچ گئے، البتہ امام بخاریؒ نے اختلاف کیا، ان کو نیشاپور اور بخاریٰ سے اس مسئلہ کی وجہ سے نکالا گیا، امام بخاری رحمہ اللہ جب نیشاپور پہنچے ہیں تو ان کا بڑا استقبال کیا گیا تھا، پھر سبق میں کسی نے پوچھ لیا کہ ہم جو قرآن پڑھتے ہیں اور سامعین سنتے ہیں یہ حادث ہے یا قدیم؟ آپؒ نے فرمایا: لفظی بالقرآن مخلوق: میں جو قرآن پڑھتا ہوں وہ قدیم نہیں، پھر کیا تھا حنابلہ نے شور مچا دیا: یہ معتزلی ہے! یہ معتزلی ہے! اور امام بخاریؒ کو کافر قرار دے دیا، چنانچہ وہ نیشاپور سے نکالے گئے، اور جب بخاریٰ پہنچے تو نیشاپور میں جو ان کی ٹکر کے محدث تھے بلکہ استاذ تھے: محمد بن یحییٰ ذہلی، انھوں نے بخاریٰ کے امیر کو خط لکھا کہ بخاری آرہا ہے اس نے یہاں بدعت

(گمراہی) کی بات کہی ہے، پس اس کو باہر نکالو، چنانچہ آپ بخاریٰ سے بھی نکالے گئے، حالانکہ امام بخاری کی بات صد فیصد صحیح تھی، اور یہ بات امام بخاریؒ سے سو سال پہلے امام ابوحنیفہؒ اپنی کتاب الفقہ الاکبر میں لکھ چکے تھے کہ کلامنا بالقرآن مخلوق اور امام بخاریؒ حدیث میں امام احمدؒ کے شاگرد تھے اور امام احمدؒ نے قرآن کے بارے میں جو کہا تھا کہ وہ مخلوق نہیں ہے، قدیم ہے، اس کا مطلب امام بخاری بہتر جانتے تھے بمقابلہ بعد کے لوگوں کے، اور امام احمد امام اعظم کے شاگردوں کے شاگرد ہیں، پس امام اعظم کی بات امام احمد کے سامنے تھی، اور امام بخاری اپنے استاذ کا مذہب صحیح سمجھ رہے تھے، مگر حنابلہ میں اتنا غلو ہو گیا تھا کہ امام بخاری کا یہ قول ان کو ہضم نہیں ہوا۔

استواء علی العرش کا مسئلہ:

پھر زمانہ آگے بڑھا تو اللہ کی ایک دوسری صفت زیر بحث آئی، قرآن کریم میں سات جگہ ہے: ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾: نہایت مہربان ہستی عرش نشیں ہوئی، ان سات جگہوں میں سے ایک جگہ سورۂ یونس کے پہلے رکوع میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِیْ سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ، يُدَبِّرُ الْأَمْرَ﴾: اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے آسمان وزمین کو چھ دنوں میں یعنی چھ دوروں میں پیدا کیا۔ دن: دنیا کا بارہ گھنٹے کا دن نہیں تھا، کیونکہ اس وقت سورج نہیں تھا، بلکہ یہ اللہ کے یہاں کا دن ہے، اس لئے میں نے لفظ دور استعمال کیا، ایک دور کتنے دن کا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں! غرض اللہ تعالیٰ عرش نشیں ہوئے، وہ پوری کائنات کا انتظام کررہے ہیں۔ اس آیت سے رد کرنا ہے ان ہندوؤں اور مشرکوں پر جنھوں نے اللہ کی حکومت کے شعبے بنائے ہیں: بارش کا خدا یہ ہے، دولت کا خدا یہ ہے، صحت کا خدا یہ ہے، مشرکین مکہ نے بھی یہی کررکھا تھا، وہ کہتے تھے: بادشاہ اکیلا حکومت نہیں چلاسکتا، پھر اللہ اتنی بڑی کائنات کا انتظام کیسے کرسکتے ہیں؟ اللہ نے بھی الگ الگ شعبے قائم کرکے الگ الگ خداؤں کو سونپ دیئے ہیں۔ قرآن جگہ جگہ اس کی تردید کرتا ہے، کہتا ہے: اللہ نے آسمانوں اورمین کو چھ دوروں میں بنایا، پھر کوئی انتظام کسی کو نہیں سونپا، وہ خود عرش نشیں ہیں اور وہی معاملات کا انتظام کررہے ہیں۔

استواء علی العرش میں سلف کا مذہب

سلف میں امام مالک، سفیان ثوری اور ایک روایت میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ قرآن میں جو استواء علی العرش آیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ سب نے ایک ہی جواب دیا کہ **الاستواءُ معلوم، والکیفُ مجهول، والإیمان به واجب، والسؤال عنه بدعة**: لغت میں استواء کے جو معنی ہیں وہ معلوم ہیں، جو بھی عربی جانتا ہے وہ اس کے معنی سمجھتا ہے، وہ معنی ہیں: سیدھا ہونا، جم کر بیٹھنا۔ اور اللہ کے عرش پر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ وہ ہمیں معلوم نہیں۔ اور اللہ کے عرش پر بیٹھنے کی جو بھی کیفیت ہے اس پر ہم ایمان لاتے ہیں، ایمانیات میں سب سے پہلے ایمان بالغیب ہے، قرآنِ کریم کی دوسری سورت میں ہے ﴿الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ اور غیب کیا ہے؟ جو بھی چیز حواس خمسہ ظاہرہ کے دائرے میں نہیں آتی وہ غیب ہے، ایسی چیزیں کیا ہیں؟ جنت ہے، جنت کی نعمتیں ہیں، جہنم ہے جہنم کا عذاب ہے، فرشتے ہیں، اللہ ہیں، اللہ کی صفات ہیں، یہ سب حواس خمسہ ظاہرہ کے دائرے میں نہیں آتے، پس یہ سب غیب ہیں، اور ان پر ایمان لانا واجب ہے، کس بنیاد پر؟ اللہ کے رسول جو سچی خبر دینے والے ہیں ان کی خبر پر اعتماد کرکے جنت بھی ماننی ہے، اس کی نعمتیں بھی ماننی ہیں، جہنم بھی ماننی ہے، فرشتے بھی ماننے ہیں، اللہ کی جو صفات قرآن وحدیث میں آئی ہیں وہ سب ماننی ہیں۔ غرض: ان حضرات نے کہا کہ عرش الٰہی پر جم کر بیٹھنا یہ اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات غیب ہیں، لہٰذا اس کو پوری طرح سمجھے بغیر ماننا ضروری ہے، جیسے جنت کو پوری طرح سمجھے بغیر ماننا ضروری ہے، جہنم کو بغیر سمجھے ماننا ضروری ہے، تھوڑا بہت تو سمجھیں گے مگر مکمل نہیں سمجھیں گے، ایسے ہی اللہ کی صفات کو تھوڑا بہت تو سمجھیں گے مگر پوری کیفیت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے پوری کیفیت سمجھے بغیر ماننا ضروری ہے۔ اور یہ جو تم پوچھ رہے ہو کہ اللہ کے عرش پر جم کر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ سوال بدعت ہے، کیونکہ یہ آیتیں آج نہیں اتریں، اور کسی صحابی نے حضور سے نہیں پوچھا، پھر تم کیوں پوچھتے ہو؟ سب نے یہی جواب دیا ہے، اور یہی اصل سلفیت ہے۔

لیکن جب حنابلہ میں غلو پیدا ہوا، اور مسلمانوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ کاغذ

بھی قدیم ہے، سیاہی بھی قدیم ہے، جلد بھی قدیم ہے، ہم جو قرآن پڑھتے ہیں وہ بھی قدیم ہے، آپ جو سنتے ہیں وہ بھی قدیم ہے، یہ بات کیسے مسلمانوں کے گلے اترتی! حنابلہ جس طرح مسئلہ کو لے کر آگے بڑھے تھے، اس طرح مسئلہ کو سمجھنا ناممکن تھا اس لئے معتزلہ کا اثر بڑھتا جارہا تھا۔

پھر عراق میں حضرت امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ پیدا ہوئے، امام ابوالحسن اشعری خود پہلے معتزلی تھے، پھر توبہ کر کے اہل السنہ میں آئے تھے، چنانچہ وہ گھر کے بھیدوں سے واقف تھے، اور ماوراء النہر میں حضرت ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ پیدا ہوئے، عراق میں امام ابوالحسن اشعری نے معتزلہ کا مقابلہ کیا اور ماوراء النہر میں ابومنصور ماتریدی نے، اور حنابلہ جس طرح مسئلہ لے کر بڑھے تھے، اس طرح مسئلہ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا، چنانچہ ان دونوں اماموں نے کہا کہ اگر آپ اللہ کی صفات کا کوئی مناسب مطلب بیان کریں اور مناسب تاویل کریں تو یہ جائز ہے۔ انھوں نے کہا: عرش نشیں ہونے کا مطلب: کائنات کا کنٹرول سنبھالنا ہے۔ جب انھوں نے یہ مطلب بیان کیا تو غالی حنابلہ نے کہا: یہ شرک ہے، کفر ہے، بس یہ کہو کہ اللہ تخت پر بیٹھے ہیں، ان دونوں اماموں نے کہا: نہیں اگر اس طرح کہیں گے تو بے پینڈے کے لوٹے لڑھک جائیں گے۔ ان کے لئے ذہن کو روک لینا مشکل ہوگا، جو دین میں پکا ہوگا وہ تو اپنے ذہن کو روک لے گا، لیکن جو عقلیت پسند ہے وہ نہیں روک سکتا یا تو وہ معطلہ میں شامل ہوجائے گا اور اللہ کی صفات کا انکار کردے گا یا مشبہہ بن جائے گا اور کہے گا: اللہ کا تخت پر بیٹھنا انسانوں کے بیٹھنے کی طرح ہے یا وہ مجسمہ کی طرف جائے گا کہ اللہ کا بھی جسم ہے، اور جیسے جسم والا بیٹھتا ہے اللہ بھی ویسے ہی بیٹھے ہیں، اور یہ سب گمراہیاں ہیں، لہٰذا مناسب تاویل کرنی چاہئے۔ لیکن یقین کے ساتھ نہیں، درجۂ احتمال میں کہنا چاہئے کہ اللہ نے چھ دن میں کائنات پیدا کر کے ساری کائنات کا کنٹرول خود سنبھالا ہے، جیسے ایک بادشاہ مرتا ہے تو دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے، مگر تخت پر بیٹھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعۃً وہ وہاں بیٹھ جاتا ہے، اور ہر وقت بیٹھا رہتا ہے، تخت پر بیٹھنا ایک محاورہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ نے ملک کا انتظام سنبھالا، اللہ کے عرش پر بیٹھنے کا بھی یہی مطلب ہے۔

اسی طرح فرمایا: اللہ تعالیٰ رات کا اتنا حصہ گذرنے پر سمائے دنیا پر اترتے ہیں، اب کوئی پوچھے کہ اللہ کیسے اترتے ہیں؟ تو یہ مت کہو کہ ہم نہیں جانتے، کیونکہ اگر ایسا کہو گے تو بیمار ذہن نہیں رکے گا، کچھ نہ کچھ سوچے گا، لہٰذا کوئی پوچھے کہ اللہ کے اترنے کا کیا مطلب ہے؟ تو کہو کہ رات کے اس حصہ میں اللہ کی عنایتیں مخلوق کی طرف مبذول ہوتی ہیں، اب آگے وہ سوچنا چھوڑ دے گا۔

غرض: اشاعرہ اور ماتریدیہ نے معتزلہ کے پھیلائے ہوئے فتنے کو دبانے کے لئے تاویل کا دروازہ کھولا، اور امام احمدؒ کا انتقال ۲۴۱ھ میں ہوا ہے، امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ کا ۳۰۳ھ میں اور امام ابومنصور ماتریدیؒ کا ۳۳۳ھ میں، پس یہ سب ایک زمانہ کے لوگ ہیں۔

غرض: حضرت امام احمدؒ سے علم کلام میں جو مسلک چلا اور جس میں حنابلہ نے بعد میں غلو کیا اس کا نام سلفیت پڑا، اور امام ابومنصور ماتریدیؒ سے جو مسلک چلا وہ ماتریدیہ کہلایا، اور امام ابوالحسن اشعری سے جو مسلک چلا وہ اشعریت کہلایا، اور اسی ایک مسئلہ کی وجہ سے یہ سب فرقے وجود میں آئے۔

رہی اللہ کی صفتِ کلام تو اگرچہ اس کی بحث ختم ہوگئی تھی مگر اس مسئلہ کی بھی اشاعرہ اور ماتریدیہ نے تاویل کی۔ اور یہ کہا کہ 'کلام نفسی' قدیم ہے، اور قرآنِ کریم اس کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ بھی قدیم ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے چار وجود ہوتے ہیں، ان میں سے حقیقی وجود ایک ہوتا ہے، باقی اعتباری وجود ہوتے ہیں، جیسے آگ کا ایک نفس الامری وجود ہے، چولہے میں جو آگ جل رہی ہے: وہ حقیقی آگ ہے، اور ہم جو ذہن میں آگ کا تصور کرتے ہیں: وہ آگ کا وجود ذہنی ہے، اور منہ سے لفظ 'آگ' کا جو تلفظ کرتے ہیں: وہ اس کا لفظی وجود ہے، اور کاغذ وغیرہ پر جو لفظ آگ لکھتے ہیں: وہ اس کا کتابی وجود ہے، اور یہ تینوں وجود اعتباری ہیں، اس لئے ان وجودوں پر آثار مرتب نہیں ہوتے، نہ ذہن جلتا ہے، نہ زبان، نہ کاغذ، آثار صرف نفس الامری وجود پر مرتب ہوتے ہیں۔

اسی طرح کلام کے بھی چار وجود ہیں: ایک نفس الامری وجود ہے: وہی حقیقی وجود ہے،

باقی تین اعتباری وجود ہیں، اول: کلام نفسی ہے، اور وہ قدیم ہے، اور اس کا مظہر قرآن کریم ہے، اس لئے وہ بھی قدیم ہے، باقی ہم جو قرآن کو لکھتے ہیں یا حفظ کرتے ہیں، یا پڑھتے ہیں: یہ تینوں اعتباری وجود ہیں، اس لئے وہ قدیم نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر قاری صاحب نے قرآن پڑھا اور آپ نے سنا، آپ نے کیا سنا؟ اللہ کا کلام سنا! اللہ کا کلام کیسے سنا؟ آپ نے قاری صاحب کا پڑھنا سنا، قاری صاحب نے کیا پڑھا؟ اللہ کا کلام پڑھا، اس کے بعد آگے سوچو، کیا اللہ کا کلام صرف یہی قرآن ہے؟ دیکھو میں متکلم ہوں، مجھے اللہ نے بولنے کی طاقت دی ہے اور شروع رمضان سے تقریریں کر رہا ہوں تو آج کی جو تقریر ہے کوئی یہی میرا کلام تھوڑئے ہے! اسی طرح اللہ کا کلام صرف یہ قرآن نہیں ہے، بلکہ قاری صاحب کا پڑھنا اللہ کی صفت کلام پر دلالت کرتا ہے، اور اللہ کا کلام صرف قرآن نہیں ہے، ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾: اللہ نے موسیٰ سے کھل کر بات کی، اللہ جانے وہ بات کیا تھی؟ قرآن نہیں تھا، بہر حال قاری کا پڑھنا قرآن پر دلالت کرتا ہے اور قرآن کریم اللہ کی صفت کلام پر دلالت کرتا ہے، پس یہ جو اللہ کی صفت کلام ہے وہ قدیم ہے اور قرآن کریم صفتِ کلام کا پیکر محسوس ہے، اس لئے وہ بھی قدیم ہے، باقی اس سے نیچے جو کچھ ہے وہ مخلوق اور حادث ہے۔ جیسے ہم مخلوق ہیں اور ہمارا وجود اللہ کی صفتِ خلق پر دلالت کرتا ہے، پس ہم قدیم نہیں ہیں، ہمارا وجود جو اللہ کی صفت خلق پر دلالت کرتا ہے وہ صفت قدیم ہے۔

غرض: اشاعرہ اور ماتریدیہ نے کہا: قدیم: اللہ کی صفتِ کلام ہے اور وہ کلام نفسی ہے اور اس کا ایک مظہر (پیکر محسوس) قرآن کریم ہے، پس وہ بھی قدیم ہے، مگر یہ قرآن ہمیں نظر نہیں آتا، اس کو حضور نے پڑھ کر سنایا، پس حضور کا پڑھنا حادث ہے، پھر اسے کاغذ پر لکھا گیا تو یہ بھی حادث ہے، پھر اس کو قاری نے پڑھا تو یہ بھی حادث ہے، اور آپ جو سنتے ہیں یہ بھی حادث ہے۔

یہ جو اس انداز سے متکلمین نے سمجھایا تو حنابلہ (سلفیوں) کے گلے نہیں اترا، انھوں نے کہا: تم مشرک ہوگئے! تم کافر ہوگئے! مگر جس طرح انھوں نے غلو کیا تھا اس کو کون عقیدہ بنائے گا؟ وہ تو اول نمبر کا شرک ہے کہ کاغذ بھی قدیم، سیاہی بھی قدیم، جلد بھی قدیم، پڑھنے

والا بھی قدیم **سبحان الله، هذا بهتان عظيم!**

ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ دمشق پہنچا، جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد گیا، نماز کے بعد ایک صاحب تقریر کے لئے منبر پر چڑھے اور وعظ شروع کیا، انھوں نے حدیث بیان کی کہ جب رات کا اتنا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سمائے دنیا پر اترتے ہیں، جب یہ حدیث بیان کی تو ایک شخص نے پوچھا: **کیف ینزل؟** اللہ تعالیٰ کیسے اترتے ہیں؟ اس نے یہ کیوں پوچھا؟ آج اگر کوئی مقرر یہ حدیث بیان کرتا ہے تو مجمع میں سے کوئی نہیں پوچھتا، اس وقت کیوں پوچھا؟ یہ ابن تیمیہؒ کا دور تھا، اور انھوں نے صفات کا یہ مسئلہ چھیڑ رکھا تھا، اس لئے کسی نے پوچھا: **کیف ینزل؟** واعظ منبر سے نیچے اتر آیا اور کہا: **هكذا ينزل:** اس طرح اللہ تعالیٰ اترتے ہیں، ابن بطوطہ لکھتا ہے: لوگوں نے اس کی خوب پٹائی کی، ابن بطوطہ نے لوگوں سے پوچھا: یہ کون بےوقوف ہے؟ لوگوں نے بتایا: یہ ابن تیمیہ ہے۔

اس واقعہ پر لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے کیونکہ جس زمانہ میں ابن بطوطہ دمشق پہنچا ہے اور جتنے دن وہاں رہا ہے ان دنوں میں ابن تیمیہ جیل میں تھے، پھر یہ واقعہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

اس کا جواب: یہ ہے کہ وہ امام ابن تیمیہؒ نہیں ہونگے تو کوئی اور ابن تیمی ہوگا، جو ان کے خیالات سے متأثر ہوگا، اور مسافر ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کرسکتا، بہر حال یہ جھوٹا واقعہ نہیں، ابن بطوطہ کا سفرنامہ دو جلدوں میں چھپا ہوا ہے، پوری کتاب میں کسی بات پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی، آخر یہی واقعہ ابن بطوطہ نے جھوٹا کیوں لکھ دیا؟

اس کی نظیر: یہ ہے کہ کوئی شخص دین میں عقلی گھوڑے دوڑاتا ہے تو لوگ کہہ دیتے ہیں: یہ مودودی ہے! یعنی مودودی خیالات سے متأثر ہے، اس لئے اس کو مودودی کہہ دیا جاتا ہے۔ یہی حال اس واعظ ہوگا، وہ چونکہ امام ابن تیمیہؒ کے خیالات سے متأثر تھا: اس لئے اس کو ابن تیمیہ کہہ دیا ہوگا۔ بہر حال اس کی بات سے امام ابن تیمیہؒ کے خیالات کی ترجمانی خوب ہوتی ہے۔

کلام نفسی کی بات ایک تاویل ہے:

اسی طرح حنابلہ کے اس غلو کو کون صحیح کہے گا کہ اللہ تعالیٰ واقعی عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

اب صحیح بات کیسے سمجھائی جائے؟ سلف کے زمانہ میں جس طرح بات سمجھائی جاتی تھی اس طرح اب نہیں سمجھائی جاسکتی تھی کہ ہم نہیں جانتے کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔ اس لئے اشاعرہ اور ماتریدیہ نے گمراہی پر کنٹرول کرنے کے لئے تاویل کا دروازہ کھولا۔ انھوں نے کہا: اللہ کی صفتِ کلام نظر آنے والا اور سنا جانے والا قرآن نہیں ہے، بلکہ کلام نفسی ہے، اور یہ قرآن صفتِ کلام کا پیکرِ محسوس ہے۔ اس لئے یہ بھی اللہ کا کلام ہے اور قدیم ہے۔ سلف یہ سب تفصیل نہیں کرتے تھے، وہ مجمل بات کہتے تھے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، ہمیں بھی بس یہی بات کہنی چاہئے، کلام نفسی اور کلام لفظی کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے۔

سلفی، اشعری اور ماتریدی: سب اہل حق ہیں:

بہرحال: میں اشعری بھی ہوں ماتریدی بھی، اور سلفی بھی، کیونکہ ان تینوں میں کوئی جھگڑا نہیں، یہ تینوں اہل حق ہیں، لیکن آج کے جو سلفی ہیں وہ اہل حق نہیں، وہ امام احمد رحمہ اللہ کے بعد غلو میں مبتلا ہوگئے ہیں، امام احمد رحمہ اللہ تک جو سلفی تھے وہی اصلی سلفی تھے، اور بعد کے لوگ نام نہاد سلفی ہیں۔

اور دارالعلوم دیوبند میں تینوں مکاتب فکر کی کتابیں نصاب میں داخل ہیں، امام طحاوی رحمہ اللہ کی عقیدۃ الطحاوی بہت پہلے کی کتاب ہے، یہ کتاب سلف کے مسلک کی ترجمانی کرتی ہے، دارالعلوم دیوبند میں سب سے پہلے یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے، پھر شرح عقائد نسفی پڑھائی جاتی ہے، اس کا متن: **العقائد النسفیہ**: عمر نسفی ماتریدی کا ہے، اور شارح علامہ سعد الدین تفتازانی شافعی: اشعری ہیں، اس طرح تینوں مکاتب فکر کی کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھائی جاتی ہیں، کیونکہ تینوں مسلک برحق ہیں۔

فقہی مکاتب فکر میں سے چار ہی مکاتب فکر برحق ہیں:

یہ تو علم کلام کی تفصیل تھی کہ امت میں کس طرح بحثیں ہوئیں اور کس طرح فرقے وجود میں آئے۔ اب مسائل میں آؤ۔ آپ جانتے ہیں کہ مسائل فقہیہ کے بھی اصول ہیں، وہ اصول کیا ہیں؟ اس میں اختلاف ہوا ہے۔ پس اگر اصول صحیح ہیں تو فقہ صحیح ہے، اور اگر اصول

غلط ہیں تو فقہ بھی غلط ہے۔

اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک اصول شرع کیا ہے؟ نورالانوار کے شروع میں ہے: **اعلم أن أصول الشرع ثلاثة: كتابُ الله، وسنةُ رسوله، وإجماع الأمة، والأصل الرابع: القياس المُستَنبَطُ من هذه الأصول الثلاثة**: یہ بات جان لو کہ شریعت (فقہ وکلام) کے اصول تین ہیں: اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول کی سنت اور اجماع امت اور چوتھی اصل وہ قیاس ہے جس کے ذریعہ ان تین اصولوں میں سے مسائل نکالے جاتے ہیں۔

اب آگے چلو، سب سے پہلے ایک فرقہ پیدا ہوا، اس نے کہا: حسبنا كتابُ الله: ہمارے لئے قرآن کافی ہے، اس سے آگے ہم کوئی چیز نہیں مانتے، یہ فرقہ خود کو اہل قرآن کہتا ہے، پس یہ فرقہ جو صرف قرآن کو مانتا ہے اس کی فقہ کیسے برحق ہوسکتی ہے؟ اصول تو تین ہیں، ان میں سے جو صرف قرآن کو مانتا ہے: اس کی فقہ کیسے برحق ہوسکتی ہے؟

دوسرا فرقہ کہتا ہے: قرآن کے بعد حدیثیں حجت ہیں، آگے کوئی چیز حجت نہیں، یہ فرقہ خود کو اہل حدیث کہتا ہے، یہ فرقہ چونکہ سنت کو اور اجماع کو حجت نہیں مانتا: اس لئے اس کی فقہ (فقہ ظاہری) کیسے برحق ہوسکتی ہے؟

اور اہل السنہ والجماعہ کہتے ہیں: قرآن کے بعد حدیث حجت نہیں، سنت حجت ہے، اور حدیث اور سنت میں فرق میں نے گذشتہ تقریر میں سمجھایا ہے، پھر تیسری اصل اجماع امت ہے، یہ بھی حجت شرعیہ ہے، اِن حضرات کا نام اہل السنہ والجماعہ ہے۔

پس جو صرف قرآن کو اصل مانتے ہیں اور انھوں نے جو فقہ تیار کی ہے وہ برحق نہیں، اور جو قرآن کے ساتھ حدیث کو بھی حجت مانتے ہیں، انھوں نے جو فقہ تیار کی ہے وہ بھی برحق نہیں، کیونکہ ان کے اصول صحیح نہیں، اور اہل السنہ والجماعہ کی فقہ چار حصوں میں تقسیم ہوگئی: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی، یہ چاروں فقہیں برحق ہیں، کیونکہ ان کے اصول صحیح ہیں، یہ حضرات قرآن کو بھی حجت مانتے ہیں، سنت کو بھی، اجماع کو بھی اور قیاس کو بھی، اور قیاس تین اصولوں سے الگ کوئی چیز نہیں، وہ تو ایک آلہ ہے اس کے ذریعہ سے تین اصولوں (قرآن، سنت اور اجماع) سے مسائل نکالے جاتے ہیں۔

اہل حق وہ ہیں جو دونوں سلسلوں سے برحق ہوں:

اب سمجھو: عقائد میں برحق تین فرقے ہیں: اشاعرہ، ماتریدیہ اور امام احمد رحمہ اللہ تک کے سلفی، آج کے یہ سلفی نہیں، یہ تو امام احمدؒ کے بعد غلو کرنے والے سلفی ہیں، یہی تین جماعتیں برحق ہیں، ان کے علاوہ سب گمراہ ہیں۔

اور فقہ میں چار جماعتیں برحق ہیں: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی: پس جب دونوں طرف سے حق پر جمع ہونگے تو مکمل برحق ہوں گے، عقائد میں اشعری، ماتریدی یا سلفی ہوں، اور فقہ میں حنفی، مالکی، شافعی یا حنبلی ہوں تو وہ مکمل طور پر برحق ہیں، اور اگر ایک سلسلہ سے برحق ہے اور دوسرے سلسلہ سے گمراہ تو وہ کریلا نیم چڑھا ہے۔ مثلاً: عقائد میں تینوں میں سے کچھ نہیں اور فقہ میں چار میں سے ایک ہے، جیسے علامہ جار اللہ زمخشری عقائد میں معتزلی تھے، اور فقہ میں حنفی، پس وہ کریلا نیم چڑھا تھے، اسی طرح ہندوستان کے وہ سلفی (غیر مقلد) جو سعودیہ میں پیٹرول نکلنے سے پہلے اشعری تھے اور فقہ میں ظاہری تھے: وہ برحق نہیں، وہ بھی کریلا نیم چڑھا ہیں۔

ہندوستان کے غیر مقلد: سلفی کب سے بنے اور کیوں بنے؟

امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ: شافعی تھے، اس لئے دنیا کے تمام شوافع اشعری ہیں، اور امام ابومنصور ماتریدی: حنفی تھے، اس لئے دنیا کے تمام حنفی ماتریدی ہیں، اور سلفیت امام احمدؒ سے چلی ہے جس طرح حنبلیت ان سے چلی ہے، اس لئے تمام حنبلی: سلفی ہیں، اور مالکیہ میں تینوں مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

غرض: سعودیہ والے فقہ میں حنبلی ہیں اور علم کلام میں سلفی، پھر وہاں پیٹرول نکل آیا تو ہندوستان کے غیر مقلدین نے خود کو سلفی کہنا شروع کردیا حالانکہ پہلے ان کا ہر عالم خود کو اشعری لکھتا تھا، ماتریدی وہ کبھی نہیں رہے، کیونکہ حنفیہ سے ان کو اللہ واسطے کی دشمنی ہے، اس لئے وہ ماتریدی نہیں ہوسکتے تھے، ہاں اشعری ہوسکتے تھے، کیونکہ امام ابوالحسن اشعری شافعی تھے، اور غیر مقلدوں کے شوافع سے فقہ میں ڈانڈے ملتے ہیں۔ شوافع بھی رفع یدین کرتے ہیں وہ بھی کرتے ہیں، شوافع بھی امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتے ہیں: وہ بھی پڑھتے ہیں، شوافع بھی آمین بالجہر کے قائل ہیں: وہ یہ بھی یہی کہتے ہیں، چنانچہ وہ علم کلام میں اشعری بن گئے

اور وہ خود کو اشعری کہتے اور لکھتے تھے۔

پھر جب انھوں نے دیکھا کہ اب سلفی بنے بغیر چارہ نہیں، یہ لبادہ اوڑھے بغیر ریال ہاتھ نہیں آسکتے تو انھوں نے اشعریت کا لبادہ اتار پھینکا اور سلفی بن گئے اور سعودیہ والے بے چارے دھوکہ میں آگئے، وہ سمجھے کہ یہ بھی ہمارے جیسے سلفی ہیں، حالانکہ وہ نقلی سلفی ہیں۔

غرض مسئلہ میں یہ سمجھا رہا تھا کہ اہل حق کون ہیں؟ جو عقائد میں تین میں سے ایک ہو، اور فقہ میں چار میں سے ایک ہو، وہی مکمل طور پر اہل حق ہیں، اور اگر ایک طرف سے اہل حق میں سے ہو، اور دوسری طرف سے اہل باطل میں سے تو وہ کریلا نیم چڑھا ہے، اور اگر دونوں طرف سے اہل باطل میں سے ہو تو اس سے اللہ کی پناہ!

خلاصہ کلام:

اب آخر میں دو باتیں سنو!

پہلی بات: سب سے پہلا سلفی میں ہوں، لیکن میں اشعری بھی ہوں، اور ماتریدی بھی، تینوں کس طرح جمع ہوسکتے ہیں؟ اس طرح کہ اللہ کی تمام صفات کو جو قرآن وحدیث میں آئی ہیں: میں مانتا ہوں، قرآن میں ہے: ﴿أَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ﴾: پس میں مانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہیں، چنانچہ ہم جب بھی کہتے ہیں: اللہ نے یہ فرمایا تو ہم انگلی اوپر کی طرف کرتے ہیں، زمین کی طرف نہیں کرتے، مگر اللہ کے آسمان میں ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ عرش نشیں ہیں، اللہ کا عرش بھی مانتا ہوں، اللہ کے عرش پر بیٹھنے کو بھی مانتا ہوں لیکن کوئی پوچھے کہ اس کی کیفیت کیا ہے؟ تو میں یہ بات نہیں جانتا، اسی طرح اللہ کا چہرہ بھی ہے، ہاتھ بھی ہے، پنڈلی بھی ہے، میں یہ سب باتیں مانتا ہوں، مگر کوئی پوچھے کہ وہ کیسے ہیں؟ تو میں یہ بات نہیں جانتا۔

پس میرا مذہب تنزیہ مع التفویض ہے، تنزیہ کا مطلب ہے: اللہ کی مخلوق کی مشابہت سے پاکی بیان کرنا، پس کہیں گے: اللہ کا ہاتھ ہمارے ہاتھ جیسا نہیں، اللہ کا چہرہ ہمارے چہرے جیسا نہیں، اور تفویض کا مطلب ہے: صفات کی کیفیت کو اللہ کے حوالہ کرنا۔ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی صفات کو بہتر جانتے ہیں۔ یہی اصل سلفیت ہے، اور علمائے دیوبند اسی کے قائل ہیں۔

لیکن بیمار ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لئے میں اللہ کی صفات کی مناسب تاویل کو بھی جائز کہتا ہوں، یعنی درجۂ احتمال میں مطلب بیان کرنے کو بھی جائز کہتا ہوں، مگر ضروری نہیں کہتا، پس اگر کوئی کہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوْالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾: زمین پر جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے، اور تیرے پروردگار ذوالجلال والاکرام کا چہرہ ہی باقی رہنے والا ہے، یعنی اللہ کی ذات ہی باقی رہے گی تو ایسا کہنا جائز ہے، صرف جائز ہے فرض نہیں، کیونکہ تاویل تو درجہ احتمال میں ہوتی ہے، وہ فرض وواجب نہیں ہوتی، اسی طرح جب پنڈلی کھولی جائے گی اور لوگوں کو حکم دیا جائے گا کہ اللہ کو سجدہ کریں، تو کافر سجدہ نہیں کرسکیں گے یعنی جس دن اللہ کی خاص تجلی ظاہر ہوگی، اور میدان محشر میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ اس تجلی کے سامنے سجدہ کرو تو جنھوں نے دنیا میں اللہ کو سجدہ کیا ہوگا وہی سجدہ کریں گے اور جنھوں نے دنیا میں اللہ کو سجدہ نہیں کیا یعنی کفار وہ اس تجلی کے ظاہر ہونے پر سجدہ نہیں کرسکیں گے۔ غرض پنڈلی کو تجلی سے تعبیر کرنا جائز ہے، اگر ایسا مطلب بیان کیا جائے تو سننے والے جو بیمار ذہن رکھتے ہیں وہ یہیں رک جائیں گے، اس سے آگے اِدھر اُدھر کی نہیں سوچیں گے۔

پس بات کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کے سلفی، چاہے وہ ظاہری ہوں یا سعودیہ والے حنبلی سلفی: سب امام احمد رحمہ اللہ کے بعد غلو میں مبتلا ہوچکے ہیں، وہ غلو کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ ان کے نزدیک سارے عقیدے اور سارا علم کلام انہی دو باتوں میں منحصر ہوگیا ہے کہ اللہ کو عرش پر بیٹھا ہوا مانو، اور اللہ کو آسمان دنیا پر اترتا ہوا مانو تبھی تم مسلمان ہو، ورنہ تم مسلمان نہیں!

دوسری بات: تین فرقے علم کلام میں برحق ہیں اور چار فقہیں برحق ہیں، پس جو بھی ان چار سے خارج ہوگا وہ اہل حق میں سے نہیں ہوگا، اور جو بھی ان تین سے خارج ہوگا وہ بھی اہل حق میں سے نہیں ہوگا۔ اور آج کے سلفی ان تین میں سے نہیں، اصلی سلفی اور تھے، اور یہ سلفی اور ہیں، وہ لوگ سلفی نہیں ہیں جو اللہ کے لئے جسم مانتے ہیں، اللہ کو مخلوق کے مشابہ مانتے ہیں، اللہ کے لئے جہت مانتے ہیں، اور اللہ کے لئے مکان مانتے ہیں۔

اللہ کہاں ہیں؟

گجرات کے ایک بڑے عالم حج یا عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گئے، امام حرم سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنا تعارف کرایا، امام حرم نے پوچھا: أَيْنَ اللّٰه؟ اللہ کہاں ہیں؟ وہ عالم خاموش رہے۔ میں نے ان سے کہا: آپ نے فوراً جواب کیوں نہ دیا کہ هو في السماء، لقوله تعالىٰ: ﴿ءَ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ﴾: اللہ تعالیٰ آسمان میں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: کیا تم لوگ ان سے بےخوف ہوگئے جو کہ آسمان میں ہے؟ پھر اگر امام صاحب پوچھتے کہ كيف هو في السماء: وہ آسمان میں کس طرح ہیں؟ تو آپ جواب دیتے: لا أدري: میں نہیں جانتا۔

اس واقعہ سے مجھے بتلانا یہ ہے کہ سعودیہ والے حنبلیوں کے نزدیک معیار حق یہی رہ گیا ہے کہ اللہ کو آسمان میں مانا جائے اور کوئی تاویل نہ کی جائے، جب کوئی تاویل نہیں کی جائے گی تو خود بخود ذہن جہت ومکانیت کی طرف سبقت کرے گا۔

مچھلی کے ڈبّے پر مذبوح کا لیبل!

اور ایک عجیب بات آخر میں یہ عرض کردوں کہ آج کل سلفیت سے علم کلام کی سلفیت مراد نہیں لی جاتی، بلکہ ظاہریت (عدم تقلید) مراد لی جاتی ہے، یہ عجیب دھوکہ ہے، ہم نے ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں مچھلی کا پکا ہوا ڈبہ خریدا، اس پر لیبل لگا ہوا تھا: مذبوح على طريقة الإسلام: اسلامی طریقے پر ذبح کیا ہوا۔ میں نے دوکاندار سے پوچھا: یہ کیا؟ اس نے جواب دیا: کسٹم کے آفیسر جاہل ہوتے ہیں، وہ اس لیبل کے بغیر گوشت کا کوئی آئیٹم ملک میں نہیں آتے دیتے، اس لئے یہ لیبل لگایا ہے۔

خواہ یہ وجہ ہو یا کوئی اور وجہ: بہرحال یہ لیبل ایک دھوکہ ہے، اسی طرح غیر مقلدین نے اپنی ظاہریت پر سلفیت کا لیبل لگایا ہے، اور اپنا کھوٹا مال چلایا ہے، اس لئے تمام مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہئے، اور ان سلفیوں کے فریب میں نہیں آنا چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزے اور زکوٰۃ کے ضروری مسائل

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! روزے تم پر لازم کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والوں پر لازم کئے گئے ہیں، تاکہ تم پرہیز گار بنو!

دو قسم کی عبادتیں

بزرگو اور بھائیو! اللہ تعالیٰ نے دو قسم کی عبادتیں رکھی ہیں: بدنی اور مالی۔ بدنی: وہ عبادتیں ہیں جن کا تعلق بدن سے ہے یعنی ان میں بدن استعمال ہوتا ہے۔ مالی: وہ عبادتیں ہیں جن میں مال استعمال ہوتا ہے، بدن استعمال نہیں ہوتا۔ اور ایک تیسری قسم دونوں سے مرکب عبادت ہے، اس میں بدن بھی استعمال ہوتا ہے اور مال بھی، اول دو کو سمجھ لیں تو تیسری خود بخود سمجھ میں آجائے گی۔

بدنی عبادتیں دو اور مالی عبادت ایک کیوں ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کے بدن میں روح رکھی ہے اور روح کی دو صفتیں (حالتیں) ہیں: ایک: ملکیت یعنی فرشتوں جیسی استعداد، دوسری بہیمیت یعنی جانوروں جیسی استعداد۔ بالفاظِ دیگر: ایک لمۂ خیر ہے، دوسرا لمۂ شر (لمۃ: اثر) قرآن میں ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا﴾ (الشّمس: ۷) قسم ہے نفس (روح) کی اور اس نفس کو درست بنانے کی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کا نفس نہایت عمدہ بنایا ہے ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا﴾ پس اللہ نے اُس نفس کو

اُس کی نیکوکاری اور اس کی بدکاری الہام کی۔ یہی روح کی دو صفتیں (ملکیت اور بہیمیت) ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ ہے ﴿وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد: ۱۰): ہم نے انسان کو دونوں راہیں سُجھا دیں، نیکوکاری کی راہ بھی اور بدکاری کی راہ بھی، اب انسان کو اختیار ہے: نیکوکاری کی راہ پر چلے گا تو جنت میں جائے گا، اور بدکاری کی راہ پر چلے گا تو جہنم رسید ہوگا۔

یہ جو اللہ نے انسان کو دو راہیں سمجھائی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی روح میں اللہ نے نیکی اور بدی کی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ اب ضروری ہے کہ اللہ کی شریعت میں ایسے اعمال اور ایسی عبادتیں رکھی جائیں جو ملکیت (نیکوکاری) کو بڑھاوا دیں اور بہیمیت (بدکاری) کو لگام دیں، چنانچہ نماز رکھی گئی نیکوکاری کو بڑھاوا دینے کے لئے، لمۂ خیر کی ترقی کے لئے، اور روزہ رکھا گیا نفسانی تقاضے کو دبانے کے لئے، آدمی میں تقوی اور پرہیز گاری پیدا کرنے کے لئے، لمۂ شر کو دبانے کے لئے۔ اسی کو قرآن میں کہا گیا ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾: یعنی روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ تم پرہیز گار بنو۔

سوال: ہمارے روزے تو پرہیز گاری پیدا نہیں کرتے؟

جواب: پیدا کرتے ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہے کہ پیدا نہیں کرتے۔ آپ رمضان سے پہلے اپنے نفس کی حالت کا جائزہ لیں اور رمضان کے بعد اپنے نفس کا جائزہ لیں، آپ خود فرق محسوس کریں گے، تھوڑا یا زیادہ یہ الگ بات ہے، فرق ہر شخص محسوس کرے گا۔ البتہ یہ فرق غور کرنے سے محسوس ہوگا، واضح طور پر محسوس نہیں ہوگا۔

اور واضح طور پر فرق محسوس نہ ہونے کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: ہم لوگ جہاں تک گنجائش ہوتی ہے دبا کر کھاتے ہیں، افطاری میں بھی اور سحری میں بھی۔ یہ جو صورت ہمارے کھانے کی ہے اس سے ہمیں روزوں کی نورانیت محسوس نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ زکریا قدس سرہ کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے ''اکابر کا رمضان'' اس کو پڑھو: اکابر رمضان میں افطاری کتنی کھاتے تھے، اور سحری کتنی کھاتے تھے۔ کیا ان کا کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا؟ چاہتا تھا، مگر انہیں روزوں کی نورانیت حاصل کرنی تھی، اور وہ نورانیت کم خوری سے حاصل ہوتی ہے، اُس کتاب میں یہ واقعہ ہے کہ بڑے حضرت رائپوری شاہ

عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ رمضان میں سحری میں صرف ایک فنجان چائے اور ایک نیم برشت انڈا لیا کرتے تھے، افطاری میں کچھ نہیں لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ چونکہ صوم وصال سے حضور نے منع کیا ہے اس لئے اتنا لے لیتا ہوں، ورنہ مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں۔

صوم وصال سے منع کرنے کی وجہ؟

خود نبی پاک ﷺ صوم وصال رکھتے تھے، پندرہ دن کا ایک روزہ رکھتے تھے، صحابہ نے دیکھا تو انھوں نے بھی شروع کیا۔ حضور نے منع فرمایا، صحابہ نے عرض کیا: إِنَّكَ تُوَاصِلُ یارسولَ اللّٰہِ! آپ تو صوم وصال رکھتے ہیں۔ حضور نے فرمایا: إنی لَسْتُ كَأَحَدِكم يُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَيَسْقِيْنِیْ: میرا معاملہ اور ہے اور تمہارا معاملہ اور ہے، مجھے میرا رب کھلاتا پلاتا ہے، تمھیں کہاں کھلائے گا پلائے گا جو میری حرص کرتے ہو، مگر اس کے باوجود حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت فاروق اعظم، حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم ایک ہفتہ کا روزہ رکھتے تھے، اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ حضور نے جو امت کو منع کیا ہے وہ إِبْقَاءً علیهم: ان پر شفقت فرماتے ہوئے منع کیا ہے، ورنہ فی نفسہ صوم وصال جائز ہے، اسی لئے حضرت عائشہؓ وغیرہ ایک ہفتہ کا روزہ رکھتے تھے، پس کیا ان کے پاس کھانا نہیں تھا؟ تھا مگر چونکہ ان کو روزے کا مقصد حاصل کرنا تھا اس لئے وہ کم کھایا کرتے تھے۔

اور روزوں کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے: غریبوں کی غریبی کو یاد کرنا، مگر پورے رمضان ہمیں غریب یاد نہیں آتے، کیونکہ ہمارے پیٹ میں جتنی گنجائش ہوتی ہے اتنا ہم بھر لیتے ہیں۔ ایک وجہ تو نورانیت کم محسوس ہونے کی یہ ہے۔

دوسری وجہ: روزوں کو گناہوں سے اور لغویات سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ آپ غسل خانے میں نہانے کے لئے جائیں اور ایگزاسٹر کھولے بغیر نہائیں تو نہانے کے بعد سارا آئینہ میلا ہو جائے گا، آپ خود کو اس میں نہیں دیکھ سکیں گے، اور اگر آپ پہلے ایگزاسٹر کھول دیں، پھر نہائیں، تو جب آپ کھڑے ہونگے آئینہ صاف ہوگا اور آپ اس میں خود کو دیکھ سکیں گے، اسی طرح ہم روزہ رکھتے ہیں، مگر ایگزاسٹر نہیں کھولتے، جھوٹ بولتے رہتے ہیں، گالیاں بکتے رہتے ہیں، دنیا بھر کی غیبتیں کرتے رہتے ہیں، الزامات اور تہمتیں لگاتے

رہتے ہیں، صبح سے شام تک ہم یہ سارے کام کرتے رہتے ہیں پس آئینہ تو میلا ہونا ہی ہے، اور جب آئینہ میلا ہو گیا تو روزے کے انوار کہاں سے نظر آئیں گے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے: مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ أَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ: جس نے روزے میں جھوٹی بات نہیں چھوڑی، غلط کام نہیں چھوڑا اس کے کھانا پینا چھوڑنے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں، جو چھوڑنا تھا وہ تو چھوڑا نہیں۔ معلوم ہوا کہ روزہ میں صرف کھانا پینا چھوڑنا ہی مطلوب نہیں، بلکہ لغو اور بے کار باتوں سے اپنے آپ کو بچانا بھی ضروری ہے۔ جب آپ ایسا روزہ رکھیں گے تو روزوں کے انوار محسوس کریں گے، ہمیں جو روزوں کی نورانیت کم محسوس ہوتی ہے اس کی یہ دو وجہیں ہیں۔

غرض روزہ جو بدنی عبادت ہے وہ بہیمیت پر، لمۂ شر پر، کنٹرول کرنے کے لئے ہے، تاکہ آدمی میں تقوی اور پرہیزگاری پیدا ہو، اور نماز بھی بدنی عبادت ہے اور وہ اس لئے ہے کہ آدمی میں نورانیت پیدا ہو، ملکیت ابھرے، لمۂ خیر ابھرے، اللہ کا قرب حاصل ہو، اللہ کی یاد آئے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾: اللہ کی یاد نماز کا بڑا فائدہ ہے، اور حدیث شریف میں ہے کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اللہ کے قدموں پر سجدہ کرتا ہے، یعنی اتنا قریب ہو جاتا ہے۔

بہر حال نماز کا مقصد یہ ہے، اور روزے کا مقصد وہ ہے، اور چونکہ ایسی کوئی بدنی عبادت نہیں جس سے دونوں مقصد حاصل ہوں اس لئے بدنی عبادتیں دو رکھیں اور مالی عبادت فقط ایک رکھی، کیونکہ مال میں دو مقصد نہیں، اور وہ مالی عبادت: زکوٰۃ ہے اور صدقۃ الفطر اور نفلی صدقات اسی لائن کی چیزیں ہیں۔

حج بدنی عبادت ہے یا مالی؟

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حج بدنی عبادت ہے، اور ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں: حج مال اور بدن سے مرکب ہے، چنانچہ امام مالک کے نزدیک ہر وہ شخص جس کو استطاعت بدنی حاصل ہے یعنی وہ مکہ چل کر پہنچ سکتا ہے اس پر حج فرض ہے، زاد وراحلہ شرط نہیں ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ میں امام مالک استطاعت سے استطاعت بدنی مراد لیتے ہیں۔ اور دیگر ائمہ کے

نزدیک استطاعت بدنی بھی ضروری ہے اور ساتھ میں سواری بھی موجود ہونی ضروری ہے، جو مکہ تک لے کر جائے اور اتنا خرچہ بھی پاس ہو کہ پیچھے فیملی کو دے کر جائے اور واپس آنے تک وہ چلتا رہے تب اس پر حج فرض ہوگا۔ اور ان کی دلیل ایک روایت ہے جس کو امام مالک ضعیف قرار دیتے ہیں۔ حضور سے پوچھا گیا: مَايُوْجِبُ الحَجَّ؟ حج کو کیا چیز واجب کرتی ہے؟ حضور نے فرمایا: الزَّادُ وَالرَّاحِلَةَ: زاد و راحلہ واجب کرتے ہیں۔

امام مالک نے یہ حدیث ضعیف ہونے کی وجہ سے نہیں لی، مگر دوسرے ائمہ کہتے ہیں: ہمیں حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں کرنا، صرف قرآن کی آیت: ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾: کی تفسیر کرنی ہے اور آیت کی تفسیر میں ضعیف حدیث کو لینے میں کوئی حرج نہیں، باقی ائمہ اس حدیث سے کوئی حکم ثابت نہیں کرتے، وہ اس حدیث کو سامنے رکھ کر صرف اتنا کہتے ہیں کہ ﴿مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً﴾ میں صرف استطاعت بدنی مراد نہیں، استطاعت مالی بھی مراد ہے۔ خیر امام مالکؒ کے نزدیک حج صرف بدنی عبادت ہے، دیگر ائمہ کے نزدیک بدن اور مال دونوں سے مرکب ہے۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بدنی عبادتیں دو رکھی ہیں اور مالی عبادت ایک رکھی ہے، ایسا کیوں ہے؟ بدنی عبادتیں دو اس وجہ سے ہیں کہ روح میں دو صفتیں ہیں، دونوں صفتوں کے لئے دو عبادتیں چاہئیں، ایک سے ملکیت بڑھے گی اور دوسری سے بہیمیت پر کنٹرول ہوگا اور چونکہ مال میں ایسی دو صفتیں نہیں، اس لئے عبادت مالی ایک ہی رکھی۔

زکوٰۃ عام مال میں ہے، خاص مال میں نہیں:

مالی عبادت میں شریعت نے کئی باتوں کا لحاظ کیا ہے:

ایک: یہ کہ جو اموال عام طور پر جمہور کے پاس ہوتے ہیں انہی میں زکوٰۃ رکھی ہے مخصوص آدمیوں کے پاس جو مال ہوتا ہے اس میں زکوٰۃ نہیں رکھی، بکریاں، گائے، بھینس، اونٹ جہاں لوگ پالتے ہیں سبھی پالتے ہیں، جب گولڈ اور سلور کرنسی تھے تو ہر آدمی کے پاس تھے۔ اور ہیرے جواہرات بنیوں کے پاس ہی ہوتے ہیں، ہم ستر سال کے ہوگئے، ہم نے ہیرے کی شکل بھی نہیں دیکھی، ہیرے بڑے مہنگے ہوتے ہیں، مگر ان میں زکوٰۃ نہیں، زکوٰۃ

جو شریعت نے فرض کی ہے اس میں اس کا لحاظ کیا ہے کہ وہ اموال عام طور پر لوگوں کے پاس پائے جاتے ہوں، مخصوص لوگوں کے پاس جو اموال ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ میں غناء کا لحاظ ہے:

دوم: زکوٰۃ فرض کرتے وقت غنا (بے نیازی) کا لحاظ رکھا گیا ہے، جس مال کی آدمی کو ضرورت نہیں، اسی میں زکوٰۃ رکھی ہے، اور جو مال ضرورت میں مشغول ہے اس میں زکوٰۃ نہیں رکھی، شریعت نے یہ طے کیا ہے کہ جو قابلِ زکوٰۃ اموال ہیں ان میں ایک معتد بہ مقدار (نصاب) ہونی چاہئے، جیب میں صرف دس ڈالر ہونے سے بے نیازی نہیں پائی جاتی، پھر وہ نصاب سال بھر اس کے پاس رہے، معلوم ہوا کہ اس کی ضرورت سے زائد ہے، اور ضرورت سے زائد ہونے کا نام غناء (بے نیازی) ہے، یہی مالداری ہے، صبح کو لاکھ دو لاکھ آئے، شام کو خرچ ہوگئے تو اس کا نام بے نیازی نہیں ہے۔

زکوٰۃ اصل مال میں نہیں، بڑھے ہوئے مال میں ہے:

سوم: شریعت نے مال میں جو بڑھوتری ہوتی ہے اس میں زکوٰۃ واجب کی ہے، اصل مال میں زکوٰۃ واجب نہیں کی۔ ایک آدمی کے پاس چالیس بکریاں ہیں، وہ ایک سال تک اس کی ملکیت میں رہیں تو سال بھر میں پندرہ بیس بچے پیدا ہو جائیں گے، اب شریعت کہتی ہے کہ جب سال پورا ہو جائے تو ایک بکری زکوٰۃ میں دو، بیس بکریاں بڑھ گئیں تو اگر شریعت نے ایک بکری لے لی تو کیا پریشانی کھڑی ہوئی؟ چالیس بکریاں آتے ہی فوراً ایک بکری نہیں لی، سال پورا ہونے پر لی ہے۔ یہی حال گایوں بھینسوں کا ہے۔ غرض شریعت نے زکوٰۃ زائد اموال میں رکھی ہے، اصل مال میں زکوٰۃ نہیں رکھی۔

پھر اس میں یہ بھی شرط ہے کہ جانور سائمہ ہوں، یعنی سال کا اکثر حصہ جنگل کی مباح گھاس چرتے ہوں تو زکوٰۃ ہے، اور اگر کوئی اپنے کھیت میں گھاس اگا کر جانوروں کو کھلائے یا چارہ خرید کر جانوروں کو کھلائے (یعنی جانور علوفہ ہوں) تو زکوٰۃ نہیں۔

اسی طرح عوامل یعنی وہ جانور جو سواری میں، ہل جوتنے میں، گاڑی وغیرہ کھینچنے میں

استعمال ہوتے ہیں ان میں بھی زکوٰۃ نہیں رکھی، یہ عوامل اگر مادہ ہوں تب بھی ان میں زکوٰۃ نہیں۔

اسی طرح اگر سب جانور نابالغ (بچے) ہوں تو بھی ان میں زکوٰۃ نہیں، کیونکہ وہ بچے نہیں دیں گے، اس لئے بڑھوتری نہیں ہوسکتی۔

سوال: جانور تو بچے دیتے ہیں لیکن گولڈ سلور اور کرنسی کہاں بچے دیتے ہیں؟ مالِ تجارت بے شک بڑھتا ہے، مگر مذکورہ تین چیزیں نہیں بڑھتیں، پھر ان میں زکوٰۃ کیوں ہے؟

جواب: شریعت نے ان میں نماء تقدیری مانا ہے یعنی بڑھوتری فرض کرلی ہے، کیونکہ سونا، چاندی اور کرنسی کاروبار میں لگانے کی چیزیں ہیں، اب اگر کوئی بینک یا تجوری میں رکھے رہے تو یہ اس کی کوتاہی ہے، گولڈ، سلور اور کرنسی کاروبار میں لگا کر بڑھانے کے لئے ہیں۔

جو اموال گردش میں رہتے ہیں ان میں زکوٰۃ کم رکھی ہے:

چہارم: پھر شریعت نے ایک لحاظ یہ بھی کیا ہے کہ جو اموال گردش میں رہتے ہیں ان میں زکوٰۃ کم رکھی ہے اور جو گردش میں نہیں رہتے ان میں نسبتاً زکات زیادہ رکھی ہے، کھیت میں دس من پیداوار ہو تو ایک من عشر واجب ہوگا یعنی دس فیصد، اور گولڈ، سلور، کرنسی اور اموال تجارت میں چالیس فیصد زکات ہے، کیونکہ زمین میں سال میں ایک دو مرتبہ پیداوار ہوتی ہے اس لئے اس میں زکوٰۃ زیادہ رکھی اور گولڈ وغیرہ اموال گردش میں رہتے ہیں اس لئے ان میں زکوٰۃ کم رکھی، تاکہ لوگوں پر زکوٰۃ ادا کرنے میں زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

سونا، چاندی اور اموال تجارت کا نصاب:

اگر کسی کے پاس صرف چاندی ہو تو اس کا نصاب چھ سو بارہ گرام چاندی ہے، یہ دو سو درہم کا وزن ہے، یہی ساڑھے باون تولہ ہے۔ اور اگر کسی کے پاس صرف سونا ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ سونا چاندی پر محمول ہے، یعنی چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے بقدر سونا ہو تو وہ صاحبِ نصاب ہے، پس سونے کا کوئی مستقل نصاب نہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

رحمہ اللہ کی یہی رائے ہے اور متقدمین میں سے کئی حضرات کی یہی رائے تھی۔ اور حضور کے زمانہ میں دس ایک کا حساب تھا، ایک دینار کے دس درہم آتے تھے، حدیثوں میں جو بیس دینار آئے ہیں وہ دو سو درہم کی قیمت تھی، بعد میں یہ حساب بدل گیا، چاندی بہت نیچے آگئی اور سونا بہت اوپر چلا گیا، پس آج بھی چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

لیکن چاروں مذاہب میں فتوی اس پر ہے کہ چاندی کا نصاب الگ ہے، اور سونے کا نصاب الگ ہے ساڑھے سات تولے (بیس مثقال) یعنی ستاسی گرام، پوئنٹ پندرہ (87,15) سونے کا نصاب ہے، اور اس سلسلہ میں تین حدیثیں ہیں اور تینوں میں ضعف ہے، مگر تینوں مل کر قوی ہوجاتی ہیں۔

مخلوط اموال کا نصاب:

اور اگر تھوڑی چاندی اور تھوڑا سونا ہو، یا ساتھ میں کرنسی بھی ہو تو چاندی کے نصاب کا اعتبار ہے، چاندی کی قیمت بازار میں پوچھ کر کاغذ پر لکھو، سونے کی قیمت پوچھ کر اس کو بھی کاغذ پر لکھو اور کرنسی کو بھی ملاؤ، پھر اگر ٹوٹل: چاندی کے نصاب (چھ سو بارہ گرام) کی قیمت کے بقدر ہوجائے تو زکوٰۃ واجب ہے۔ غرض ایسی صورت میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا، سونے کے نصاب کا اعتبار نہیں ہوگا، کیونکہ وہی انفع للفقراء ہے، فتوی چاروں ائمہ کے یہاں اس پر ہے۔

قیمتی کرنسی میں سونے کا اعتبار ہے یا چاندی کا؟

جو ہیوی (بھاری) کرنسیاں ہیں میں ان میں سونے کے نصاب کا اعتبار کرتا ہوں، پس جب بھاری کرنسی میں گولڈ کے نصاب کا اعتبار کرلیا تو اگر ٹوٹل ستاسی گرام کے بقدر ہوجائے اور اتنی مالیت پورے سال کسی کے پاس رہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی، میں چاندی کے نصاب کا اعتبار بھاری کرنسی میں نہیں کرتا، کیونکہ وہ بے قدر مالیت ہوتی ہے، اور بھاری کرنسیاں: پاؤنڈ، ڈالر اور دینار ہیں۔ لیکن فتوی چاروں ائمہ کے یہاں اس پر ہے کہ چاندی کے نصاب کا اعتبار ہے۔

اموالِ زکوٰۃ کے نصابوں کی پانچ اجناس، اور بڑا نصاب:

اموالِ زکات کی پانچ اجناس ہیں، اور وہ الگ الگ ہیں ایک کو دوسرے کے ساتھ نہیں ملائیں گے اور ہر جنس کا ایک نصاب طے کیا گیا ہے، اور یہ بڑا نصاب کہلاتا ہے، اس کے علاوہ ایک چھوٹا نصاب بھی ہے، چھوٹے نصاب سے پانچ احکام متعلق ہیں اور بڑے نصاب سے چھ۔

پہلی جنس: اگر کسی کے پاس اونٹ ہوں اور وہ جنگل کی مباح گھاس سال کا بیشتر حصہ کھاتے ہوں (یعنی سائمہ ہوں) تو ان کا نصاب پانچ اونٹ ہیں، اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔

دوسری جنس: گائیں اور بھینسیں ایک ہی خاندان ہیں، ان کا نصاب تیس ہے، بشرطیکہ وہ سائمہ ہوں علوفہ نہ ہوں، تیس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔

تیسری جنس: بھیڑ بکریاں بھی ایک خاندان ہیں، ان کا نصاب چالیس ہے، بشرطیکہ وہ سائمہ ہوں۔ چالیس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔

چوتھی جنس: زمین کی پیداوار ہے۔ اگر سینچائی پر خرچہ کیا گیا ہے یا محنت کی گئی ہے تو پیداوار کا بیسواں حصہ واجب ہے، اور اگر سینچائی پر خرچہ نہیں کیا گیا، بارش سے پیداوار ہوئی ہے تو پیداوار کا دسواں حصہ واجب ہے، اس کے علاوہ دوسرے خرچے: ہل جوتنا، بیج ڈالنا، کھاد ڈالنا وغیرہ نہیں دیکھے جائیں گے، اس زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں اور یہ حکومت وصول کرتی ہے، اور غریبوں پر خرچ کرتی ہے۔

اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کی زمینوں میں عشر کا مسئلہ:

ملک تین قسم کے ہیں: ایک: اسلامی ملک۔ دوسرا: وہ ملک جو کبھی اسلامی تھا پھر مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا جیسے انڈیا۔ تیسرا: وہ ملک جو کبھی بھی اسلامی ملک نہیں بنا، جیسے آپ کا یہ ملک کناڈا۔ ان سب کی زمینوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

وہ ملک جو اسلامی ہیں ان کی زمینیں دو قسم کی ہیں: ایک: وہ ہیں جو قدرتی دریاؤں سے سینچی جاتی ہیں اور شروع سے زمین کے مالک مسلمان ہیں تو اس میں عشر (دسواں حصہ

واجب ہے۔ اور اگر وہ زمینیں کنوؤں سے یا ٹیوب ویل سے سینچی جاتی ہیں تو اس میں بیسواں حصہ واجب ہے۔ دوسری قسم: وہ زمینیں ہیں جو اگرچہ قدرتی دریاؤں سے سینچی گئی ہوں مگر وہ زمینیں پہلے غیر مسلموں کے پاس رہی ہیں، ان کے پاس سے مسلمانوں کے پاس آئی ہیں تو ان میں عشر نہیں، بلکہ بیگہ (خراج) لیا جاتا ہے، خراج حکومت لیتی ہے اور اس کا بڑا حصہ فوج پر اور ملک کی ترقی میں خرچ ہوتا ہے۔

اور وہ ملک جو کبھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے ہیں، پھر وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے جیسے انڈیا تو ایسے ملکوں کے بارے میں فتوی یہ ہے کہ چونکہ وہاں گورنمنٹ زمینوں سے بیگہ لیتی ہے اس لئے ان زمینوں میں عشر واجب نہیں۔ کیونکہ دو مؤنتیں (خرچ) جمع نہیں ہوتیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ ان کا بھی عشر نکالا جائے۔

تیسرے وہ ملک ہیں جو کبھی بھی اسلامی ملک نہیں بنے، جیسے کناڈا۔ اس میں بہ درجۂ اولی عشر واجب نہیں، جب انڈیا جیسے ملک میں عشر واجب نہیں تو اس تیسری قسم کے ملکوں میں عشر کیسے واجب ہوگا؟ یہاں بھی صرف استحباب ہوگا۔ بہر حال یہ جو زمین کا عشر لیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ کے حکم میں ہے اور یہ ایک مستقل جنس ہے۔

پانچویں جنس: میں چار چیزیں شامل ہیں، اور چاروں مل کر ایک جنس ہیں: سونا، چاندی، کرنسی اور اموالِ تجارت۔ اگر صرف سونا ہے تو اس کا نصاب گذر چکا، اگر صرف چاندی ہے تو اس کا نصاب بھی گذر چکا، اگر صرف کرنسی یا اموالِ تجارت ہیں تو چاندی کے نصاب سے موازنہ کریں گے یا سونے کے نصاب سے؟ مفتیوں کا فتوی یہ ہے کہ چاندی کے نصاب سے موازنہ کریں گے۔ اور میں کہتا ہوں: جو بھاری کرنسیاں ہیں ان کو سونے کے نصاب سے موازنہ کریں گے۔

اور اگر تھوڑا سونا، تھوڑی چاندی، تھوڑی کرنسی اور تھوڑا مال تجارت ہے تو سب کی قیمت لگائیں گے، اگر چاندی یا سونے کے نصاب کے بقدر ہوجائے تو حولانِ حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہ پانچ اجناس ہیں، ان میں سے زمین کی پیداوار کو الگ کردیں، باقی چار اجناس بڑا نصاب ہیں۔ یہ قدرتِ مُیَسِّرَہ والا نصاب ہے۔

چھوٹا نصاب اور اس سے متعلق احکام:

اور ایک چھوٹا نصاب ہے یعنی قدرتِ مُمَکِّنَۃ والا نصاب، اور وہ یہ ہے کہ انسان کی اپنی حاجاتِ اصلیہ میں جو چیزیں مشغول ہیں ان کو الگ کرلیا جائے اور جو ضرورت سے زائد چیزیں ہیں ان کی قیمت لگائی جائے، اور وہ نصاب میں گنی جائیں۔ جیسے اتنی زمین جس سے اس کی فیملی کا گذارہ چل سکے اس کی حاجت میں مشغول ہے، اس سے زائد زمین قیمت لگا کر نصاب میں آئے گی، اگر مکانات ہیں اور ان کے کرایوں سے اس کا گذارہ ہوتا ہے تو اتنے مکان جن سے اس کا اور اس کی فیملی کا گذارہ ہوسکے الگ کرلئے جائیں گے، اس سے زائد جو مکان ہیں ان کی قیمت لگ کر نصاب میں آئے گی۔ گھر میں برتن بھرے ہوئے ہیں، مردوں یا عورتوں کے پاس بے حساب کپڑے ہیں پس جو برتن یا کپڑے ضرورت کے ہیں ان کو الگ کرلیا جائے گا، باقی زائد کپڑے اور برتن قیمت لگا کر نصاب میں آئیں گے۔ پھر چاندی کے نصاب کے بقدر یا سونے کے نصاب کے بقدر مالیت ہوجائے تو وہ چھوٹے نصاب کا مالک ہوگیا۔

چھوٹے نصاب سے پانچ احکام متعلق ہیں: ۱- اس پر قربانی واجب ہے۔ ۲- اس پر صدقۂ فطر واجب ہے۔ ۳- اس کے لئے زکوٰۃ لینا حرام ہے وہ غنی ہے، اس کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ۴- اس پر حج فرض ہے۔ اگر رقم حج کے لئے کافی ہو۔ ۵- اس پر ددھیال اور ننھیال کے ایسے مرد یا عورت کا جو کمانے کے قابل نہیں، اور غریب ہیں ان کا نفقہ واجب ہے۔

اور جس کے پاس بڑا نصاب ہے یعنی پانچ اونٹ یا تیس گائیں بھینسیں یا چالیس بکریاں یا سونا، چاندی، کرنسی یا اموالِ تجارت کا نصاب ہے: اس پر چھ چیزیں واجب ہیں۔ پانچ وہی اور چھٹی چیز: اس پر زکوٰۃ نکالنا فرض ہے۔

تجارت کا مال کونسا ہے؟

وہ چیز جسے خریدا گیا ہے بیچنے کی نیت سے: وہ تجارت کا مال ہے اور اگر خریدتے وقت

بیچنے کی نیت نہیں تھی تو وہ تجارت کا مال نہیں۔ پھر وہ کیوں خریدی ہے؟ خریدی تھی کرایہ پر دینے کے لئے اور اس سے پیسا کمانے کے لئے تو یہ تجارت کی چیز نہیں ہے۔ یا اس لئے خریدی تھی کہ بچے بڑے ہوں گے اور مکان کی ضرورت پڑے گی پس ان کے مکان اسی زمین میں بناویں گے اور اگر کوئی اچھی قیمت آئے گی تو بیچ بھی دیں گے۔ یہ بھی تجارت کی چیز نہیں۔ یا ہمارے کھیت میں جو پیداوار ہوتی ہے اور وہ کھانے کی نہیں ہے جیسے کپاس، سرسوں وغیرہ، کسان لامحالہ اس کو بیچے گا، یا کھانے کا اناج پیدا ہوتا ہے، مگر تیس من ہم کھائیں گے اور پیداوار ہوئی ہے دو سو من، پس باقی کسان بیچے گا، مگر یہ بھی تجارت کا مال نہیں، وہ جب تک رکھی رہے گی اس میں کوئی زکوٰۃ نہیں، جب اسے بیچ دیں گے اور پیسہ بیلنس میں آجائے گا تو بیلنس پر جب سال پورا ہوگا تو اس نئے پیسے پر بھی بیلنس میں شامل ہوکر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اگر کسی نے کپاس، سرسوں اس لئے خریدا ہے کہ جب ریٹ بڑھیں گے بیچ دیں گے تو یہ تجارت کا مال ہے، اسی طرح اگر مکان خریدا ہے کرایہ پر اٹھانے کے لئے، بیچنے کے لئے نہیں خریدا، ہاں اگر کبھی اچھے پیسے ملے تو بیچ بھی دیں گے تو اس مکان پر زکوٰۃ نہیں، بلکہ اس کا کرایہ بیلنس میں جائے گا اور سال پورا ہونے پر کرایہ پر بیلنس میں شامل ہوکر زکوٰۃ آئے گی۔

زکوٰۃ میں کونسا قرض منہا اور کونسا شامل ہوتا ہے؟

جاننا چاہئے کہ زکوٰۃ کا حساب کرتے وقت بیلنس میں سے سب سے پہلے آپ قرضہ لیس (منہا) کریں، پھر جو باقی بچے اس پر زکوٰۃ آئے گی، اور قرض تین قسم کے ہیں:

۱- قوی قرض: جو آپ کسی بھی وقت وصول کرسکتے ہیں یا آپ سے کسی بھی وقت مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ قرض حسنہ ہے، یہ قرض اگر آپ کو لینا ہے تو بیلنس میں ایڈ (شامل) ہوگا اور اگر دینا ہے تو لیس (منہا) ہوگا۔

۲- ضعیف قرض: جیسے بیوی کے دو مہر ہوتے ہیں، ایک کیش (معجّل) دوسرا ادھار (مؤجل) کیش مہر قوی قرض ہے وہ بہر حال دینا ہے، لیکن جو ادھار مہر ہے وہ موت یا طلاق تک نہیں مانگا جاتا، پس وہ کمزور قرض ہے، لہٰذا عورت مہر کو اپنے بیلنس میں ایڈ نہیں کرے گی

اور شوہر اپنے بیلنس سے لیس نہیں کرے گا۔

اور آج اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں، لوگ قسطوں پر گھر خریدتے ہیں، مشین خریدتے ہیں، پروپرٹی، ٹی وی وغیرہ خریدتے ہیں، پس جو قسط پک گئی وہ قوی قرض ہے اور جو قسطیں ابھی کچی ہیں وہ سب ضعیف قرضے ہیں، وہ نہ لیس ہونگے نہ ایڈ، کیونکہ وہ قسطیں ابھی مانگنے کا حق نہیں، اور جو قسط پک گئی جو کسی بھی وقت مانگی جا سکتی ہے وہ قوی قرضہ ہے۔

مصنوعات اور خام مال کا حکم:

اس کے علاوہ ایک نئی شکل پروڈکشن کی نکلی ہے، بڑے بڑے کارخانے ہوتے ہیں، ان میں لاکھوں روپے کا خام مال ہوتا ہے، وہ خام مال بیچنے کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ مصنوعات اس سے تیار ہوتی ہیں، پھر وہ مصنوعات بیچی جاتی ہے، یا جیسے مرغی فارم میں مرغیاں انڈے دینے کے لئے ہوتی ہے، بیچنے کے لئے نہیں ہوتیں، یا بیچنے کے لئے ہوتی ہیں، مگر جب ایک کلو کی ہوجائیں گی تب بکیں گی، اس سے پہلے نہیں بکیں گی۔ یہ سب پروڈکشن ہے۔

اس بارے میں دارالعلوم دیوبند کا فتوی یہ ہے کہ خام مال پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، وہ فروختگی کا مال ہے، لیکن میں خام مال کو تجارت کے مال میں نہیں شمار کرتا، کیونکہ جیسے مشینوں میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ وہ ذرائع اور آلات ہیں ایسے ہی یہ خام مال بھی ذریعہ ہے، پھر جب اس کی مصنوعات تیار ہوگئیں تو اب بھی ان پر زکوٰۃ نہیں، جیسے آپ کے کھیت میں گیہوں پیدا ہوئے تو جب تک وہ بک نہ جائیں ان پر زکوٰۃ نہیں، ایسے ہی کارخانے کا معاملہ ہے، جو چیز تیار ہوئی ہے اس پر زکوٰۃ نہیں، ہاں جب مال بک جائے تو اس کی قیمت بیلنس میں ایڈ ہوگی اور بیلنس پر جب سال پورا ہوگا تو اس پر بھی زکوٰۃ آئے گی۔ لیکن دارالافتاء کے نزدیک یہ خام مال تجارتی مال ہے اس پر زکوٰۃ آئے گی، لہٰذا اگر کوئی دارالافتاء کے فتوی پر عمل کرے تو اس میں احتیاط ہے۔

۳- متوسط قرض: کسی نے قرض لے رکھا ہے، وہ انکار بھی نہیں کرتا اور دیتا بھی نہیں، پس اگر ایسا قرض دینا ہے تو بیلنس میں سے لیس نہیں ہوگا، دینا ہے تو دیدو، اس کو روک کیوں

رکھا ہے۔ لینا ہے تو اس میں ہمارا اختیار نہیں ہے، لہٰذا وہ فی الحال ایڈ نہیں ہوگا لیکن جب وصول ہوگا گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

تجارتی مال میں اعتبار مارکیٹ ویلیو کا ہے یا خرید قیمت کا یا نفع کا؟

تجارتی اموال میں کونسی قیمت کا اعتبار ہے، خرید قیمت کا یا جو ہم بیچیں گے اس قیمت کا یا مارکیٹ ویلیو کا؟

جواب: مارکیٹ ویلیو کا اعتبار ہے اور خریدی ہوئی قیمت اور مارکیٹ ویلیو عام طور پر ایک ہوتے ہیں، اگر مدت لمبی نہیں ہوئی اور اگر مدت لمبی ہوگئی جیسے ایک پلاٹ خریدا ہے اور تین سال سے پڑا ہے تو اب مارکیٹ ویلیو بدلے گی، گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے، لیکن اگر مال آج آیا اور مہینہ میں ہی بک گیا تو اس کی خرید قیمت اور مارکیٹ ویلیو عام طور پر ایک ہوتی ہے۔ اور جو نفع کے ساتھ بیچنا ہے جیسے ایک روپے کی چیز ڈیڑھ روپے میں بکے گی تو اس نفع (پچاس پیسے) کا اعتبار زکوٰۃ کے باب میں نہیں ہے وہ نفع ہے جب ملے گا ملے گا، اس کا ملنا کوئی ضروری نہیں، ہوسکتا ہے اس سے پہلے چوری ہوجائے یا قیمت گھٹ جائے، لہٰذا اگر مارکیٹ ویلیو اور خرید کا زمانہ قریب ہے تو وہاں تو دونوں ایک ہی ہوتے ہیں اور اگر زمانہ بعید ہوگیا ہے تو مارکیٹ ویلیو کا اعتبار ہوگا، خرید کا اعتبار نہیں۔ یہ چند ضروری مسائل ہیں جو میں نے آپ حضرت کے سامنے عرض کئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمين۔

۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزوں کے تعلق سے رمضان کی تخصیص

خطبۂ مسنونہ کے بعد:﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ، وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدىٰ وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾وقال النبی صلی اللہ علیه وسلم: من صام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن قام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن قام ليلة القدر غفرله ماتقدم من ذنبه۔

بزرگو اور بھائیو! یہ مبارک مہینہ جس سے ہم اور آپ گذر رہے ہیں: رمضان شریف کا مہینہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جس کو جتنی توفیق دیتے ہیں اتنا وہ نیک اعمال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس مبارک مہینہ کی قدر کرنے کی اور زیادہ سے زیادہ اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

اس مبارک مہینے کے تعلق سے قرآن وحدیث میں بہت سی باتیں ذکر کی گئیں ہیں، اس وقت مجھے وہ سب ذکر نہیں کرنی، وہ آپ حضرات نے سن بھی رکھی ہونگی اور پڑھ بھی رکھی ہونگی، مجھے آج مختصر وقت میں صرف دو باتیں عرض کرنی ہیں۔

خاص رمضان کے روزے کیوں فرض کئے گئے ہیں؟

پہلی بات: قرآنِ کریم میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے خاص رمضان کے روزے کیوں لازم کئے گئے ہیں؟ دوسرے گیارہ مہینوں میں روزے کیوں نہیں رکھے گئے؟ آدمی کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ رمضان کے روزے فرض کرنے

میں کوئی نہ کوئی حکمت ہونی چاہئے، اگرچہ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہم اللہ کے فیصلوں پر اعتراض نہیں کرتے، مگر حکمت جاننا چاہتے ہیں کہ اللہ نے باقی گیارہ مہینوں میں روزے فرض نہیں کئے، صرف اسی مہینہ میں فرض کئے، آخر اس میں حکمت کیا ہے؟

حکمت جاننے کا ہر مؤمن کا جذبہ ہوتا ہے، قرآن وحدیث میں بہت سے احکام کی اللہ نے حکمتیں بیان کی ہیں، اللہ کے رسولؐ نے بھی حکمتیں بیان کی ہیں، اور جو باقی چھوڑی ہیں وہ علمائے امت نے بیان کی ہیں۔

کپڑا ٹخنے سے اوپر پہننے کی حکمت:

مثلاً احادیثِ شریفہ میں یہ حکم آیا ہے کہ اپنا کپڑا خواہ لنگی ہو، پائجامہ ہو، پتلون ہو، ٹخنے سے نیچے مت جانے دو، اگر ٹخنہ چھپ گیا تو جتنے حصہ کو کپڑا چھپائے گا وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اور ایسا تو ہوتا نہیں کہ ایک انگلی جہنم میں جائے اور باقی جسم جنت میں جائے۔ جب کچھ حصہ جہنم میں جائے گا تو باقی جسم بھی جہنم میں جائے گا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ جو شخص ٹخنوں سے نیچے کپڑا پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف مہربانی کی نظر نہیں فرماتے۔ یہ حکم سبھی مسلمان جانتے ہیں، لیکن آدمی کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ حکم کیوں ہے؟ اس میں مصلحت کیا ہے؟ یہ مصلحت اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقعہ پر سمجھائی ہے۔

شمائل ترمذی میں مختصر روایت ہے اور مفصل روایت دوسری کتابوں میں ہے کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ بازار تشریف لے گئے، وہاں ایک صحابی کھڑے تھے، وہ دوسری طرف منہ کر کے کھڑے تھے، حضورؐ نے پیچھے سے آ کر دونوں ہاتھوں سے ان کی آنکھیں دبا دیں، انھوں نے کہا: کون ہے؟ چھوڑ مجھے! لیکن حضورؐ نے دبائے رکھا، چھوڑا نہیں، اب جوان صحابی نے پہچاننے کی کوشش کی تو پہچان گئے کہ یہ حضور اکرم ﷺ ہیں، اب انھوں نے آنکھیں چھڑانے کے بجائے اپنی پیٹھ برکت حاصل کرنے کے لئے حضورؐ کے سینہ سے لگا دی، کیونکہ ایسا موقعہ پھر کہاں ملے گا، یہ موقعہ تو آج اتفاق سے مل گیا۔ اب حضورؐ نے ہاتھ ہٹا لئے، کیونکہ کھیل ختم ہو گیا۔

انہی صحابی کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: أَزْهَرُ بَادِ يَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُوْهُ: ازہر ہمارا گاؤں ہے اور ہم اس کا شہر ہیں، یہ صحابی دیہات کے تھے، اور ہر جمعہ کو جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے، اور جب دیہات سے آتے تھے تو دیہات میں کھیتوں میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں، سبزیاں، ترکاریاں وغیرہ، ان سب کو جمع کر کے حضورؐ کے لئے ہدیہ لایا کرتے تھے، اور جمعہ پڑھ کر اپنے گاؤں لوٹ جاتے تھے، لوٹتے وقت حضورؐ گھر کی ضروریات مثلاً نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ بازار سے خرید کر ان کو ہدیہ دیتے تھے۔ اس بات کی طرف حضورؐ نے اشارہ فرمایا ہے کہ ازہر ہمارا گاؤں ہے یعنی وہ ہماری دیہات کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور ہم اس کا شہر ہیں یعنی ان کی شہری ضرورتیں ہم پورا کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے حضرت ازہر کی لنگی کی طرف دیکھا تو وہ ٹخنوں سے نیچے تھی، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اِرْفَعْ إِزَارَكَ فَإِنَّهُ أَنْقٰى وَأَبْقٰى: لنگی اونچی اٹھاؤ، لنگی اونچی باندھنے میں دو فائدے ہیں: ایک: اس سے کپڑا پاکیزہ اور صاف رہتا ہے، نیچے ہوگی تو زمین پر لگے گی، اور جوتوں کے ساتھ لگے گی، جو لوگ نیچے تک کپڑا پہنتے ہیں آپ دیکھیں: ان کے نیچے کے حصے سڑے ہوئے اور بدبودار ہوتے ہیں، پس حضورؐ نے کپڑے کو اونچا رکھنے میں ایک حکمت تو یہ سمجھائی کہ اس سے کپڑا صاف رہتا ہے۔

کیا روزانہ کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟

یہ بہت بڑی حکمت ہے کہ آدمی صاف ستھرا رہے، اور یہ جو غیر مسلم امریکہ ویورپ وغیرہ میں روزانہ کپڑے بدلتے ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی بعض مسلمان بھی روزانہ کپڑے بدلتے ہیں: یہ کوّے ہیں جو کبوتر کی چال چلتے ہیں! ہمیں روزانہ کپڑے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے لئے تو ہفتہ میں دو مرتبہ کپڑے بدلنا کافی ہے۔

اور ان کو روزانہ اس لئے بدلنے پڑتے ہیں کہ وہ کاغذ سے استنجاء کرتے ہیں، پانی استعمال نہیں کرتے، پس جب کاغذ سے استنجاء کر کے پتلون پہنیں گے اور وہ بھی تنگ تو وہ شام تک بیت الخلاء بن جائے گی، اتنی سڑ جائے گی کہ دوبارہ پہننے کے قابل نہیں رہے گی، اس لئے دوسرے دن کپڑے بدلنا ان کی مجبوری ہے، لیکن مسلمانوں کو کیا آفت ہے کہ وہ

روزانہ کپڑے بدلتے ہیں، مسلمان تو چھوٹا استنجاء کرتا ہے تو پانی استعمال کرتا ہے، بڑا استنجاء کرتا ہے تو پانی استعمال کرتا ہے، اس کے کپڑوں اور بدن پر تو ناپاکی کا ایک قطرہ بھی نہیں لگتا، پھر اس کے کپڑے صبح سے شام تک کیسے میلے ہو گئے کہ دوسرے دن ان کو بدل دیا جائے۔

بہرحال جو مسلمان نماز پڑھتا ہے وہ ہمیشہ پاک صاف رہتا ہے، اب اگر اس کا کپڑا نیچے تک لٹکا ہوا ہوگا تو وہ جوتے پر بھی لگے گا، زمین پر بھی لگے گا اور کسی گندی جگہ پر بھی لگ سکتا ہے، اور جب نچلا حصہ ناپاک ہوگیا تو اب وہ نماز کیسے پڑھے گا؟ لہٰذا اس کو اپنی لنگی، پائجامہ، پتلون وغیرہ جو بھی اس نے پہن رکھا ہے، اس کو زمین سے اتنا اوپر رکھنا چاہئے کہ ناپاکی سے لگنے کا موقعہ ہی نہ آئے، پس ایک حکمت تو حضورؐ نے یہ بیان فرمائی کہ اس میں صفائی ہے، پاکیزگی ہے!

دوسری حکمت: حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ اگر لنگی اونچی پہنی جائے گی تو کپڑا جلدی پھٹے گا نہیں اور نیچی پہنے گا تو چلتے وقت کپڑا پاؤں میں الجھے گا اور جب کپڑا پاؤں میں پھنسے گا تو آدمی چلتے چلتے گر بھی سکتا ہے اور کپڑا بھی جلدی پھٹے گا۔ اور اونچا پہنا ہوگا تو چلتے وقت کپڑا الجھے گا نہیں اور جلدی پھٹے گا بھی نہیں، یہ کپڑا اونچا پہننے میں اقتصادی فائدہ ہے۔

جب یہ دو باتیں حضورؐ نے حضرت ازہر رضی اللہ عنہ کو بتائیں تو ان میں سے جو پہلی حکمت تھی اس کے بارے میں تو انھوں نے کچھ نہیں کہا، لیکن جو دوسری حکمت تھی کہ کپڑا زیادہ دنوں تک چلتا ہے اس کے بارے میں انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! إِنَّمَا هِيَ بَرْدَةٌ مَلْحَاءُ: اے اللہ کے رسول! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے، چار پیسے کی ہے، جلدی پھٹ جائے گی تو کیا پریشانی ہے! کوئی قیمتی کپڑا تو ہے نہیں کہ آدمی اس کو احتیاط سے استعمال کرے، انھوں نے بات ٹھیک ہی کہی تھی، مگر حضورؐ نے ان کی بات کا جواب نہ دے کر بات دوسری طرف پھیر دی اور ارشاد فرمایا: أَمَا لَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ: کیا تیرے لئے میرے اندر نمونۂ عمل نہیں؟!

اصل بات کا جواب نہ دینا اور بات کا رخ پھیر دینا:

جواب دینے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ کسی سے گفتگو ہو رہی ہو اور مخاطب ہماری بات

کا جواب دیدے تو پھر اس کی بات کا جواب دینا بھی ایک طریقہ ہے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بات کا رخ پھیر دیا جائے۔ قرآنِ کریم میں یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس بادشاہ کے پاس جو خدائی کا دعوے دار تھا اللہ کی دعوت لے کر گئے اور اللہ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: ﴿رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ﴾: میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بادشاہ نے جواب دیا: یہ کام تو میں بھی کرتا ہوں ﴿اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ﴾: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اور اس نے حکم دیا کہ جیل خانے سے ایک ایسے آدمی کو جس کو پھانسی کا حکم ہو چکا ہے بلاؤ، جب وہ لایا گیا تو نمرود نے کہا: جا میں نے تجھے معاف کر دیا! اور ایک بے گناہ راستہ چلتے ہوئے آدمی کو بلایا اور اس کی گردن اڑا دی اور کہا: دیکھو میں نے اس کو قتل کر دیا جس کو پھانسی کا حکم ہو گیا تھا، میں نے اس کو معاف کر دیا، پس زندہ تو میں بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں۔

اس بے وقوف کو کون سمجھائے کہ اس کا نام زندہ کرنا اور مارنا نہیں ہے، مگر وہ بادشاہ تھا، خدائی کا دعویدار تھا، غرور اس کے دماغ میں بھرا ہوا تھا، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا، بلکہ دوسری دلیل پیش کی، فرمایا: میرا پروردگار وہ ہے جو روزانہ مشرق سے سورج نکالتا ہے اگر تو خدا ہے تو کل سورج مغرب سے نکال: ﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ﴾: پس وہ حیران رہ گیا کہ کیا جواب دے۔

مجھے اس مثال سے سمجھانا یہ ہے کہ کسی سے گفتگو ہو رہی ہو اور وہ ہماری بات کا جواب دیدے اور وہ جواب غلط ہو مگر اس کی غلطی واضح کرنے کا موقع نہ ہو تو پھر جواب کا جواب دینے سے بہتر یہ ہے کہ بات کا رخ پھیر دیا جائے اور دوسرے انداز سے بات کی جائے۔

غرض: جب حضرت ازہر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ تو لٹھے کی لنگی ہے! چار پیسے کی ہے! جلدی پھٹ جائے گی تو کیا نقصان ہے؟ سسری کو پھینک دیں گے اور دوسری لے آئیں گے، پس حضورؐ نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا حالانکہ اس کا جواب تھا۔

میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے:

اس کا جواب کیا ہے؟ جواب: مال اللہ کی نعمت ہے اور انسان مال میں منیجر ہے، مالک

نہیں ہے ﴿جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾: اللہ نے ہمیں مال میں منیجر بنایا ہے، پس ایک ایک پیسہ صحیح طریقہ پر استعمال کرنا: یہ اسلام کی تعلیم ہے، حدیث شریف میں ہے: **الاقتصاد نصف المعيشة**: میانہ روی سے خرچ کرنا آدھی کمائی ہے، اگر آپ مہینہ میں پانچ ہزار روپے کماتے ہیں تو ڈھنگ سے خرچ کرنے کی صورت میں وہ دس ہزار کا کام دیں گے، اور اگر آپ ان کو بے ڈھنگے طریقہ پر خرچ کریں گے تو وہی پانچ ہزار روپے ڈھائی ہزار کا کام کریں گے۔

مال مایۂ زندگانی ہے:

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے مال کو لوگوں کے لئے سہارا فرمایا ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾: اور نہ دو تم کم عقلوں (یتیموں) کو ان کے وہ مال جس کو اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے، یعنی زندگی مال کے سہارے قائم ہے۔ اس آیت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مال کتنی اہم چیز ہے، اتنی اہم چیز کو اناپ شناپ اڑا دینا سمجھ داری کا کام نہیں، چیز جتنی اہم ہوتی ہے اتنی ہی احتیاط کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے، لہٰذا اگر آپ یہ سمجھیں کہ میرے پاس تو پیسے بہت ہیں، اس لئے ایک گڈی صبح چولہے میں جلا کر ناشتہ پکائیں، اور ایک گڈی شام کو تو مال کئی دن چلے گا؟ ٹھیک ہے آپ کے پاس مال بہت ہے، مگر اس طرح گڈیاں جلا جلا کر کھانا پکانا حرام ہے، اس لئے کہ پیسہ لوگوں کے لئے سہارا ہے۔ اس کو فضول خرچ کرنا جائز نہیں۔

فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے:

یہاں ایک اہم بات سمجھ لینی چاہئے، اور وہ ایک سوال کا جواب بھی ہے، سوال یہ ہے کہ ہر فرد کے پاس مال کہاں ہے، مال تو مالداروں کے پاس ہے، پھر مال (تمام) لوگوں کے لئے سہارا کیسے ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فرد کی مالداری قوم کی مالداری ہے، اور فرد کی ناداری قوم کی ناداری ہے، کیونکہ ہر آدمی ملت کا فرد ہے، پس اگر ملت کا کوئی فرد کمزور ہوگا تو پوری ملت کمزور ہوگی

اورملت کے افراد مضبوط ہونگے تو پوری ملت مضبوط ہوگی، جیسے ہاتھ کی کوئی انگلی کمزور ہوگی تو پورا ہاتھ کمزور ہوگا، اور ایک انگلی مضبوط ہوگی تو تمام انگلیوں کو اس کی طاقت پہنچے گی، پس ملت کے بعض افراد اگر کمزور ہوں گے تو ان کی کمزوری کا اثر ملت تک پہنچے گا اور ملت کے افراد مضبوط ہوں گے تو پوری قوم اس کی طاقت محسوس کرے گی، اس لئے اگر کوئی کہے کہ میرے پاس مال ڈھیروں ہے، اس لئے گڈیاں جلا جلا کر کھانا پکاؤں گا تو یہ حرام ہے، کیونکہ تیرے پاس جو مال ہے وہ صرف تیرا نہیں ہے، اس مال سے پوری ملت کو فائدہ پہنچنا ہے، رہے گا اگرچہ وہ تیرے ہی پاس لیکن ملت اس کے ذریعہ سے قوت پائے گی، لہٰذا مال کو سلیقہ کے ساتھ اور پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا یہ شریعت کی تعلیم ہے۔

غرض: ان صحابی کو یہ جواب دیا جاسکتا تھا کہ ٹھیک ہے لٹھے کی لنگی ہے، معمولی قیمت کی ہے، مگر ہے وہ بھی مال! اسے بھی قاعدہ سے استعمال کرنا چاہئے، وہ اگر چار دن سے زیادہ چلتی ہے تو وہ بھی انسان کے لئے سہارا ہے، لیکن حضورؐ نے یہ جواب نہیں دیا، بلکہ بات پھیر دی اور فرمایا: أَمَالَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ: کیا تیرے لئے میری ذات میں کوئی نمونہ نہیں! یعنی تو مجھے مشعل راہ کیوں نہیں بناتا؟ اب جو حضرت ازہرؓ نے حضورؐ کی لنگی پر نظر ڈالی تو اس کو آدھی پنڈلی تک بندھا ہوا پایا، پس انھوں نے فوراً اپنی لنگی آدھی پنڈلی پر باندھ لی۔ جب حضورؐ کا نمونہ سامنے آیا تو اب کوئی سوال باقی نہ رہا، اور جہاں تک حضورؐ کی لنگی تھی وہیں تک اپنی لنگی بھی باندھ لی!

احکام کی سب سے بڑی حکمت اللہ ورسول کا فرمان ہے:

اور اس حدیث شریف سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کو احکام کی حکمت جاننی چاہئے، لیکن اگر کسی حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ وہ اللہ ورسول کا حکم ہے، یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد کسی اور حکمت کی ضرورت نہیں رہتی، یہی سب سے بڑی حکمت ہے۔

روزے: رمضان ہی کے کیوں فرض ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ

الْقُرْآنُ﴾: رمضان کے روزے اس لئے فرض کئے گئے ہیں کہ رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآنِ کریم اتارا گیا ہے، اور قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، وہ اللہ کی صفت ہے، اللہ کی آخری کتاب ہے اور قیامت تک اس کو باقی رہنا ہے، اتنی اہمیت رکھنے والی کتاب اس مہینے میں اتاری گئی ہے، اور آپ حضرات جانتے ہیں کہ کسی دن میں یا کسی مہینہ میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو وہ دن اور مہینہ یادگار بن جاتا ہے، جیسے ہمارے ہندوستان میں ۲۶ جنوری اور ۱۵ اگست کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ ملک کی آزادی کے تعلق سے ان دنوں میں بڑا واقعہ پیش آیا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رمضان کو اہمیت اس لئے حاصل ہوئی ہے کہ اس میں ایک بہت بڑا واقعہ پیش آیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس مہینہ میں قرآن اتارا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی تین صفتیں:

قرآنِ کریم کی کیا اہمیت ہے؟ ارشاد فرمایا: ﴿هُدًى لِلنَّاسِ﴾: یہ قرآن تمام لوگوں کے لئے راہ نما کتاب ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، تمام لوگوں کے لئے راہ نما ہے اور قرآن کریم کے شروع میں جو ہے: ﴿هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ﴾: یعنی قرآنِ کریم پرہیزگاروں کے لئے راہ نما کتاب ہے، ان دونوں آیتوں میں بعض لوگ تعارض سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ غور کریں تو ان میں کوئی تعارض نہیں۔ قرآن کے شروع میں جو آیت ہے وہاں یہ تھوڑئے ہے کہ یہ صرف متقیوں کے لئے ہدایت ہے، صرف کا لفظ استعمال نہیں کیا، پھر جب دوسری آیت میں فرمایا کہ قرآن تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے تو متقی بھی اس میں شامل ہوگئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ یہ چیز دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہے، پھر کسی موقعہ پر کہے کہ یہ چیز ایشیا والوں کے لئے ہے تو اس میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ تمام انسانوں کے اندر ایشیا والے بھی داخل ہیں، پس جب تمام انسانوں کے لئے قرآن کتاب ہدایت ہے تو اس میں متقی بھی آگئے، ان کے لئے بھی یہ کتاب: کتاب ہدایت ہے۔

گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں:

اور اگر کوئی کہے کہ چلو مان لیا کہ ان میں تعارض نہیں، مگر سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کہا

ہے؟ یہ اسلوب بیان بدلا ہوا کیوں ہے؟ ایک جگہ کہا کہ یہ متقیوں کے لئے کتاب ہدایت ہے، اور دوسری جگہ کہا کہ یہ تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ گفتگو کے مواقع مختلف ہوتے ہیں، ایک موقعہ تعریف کا ہوتا ہے اور ایک موقعہ اظہار حقیقت کا، یعنی بات صاف صاف بیان کرنے کا، دونوں موقعوں کے تقاضے الگ الگ ہوتے ہیں، مثلاً کسی ملک کی تاریخ لکھنی ہو تو تاریخ میں سب چیزیں بتائی جائیں گی کہ اس ملک میں یہ جانور ہیں، ان جانوروں میں کتے، خنزیر، لومڑیاں وغیرہ سب گنائے جائیں گے، جتنے کیڑے مکوڑے ہیں سب گنائے جائیں گے، غرض ملک میں جو بھی چیز ہے اچھی ہو یا بری وہ سب گنائی جائے گی، کیونکہ وہ کتاب ملک کی حالات پر لکھی جارہی ہے، اور اگر اسی ملک کا بادشاہ یا وزیر اعظم مہمان آئے، اور اس کی تعریف میں سپاس نامہ پڑھا جائے، اور اس میں آپ پڑھیں کہ ان کے ملک میں اتنے خنزیر ہیں اور اتنے کتے ہیں تو لوگ وہیں ماریں گے، وہاں تو اس کی تعریف میں بڑی بڑی چیزیں ذکر کی جائیں گی کہ یہ وہ صاحب ہیں جن کے ملک میں ایسے ایسے سائنس دان ہیں، ایسے ایسے انجینئر اور فلاسفر ہیں، غرض جو قابل تعریف چیزیں ہوتی ہیں وہی سپاس نامہ میں لکھی جاتی ہیں، دوسری چیزیں نہیں لکھی جاتیں، قرآن کریم کے شروع میں قرآن کی تعریف کی جارہی تھی، اس لئے وہاں جو اہمیت رکھنے والی چیز تھی اس کا تذکرہ کیا اور فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾: یہ کتاب متقیوں کے لئے راہ نما ہے، دنیا میں جو بڑے بڑے لوگ ہیں انبیاء، اولیاء، شہداء، صالحین وہ سب اس کتاب کے محتاج ہیں، اس کتاب کی راہ نمائی کے بغیر یہ بڑے بڑے حضرات بھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اتنے بڑے لوگوں کا اس کتاب کا محتاج ہونا یہ قرآن کی تعریف ہے، اور اگر یوں کہیں کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی جاہلوں کو ضرورت ہے تو یہ قرآن کی کیا تعریف ہوئی؟ جاہل کو تو بہر حال ضرورت ہوتی ہے۔ اور آیت ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ میں قرآن کی تعریف نہیں کی جارہی ہے، بلکہ قرآن کی حقیقت سمجھائی جارہی ہے کہ رمضان میں جو قرآن اتارا گیا ہے وہ کس مقصد سے اتارا گیا ہے، فرمایا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾: وہ تمام لوگوں کے لئے ہدایت بنا کر اتارا گیا ہے۔ یہ قرآن کی پہلی صفت ہے۔

خیر کی طرح شر بھی اللہ کے قبضہ میں ہے:

اس فرق کو ایک مثال سے سمجھو! قرآن کریم میں ایک جگہ اللہ کی تعریف ہے: ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ، وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾: اے اللہ! اے ملک کے مالک! جس کو آپ چاہتے ہیں ملک دیتے ہیں اور جس سے چاہتے ہیں ملک لے لیتے ہیں، جسے چاہتے ہیں عزت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ذلت سے ہم کنار کرتے ہیں، آپ کے قبضہ میں خیر ہے۔

سوال یہ ہے کہ شر کس کے قبضہ میں ہے؟ وہ بھی تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، پھر صرف ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ کیوں کہا؟ اور دوسرا حصہ کیوں چھوڑ دیا؟ جواب: یہاں اللہ کی تعریف کی جارہی ہے، تعریف کے موقعہ پر یہ کہنا کہ اے اللہ! آپ کے ہاتھ میں خیر بھی ہے اور شر بھی یہ تعریف کے منافی ہے، اس لئے اس کو چھوڑ دیا اور فرمایا: ﴿إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾: آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ اس طرح جو بات چھوڑ دی تھی اس کو دوسرے انداز میں بیان کر دیا۔ غرض: تعریف کے موقعہ پر تعریف کا پہلو اجاگر کیا جاتا ہے اور دوسرے موقعہ پر بات کھول کر سمجھائی جاتی ہے۔

قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ﴾: اس آیت میں مضمون یہ ہے کہ کافر جو نبیوں کے مخالف ہیں، جب ان کو خیر پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ﴿هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: یہ خیر تو اللہ نے پہنچائی، اور اگر انہیں برے احوال پہنچتے ہیں تو وہ اپنے پیغمبر سے کہتے ہیں: ﴿هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ﴾: یہ نحوست تمہاری وجہ سے آئی ہے، تم جیسا منحوس آدمی ہماری قوم میں پیدا ہوا اس لئے یہ مصیبتیں آئیں، قرآن نے نبیوں سے کہا: ان کو جواب دو: ﴿قُلْ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾: سب حالات اللہ کی طرف سے آتے ہیں، یہاں چونکہ اظہار حقیقت کا موقعہ ہے، اس لئے فرمایا کہ اچھے اور برے سب حالات اللہ کی طرف سے آتے ہیں اور وہاں: ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾: کہہ کر شر کو چھوڑ دیا۔

غرض: گفتگو موقعہ کے اعتبار سے کی جاتی ہے، چونکہ قرآن کے شروع میں قرآن کی تعریف کی جارہی ہے، اس لئے کہا: یہ قرآن متقیوں کے لئے کتاب ہدایت ہے اور یہاں چونکہ قرآن کی حقیقت بیان کی جارہی ہے اس لئے فرمایا: قرآن تمام لوگوں کے لئے کتاب ہدایت ہے۔

قرآن میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں:

دوسری خوبی قرآن کی یہ ہے کہ اس میں ہدایت کی واضح دلیلیں ہیں: ﴿وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدٰى﴾: اتنی آسان اور واضح کتاب کہ ہر انسان خواہ مرد ہو عورت ہو، شہری ہو دیہاتی ہو، عالم ہو یا جاہل ہو ہر کوئی قرآن کی بات سمجھ سکتا ہے۔

قرآن: فرقان ہے!

اور تیسری خوبی اس کی یہ ہے کہ یہ فرقان ہے، جدا کرنے والی کتاب ہے، یعنی اس قرآن نے آکر دودھ اور پانی کو الگ الگ کردیا ہے، کفر اور ایمان میں خط امتیاز کھینچ دیا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے۔

جب ایسی اہمیت رکھنے والی کتاب اس مہینہ میں اتاری گئی ہے تو اس مہینہ کو بھی کوئی اہمیت ملنی چاہئے، اس لئے فرمایا: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾: پس جو تم میں سے اس مہینے کو دیکھے وہ اس مہینے کے روزے رکھے، اس سے معلوم ہوا کہ اس مہینہ کے روزے اس لئے رکھے گئے ہیں کہ اتنی اہم کتاب اس مہینہ میں اتاری گئی ہے۔

رمضان میں دو چیزیں اہم ہیں:

خلاصہ یہ نکلا کہ اس مہینہ میں دو چیزیں اہمیت رکھنے والی ہیں، ایک قرآن ہے، اور قرآن کی اہمیت پورے بارہ مہینے ہے، لیکن اس مہینہ میں اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ دوسری: خود اس مہینہ کی بھی اہمیت ہے، اس لئے اس مہینہ میں دو چیزیں رکھی گئی ہیں، روزہ اور تراویح۔ روزہ وقت کی اہمیت کا حق ادا کرنے کے لئے ہے اور تراویح قرآنِ کریم کا حق ادا کرنے کے لئے ہے اور یہی دو عبادتیں اس مہینہ کی خاص عبادتیں ہیں۔

روزہ اور تراویح مؤمن کے لئے سفارش کریں گے:

اور حدیث شریف میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن روزہ اور قرآن دونوں مؤمن کے لئے سفارش کریں گے، روزہ کہے گا: اے پروردگار! میں نے آپ کے اس بندے کو کھانے پینے سے اور لذتوں سے دن بھر روکے رکھا اور یہ مسلسل رکا رہا لہٰذا میں اس کے لئے سفارشی بن کر آیا ہوں، آپ میری سفارش قبول فرمائیں، اور اس کی مغفرت فرمائیں۔ اور قرآن کہے گا: خدایا! میں نے اس کو رمضان کی راتوں میں سونے نہیں دیا، اس نے میری بات مانی اور وہ سویا نہیں اور مجھے پڑھتا رہا اور میرا حق اس نے ادا کیا اس لئے خدایا میں آپ کی بارگاہ میں سفارشی بن کر آیا ہوں، لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرمائیں، اور اس کی بخشش فرمائیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دونوں کی سفارش قبول فرمائیں گے اور اس مؤمن کی بخشش فرمادیں گے جس نے دونوں کا حق ادا کیا ہے، یہ حدیث بیہقی کی شعب الایمان میں ہے، اور مشکاۃ کی کتاب الصوم (حدیث ۱۹۶۳) میں ہے، پس یہی دو عبادتیں اس مہینہ میں اہم ہیں، اگر ہم ان کا حق ادا کردیں تو بیڑا پار ہے۔

بھاری عبادتوں کو آسان بنانے کا فارمولہ:

لیکن یہ دونوں عبادتیں بھاری ہیں اور جب روزے گرمیوں میں آتے ہیں تو اور بھی بھاری ہوجاتے ہیں، گرمی تو ہوتی ہی ہے، اور دن بھی بڑا ہوجاتا ہے، ایسے میں کاشتکار کو کھیت میں ہل چلانا پڑتا ہے، چھٹی نہیں کرسکتا، کیونکہ کوئی دو دن کا تو مسئلہ نہیں، پورے مہینہ کا کام ہے، اور رات میں سونے کو بڑا دل چاہتا ہے، مگر کھڑے ہوکر قرآن پڑھنا پڑتا ہے اس لئے حضورؐ نے اُن حدیثوں میں جو میں نے خطبہ میں پڑھی ہے اس بھاری اور مشکل کام کو آسان بنانے کا فارمولہ بیان فرمایا ہے۔

وہ فارمولہ ہے: إِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا۔ ایمان کے جو معنی معروف ہیں، وہ یہاں مراد نہیں۔ یہاں ایمان کے معنی ہیں: یقین، اور احتساب کے معنی ہیں: ثواب کی امید رکھنا۔ پس اس

جملہ کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ نے اعمال پر جو ثواب کے وعدے کئے ہیں: اس پر پختہ یقین رکھنا، اور اس کو نظروں کے سامنے لانا یہ مشکل سے مشکل کام کو نہایت آسان بنادیتا ہے۔

اس کی تھوڑی تفصیل یہ ہے کہ اللہ نے جو احکام ہم پر لازم کئے ہیں وہ بیگار نہیں ہیں۔ بیگار کا مطلب ہے: مفت میں کام لینا، پرانے زمانے میں راجے مہاراجے لوگوں سے مفت میں کام لیتے تھے، اس کو بیگار کہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمارے خالق و مالک ہیں اور ہم ان کے بندے ہیں، وہ ہمارے پالنہار ہیں اور ہم ان کا رزق کھاتے ہیں وہ جو حکم دیں ہمارے لئے ان کو بجالانا ضروری ہے، وہ اس کے بدلہ میں کچھ بھی نہ دیں تو بھی انہیں حق پہنچتا ہے، مگر انھوں نے ہم سے بیگار نہیں لی، بلکہ یہ کہا کہ کام کرو ہم اتنا ثواب دیں گے۔ یہ جو ثواب کے وعدے اللہ نے کئے ہیں ان وعدوں کو نگاہوں کے سامنے لایا جائے تو کام ہلکا ہوجائے گا۔

جیسے ایک آدمی ہے، اسے معلوم ہے کہ میں دفتر جاؤں گا تو مہینہ کے آخر میں دس ہزار روپے تنخواہ ملے گی، چنانچہ رات کے دو بجے بھی اس کی ڈیوٹی ہوتی ہے تو چاہے آسمان زمین ٹل جائیں، مگر وہ ٹھیک وقت پر حاضر ہوگا، اور جب اس کے آٹھ گھنٹے پورے ہوجائیں گے تو کچھ لے کر نہیں لوٹے گا، جیسا خالی ہاتھ گیا تھا ویسا ہی خالی ہاتھ آجائے گا، جاتے ہوئے بھی گاڑی میں تیل اپنے پیسوں سے ڈلوائے گا اور واپسی میں بھی۔ اب اگر کوئی اس سے کہے کہ بھائی آپ جیسا بے وقوف کون ہوگا کہ اتنی پابندی سے ڈیوٹی پر جاتے ہو اور اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے تیل بھی ڈلواتے ہو، لیکن لاتے کچھ بھی نہیں، تو وہ جواب دے گا کہ بے وقوف میں نہیں ہوں، جناب عالی ہیں (ج: مخفف ہے جاہل کا، ن: نالائق کا، الف: الّو کا، ب: باؤلے کا اور عالی کے معنی ہیں: مہا، بہت بڑا) میں اگرچہ آج کچھ نہیں لاتا، مگر جب مہینہ پورا ہوگا تو لاؤں گا۔

میرے بھائیو! پھر عبادتوں میں اور احکام کی بجا آوری میں انسان کیوں یہ امید رکھے کہ میں گھر سے نماز پڑھنے جاؤں تو میری نماز کا سلام پھرنا نہیں چاہئے کہ میری جیب بھر جائے۔ دنیا کے کاموں میں ایک وقت کے بعد تنخواہ ملتی ہے، اسی طرح اللہ نے جو عبادتیں رکھی ہیں ان کے ثواب کے لئے بھی اللہ نے ایک وقت مقرر کیا ہے، اس وقت تک انتظار

کیوں نہیں کیا جاتا، اور وہ وقت موت ہے، آنکھ بند ہوتے ہی ساری زندگی کے کئے ہوئے کاموں کا ثواب سامنے آجائے گا۔

یہ جو ثواب مرنے کے بعد ملے گا اس کو ذہن میں تازہ کرلیا جائے کہ میں جو روزے رکھتا ہوں اس کا ثواب مجھے ضرور ملے گا، میں جو تراویح پڑھتا ہوں تو مجھے اس کا ثواب ملے گا، اس ثواب کی امید کو تازہ کرنا مشکل سے مشکل کام کو آسان بنادیتا ہے۔ غرض حضورؐ نے یہ فارمولہ بتایا کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ اور جس نے تراویح پڑھی یقین کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ، اور جس نے شب قدر میں عبادتیں کیں اسی ایمان و احتساب کے ساتھ تو تینوں کا بدلہ ہے: **غُفِرَ له ماتقدم من ذنبه**: اس کے گذشتہ تمام گناہ معاف ہوجائیں گے اور اس کی پچھلی تمام زندگی کا ریکارڈ صاف ہوجائے گا۔

چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے:

یہاں اگر کوئی شخص کہے کہ جب ان تینوں کا فائدہ ایک ہی ہے تو پھر تینوں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تینوں میں سے ایک کام کرلیا جائے تو ریکارڈ صاف ہوجائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب چند مکفرات جمع ہوتے ہیں تو جلا پیدا ہوتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھو: ہمارے ہندوستان میں جب عورتیں کپڑے دھوتی ہیں تو پہلے صابن لگاتی ہیں، صابن کیا کام کرتا ہے؟ میل کاٹتا ہے! پھر کپڑے کو کوٹتی ہیں اور پانی سے دھوتی ہیں، جب کپڑا صاف ہوجاتا ہے تو اس کو نیل میں ڈالتی ہیں، نیل کیا کام کرتی ہے؟ نیل کپڑے میں چمک پیدا کرتی ہے یا ایک پاؤڈر ٹینی پال ہے اس میں ڈالتی ہیں، وہ بھی کپڑے میں جلا (چمک) پیدا کرتا ہے، پھر جب کپڑے پریس ہو کر تیار ہوجاتے ہیں تو نہایت اجلے معلوم ہوتے ہیں۔

اب اگر کوئی کہے کہ بھائی جب تینوں (صابن، نیل اور ٹینی پال) کا کام ایک ہی ہے تو تینوں چیزیں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بس صابن سے دھوڈالو، کیا ضرورت ہے نیل ڈالنے کی؟ تو سب یہی کہیں گے کہ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہے، اگرچہ سب چیزیں ایک ہی کام

کرتی ہیں، مگر جب یہ سب چیزیں اکٹھا ہوں گی تو ان کی صورت کچھ اور ہو جائے گی۔

اسی طرح دو آنکھیں ہیں، جو کام ایک آنکھ کرتی ہے وہی دوسری بھی کرتی ہے، پھر دوسری بیکار ہوئی؟ نہیں! بیکار نہیں ہے، دو کا کام دو کا ہے، اور ایک کا کام ایک کا ہے، اسی طرح گناہوں کی صفائی اور معافی ایک کام سے ہوگی تو اس کی شکل اور ہوگی، اور تین سے ہوگی تو اس کی شکل اور ہوگی، اس سے آدمی کی صفائی بڑھ جائے گی۔

رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں:

رمضان میں دو نمازیں الگ الگ ہیں، ایک نماز سونے سے پہلے ہے، اس کا نام قیام رمضان ہے، اسی کا نام تراویح بھی ہے، اس کی جماعت کے ساتھ بیس رکعتیں ہیں، اور یہ نماز سونے سے پہلے پڑھنی ہے، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو میں نے ابھی سنائی کہ تراویح مؤمن کے لئے سفارش کرے گی، سفارش کرتے ہوئے وہ کہے گی: اے اللہ! میں نے اس بندے کو سونے سے روکا، میں نے اس کو سونے نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ نماز سونے سے پہلے ہے۔

اور ایک دوسری نماز ہے جو پورے سال پڑھی جاتی ہے، اسے رمضان میں بھی پڑھنا ہے، اور وہ تہجد کی نماز ہے، جب آپ سحری کے لئے اٹھیں تو سحری ہی میں نہ لگ جائیں، سحری ضرور کھائیں مگر تہجد بھی پڑھیں، یہ تہجد حضورؐ بارہ مہینے پڑھتے تھے اور اس کی آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے، رمضان کی وجہ سے اس کی رکعتوں میں اضافہ نہیں ہوتا تھا، لہٰذا جب ہم سحری کے لئے اٹھیں تو ہمیں تہجد کی آٹھ رکعتیں ضرور پڑھنی چاہئے، دوسرے گیارہ مہینوں میں تو ہم تہجد کے لئے اٹھ نہیں پاتے، لیکن رمضان میں تو سحری کھانے کے لئے اٹھنا ہی ہے، پھر ہم خرما و ہم ثواب کیوں نہیں کر لیتے، اور آٹھ پڑھنی ضروری نہیں، اگر آپ آٹھ نہ پڑھ سکیں تو چھ پڑھ لیں، چار کا موقعہ ہو تو چار پڑھ لیں، ورنہ کم از کم دو تو ضرور پڑھ لیں۔

تراویح کی نماز آسان ہے، لوگوں نے اس کو مشکل بنادیا ہے:

اور تراویح کو تراویح کیوں کہتے ہیں؟ اس لئے کہ ہر چار رکعت پر ترویحہ آتا ہے اس

لئے اس کو تراویح کہتے ہیں اور ترویحہ کے معنی ہیں: آرام کرنا۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ تراویح کی چار رکعتیں جتنی دیر میں پڑھی جاتی ہیں اتنی دیر آرام کرنا چاہئے، پھر اگلی چار رکعتیں پڑھی جائیں، پھر اتنی ہی دیر آرام کیا جائے، دس منٹ میں اگر آپ نے چار رکعتیں پڑھی ہیں تو دس منٹ آرام کریں، مگر ہم اس طرح تراویح نہیں پڑھتے، اس لئے تھک جاتے ہیں۔

مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ جب ہم گھنٹے سوا گھنٹے میں تھک جاتے ہیں تو اگر دس دس منٹ وقفہ کریں گے تو ڈھائی گھنٹے لگیں گے، ڈھائی گھنٹے میں تو ہم اکڑ کر لاٹھی بن جائیں گے۔

میرے بھائیو! ایسا نہیں ہے، ہم جو جلدی جلدی پڑھتے ہیں یہی چیز ہمیں تھکا دیتی ہے، اتنا فٹافٹ جگاڑ چلتا ہے کہ رکوع وسجدہ میں دو مرتبہ بھی تسبیح نہیں کہہ پاتے، یاد رکھو جتنا جلدی کروگے اتنا ہی تھکوگے، اور اگر دس منٹ میں چار رکعات پڑھو اور دس منٹ آرام کرو، پھر اگلا ترویحہ دس منٹ میں پڑھو اور دس منٹ آرام کرو تو کبھی تھکن نہیں ہوگی، جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اس نماز کو بوجھ بنا رکھا ہے، ہم جلد سے جلد اپنے سر سے اس کو ٹال دینا چاہتے ہیں اور گھنٹے سوا گھنٹے میں نمٹ کر پھر چوراہے پر کھڑے کھڑے دو گھنٹے گپ کرتے ہیں، نہ نیند آتی ہے، نہ کسی کام کا تقاضہ ہوتا ہے۔

پس اگر **ایمانا واحتسابا** والا فارمولہ ہمارے پیش نظر رہے تو یہ نماز ہم پر بھاری نہیں ہوگی، بلکہ اس میں مزہ اور لطف آئے گا۔ اللہ تعالی ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں اور تمام عبادتوں کو ثواب کے یقین وامید کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین یارب العالمین) **وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین۔**

ے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز عید سے پہلے خطاب

[یہ خطاب شہر لندن کی مسجد قبا میں نماز عید الفطر سے پہلے فرمایا ہے]

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾
[البقرۃ ۱۸۵]

محترم بھائیو اور بزرگو! رمضان کا مبارک مہینہ گذر گیا۔ اللہ جل شانہ نے اس مبارک مہینے میں ہمیں جو خیر کے کاموں کی توفیق عطا فرمائی اس پر ہم اللہ کا شکر بجالاتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم سے کوتاہیاں ہوگئی ہیں: ہم بارگاہ خداوندی میں توبہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائیں۔

مبارک مہینہ گذرنے کے بعد آج شوال کا پہلا دن آیا ہے، یہ عید کا دن ہے، اللہ کی بارگاہ میں دوگانۂ شکر بجالانے کا دن ہے۔ اور ہم اس کی بارگاہ میں دوگانۂ شکر بجالانے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

عید کی نماز اور تکبیرات زوائد کا قرآن سے استنباط:

اس نماز کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تمہیں راہ ہدایت دکھائی، اور تاکہ تم شکر بجالاؤ، دنیا میں بے شمار انسان ہیں جن کو ہدایت کی راہ نظر نہیں آئی، کیونکہ انھوں نے ہدایت کا راستہ دیکھنا ہی نہیں چاہا اس لئے اللہ نے ان

کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھایا، اور ہم نے اللہ کی توفیق سے ہدایت کا راستہ دیکھنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے دکھلایا، ہمیں مؤمن بنایا، ہمیں اعمال کی توفیق عطا فرمائی، ہمیں اعمال کا شوق عطا فرمایا، پورا مہینہ ہم نے روزے رکھے، تلاوتیں کیں، نمازیں پڑھیں، اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرنی چاہئے، آیت کے اس حصہ میں ایک اشارہ ہے، مگر وہ اشارہ اللہ کا رسول ہی سمجھ سکتا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے، اشارے تو ہم بھی سمجھتے ہیں مگر یہ اشارہ اللہ کا رسول ہی سمجھ سکتا ہے، ہم نہیں سمجھ سکتے، چنانچہ نبی ﷺ نے: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ﴾ سے تکبیراتِ زوائد اور ﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ سے نماز عید مستنبط فرمائی، پھر تکبیراتِ زوائد کو عید کی نماز میں شامل فرمایا، اس طرح اس اشارے کو پھیلانا مجتہدین کے بس کی بات نہیں، یہ رسول ہی کا منصب ہے۔

اس کی نظیر: قرآن میں جگہ جگہ فرمایا ہے: ﴿أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾: نماز کا اہتمام کرو، نماز کیا ہے؟ اس کو کس طرح سے پڑھا جائے، اور اس کا اہتمام کیسے کیا جائے؟ یہ سب باتیں اللہ کا رسول ہی سمجھ سکتا ہے، کیونکہ وہ اللہ کے سمجھانے سے سمجھتا ہے، چنانچہ آپؐ نے اس کی پوری تفصیل پیش کردی ہے۔

اسی طرح اس آیتِ کریمہ میں جو اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا ذکر ہے، وہ بڑائی کیسے بیان کی جائے؟ یہ بات اللہ کا رسول ہی بتائے گا اور اللہ کے سمجھانے سے بتائے گا۔ چنانچہ اللہ کے رسول نے عملی طور پر سمجھایا کہ رمضان کے ختم پر دوگانۂ شکر ادا کیا جائے، شہر وقصبات اور بڑے گاؤں کے لوگوں پر عید کی نماز پڑھنا واجب کیا، اور اس نماز میں خاص طور پر اللہ اکبر کا اضافہ کیا۔ پہلی رکعت میں تین کا اضافہ کیا اور دوسری رکعت میں تین کا۔ یہ چھ زائد تکبیریں بھی واجب ہیں۔ اور گھر سے نماز عید کے لئے آئے تو بھی تکبیر کہتا ہوا آئے۔

عید کی نماز کے بعد دعا اور دعا کا ادب:

پھر روزوں کے بیان کے بیچ میں ایک آیت آئی ہے: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ، أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ، فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ، وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ﴾: جب آپؐ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ ان کو بتلادیں کہ میں قریب ہوں۔ لوگوں نے پوچھا تھا کہ اللہ تعالیٰ قریب ہیں کہ ہم ان کو آہستہ پکاریں یا دور ہیں کہ ہم زور

سے پکاریں؟ پس یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور کہا گیا کہ جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ بتادیں کہ اللہ قریب ہیں، پس ان کو آہستہ پکارو، چلانے کی ضرورت نہیں، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے: ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾: تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے سے پکارو! اور ایک مرتبہ نبی ﷺ سفر کرتے ہوئے جارہے تھے، لشکر زور زور سے تکبیر پڑھ رہا تھا آپؐ نے لوگوں سے فرمایا: **إنكم لاتدعون أصما ولابعيداً**: آپ لوگ کسی بہرے کو نہیں پکار رہے ہو، نہ کسی دور کو پکار رہے، پس آہستہ ذکر کرو، اللہ قریب ہیں، اور سمیع ہیں، سب کی سنتے ہیں۔

اس لئے دعا میں افضل یہ ہے کہ بہت عاجزی سے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جائے، اور یہ آیت یہاں اس لئے آئی ہے کہ عید کی نماز کے بعد دعا مانگنی ہے۔

آگے فرمایا: میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے، پس چاہئے کہ وہ میرے حکم پر لبیک کہیں، اور میری ذات پر یقین رکھیں تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔

میرے بھائیو! آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کے دن سب سے پہلے دوگانۂ عید ادا کیا جائے گا، پھر دعا مانگی جائے گی پھر اس کے بعد خطبہ ہوگا، میں ان تینوں کی تھوڑی تفصیل عرض کرتا ہوں:

عید کی نماز کا طریقہ

عید کی نماز ہمیشہ ادا کی جاتی ہے اور بڑے لوگ اس کا طریقہ جانتے ہیں، مگر چھوٹے اس کے محتاج ہیں کہ ان کو عید کی ترکیب بتائی جائے:

سب سے پہلے نیت کرنی ہے، نیت دل سے ہوتی ہے اور زبان سے بھی کہہ لیا جائے تو اچھا ہے، ضروری نہیں، یہ نیت کریں کہ میں عید کی نماز امام کی اقتدا میں پڑھتا ہوں، بس اتنی نیت کافی ہے، اور یہ بات پہلے ہی سے آپ کے دل میں ہوتی ہے، اور اسی لئے آپ تشریف لائے ہیں، مگر پھر بھی اس کا استحضار ضروری ہے، اور زبان سے بھی کہہ لیں تو اچھا ہے۔

اور عام طور پر جو نیت بتائی جاتی ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں عید کی، چھ زائد تکبیروں کے

ساتھ، منہ میرا کعبہ کی طرف: یہ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ منہ تو کعبہ کی طرف ہوتا ہی ہے، کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور عید کی دو ہی رکعتیں ہیں اس کو بھی کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اس میں چھ زائد تکبیریں بھی ہوتی ہی ہیں: اس کو بھی کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں! یہ کہنا ضروری ہے کہ امام کی اقتدا میں پڑھتا ہوں، اگر اقتدا کی نیت نہیں کرے گا تو مقتدی کی نماز نہیں ہوگی۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ ہم گھر سے عید کی نماز کی نیت ہی سے آئے ہیں، پھر دوبارہ نیت کی کیا ضرورت ہے؟

جواب: یہ ہے کہ ٹھیک ہے، مگر نیت کا تکبیر تحریمہ سے اتصال بھی چاہئے، مثلاً ایک آدمی نے نماز کی نیت کرلی، پھر کسی نے اس کے کان میں کوئی بات کہی، وہ اس نے سنی، اب وہ نماز شروع کرتا ہے تو دوبارہ نیت کرے، تکبیر تحریمہ کے ساتھ نیت کا متصل ہونا افضل ہے۔

اس کے بعد امام صاحب تکبیر تحریمہ کہیں گے، ان کی تکبیر کے بعد تمام مقتدی ہاتھ اٹھا کر تکبیر کہیں، اور تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لیں، پھر جس طرح ہر نماز میں ثناء پڑھی جاتی ہے: ثناء پڑھیں، پھر ثنا پڑھ کر خاموش ہوجائیں، اس کے بعد امام صاحب زائد تکبیریں کہیں گے، وہ یکے بعد دیگرے تین تکبیریں کہیں گے، آپ بھی کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں، اور تیسری مرتبہ میں اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیں۔ اس کے بعد امام صاحب قراءت کریں گے، سورۂ فاتحہ پڑھیں گے اور سورت ملائیں گے، پھر رکوع کریں گے، سجدے کریں گے، پھر کھڑے ہوکر قراءت شروع کریں گے۔ جب سورت پوری ہوگی تو اللہ اکبر کی آواز آئے گی، اس وقت آپ رکوع میں نہ چلے جائیں، یہ زائد تکبیریں کہی جارہی ہیں، آپ کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں، دوسری مرتبہ میں بھی یہی کریں اور تیسری مرتبہ میں بھی یہی کریں۔ اس کے بعد رکوع کی چوتھی تکبیر ہاتھ اٹھائے بغیر کہہ کر رکوع میں جائیں، اور حسب معمول نماز پوری کریں۔

اس میں اگر مقتدی سے بھول ہوجائے اور وہ تکبیر سن کر رکوع میں چلا جائے، پھر دیکھے کہ باقی سب لوگ کھڑے ہیں اور وہ کھڑا ہوجائے تو کوئی حرج نہیں، امام کے پیچھے بھول

معاف ہوتی ہے۔ باقی اسے اب رکوع ہی میں زائد تکبیریں کہنی چاہئیں، کھڑا نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ یہ فرض سے واجب کی طرف لوٹنا ہے جو جائز نہیں۔

اور اگر امام سے ایسی بھول ہوجائے اور اسے رکوع میں جانے کے بعد یاد آئے تو وہ بھی اب رکوع ہی میں زائد تکبیریں کہے اور مجمع کھڑا کھڑا تکبیریں کہے۔

اور اگر پیچھے سے لوگوں نے لقمہ دیا اور امام ہڑ بڑا کر کھڑا ہوگیا تو یہ کھڑا ہونا غلط ہے، فرض سے واجب کی طرف لوٹنا ہے، لیکن اگر کھڑا ہوگیا تو اب کھڑے ہوکر تین تکبیریں کہے، پھر رکوع کرے اور آخر میں سجدۂ سہو نہ کرے۔ دوسری نمازوں میں ایسا کرنے سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے، لیکن عید کی نماز میں سجدۂ سہو نہیں کیا جاتا، کیونکہ عید کی نماز میں عام طور پر مجمع بڑا ہوتا ہے۔ اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ عید کی نماز میں اگر کوئی بھول ہوجائے اور کوئی واجب چھوٹ جائے تو سجدۂ سہو نہیں کیا جاتا۔

پھر نماز پوری ہونے کے بعد دعا ہوگی، اور دعا میں اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں جو ارمان ہیں: وہ مانگے، البتہ کچھ دعائیں ایسی ہوتی ہیں جو سبھی مؤمنین کی آرزو ہوتی ہیں، اس لئے امام صاحب نماز کے بعد تھوڑی دیر زور سے دعا کریں، پھر وہ خاموش ہوجائیں اور لوگ اپنے دل کی مرادیں مانگیں۔

خطبہ سننا واجب ہے:

پھر دعا کے بعد امام صاحب خطبہ دیں گے، عید کا خطبہ سنت ہے، مگر اس کا سننا واجب ہے، جیسے سلام کرنا سنت ہے، مگر اس کا جواب دینا واجب ہے۔ پس ہر آدمی اپنی جگہ صف میں بیٹھا رہے اور پورا خطبہ سنے، جب خطبہ ختم ہو تو لوگ جاسکتے ہیں۔

عید کی نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ کا حکم:

اس موقعہ پر ایک خاص رسم ہے، لوگ اچھل اچھل کر معانقہ کرتے ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ یہ رسم ہے یا بدعت ہے۔ اگر آپ اس میں ثواب کا تصور کرلیں تو بدعت ہے ورنہ رسم ہے، اور رسم سے بھی بچنا ضروری ہے، اس لئے کم سے کم اس بلڈنگ کے احاطہ میں ——

اس وقت پوری بلڈنگ مسجد کے حکم میں ہے، آخر تک نماز ہوتی ہے، صفیں لگتی ہیں، اس لئے یہ پوری بلڈنگ مسجد ہے —— یہ رسم یا یہ بدعت نہیں ہونی چاہئے، آپ باہر نکل کر یا اپنے گھر جاکر جو چاہیں کریں میں منع نہیں کرتا۔ لیکن جہاں اللہ کے حکم کی تعمیل ہورہی ہو، وہاں اللہ کے حکم کے خلاف نہیں ہونا چاہئے۔

عید کے دن شیر خرما کا حکم:

ہاں ایک بات رہ گئی: اور وہ 'شیر خرما' کی بات ہے، یہ بھی ایک رسم ہے، بدعت نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی، بس ایک رسم چلی آرہی ہے اور مؤمن کو رسموں کا پابند بھی نہیں ہونا چاہئے۔ عید کے دن کچھ پکانا ہے تو پکاؤ مگر ایک ہی چیز کیوں پکڑ رکھی ہے، پلاؤ پکاؤ، کوئی اور چیز پکاؤ، جو اللہ توفیق دے پکاؤ، مگر ایک چیز پر تکیہ مت کرو، اس طرح تخصیص کرنے سے دین بگڑ جاتا ہے، دین میں جب رسمیں داخل ہوتی ہیں تو دین اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا۔

میرے بھائیو! یہ ضروری باتیں تھیں جو عرض کی گئیں، اب اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے مؤمن بندوں میں شامل فرمایا، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ شکر بجالانا بہت بڑی صفت ہے، اور اللہ کو بہت پسند ہے، ارشادِ پاک ہے: ﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ﴾: یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اعلان عام کیا کہ اگر تم میری نعمتوں کا شکر بجالاؤ گے تو میں نعمتیں اور زیادہ دوں گا، عبادتوں کی جو ہمیں توفیق ملی ہے یہ بھی ایک نعمت ہے، اس نعمت کا شکر بجالاؤ گے تو اللہ اور عبادتوں کی توفیق دیں گے، اور اگر تم نے میری نعمتوں کی ناشکری کی تو جان لو: میری سزا بہت سخت ہے۔ ﴿وَقَالَ مُوْسٰى: إِنْ تَكْفُرُوْا أَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا فَإِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ اگر تم اور ساری زمین کے لوگ مل کر ناشکری کروگے تو اللہ تعالیٰ بے نیاز ہیں، ستودہ صفات ہیں، ان کی شان میں، ان کی بادشاہت میں، ان کی عظمت میں، ان کی کبریائی میں، ان کی بڑائی میں کچھ کمی نہیں آئے گی! ہم اگر شکر بجالاتے

ہیں تو اپنے فائدے کے لئے بجالاتے ہیں، شکر بجالانے کا فائدہ ہماری طرف لوٹتا ہے۔ اس لئے اللہ کی نعمتوں کا ہمیشہ شکر بجالاؤ، اپنے گناہوں کی معافی مانگو، خاص موقعوں پر آدمی اگر گناہوں سے توبہ کرے تو توبہ کی قبولیت کا چانس زیادہ ہوتا ہے، اور اپنی زندگیوں کو اللہ کے احکام کے مطابق ڈھالنے کا پختہ ارادہ کرو، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائیں، ہماری زندگیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے احکام کے مطابق بنائیں، اور اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا وآخرت کی تمام بھلائیوں سے ہمکنار فرمائیں (آمین)

صدقۂ فطر واجب ہے:

اور آج صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے، اور اس کو عید کی نماز سے پہلے نکالنا مستحب ہے، آپ حضرات میں سے اکثر حضرات تو صدقۂ فطر ادا کر کے عید کی نماز کے لئے تشریف لائے ہونگے، اور جن حضرات نے ابھی ادا نہیں کیا وہ عید کی نماز کے بعد ادا کر دیں، باہر فطرہ کا بکس رکھا ہے، اس میں فطرہ کی رقم ڈال دیں، اور جو لوگ رقم ساتھ نہیں لائے ان کو بھی فطرہ ادا کرنا ہے، بھولیں نہیں!

شوال کے چھ روزے:

اور آخری بات یہ یاد رکھیں کہ شوال میں چھ روزے مستحب ہیں۔ مسلم شریف میں روایت ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر بعد میں شوال کے چھ روزے رکھے تو اس نے زمانہ بھر کے روزے رکھے، یعنی وہ حکماً صائم الدہر (ہمیشہ روزے رکھنے والا) ہوجاتا ہے، اس لئے جس کو اللہ توفیق دے وہ یہ چھ روزے ضرور رکھے، عید کے دوسرے ہی دن سے یہ روزے شروع کر دیئے جائیں تو آسانی سے پورے ہوجاتے ہیں، باقی متصلاً رکھنا ضروری نہیں، شوال میں متفرق طور پر رکھ لئے جائیں تو بھی درست ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ختم نبوت کا بیان

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ، وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب آیت ۴۰)

اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کے بقاء کا سامان کیا ہے

بزرگو اور بھائیو! جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو کر فرعون کے پاس پہنچے اور اس کو ایمان کی دعوت دی تو فرعون نے کہا: ﴿مَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى﴾ (طٰہٰ آیت ۴۹) تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ؟ یعنی جس رب پر ایمان لانے کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو وہ کون ہے؟ اس کا تعارف کراؤ! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿رَبُّنَا الَّذِيْٓ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ (طٰہٰ آیت ۵۰): ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی، یعنی اس کو پیدا کیا، وجود بخشا، پھر اس کی راہنمائی فرمائی، یعنی مخلوقات جس ہدایت کی اور جن چیزوں کی محتاج تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی وہ ضرورت پوری کی اور اس کی راہنمائی فرمائی۔

دنیا میں جتنی مخلوقات ہیں ان کی صرف جسمانی ضروریات ہیں، تمام مخلوقات اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے کچھ چیزوں کی محتاج ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کی بقاء کا سامان کیا، تا کہ وہ زندگی کے اسٹیج پر برقرار رہ سکے، ساتھ ہی ہر مخلوق کو یہ بھی سمجھا دیا کہ وہ ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرے اور ان سے کس طرح متمتع ہو؟ ﴿ثُمَّ هَدٰى﴾ کے مفہوم میں یہ سب کچھ شامل ہے۔

انسان کی دوضرورتیں: جسمانی اور روحانی

مگر انسان کی دوضرورتیں ہیں: ایک: اس کے جسم کی ضرورت ہے، یعنی دیگر مخلوقات کی طرح انسان بھی اپنا وجود باقی رکھنے کے لئے کچھ اسباب کا محتاج ہے، اللہ تعالیٰ نے وہ اسباب بھی پیدا کئے جو انسان کے وجود کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہیں، دوسری: انسان کی روحانی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں ایک روح ودیعت فرمائی ہے اور انسان میں دوروحیں رکھی ہیں۔ یہ بات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان فرمائی ہے۔ تمام حیوانات میں صرف ایک روح ہے وہ روح حیوانی ہے (۱) اور انسان میں دوروحیں ہیں: روح حیوانی اور روح ربانی۔ اور اللہ تعالیٰ نے روحِ حیوانی کی ضرورتوں کا بھی انتظام کیا ہے اور روحِ ربانی کی ضرورتوں کا بھی۔ اور انسانیت کے آغاز ہی سے روحِ ربانی کی ضرورتوں کا انتظام فرمایا ہے۔ آپ جانتے ہیں: جو پہلا انسان ہے وہی پہلا نبی ہے، حضرت آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان ہیں اور وہی سب سے پہلے نبی ہیں، کیونکہ انسان کی روح کی تربیت کا نظم وانتظام اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور یہ راہنمائی اللہ تعالیٰ نبیوں کے ذریعہ فرماتے ہیں۔ اور حضرت آدم علیہ السلام بھی ایک انسان تھے، ان کی اور ان کی اولاد کی روحانی ضرورت کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنایا۔ اور ان پر ہدایات نازل فرمائیں۔ اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کی روح کی اور ان کی اولاد کی ارواح کی تربیت کا انتظام فرمایا۔ یہی سلسلہ نبوت کہلاتا ہے جو انسانیت کے آغاز ہی سے شروع ہوا، پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، مختلف قوموں میں، مختلف زمانوں میں اور مختلف جگہوں میں اللہ جل شانہ نے بہت سے نبی اور رسول بھیجے۔

نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں

اور چھوٹے حضرات نبی کہلاتے ہیں، اور بڑے حضرات رسول کہلاتے ہیں۔ نبی صرف

(۱) اور اسی وجہ سے قیامت کے دن حساب کتاب کے بعد تمام حیوانات مٹی بنادیئے جائیں گے، کیونکہ ان میں روح فوقانی نہیں، جس کو عالم بالا میں بھیجا جائے۔

نبی ہوتا ہے، اور رسول نبی بھی ہوتا ہے اور رسول بھی، پس رسالت بڑا درجہ ہے، جیسے مولوی اور مفتی۔ جو مولوی ہے اس کا مفتی ہونا ضروری نہیں، لیکن جو مفتی ہے وہ مولوی ضرور ہوتا ہے (۱)

اور اس طرح بھی فرق کیا گیا ہے کہ جس انسان پر خدا کی وحی نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے اور جس کو نئی شریعت بھی عطا کی گئی ہے وہ "رسول" ہے۔

اور اس طرح بھی فرق کیا گیا ہے کہ جو مؤمنین کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں: وہ نبی ہیں، اور جو کفار کی طرف بھی مبعوث کئے گئے ہیں: وہ رسول ہیں (۲)

اور اگر ملائکہ کو شامل کر کے نسبت بیان کی جائے تو من وجہ کی نسبت ہوگی، جبرئیلؑ صرف رسول ہیں، انبیائے بنی اسرائیل صرف نبی ہیں، اور اولوالعزم رسول: رسول بھی ہیں اور نبی بھی۔

پس حضرت آدم علیہ السلام صرف نبی ہیں، اور سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں، مسلم شریف بابِ شفاعت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے، اس میں اس کی صراحت ہے: **یانوحُ! أنتَ أوَّلُ الرُّسُلِ إلی الأرض**: اے نوح! آپ زمین پر سب سے پہلے رسول ہیں۔

تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں

اور حضرت نوح علیہ السلام کا لقب آدم ثانی اور ابوالبشر ثانی ہے اور آپ کا یہ لقب اس لئے ہے کہ آج دنیا میں جتنے انسان ہیں: سب حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ﴾ (الصّفت ۷۷): اور ہم نے انہی کی اولاد کو باقی رہنے والا بنایا یعنی کشتی والوں میں سے اور کسی کی نسل نہیں چلی۔

آپ حضرات جانتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو طوفان آیا تھا اس میں تمام انسان غرق ہوگئے تھے، اس وقت انسان ساری زمین پر بسے ہوئے نہیں تھے، زمین کے ایک مخصوص حصہ میں بسے ہوئے تھے۔ اور جہاں انسان بسے ہوئے تھے، وہاں

(۱) پس دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے، نبی عام ہے اور رسول خاص۔
(۲) ان صورتوں میں بھی وہی عام وخاص کی نسبت ہوگی۔

پانی کا طوفان آیا تھا، اس لئے سب ہلاک ہوگئے، صرف حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں جو لوگ سوار تھے، جو کم وبیش اسّی مرد وزن تھے، وہی بچے، طوفان کے بعد ان کی نسلیں چلیں، مگر آہستہ آہستہ سب کی نسلیں ختم ہوگئیں، صرف حضرت نوح علیہ السلام کے جو تین صاحبزادے کشتی میں سوار تھے، انہیں کی نسلیں باقی رہیں، آج دنیا میں جتنے انسان ہیں وہ سب حضرت نوح علیہ السلام کے انہیں تین بیٹوں کی اولاد ہیں، یہی مطلب ہے ارشادِ پاک: ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِيْنَ﴾ کا، یعنی ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہی کو باقی رہنے والا بنایا یعنی سب کی نسلیں ختم ہوگئیں، صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد کی نسل چلی، اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام آدم ثانی اور ابوالبشر ثانی ہیں، اور وہی سب سے پہلے رسول ہیں، ان سے پہلے جتنے انبیاء تھے، وہ صرف نبی تھے۔

آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان انبیاء کی تعداد

حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کتنے نبی ہوئے ہیں؟ اور کون ہیں؟ یہ بات میں یقین سے نہیں بتا سکتا۔ قرآنِ کریم میں حضرت آدم ونوح علیہما السلام کا ذکر ہے، مگر آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان کتنے انبیاء ہوئے ہیں؟ اور وہ کون ہیں؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت شیث علیہ السلام کے بارے میں تقریباً اتفاق ہے کہ وہ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان ہوئے ہیں اور حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ آدم ونوح علیہما السلام کے درمیان میں ہوئے ہیں یا بعد میں؟ اور ہمارے لئے یہ بات جاننا ضروری بھی نہیں، اور دونوں کے درمیان کتنی پشتیں گذری ہیں اس کی تعیین بھی ضروری نہیں، اصل بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ رسولوں کا سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا ہے، ان سے پہلے جتنے بڑے حضرات گذرے ہیں وہ سب نبی تھے، رسول نہیں تھے۔

رسول اور نبی میں فرق کی مزید وضاحت

رسول اور نبی میں فرق اچھی طرح سمجھیں:

جو شخصیتیں مؤمنین کی طرف مبعوث کی گئی ہیں وہ انبیاء ہیں، اور جو شخصیتیں کفار کی طرف بھی مبعوث کی گئی ہیں وہ رسول ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک لمبے عرصہ تک سب انسان مؤمن تھے، پھر گمراہی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ کوئی مؤمن باقی نہ رہا۔ سب کفر وشرک کی دلدل میں پھنس گئے، پس ان کو کفر وشرک کی تاریکیوں سے نکالنے کے لئے اور ایمان کی روشنی دکھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، جو ان پر ایمان لائے وہ مؤمنین کہلائے اور جو ایمان نہ لائے وہ کافر رہے۔ غرض کفار کی طرف مبعوث ہونے والی سب سے پہلی شخصیت حضرت نوح علیہ السلام کی ہے، اس لئے وہ سب سے پہلے رسول ہیں، اور جو شخصیتیں مؤمنین کی طرف مبعوث ہوئی ہیں وہ انبیاء ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان میں انبیاءِ بنی اسرائیل ہوئے ہیں، وہ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کئے گئے تھے جو سب مؤمنین تھے، اس لئے وہ نبی کہلاتے ہیں۔

نبیوں اور رسولوں کی تعداد کتنی ہے؟

اور کتنے نبی اور کتنے رسول آئے ہیں؟ ان کی تعداد بتانا مشکل ہے، البتہ ایک ضعیف روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کی تعداد آئی ہے جن میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں (رواہ احمد، مشکوٰۃ حدیث ۵۷۳۷ باب بدء الخلق، کتاب أحوال القیامة) مگر یہ ضعیف حدیث ہے۔ اور تعداد جاننا ضروری بھی نہیں، بالاجمال تمام انبیاء پر ایمان لانا کافی ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی ہیں

نبوت کا جو سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا، وہ فخر عالم ﷺ پر پورا ہوگیا۔ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ یعنی حضرت محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، البتہ آپ میں دو صفتیں ہیں: ایک: آپؐ اللہ کے رسول ہیں، دوسری: آپؐ نبیوں کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں، نبیوں کے سلسلہ کو پورا کرنے والے ہیں، آپؐ آخری نبی ہیں، اب اور کوئی نیا نبی آنے والا نہیں۔

لے پالک کی مطلقہ سے نکاح جائز ہے

اس آیتِ پاک میں پہلا مضمون یہ ہے کہ نبی ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، اس مضمون کا ایک پسِ منظر ہے اس کو سمجھنا چاہئے۔ نبی پاک ﷺ کی ایک زوجہ تھیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا، وہ حضور اکرم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، جو حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے، حضور ﷺ نے ان کو گود لیا تھا، ان دونوں میں نباہ نہیں ہوا، چنانچہ حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دیدی، عدت کے بعد نبی ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا، کیونکہ متبنیٰ کی بیوی سے نکاح جائز ہے، مگر غیر مسلموں میں یہ تصور پایا جاتا تھا اور آج بھی پایا جاتا ہے کہ اگر کسی کی اولاد کو گود لے لیا تو وہ حقیقی بیٹا اور بیٹی کی طرح ہوجاتی ہے، اسلام نے اس خیال کو رد کردیا ہے، گود لینے سے حقیقی بیٹا بیٹی نہیں ہوجاتے، وہ غیر کا ہی بیٹا رہتا ہے، البتہ گود لینے والا اس کے ساتھ حسن سلوک کرسکتا ہے، بلکہ کرنا چاہئے۔

ظہار سے بیوی ماں نہیں ہوجاتی

اس کی نظیر ظہار ہے، ظہار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ دے کہ تو میرے لئے میری ماں کی طرح ہے۔ اس طرح کہنے سے ظہار ہوجاتا ہے اور کفارہ کی ادائیگی تک بیوی حرام ہوجاتی ہے، جب تک کفارہ ادا نہیں کرے گا بیوی سے صحبت کرنا جائز نہیں ہوگا، مگر بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں نہیں بن جاتی، بدستور بیوی ہی رہتی ہے، اسی طرح گود لیا ہوا بچہ جس کا ہے اسی کا رہتا ہے، گود لینے سے وہ حقیقی بیٹے اور بیٹی کی طرح نہیں ہوجاتا۔ مگر زمانہ جاہلیت میں غیر مسلم یہ سمجھتے تھے کہ گود لینے سے بچہ حقیقی بیٹے کی طرح ہوجاتا ہے، وہ میراث پاتا ہے، اور باپ کی جگہ گود لینے والے کا نام لکھتے تھے، نبی ﷺ نے جب حضرت زیدؓ کو اپنا بیٹا بنایا تو لوگ ان کو زید بن محمد کہنے لگے۔ آیت کے پہلے حصے میں اسی باطل نظریہ کی تردید ہے۔

حضرت زیدؓ کو گود لینے کی داستان

اور آنحضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ کو بیٹا کیوں بنایا تھا؟ دوسرے کی اولاد کو گود وہ لیتا

ہے جس کی کوئی اولاد نہ ہو، آپ کی تو اولاد تھی، چار صاحبزادیاں تھیں، تین صاحبزادے ہوئے تھے، اور جس کی اولاد ہوتی ہے وہ دوسرے کے بچہ کو گود نہیں لیتا، پھر حضور اقدس ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو گود کیوں لیا؟

اس کی ایک داستان ہے، زمانۂ جاہلیت میں قبیلے آپس میں لڑتے تھے، اور ایک دوسرے کو قید کرتے تھے، اور ان کو غلام بناتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں حضرت زیدؓ کے قبیلہ پر دشمن قبیلہ نے حملہ کیا، جو قیدی پکڑے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے، اس وقت وہ بچے تھے، وہ غلام بنا کر بیچ دیئے گئے، یہ بچہ بکتا بکتا مکہ پہنچا اور حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی ملکیت میں آیا۔ حضرت خدیجہؓ آنحضور ﷺ کی سب سے پہلی بیوی ہیں، پھر جب حضور اکرم ﷺ سے ان کا نکاح ہوا تو یہ بچہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضور ﷺ کے گھر میں آیا۔

اُدھر حضرت زید رضی اللہ عنہ کا باپ اپنے بیٹے کی جدائی میں تڑپتا تھا، وہ زندگی بھر تلاش کرتا رہا۔ مگر نامراد رہا، مرتے وقت اس نے اپنے دوسرے بیٹے کو اور اپنے بھائی کو وصیت کی کہ تم دونوں اس کو ڈھونڈھنا، اور جہاں بھی ملے ہر قیمت پر اس کو واپس لانا، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے قبیلہ کے کچھ لوگ حج کے لئے آئے، زمانۂ جاہلیت میں بھی حج ہوتا تھا، کسی نے حضرت زید کو دیکھا اور پہچان لیا، واپس جا کر ان کے چچا کو اور بھائی کو بتایا کہ زید کو ہم نے منی میں ایک آدمی کے ساتھ دیکھا ہے، ابھی آنحضور ﷺ نبوت سے سرفراز نہیں کئے گئے تھے، مگر آپؐ ہر سال حج کرتے تھے، جب حضرت زید کے بھائی اور چچا کو اطلاع ملی کہ زید مکہ میں ہے اور قریش کے کسی آدمی کے پاس ہے تو وہ بہت سا مال لے کر مکہ آئے تا کہ فدیہ دے کر بھائی کو اور بھتیجے کو چھڑائیں۔ وہ تلاش کرتے ہوئے اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے نبی ﷺ تک پہنچے، اور آپؐ سے پوری داستان بیان کی کہ یہ ہمارا بھائی اور ہمارا بھتیجہ ہے، وہ غلام نہیں ہے، وہ کیسے قید ہوا اور اس کے باپ کی کیا حالت تھی اور مرتے وقت اس نے کیا وصیت کی تھی یہ سب داستان آپؐ کو سنائی اور عرض کیا کہ آپؐ جو قیمت چاہیں ہم دینے کے لئے تیار ہیں، آپؐ اسے ہمیں دیدیں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: اس سے پوچھ لو، اگر وہ تمہارے ساتھ

جانے کے لئے تیار ہے تو شوق سے لے جاؤ، مجھے کوئی قیمت نہیں چاہئے، وہ خوش ہو گئے اور حضرت زیدؓ کے پاس گئے، ابھی وہ نابالغ تھے، جا کر ان سے اپنا تعارف کرایا کہ میں تیرا چچا ہوں، یہ تیرا بھائی ہے۔ تیرا باپ تیری جدائی میں بہت تڑپتا رہا ہے اور اس نے مرتے وقت ہمیں وصیت کی ہے اور ہم تجھے لینے آئے ہیں، اور تیرا آقا بھی تجھے بھیجنے پر راضی ہے۔ مگر اس بچے نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا: میں زندگی بھر اپنے آقا کے ساتھ رہوں گا، میں نے اپنے آقا میں ایک چیز دیکھی ہے اس لئے میں کبھی ان سے جدا نہیں ہوؤں گا۔ بھائی اور چچا حیرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے کہا: باؤلے! تیرا دماغ چل گیا ہے! تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے! مگر وہ بچہ کسی صورت میں تیار نہیں ہوا، تو انھوں نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ وہ تو ہمارے ساتھ آنے کے لئے تیار نہیں، آپ سمجھائیں، وہ ہمارے ساتھ آئے، آپؐ نے فرمایا: جب وہ تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں تو میں اس کو زبردستی اپنے سے کیسے دور کروں!

آپ ﷺ کو زیدؓ کی اس بات سے اتنی خوشی ہوئی کہ آپؐ ان کو لے کر کعبہ شریف کے پاس آئے۔ وہاں قریش کی مجلس جمی ہوئی تھی۔ آپؐ نے ان کو اٹھایا اور فرمایا: لوگو! گواہ رہو، میں نے آج سے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے، ان کے بھائی اور چچا اس سے مطمئن ہو گئے اور خوش ہو کر واپس لوٹ گئے۔ کیونکہ زید اب غلام نہیں رہے تھے، بلکہ عرب کے سب سے معزز قبیلہ قریش کے ایک شخص کے بیٹے بن گئے تھے، یوں آپؐ نے ان کو بیٹا بنایا تھا، ورنہ حضور ﷺ کو بیٹا بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اولاد سے نوازا تھا۔

اور جب بیٹا بنا لیا تو اپنے ہی خاندان میں ان کی شادی کی۔ حضرت زینبؓ جو آپؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں: ان سے ان کا نکاح کیا، مگر دونوں میں موافقت نہ ہوئی، نبی ﷺ بار بار سمجھاتے کہ اللہ سے ڈرو، بگاڑ مت پیدا کرو، باہم الفت ومحبت سے رہو، مگر بیل منڈھے نہ چڑھی، بالآخر حضرت زیدؓ نے طلاق دیدی۔ عدت کے زمانہ میں نبی ﷺ نے حضرت زینبؓ پر سے داغ دھونے کے لئے سوچا کہ آپؐ ان سے نکاح کر لیں تا کہ ان کا سر فخر سے اونچا ہو جائے۔ مگر خوف یہ تھا کہ کفار پروپیگنڈہ کریں گے کہ اپنے بیٹے کی مطلقہ (بہو) کو

بیوی بنا لیا، اور ان کے اس پروپیگنڈہ سے اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ مگر جب عدت پوری ہوئی تو وحی نازل ہوئی، اور آنحضور ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ ہم نے آپؐ کا نکاح حضرت زینبؓ سے کر دیا، اب حضور ﷺ کے لئے کچھ سوچنے کا موقع نہیں رہا تھا، چنانچہ باقاعدہ دنیا میں بھی آپؐ کا حضرت زینبؓ سے نکاح ہوا اور وہ بیوی بن کر حضور ﷺ کے گھر میں آ گئیں، اور جیسا کہ اندیشہ تھا چاروں طرف طوفان کھڑا ہو گیا کہ لو اپنی بہو کو گھر میں بسا لیا، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، اور یہ بات صاف کر دی کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں۔ پس اس کی بیوی سے نکاح جائز ہے۔

آپؐ نے متعدد نکاح کیوں کئے؟

یہاں ایک ضروری بات سمجھ لینی چاہئے۔ نبی پاک ﷺ نے جو متعدد نکاح فرمائے ہیں اس پر اغیار اعتراض کرتے ہیں، اس لئے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ آپؐ نے متعدد نکاح کیوں کئے ہیں؟ اور اعدائے اسلام جو اعتراض کرتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟

نبی پاک ﷺ نے سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا سے کیا، اس وقت آپؐ کی عمر مبارک ۲۵ سال تھی، اور جب تک حضرت خدیجہؓ زندہ رہیں، آپؐ نے دوسرا کوئی نکاح نہیں کیا۔ آپؐ کی ساری اولاد — ایک صاحبزادے کے علاوہ جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے اور جن کا نام ابراہیم تھا — حضرت خدیجہؓ سے ہی ہوئی ہے، دو یا تین صاحبزادے پیدا ہوئے جو بچپن ہی میں وفات پا گئے، اور چار صاحبزادیاں ہوئیں، جب آنحضرت ﷺ نبوت سے سرفراز کئے گئے اس وقت آپؐ کی یہی ایک بیوی تھی۔

حضرت سودہؓ سے نکاح خانگی ضرورت سے کیا:

پھر جب نبوت کے پانچویں یا ساتویں سال حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا تو گھر کا انتظام کرنے والا کوئی نہ رہا۔ آپؐ پر ایک طرف نبوت کی ذمہ داریاں تھیں، دوسری طرف گھر کے انتظام اور بچیوں کی پرورش کا مسئلہ تھا، اس لئے خاندان کی عورتوں نے مشورہ دیا کہ آپؐ شادی کر لیں، تا کہ بیوی آپؐ کے گھر کا انتظام بھی کرے اور بچیوں کو بھی سنبھالے، چنانچہ

آپ ؐ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا ابتداء نبوت ہی میں مشرف باسلام ہوچکی تھیں اور بیوہ تھیں، ان کا پہلا نکاح ان کے چچازاد بھائی سکران بن عمرو سے ہوا تھا، انھوں نے آکر گھر اور بچیوں کو سنبھالا، یہ دوسری بیوی ہیں جو حضور اکرم ﷺ کے گھر میں آئیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح بہ اذنِ الٰہی ہوا

اسی زمانہ میں نبی ﷺ نے ایک خواب دیکھا اور دو مرتبہ دیکھا: ایک فرشتہ ریشمی کپڑا لایا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! اس کو کھولئے۔ نبی پاک ﷺ نے اس کو کھولا تو اس میں حضرت عائشہ نظر آئیں۔

حضرت عائشہؓ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور ان کے گھر میں آنحضور ﷺ کا بکثرت آنا جانا تھا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ بچی تھیں، ۶ سال کی تھیں اور آپ ؐ نے ان کو دیکھا تھا اس لئے جب آپ ؐ نے کپڑا کھولا اور اس میں وہ نظر آئیں تو آپ ؐ نے فوراً پہچان لیا کہ عائشہ ہیں۔ فرشتہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ آپ کی بیوی ہیں۔

(بخاری حدیث ۷۰۱۲)

آپ ؐ نے سوچا: شادی تو کرنی ہے، مگر عائشہ ابھی بچی ہیں، سات آٹھ سال کے بعد بالغ ہونگی اور رخصتی کے لائق ہونگی۔ اور بیوی کی ضرورت ابھی ہے، جو گھر کو سنبھالے اور بچیوں کی پرورش کرے، بخاری کی روایت میں ہے کہ آپ ؐ نے دل میں سوچا: اگر یہ بات اللہ کی طرف سے ہے تو اس کا کوئی سبب بنے گا، چند دن کے بعد آپ ؐ نے پھر بعینہٖ یہی خواب دیکھا۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ جب خاندان کے لوگ آنحضرت ﷺ کے لئے مناسب رشتہ تلاش کر رہے تھے: ابوبکرؓ کے دل میں خیال آیا کہ حضرت سودہؓ بوڑھی عورت ہیں، چند دن کی مہمان ہیں، اگر کسی مناسب جگہ آپؐ کا رشتہ ہوجاتا تو بہتر تھا۔ اس وقت حضرت عائشہ بچی تھیں اور دوسری کوئی صاحبزادی ان کی نہیں تھی۔ آپؓ نے خیال کیا کہ عائشہ ابھی بچی ہیں، نکاح کے لائق نہیں، مگر انھوں نے سوچا کہ حضرت سودہؓ بوڑھی عورت ہیں، بظاہر زیادہ دنوں کی مہمان نہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر میں برکت فرمائی، اور وہ حضور ﷺ کے بعد تک

زندہ رہیں، لیکن عمر طبعی کے اعتبار سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ اندازہ کیا کہ چند سالوں میں ان کا انتقال ہوجائے گا، اور اس وقت تک عائشہ بڑی ہوجائیں گی، اور حضرت سودہؓ کے بعد وہ آپؐ کا گھر سنبھال لیں گی، یہ سب باتیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ذہن میں تھیں۔

اُدھر حضور ﷺ دو مرتبہ خواب میں حضرت عائشہ کو دیکھ چکے تھے، اور فرشتہ کہہ چکا تھا کہ وہ آپ کی بیوی ہیں، چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ نے پیش کش کی تو عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضور ﷺ کا نکاح ہوگیا، مگر وہ شوہر کے گھر بھیجنے کے قابل نہیں تھیں، اس لئے صرف نکاح ہوا، رخصتی عمل میں نہیں آئی (۱)

ہجرت تک تنہا حضرت سودہؓ آپ ؐ کے گھر میں رہیں، ہجرت کے بعد دوسرے سال حضرت عائشہ اس قابل ہوگئیں کہ وہ شوہر کے گھر بھیجی جاسکیں، چنانچہ ہجرت کے دوسرے سال ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ اب آپ ؐ کے گھر میں دو بیویاں اکٹھی ہوئیں، اس وقت نبی ﷺ کی عمر مبارک ۵۵ سال تھی۔ اور پوری عمر مبارک ۶۳ سال ہوئی ہے، پس گویا وفات سے آٹھ سال پہلے حضور ﷺ کے گھر میں دو بیویاں جمع ہوئیں ہیں۔

آنحضور ؐ نے حضرت خدیجہؓ اور حضرت سودہؓ کے علاوہ تمام نکاح ملّی، ملکی اور شخصی مصلحتوں سے کئے ہیں

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آدمی کو چند بیویوں کی ضرورت جوانی میں ہوتی

(۱) یورپ وامریکہ میں لوگ سوال کرتے ہیں: چھ سال کی لڑکی سے نکاح کرنے کا کیا تک تھا؟ وہ لوگ نکاح اور زفاف کا فرق نہیں جانتے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی، ہندوؤں میں بھی اور مسلمانوں میں بھی نابالغوں کے نکاح کا رواج ہے، مگر لڑکی شوہر کے گھر اس وقت بھیجی جاتی ہے: جب وہ شوہر کے قابل ہوجائے، حضرت عائشہؓ بھی بلوغ کے بعد رخصت کی گئی تھیں۔

اور یورپ وامریکہ والوں کے نزدیک بلوغ کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ غلط ہے، اسلام میں جب لڑکی کو ماہواری آجائے تو وہ بالغ ہوجاتی ہے۔

ہے، پچپن سال میں آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں متعدد بیویوں کی ضرورت نہیں ہوتی، اور آپؐ کی جوانی اور ادھیڑ عمر ایک بیوی کے ساتھ گذری ہے، اور ایک سے زائد بیویاں عمر مبارک کے آخری آٹھ سالوں میں کی ہیں۔ اس سے ہر صاحب فہم سمجھ سکتا ہے کہ آپؐ نے جو متعدد نکاح کئے ہیں وہ ذاتی ضرورت سے نہیں کئے، بلکہ کسی مصلحت سے کئے ہیں اور وہ مصلحتیں تین ہیں: ملّی، ملکی اور شخصی۔ اور شخصی سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات نہیں ہے بلکہ بیوی صاحبہ کی یا ان کے علاوہ کسی کی دلجوئی کے لئے نکاح کیا ہے، یہاں سب نکاحوں کی تفصیل کرنا تو مشکل ہے، ایک ایک مصلحت کی ایک ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت زینبؓ سے نکاح ملّی مصلحت سے کیا ہے

پہلے دو باتیں آپ حضرات ذہن میں رکھیں:

پہلی بات: نبی ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ تمام نکاح بیوہ عورتوں سے کئے ہیں، حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا جو آپؐ کی سب سے پہلی زوجۂ مطہرہ ہیں، اور جن کے ساتھ آپؐ نے پوری جوانی کا زمانہ گذارا ہے وہ بھی بیوہ تھیں، حضور اکرم ﷺ سے پہلے دو جگہ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ پہلا نکاح ابو ہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوا تھا اور دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے۔

دوسری بات: دو نکاح اللہ تعالیٰ نے کرائے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نکاح کرنے کا صریح حکم آیا ہے یا اشارہ ملا ہے، اس لئے آپؐ نے وہ دونوں نکاح کئے ہیں: حضرت زینبؓ کا نکاح اللہ نے کرایا ہے اس نکاح کا تذکرہ قرآنِ کریم میں سورۂ احزاب (آیت ۳۷) میں ہے: ﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا﴾: جب زیدؓ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے (اور انھوں نے طلاق دیدی) تو ہم نے ان کے ساتھ آپؐ کا نکاح کر دیا، پس حضرت زینبؓ سے نکاح وحی متلو سے ہوا ہے، اور حضرت عائشہؓ سے نکاح وحی غیر متلو سے ہوا ہے، ان کو خواب میں دکھایا گیا اور بتایا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہیں، یہ دو نکاح تو اللہ نے کرائے ہیں، باقی جتنے نکاح کئے ہیں وہ حضور اقدس ﷺ نے خود کئے ہیں، اور سارے

نکاح مذکورہ تین مصلحتوں سے کئے ہیں۔

ملّی، ملکی اور شخصی مصلحتوں کی مثالیں

ملّی ضرورت سے حضرت عائشہ اور حضرت زینبؓ سے اللہ تعالیٰ نے نکاح کرایا ہے اور حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور حضرت معاویہؓ کی بہن حضرت ام حبیبہؓ سے جو حضور ﷺ نے نکاح کیا ہے وہ ملکی (سیاسی) مصلحت سے کیا ہے، اور شخصی مصلحت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے کیا ہے، حضرت حفصہؓ سے نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے اور ام سلمہؓ سے نکاح ان کی دلجوئی کے لئے کیا ہے۔

حضرت عائشہؓ سے نکاح کی مصلحت

نبی ﷺ کی زندگی خلوت وجلوت میں منقسم ہے اور آپؐ کے قول وفعل سے شریعت بنتی ہے اور آپؐ جلوت میں جو کچھ ارشاد فرمائیں گے یا جو کام کریں گے اس کو صحابہ سنیں گے، دیکھیں گے اور محفوظ کریں گے، مگر خلوت کے اقوال وافعال کو صحابہ اخذ نہیں کر سکتے، جبکہ وہ اقوال وافعال بھی شریعت ہیں اس لئے ضروری تھا کہ آپؐ کے گھر میں کوئی ایسی سمجھ دار زیرک بیوی ہو جو خانگی زندگی کے اقوال وافعال کو محفوظ کرے۔ اور حضرت سودہؓ اگرچہ آپؐ کے گھر میں تھیں، مگر وہ عمر رسیدہ تھیں، اور بہت زیادہ زیرک بھی نہیں تھیں: وہ اس اہم ترین ذمہ داری کو بخوبی انجام نہیں دے سکتی تھیں، اس لئے وحی غیر متلو سے حضرت عائشہؓ سے آپؐ کا نکاح کرایا گیا تا کہ وہ خانگی زندگی کے اقوال وافعال کو محفوظ کر کے امت تک پہنچائیں اور شریعت مکمل ہو، چنانچہ جب ۲ ہجری سے شریعت نازل ہونی شروع ہوئی تب وہ حضور ﷺ کے گھر میں آئیں (۱)

(۱) مکی زندگی میں اسلامی عقائد: توحید، رسالتِ محمدی اور آخرت پر زور دیا گیا تھا، احکام تفصیل سے نازل نہیں ہوئے تھے، بالاجمال زکات وغیرہ کا حکم آیا تھا مگر اس کی تفصیلات نازل نہیں ہوئی تھیں، تفصیلات ۲ ہجری سے نازل ہونی شروع ہوئی ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نصف دین کی حامل

ایک موقع پر حضور ﷺ نے صحابہ میں اعلان فرمایا: **خذوا نصفَ دینکم من حُمیراء**: آدھا دین عائشہؓ سے حاصل کرو، آدھے دین سے پچاس فیصد مراد نہیں، عربی میں لفظ نصف مختلف اعتبارات سے بولا جاتا ہے، علم المیراث (علم الفرائض) کو آدھا علم کہا گیا ہے، **تعلّموا الفرائض فإنها نصف العلم**: علم الفرائض کو سیکھو: وہ آدھا علم ہے، انسان کی زندگی دو حصوں میں منقسم ہے: موت سے پہلے کی زندگی اور موت کے بعد کی زندگی، پس جو احکام دنیا کی زندگی سے متعلق ہیں وہ آدھا علم ہیں، اور علم میراث موت کے بعد کے احوال سے متعلق ہے، اس لئے وہ آدھا علم ہے۔ غرض آدھے کے لئے پچاس فیصد ہونا ضروری نہیں، مختلف اعتبارات سے نصف کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا ہے کہ نصف علم عائشہؓ سے حاصل کرو، یعنی خلوت کے احکام حضرت عائشہ سے معلوم کرو، اور جلوت کے احکام صحابہ سے سیکھو، نفس الامر میں جلوت کے مسائل زیادہ ہیں اور خلوت کے کم مگر جلوت اور خلوت آپؐ کی زندگی کے دو پہلو ہیں، اس اعتبار سے خلوت کے احکام کو نصف علم کہا گیا ہے[۱]

حضرت زینبؓ سے نکاح لے پالک کی رسم ختم کرنے کے لئے کیا ہے

میں یہ بیان کررہا تھا کہ جب سے شریعت کی تفصیلات نازل ہونی شروع ہوئی ہیں تب سے حضرت عائشہؓ حضور ﷺ کے گھر میں آئی ہیں تاکہ خلوت کے احکام محفوظ کرکے امت کو پہنچائیں۔ یہ ملّی مصلحت ہے اسی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح آپؐ سے کرایا ہے اور اسی مصلحت سے حضرت زینبؓ سے بھی اللہ تعالیٰ نے نکاح کرایا ہے، زمانۂ

(۱) حدیث **خذوا شطر دینکم من الحمیراء** محض بے اصل روایت ہے، کسی کتاب میں اس کی کوئی سند نہیں (تحفۃ الاحوذی ۴:۳۶۴) مگر ترمذی میں حدیث (نمبر ۳۹۱۰) ہے: ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب بھی صحابہ پر کوئی بات مشتبہ ہوتی تھی تو حضرت عائشہؓ کے پاس اس مسئلہ کا کچھ نہ کچھ علم ہوتا تھا پس مضمون صحیح ہے کہ حضرت عائشہؓ کے پاس دین کا بڑا علم تھا۔

جاہلیت سے یہ تصور چلا آرہا تھا کہ منہ بولا بیٹا، بیٹی حقیقی اولاد کی طرح ہیں۔ حضرت زینبؓ سے جو آپؐ کے متبنّی حضرت زیدؓ کی مطلقہ تھیں نکاح کراکر اس رسم کو ختم کردیا۔

منہ بولے بیٹے بیٹی سے پردہ واجب ہے

چنانچہ آج معمولی پڑھے لکھے آدمی کے ذہن میں بھی کوئی الجھن نہیں۔ وہ بخوبی جانتا ہے کہ منہ بولا بیٹا اور بیٹی حقیقی اولاد نہیں۔ لہٰذا ان کو میراث نہیں ملے گی۔ ہاں گود لینے والا اپنی زندگی میں ان کو مکان، زمین، دولت وغیرہ دیدے یا تہائی مال کی وصیت کرے تو جائز ہے، مگر ان کو میراث نہیں ملے گی۔ میراث صرف ورثاء کا حق ہے، اور متبنّی وارث نہیں، اس کے احکام وہی ہیں جو اجنبی کے ہیں، چنانچہ گود لی ہوئی لڑکی سے بالغ ہونے کے بعد پردہ واجب ہے، کیونکہ وہ اجنبی ہے، گود لینے سے وہ بیٹی نہیں بن گئی، اسی طرح کسی عورت نے کوئی لڑکا گود لیا تو بالغ ہونے کے بعد گود لینے والی پر پردہ کرنا واجب ہے، کیونکہ وہ ماں نہیں ہے۔ یہ تمام احکام اس نکاح کے ذریعہ واضح کئے گئے، اور زمانۂ جاہلیت سے جو تصور چلا آرہا تھا اس کو اس نکاح کے ذریعہ ختم کردیا گیا۔

حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح ملکی (سیاسی) مصلحت سے کیا ہے

اور حضور ﷺ نے بعض نکاح ملکی مصلحت سے کئے ہیں، نبی ﷺ جہاں اللہ کے رسول تھے، حکومت کے سربراہ بھی تھے، اور حکومت کے سربراہ کو بہت سے معاملات سیاسی انداز سے سوچنے پڑتے ہیں، اور ان کا حل تلاش کرنا پڑتا ہے، اسی ملکی مصلحت سے حضور ﷺ نے کئی نکاح کئے ہیں، ان کی تفصیل کرونگا تو بات لمبی ہوجائے گی، اس لئے میں نے اس کی جو مثال دی ہے، اس کی وضاحت کرتا ہوں۔

وہ مثال حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی ﷺ اور صحابہ کرام ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے، اور جو مسلمان ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تھے وہ بھی مدینہ آنے لگے اور انصار نے ہر طرح مسلمانوں کی نصرت وحمایت کا وعدہ کیا تو کفار مکہ نے اہل مدینہ کو خط لکھا کہ جو مسلمان بھاگ کر تمہارے یہاں آئے ہیں ان کو واپس کرو،

ورنہ ہم تم پر حملہ کریں گے، مدینہ والوں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا، اس سے قریش کا پارہ چڑھ گیا۔ انھوں نے حملہ کی تیاریاں شروع کردیں، ایک قافلہ ہتھیار خریدنے کے لئے ملک شام بھیجا، جب وہ قافلہ ہتھیار لے کر لوٹا تو مسلمانوں کو اس کی خبر ہوئی، انھوں نے اس کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا، جب اس کی اطلاع کفار مکہ کو ہوئی تو وہ بڑے لشکر کے ساتھ قافلہ کو بچانے کے لئے نکلے، اس طرح بدر کا معرکہ پیش آیا۔

یہ اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی، اس جنگ میں مکہ والے حملہ آور نہیں ہوئے تھے، حقیقت میں وہ اپنا قافلہ بچانے کے لئے نکلے تھے جو شام سے ہتھیار لے کر مکہ آرہا تھا، قافلہ تو صحیح سالم نکل گیا، مگر مکہ سے جو لشکر قافلہ کو بچانے کے لئے چلا تھا وہ واپس نہیں لوٹا، بلکہ مدینہ کی طرف بڑھا اور بدر کا معرکہ پیش آیا، اس جنگ کے بعد بھی بار بار مکہ والے مدینہ پر چڑھ کر آئے، احد میں چڑھ کر آئے، غزوۂ احزاب میں تو تمام قبیلے ایک ساتھ اکٹھا ہو کر حملہ آور ہوئے، اور ان تمام جنگوں میں — بدر کے علاوہ — کمانڈر انچیف ابوسفیان تھے، وہی سردار مکہ تھے اور وہی بار بار فوج کشی کر رہے تھے، اگرچہ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے مگر جنگ بدر کے علاوہ جتنی مرتبہ کفار مدینہ پر حملہ آور ہوئے ہیں، تمام جنگوں میں کمانڈر انچیف ابوسفیان ہی تھے، ابوسفیان کی ایک صاحبزادی ام حبیبہ تھیں، وہ مسلمان ہو گئی تھیں، اور اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں، جب ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور نبی ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ایک وفد شاہ حبشہ نجاشی رحمہ اللہ کے پاس بھیجا۔ آپؐ نے اس وفد کے ساتھ نجاشیؒ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ام حبیبہ کو میرے نکاح کا پیغام دو، چنانچہ شاہ حبشہ نجاشی رحمہ اللہ نے نبی پاک ﷺ کی طرف سے منگنی بھیجی۔ حضرت ام حبیبہ کے لئے اس سے بڑی کیا سعادت ہو سکتی تھی انھوں نے فوراً منگنی قبول کر لی، پھر نجاشی رحمہ اللہ کے دربار میں حضرت ام حبیبہ کا نکاح پڑھا گیا، اور حضور اکرم ﷺ کی طرف سے نجاشیؒ وکیل بنے اور خود انھوں نے اپنی طرف سے مہر ادا کیا اور فرمایا کہ جب نبیوں کا نکاح ہوتا ہے تو اس کے بعد کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھلائی جاتی ہے، چنانچہ انھوں نے نکاح کے بعد مٹھائی تقسیم کی، پھر حضرت ام حبیبہؓ کو وفد کے ساتھ بہت سے ہدایا دے کر مدینہ منورہ بھیج دیا۔

اس نکاح کی جب ابوسفیان کو خبر ہوئی تو ان کی مکھی تیل میں گری، اس کے بعد ابوسفیانؓ کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ مدینہ پر چڑھائی کریں۔ غزوۂ احزاب کے بعد یہ نکاح ہوا تھا۔ جب ابوسفیان کو اس نکاح کی خبر ہوئی تو انھوں نے نبی ﷺ کے بارے میں کہا: اس سانڈ کو کوئی نکیل نہیں ڈال سکتا۔

غرض حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ نکاح کرنے کی وجہ سے مکہ والوں سے لڑائی ختم ہو گئی، یہ ملکی مصلحت تھی، اور بھی کئی نکاح حضور ﷺ نے اس مصلحت سے کئے ہیں، پھر کبھی مقصد پورا ہوا، کبھی نہیں ہوا۔ حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کرنے کا جو مقصد تھا اس میں سو فیصد کامیابی ہوئی۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح ملکی مصلحت سے کیا ہے

اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے نکاح یہودیوں کو قریب لانے کے لئے کیا تھا، مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ یہود بے بہود آنحضور ﷺ اور اسلام کے کٹر مخالف تھے، ان کے دل بغض و عناد سے بھرے ہوئے تھے، اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حیی بن اخطب سردار بنی نضیر کی بیٹی تھیں، اور دوسرے سردار کنانہ بن ابی الحقیق کی بیوی تھیں، جنگ خیبر میں یہ دونوں مارے گئے تھے، نبی ﷺ نے حضرت صفیہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا، تاکہ یہود قریب آئیں، کیونکہ جب حضور ﷺ ان کے داماد بن جائیں گے تو قدرتی طور پر ان کو حضور ﷺ سے محبت ہو گی اور قریب آئیں گے، مگر جو مقصد تھا وہ حاصل نہیں ہوا، وہ ناہنجار قوم ذرا قریب نہیں آئی، یہ تو اللہ کے اختیار کی بات ہے کہ مقصد حاصل ہو گا یا نہیں؟ بندہ تو اسباب اختیار کرتا ہے، پھر کبھی اسباب کارگر ہوتے ہیں اور کبھی فیل ہو جاتے ہیں۔

حضرت حفصہؓ سے نکاح حضرت عمرؓ کی دلجوئی کے لئے کیا ہے

اور بعض نکاح حضور ﷺ نے شخصی مصلحت سے کئے ہیں، مگر میں نے بتایا ہے کہ شخص سے مراد حضور اکرم ﷺ کی ذات نہیں ہے، یعنی حضور ﷺ نے اپنی ذاتی ضرورت سے وہ نکاح نہیں کئے، بلکہ یا تو جس عورت سے نکاح کیا ہے اس کی دلجوئی مقصود تھی یا اس عورت

کے کسی متعلق کی، جیسے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے کیا ہے، حضرت حفصہؓ کا پہلا نکاح خُنیس بن حذافہ سَہمی رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، یہ بدری صحابی ہیں اور جنگ بدر کے بعد مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا ہے، جب حضرت حفصہؓ بیوہ ہوگئیں تو حضرت عمرؓ کو ان کی شادی کی فکر ہوئی، چنانچہ وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملے اور ان کے سامنے پیشکش کی۔ حضرت عثمان غنی نے فرمایا: میں سوچ کر جواب دوں گا، پھر چند دن کے بعد جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا: میرا فی الحال شادی کرنے کا ارادہ نہیں، پھر حضرت عمرؓ: حضرت ابوبکرؓ سے ملے اور ان کے سامنے پیشکش کی، حضرت ابوبکرؓ خاموش ہوگئے، کوئی جواب نہیں دیا، جس سے حضرت عمرؓ کو ملال ہوا، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے انکار سے ملال نہیں ہوا تھا، کیونکہ انھوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ کے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے، وہ حضرت ابوبکر سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے، اور ان سے حضرت عمرؓ کو بہت زیادہ امید تھی، اگر وہ بھی انکار کردیتے تو زیادہ غم نہ ہوتا، کیونکہ ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہے، کسی پر زبردستی اپنی مرضی نہیں تھوپی جاسکتی، مگر حضرت ابوبکرؓ بات سن کر خاموش ہوگئے، کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بڑا رنج ہوا۔

اس کے بعد چند دن گذرے تھے کہ نبی ﷺ نے اپنے لئے پیام دیا، حضرت عمرؓ خوش ہوگئے، اور حضرت حفصہؓ کا آپؐ سے نکاح کردیا، تب حضرت ابوبکرؓ نے کہا: تم نے جس وقت حفصہؓ سے نکاح کی پیشکش کی تھی اور میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا: اس وقت تمہیں غصہ تو آیا ہوگا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: بہت غصہ آیا تھا! حضرت ابوبکرؓ نے کہا: وہ ایک راز تھا۔ میں نے اس وجہ سے جواب نہیں دیا تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے حفصہ کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا تھا کہ جب سے میں نے عائشہ سے نکاح کیا ہے: عمر کا دل ٹوٹا ہوا ہے، اب حفصہ خالی ہوئی ہیں، پس کیا میں ان سے نکاح کرلوں؟ میں نے آپؐ کو مشورہ دیا تھا کہ آپؐ ضرور ان سے شادی کرلیں، اس سے عمرؓ کی دلجوئی ہوگی، اور میں اس وقت رسول اللہ ﷺ کا راز فاش کرنا نہیں چاہتا تھا، اگر آپؐ حفصہ سے شادی نہ کرتے تو میں کرلیتا، غرض آنحضور ﷺ

نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح نہ اپنی ضرورت کے لئے کیا نہ حفصہؓ کی ضرورت سے، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دلجوئی کے لئے کیا تھا(۱)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ سے بھی نکاح شخصی مصلحت سے کیا ہے

اور حضرت ام سلمہؓ سے نکاح خود ان کی دلجوئی کے لئے کیا ہے، ان کا پہلا نکاح ان کے چچازاد بھائی ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ سے ہوا تھا، انہی کے ساتھ وہ مشرف باسلام ہوئیں تھیں، اور انہی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، پھر وہاں سے مکہ مکرمہ واپس آکر مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ جب مدینہ میں حضرت ابوسلمہؓ کا انتقال ہوگیا تو نبی ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کی دلداری کے لئے ان سے نکاح کرلیا۔ اور ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد علم وفضل میں حضرت ام سلمہؓ ہی کا نمبر ہے، آنحضور ﷺ کی خانگی زندگی کو حضرت عائشہؓ کے بعد سب سے زیادہ انھوں نے محفوظ کیا ہے۔

نبی ﷺ کسی مرد کے باپ نہیں

خیر بات دوسری طرف نکل گئی، میں یہ مضمون سمجھا رہا تھا کہ حضرت زینبؓ آنحضور ﷺ کے متبنی حضرت زیدؓ کی بیوی تھیں، جب انھوں نے طلاق دیدی اور عدت کے بعد نبی ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا تو مشرکین نے بڑا طوفان مچایا کہ لو جی بہو سے نکاح کرلیا! اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ﴾ ان کو جواب دیا کہ تم کیا پروپیگنڈہ کررہے ہو، حضور پاک ﷺ کا کوئی بچہ بالغ نہیں ہوا، رجل: عربی میں بالغ آدمی کو کہتے ہیں، بچہ بلوغ سے پہلے صَبِیٌّ کہلاتا ہے، حضور ﷺ کے نابالغ لڑکے تو ہوئے ہیں، مگر کوئی لڑکا رجلٌ نہیں ہوا، پھر بیٹے کی بہو کہاں سے آئی؟ اس ٹکڑے

(۱) حضرت عمرؓ ہمیشہ حضرت ابوبکرؓ سے دین میں آگے بڑھنا چاہتے تھے، مگر کبھی نہ بڑھ سکے۔ جب ابوبکرؓ نے عائشہؓ کا آپؐ سے نکاح کیا، اس زمانہ میں عمرؓ بھی اس کے خواہشمند تھے، مگر اس وقت ان کی کوئی لڑکی نہیں تھی، چنانچہ اس وقت سے ان کا دل ٹوٹا ہوا تھا۔ اب موقع آیا تو آپؐ نے حفصہ سے نکاح کرکے ان کی دلجوئی کی۔

میں یہی بات کہی گئی ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی دو خوبیاں

لیکن یہاں ذہنوں میں اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب لوگوں کے بالغ لڑکے ہیں اور حضور ﷺ کا کوئی بالغ لڑکا نہیں ہوا تو یہ بات ایک اعتبار سے نقص ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی دو خوبیاں بیان کیں: ﴿وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ لکن استدراک کے لئے آتا ہے، یعنی پہلے کلام سے جو وہم پیدا ہوتا ہے اس کو لکن سے دفع کیا جاتا ہے، فرمایا: آپ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے سلسلہ کو پورا کرنے والے ہیں۔ یہ دو خوبیاں حضور اکرم ﷺ میں ہیں۔

رسول اللہ ہونے کی وضاحت

پہلی خوبی یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور رسول اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ جیسے استاذ اپنے شاگردوں کا روحانی باپ ہوتا ہے، پیر اپنے مریدوں کا روحانی باپ ہوتا ہے، اللہ کا رسول بھی اپنی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے، کیونکہ اس کا درجہ استاذ اور پیر سے بڑھا ہوا ہے، پس قیامت تک جتنے مؤمنین ہونگے، نبی ﷺ سب کے روحانی باپ ہیں، پس اگر نبی ﷺ کے چند جسمانی بیٹے نہ ہوئے تو کیا فرق پڑتا ہے؟(۱)

خاتم النّبیین کی وضاحت

اور آپ کی دوسری خوبی یہ ہے کہ آپ تمام نبیوں کے خاتم ہیں، خاتم کے معنی ہیں: آخری سرا، ہر چیز جس سرے پر رک جاتی ہے وہ سرا خاتم ہے، جیسے مسجد میں روشنی بلب سے پھیل رہی ہے، اور بلب میں روشنی پاور ہاؤس سے آرہی ہے، پس پاور ہاؤس خاتم ہے، اسی طرح ہر

(۱) نسبی بیٹا ہونا بھی ایک کمال ہے اور روحانی بیٹے ہونا بھی۔ اور تمام کمالات ہر بندے کو ملنے ضروری نہیں، ہر کمال کی مالک ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اب رہی یہ بات کہ کس کو کونسا کمال دینا چاہئے؟ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت پر موقوف ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بالغ بیٹے نہیں دیئے: اس کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، اور ان گنت روحانی اولاد عطا فرمائی اس کی حکمت ظاہر ہے۔

کمال کا ایک آخری سرا ہوتا ہے، اور نبوت انسانیت کے لئے بڑا کمال ہے، بلکہ اس سے بڑا کوئی کمال نہیں، اور انبیاء بے شمار ہوئے ہیں اور جو رسول ہیں وہ بھی نبی ہیں، پس ان سب کا آخری سرا کون ہے؟ ان کا آخری سرا سرکارِ مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

آپ نبوت کے ساتھ بالذات اور دوسرے انبیاء بالعرض متصف ہیں:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو نبوت ملی ہے وہ نبی پاک ﷺ کے طفیل میں ملی ہے، نبی ﷺ نبوت کے ساتھ متصف بالذات ہیں اور دوسرے انبیاء متصف بالعرض، جیسے سورج نکلتا ہے تو زمین کا ذرہ ذرہ روشن ہوجاتا ہے، سورج سے صحن میں روشنی آتی ہے، صحن سے کمرہ روشن ہوجاتا ہے، پس روشنی کے ساتھ سورج بالذات متصف ہے، اور صحن اور کمرہ بالعرض۔ صحن بلا واسطہ اور کمرہ بالواسطہ۔ اسی طرح تمام انبیائے کرام کو نبی ﷺ کے فیض سے نبوت ملی ہے، اصل نبی حضور ﷺ ہیں اور باقی تمام انبیاء آپ کے فیض سے نبی بنے ہیں، سورۂ آلِ عمران (آیت ۸۱) میں ارشادِ پاک ہے: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ﴾: اس آیت کریمہ میں یہ مضمون ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے اور ان کی پشت سے قیامت تک کی ساری اولاد نکالی گئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے دو عہد لئے۔ ایک: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے اقرار کیا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں، یہ عہد الست کہلاتا ہے۔ اور سورۂ اعراف (آیت ۱۷۲) میں اس کا ذکر ہے۔ اور دوسرا عہد نبیوں سے لیا گیا، اس آیت میں اسی دوسرے عہد کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دیکھو اگر میں تمہیں نبوت سے سرفراز کروں، آسمانی کتاب تم پر نازل کروں، حکمت عنایت کروں، پھر تمہارے زمانہ میں محمد ﷺ آجائیں تو تم سب ان پر ایمان لاؤ گے؟ اور ان کی مدد کرو گے؟ سب نبیوں نے جواب دیا: ہم اپنی نبوت چھوڑ دیں گے اور خاتم النّبیین محمد ﷺ پر ایمان لے آئیں گے۔ یہ اس آیت کا خلاصہ ہے اور اس کی تفصیل لمبی ہے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبوت سے درحقیقت حضور ﷺ سرفراز کئے گئے ہیں، اور آپ کے فیض سے تمام انبیاء کو نبوت ملی

ہے، اور جب اصل اور عارض جمع ہوجائیں تو اصل کی چلتی ہے، عارض کی نہیں چلتی، اسی لئے نبی پاک ﷺ نے فرمایا: اگر موسیٰ علیہ السلام آج موجود ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا، اسی طرح جو بھی نبی حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود ہوگا اس کے لئے آپؐ کی اتباع ضروری ہوگی۔

عیسیٰ علیہ السلام نبی ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے

چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام جو پہلے کے نبی ہیں، جب وہ قیامت سے پہلے آسمان سے اتریں گے تو اپنی نبوت پر عمل نہیں کریں گے، بلکہ نبی پاک ﷺ کی شریعت پر عمل کریں گے اور اسی کے مطابق مسلمانوں کی راہنمائی کریں گے۔

یہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے آسمان پر کیا گناہ کیا تھا جو ان کی نبوت ختم ہوگئی؟ وہ آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے نبی تھے، اور جب اتریں گے تو نبی نہیں ہونگے!

ایسا سوچنے والے غلطی پر ہیں، ان کی نبوت برقرار رہے گی، مگر اب وہ اپنی شریعت پر عمل نہیں کریں گے، اس کو ایک مثال سے سمجھیں: ہندوستان کا وزیر اعظم یہاں امریکہ میں آیا، جب تک وہ امریکہ میں رہے گا اپنے ملک کا وزیر اعظم ہوگا، مگر اس ملک میں اس کا کوئی قانون نہیں چلے گا، اس کو اس ملک کے قانون کی پیروی کرنی ہوگی، اگر وہ اس ملک کے قانون کے خلاف کارچلائے گا تو ماخوذ ہوگا۔ اس کی وزارت ختم نہیں ہوئی، وہ بدستور اپنے ملک کا وزیر اعظم ہے، مگر اس کو اتباع اس ملک کے قانون کی کرنی ہوگی۔ یہاں امریکہ میں وہ اپنے ملک کا قانون نہیں چلا سکتا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیشک نبی ہونگے، ان کی نبوت برقرار ہوگی، مگر جب حضور ﷺ کے زمانہ میں تشریف لائیں گے تو آپؐ ہی کی شریعت پر خود بھی عمل کریں گے اور دوسروں کو بھی عمل کرائیں گے۔

نزولِ عیسیٰ کا ثبوت قرآنِ کریم سے

اور یہ بات قرآنِ کریم میں دو جگہ آئی ہے، ایک: سورۂ آل عمران میں، دوسری سورۂ

انعام کے آخر میں ——— فرشتے نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو خوشخبری دیتے ہوئے کہا تھا: ﴿يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰاةَ وَالْإِنْجِيْلَ﴾ (آل عمران ۴۸ و ۴۹) اللہ تعالیٰ ان کو قرآن سکھائیں گے، حدیث سکھائیں گے، تورات سکھائیں گے اور انجیل سکھائیں گے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں رہے، قرآن نہیں اترا تھا، قرآن حضور ﷺ پر اترا ہے۔ اور حدیثیں حضور ﷺ کے ارشادات ہیں، وہ بھی وجود میں نہیں آئی تھیں، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث کب سکھائیں گے؟ اس میں صاف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آخری دور میں اترنا ہے، جب دنیا میں قرآن وحدیث کا وجود ہوجائے گا اس وقت اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھلائیں گے۔ پس پہلا اشارہ تو آیت پاک میں یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی نہیں دی گئی، جیسا کہ عیسائیوں کا اور یہودیوں کا عقیدہ ہے، ان کے خیال فاسد کو قرآن نے رد کیا ہے ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ﴾ (النساء آیت ۱۵۷) بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس اٹھالیا ہے، کیوں اٹھالیا ہے؟ ان کو آخری دور میں اتارنا ہے، اور ان کو قرآن وحدیث سکھانا ہے، اور دوسرا اشارہ یہ ہے کہ نزول کے بعد آپ شریعتِ محمدی پر عمل کریں گے، ورنہ قرآن وحدیث سکھانے کی کیا ضرورت تھی؟

انجیل: تورات کا ضمیمہ ہے

اور اس میں تیسرا اشارہ یہ ہے کہ انجیل مستقل کتاب نہیں، بلکہ تورات کا ضمیمہ ہے۔ چنانچہ عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ تورات بھی سکھائیں گے اور انجیل ان پر نازل فرمائیں گے، وہ اپنے زمانہ میں ان دونوں کتابوں سے راہنمائی فرمائیں گے۔ پھر وہ آسمان پر اٹھالئے جائیں گے پھر آخری زمانہ میں ان کو اتاریں گے، اور قرآن وحدیث سکھلائیں گے۔

قرآن وحدیث کی تقدیم اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب وحکمت (قرآن وحدیث) کی

تعلیم کو پہلے بیان کیا ہے جب کہ نفس الامر میں تورات وانجیل پہلے سکھلائی ہے اور قرآن وحدیث: قربِ قیامت میں جب ان کا نزول ہوگا تب سکھلائیں گے، پس قرآن وحدیث کی تقدیم کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ان کو پہلے بیان کیا ہے، اور قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، ایک چیز نفس الامر میں بعد میں ہوتی ہے، مگر اس کو پہلے بیان کیا جاتا ہے تاکہ اس کی اہمیت ظاہر ہو، جیسے اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ﴾ (آلِ عمران ۵۵) یاد کرو جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہیں موت دینے والا ہوں اور میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں۔ اس آیت میں موت کا ذکر پہلے کیا ہے اور اٹھائے جانے کا ذکر بعد میں، حالانکہ وجود میں اس کے برعکس ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر پہلے اٹھایا ہے اور موت قربِ قیامت میں جب وہ اتریں گے تب آئے گی، مگر موت کا ذکر پہلے اس لئے کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو، پہلے سے بتادیا کہ حضرت عیسیٰ بھی ایک انسان ہیں اور جیسے تمام انسانوں کو موت آنی ہے حضرت عیسیٰ کو بھی آنی ہے، لیکن فی الحال وہ آسمانوں پر اٹھائے جائیں گے، اگر پہلے سے یہ کہہ دیا جاتا کہ میں تمہیں اٹھانے والا ہوں تو ان کی امت کو غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غیر معمولی شخصیت ہیں، چنانچہ ان کو موت نہیں آئی، اس وہم کو ختم کرنے کے لئے اللہ جل شانہ نے موت کا ذکر پہلے کیا۔

اسی طرح یہاں بھی قرآن وحدیث کی تعلیم اگرچہ وجود میں بعد میں آئے گی مگر اس کو پہلے ذکر کیا۔ کیوں؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قربِ قیامت میں نزول واقعی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث ضرور سکھلائیں گے، مگر جب تک ان کا نزول نہیں ہوتا اور ان کو اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث نہیں سکھلاتے، وہاں تک انکار کرنے والوں کے لئے انکار کا موقع تھا، اس لئے تاکید کے لئے کتاب وحکمت کو پہلے بیان کیا۔

خیر بات پھیلتی چلی گئی، اور کہیں سے کہیں نکل گئی، مجھے تو سمجھانا یہ تھا کہ تمام نبیوں کی نبوت سرکارِ مدینہ ﷺ کی نبوت کا فیض ہے، نبی ﷺ نبوت کے ساتھ متصف بالذات

ہیں، اور باقی تمام انبیاء متصف بالعرض، اور آپ خاتم النّبیین ہیں۔ نبوت کے سلسلہ کی آخری کڑی ہیں اور قیامت تک کے تمام لوگوں کے روحانی باپ ہیں، اور گذشتہ تمام امتوں کے روحانی دادا ہیں، آپ کا فیض نبیوں کو پہنچا، اور نبیوں کا فیض ان کی امتوں کو پہنچا، اس طرح آپ گذشتہ امتوں کے روحانی دادا ہوئے۔

یہاں کوئی سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ آنحضور ﷺ کو دونوں فضیلتوں سے سرفراز کرسکتے تھے، آپ کے روحانی بیٹے پوتے بھی ہوتے اور جسمانی بھی، اس میں کیا جرج تھا؟ دونوں فضیلتیں اکٹھا ہوجاتیں تو کیا نقصان تھا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والے ہیں، ان کی حکمتیں ہم نہیں جان سکتے۔ یعنی ایسا کیوں کیا؟ ایک فضیلت دی، دوسری نہیں دی، اس میں کیا حکمت ہے؟ وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، وہی ہر چیز کا پورا علم رکھتے ہیں، ہم ہر بات نہیں جانتے۔

آپ خاتم رُتبی بھی ہیں اور زمانی بھی!

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ جب آپ نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہیں اور دوسرے انبیاء بالعرض، تو آپ کے بعد بھی لوگ آپ کے فیض سے نبی ہوسکتے ہیں۔ ایسا خیال صحیح نہیں، قادیانیوں کو ایسا ہی دھوکہ ہوا ہے، کیونکہ آپ صرف خاتم رُتبی نہیں ہیں، بلکہ خاتم زمانی بھی ہیں۔ تمام نبیوں کے آخر میں مبعوث ہوئے ہیں۔ کیونکہ ستارے: سورج طلوع ہونے سے پہلے جگمگا سکتے ہیں، مگر جب سورج نکل آتا ہے تو ان کی ضیا پاشی ختم ہوجاتی ہے، اور نبی ﷺ کو قرآن میں ﴿سِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾ کہا گیا ہے، یعنی آپ آفتابِ نبوت ہیں، اس لئے اللہ نے دیگر انبیاء کو پہلے بھیجا، جب وہ اپنی تابانی دکھا چکے تو آفتابِ نبوت طلوع ہوا، اور اب وہ قیامت تک چمکتا رہے گا، اب سابقہ کوئی نبی تابع ہوکر تو آسکتا ہے، مگر نیا کوئی نبی نہیں آسکتا۔

خاتَم (بفتح التاء) اور خاتِم (بکسر التاء) کے ایک معنی ہیں

آیتِ کریمہ میں ﴿خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ تاء کے زبر کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور زیر کے

ساتھ بھی، بکسر التاء کے معنی ہیں: ختم کرنے والا، پورا کرنے والا۔ اور بفتح التاء کے معروف معنی ہیں: مہر، انگوٹھی (پہلے مہر انگوٹھی میں بنتی تھی) اور مہر: دستاویز کے آخر میں لگائی جاتی ہے، جہاں مضمونِ خط پورا ہوجاتا ہے وہاں اعتبار پیدا کرنے کے لئے مہر لگائی جاتی ہے، نبی ﷺ کے والا ناموں پر بھی مہر خط کے آخر میں لگائی گئی تھی، پس مہر: خط کا مضمون ختم ہونے کی علامت ہے، اور تفسیر کا قاعدہ ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے، اور دو قراءتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہوتی ہیں، اس لئے دونوں لفظ ختم نبوت زمانی پر بھی دلالت کرتے ہیں اور رتبی پر بھی، یعنی آپ کا زمانہ تمام نبیوں کے بعد ہے، آپؐ کے بعد کسی قسم کا کوئی نیا نبی آنے والا نہیں، اور آپ کا مرتبہ نبیوں میں سب سے بڑھ کر ہے، آپؐ وصف نبوت کے ساتھ بالذات متصف ہیں اور دیگر انبیاء بالعرض! بلکہ حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے تو ختم نبوت مکانی بھی اس آیت سے ثابت کی ہے، جس کی تفصیل تحذیر الناس میں ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ مِثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ، اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ (آل عمران ۵۹و۶۰)

بزرگو اور بھائیو! آج جو پارہ پڑھا گیا ہے اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت طویل مضامین آئے ہیں، ان تمام مضامین کو اس مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے، اس لئے ان میں سے ایک حصہ آپ حضرات کے گوش گذار کرتا ہوں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد نبی ﷺ کی خبر دینا ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ سے بالکل متصل زمانہ میں آئے ہیں، بیچ میں کسی نبی کا فاصلہ نہیں، اور ان سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے ہیں۔ یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے، اور دونوں تقریباً ہم عمر تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام چھ سات مہینے بڑے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام چھوٹے، اور حضرت یحییٰ کی بعثت کا ایک مقصد حضرت عیسیٰ کی آمد کی اطلاع دینا تھا۔ وہ اعلان کرتے تھے کہ کلمۃ اللہ آرہے ہیں، روح اللہ آرہے ہیں، ان پر ایمان لانے کے لئے تیار ہوجاؤ۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد فخر دو عالم ﷺ کا زمانہ قریب آنے کی اطلاع دینا تھا، لوگوں کو بتانا تھا کہ محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لانے والے ہیں، ان پر ایمان لانے کے لئے تیار ہوجاؤ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِيْ اسْمُهٗ أَحْمَدَ﴾ (الصّف ۶): میں ایک ایسے رسول کی خوشخبری سنارہا ہوں جو میرے

بعد آئیں گے۔ میرے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد آئیں گے، جن کا نام پاک احمد ہوگا۔

احمد وصفی نام ہے اور محمد ذاتی نام

أَحْمَدُ: أکبر کے وزن پر ہے اور اسم تفضیل ہے اور اس کے معنی ہیں: سب سے زیادہ تعریف کرنے والا، اور یہ آنحضور ﷺ کا وصفی نام ہے، جو نام کسی خوبی کو ظاہر کرتا ہے، اس کو وصفی نام کہتے ہیں۔ اور ذاتی نام کو علم کہتے ہیں، جیسے ایک شخص کا نام عبدالرحیم ہے تو یہ علم (ذاتی نام) ہے اور وہ مفتی، حافظ، قاری بھی ہے تو یہ مفتی حافظ اور قاری وصفی نام ہیں، آنحضور ﷺ کا علم (خاص نام) محمدؐ ہے اور وصفی نام بہت ہیں، بعض حضرات نے ننانوے نام اکٹھا کئے ہیں، اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، ان وصفی ناموں میں ایک نام احمد بھی ہے، اس کے معنی ہیں: اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔

انجیل میں نبی ﷺ کا وصفی نام احمد ہے

انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے اور جو سریانی زبان میں تھی، اس میں آنحضور ﷺ کا وصفی نام: پیروکلی طس (Peroclitus) آیا ہے جس کی عربی فارقلیط ہے، یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، اس کا مفہوم وہی ہے جو احمد کا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔

ویدوں اور پرانوں میں آنحضور ﷺ کی بشارت

نبی ﷺ کی بشارت ویدوں میں بھی ہے، اور پرانوں میں بھی۔ ویدوں میں آپؐ کا نام: نراشیش آیا ہے، اور پرانوں میں کلکی اوتار۔ اور یہ کتنی پرانی کتابیں ہیں اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، بعض کہتے ہیں: حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کو جو کتابیں دی گئی تھیں وہ یہ ہیں، اللہ جانے حقیقت کیا ہے؟ ان کی تاریخ مجہول ہے۔ اور نراشیش جس کی وید میں بشارت دی گئی ہے، اس کے معنی ہیں: اللہ کی بے حد پرسنا (تعریف) کرنے والا۔ یعنی لفظ احمد کے جو معنی ہیں وہی اس لفظ کے بھی ہیں۔ اور پرانوں میں کلکی اوتار ہے، جس کے معنی ہیں: خاتم النّبیین ﷺ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ختم نبوت کا نمونہ تھی

غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی پاک ﷺ کی بشارت لے کر آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش میں دنیا والوں کو ایک معجزہ دکھایا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سنتِ الٰہی یہ چلی آ رہی تھی کہ مرد و زن کے ملنے سے انسان پیدا ہوتا تھا، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا، اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ کیوں دکھایا؟ کسی اور نبی کو بغیر باپ کے کیوں پیدا نہیں کیا؟ اس لئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی پاک ﷺ سے بالکل متصل زمانے میں مبعوث ہوئے ہیں، ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان کسی نبی کا فاصلہ نہیں، اور ان کی بعثت کا اہم ترین مقصد آپؐ کی آمد کی بشارت دینا تھا، اور آج تک نبوت کے جو مختلف سلسلے جاری تھے، اللہ تعالیٰ ان کو نبی آخر الزماں ﷺ کی ذات میں سمیٹنے والے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو جو آنحضور ﷺ سے متصل تھے بغیر باپ کے پیدا کر کے دنیا والوں کو دکھایا کہ اللہ کی قدرت میں سب کچھ ہے۔ وہ نبوت کے تمام سلسلوں کو ایک ہستی سے سمیٹنے پر قادر ہیں، جو ہستی بغیر باپ کے صرف ماں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کر سکتی ہے، وہ ایک ذات میں نبوت کو کیوں نہیں سمیٹ سکتی؟ نبوت کے تمام سلسلوں کو ایک ذات میں سمیٹ دینا اتنا مستبعد نہیں جتنا بغیر باپ کے انسان کو پیدا کرنا مستبعد ہے۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عجیب پیدائش آنحضور ﷺ کے خاتم النّبیین ہونے کی دلیل ہے، بغیر باپ کے ان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ خاتم النّبیین ﷺ کی بشارت لے کر آئے تھے، اور خاتم النّبیین ﷺ کے زمانہ سے متصل زمانہ میں آئے تھے۔

عیسائیوں کو لفظ روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے دھوکہ ہوا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں چند باتیں جمع ہو گئی تھیں، ان میں سے چار باتیں ایسی تھیں جو دوسرے انبیائے کرام میں نہیں تھیں، اس لئے ان کے ماننے والوں کو ان کے بارے میں غلط فہمی ہوئی: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھا، دوسری: انجیل میں ان کو ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) کہا گیا ہے، تیسری: ان کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ہے، چوتھی: ان کا

آسمان پر اٹھایا جانا ہے۔

پہلی بات: آج ہی یہ آیت پڑھی گئی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ (اللہ کا بول) ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی طرف ڈالا، اور وہ روح اللہ ہیں۔ انجیل میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یہ القاب آئے ہیں اور جب وہ "اللہ کی روح" ہیں تو وہ یا تو خود خدا ہیں یا خدائی کا حصہ ہیں، یعنی اس میں شریک ہیں، چنانچہ اکثر عیسائیوں کا یہی عقیدہ ہے کہ وہ تہائی خدا ہیں۔

ہندؤں کے عقیدۂ اوتار کی حقیقت

ہندؤں کے یہاں اوتار کا عقیدہ ہے وہ کہتے ہیں: دنیا میں جب فساد بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کسی عورت کے پیٹ سے انسانی بھیس میں پیدا ہوتے ہیں، وہ انسان درحقیقت اللہ ہوتا ہے، وہ لوگ اس کو اوتار کہتے ہیں، وہ انسان بڑا ہو کر لوگوں کی اصلاح کرتا ہے، پھر وہ انسان مرجاتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی جگہ چلے جاتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ خدا ہیں، نہ خدا کا کوئی حصہ!

اسی طرح عیسائی بھی حضرت عیسیٰ کو خدا کہتے ہیں یا خدائی میں حصہ دار مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نظریہ کو رد کیا ہے: ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ، قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ، وَأُمَّهٗ، وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا، وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا. وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (المائدہ:۱۷) بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم ہی ہیں۔ آپ کہئے: اگر ایسا ہے تو بتلاؤ: اللہ تعالیٰ حضرت مسیح بن مریم کو اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین میں ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہیں تو کون ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ان کو بچا سکے؟ اور اللہ تعالیٰ ہی کی آسمانوں پر، زمین پر اور جتنی چیزیں ان میں ہیں ان پر حکومت ہے، وہ جو چاہیں پیدا کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

اس آیت میں صاف فرما دیا ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا مانتے ہیں وہ کافر ہیں۔ اور یہ بعض عیسائیوں کا عقیدہ تھا اور ہو سکتا ہے وہ آج بھی موجود ہوں اس لئے کہ

عیسائیوں میں اتنے فرقے ہیں کہ ہم کہاں تک ان کے احوال جانیں گے؟ لیکن عیسائیوں کی اکثریت اس کی قائل نہیں۔ اکثر عیسائی تین کے مجموعہ کو خدا کہتے ہیں، وہ ایک خدا کے تین حصے کرتے ہیں، اس نظریہ کی بھی قرآن نے تردید کی ہے، فرمایا: ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا إِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ (المائدہ:۷۳): وہ لوگ بھی کافر ہیں جنھوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تین میں سے ایک ہیں، جنھوں نے اللہ کو ۱/۳ مانا انھوں نے بھی اللہ کا انکار کردیا۔

دونوں عقیدے کفر ہیں، جنھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم ہیں، انھوں نے تو اللہ کو مانا ہی نہیں۔ اور جنھوں نے کہا کہ اللہ ۱/۳ ہیں، انھوں نے بھی اللہ کو نہیں مانا، پھر فرمایا: ﴿وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا إِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾: جبکہ ایک معبود کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ کامل و مکمل ہیں، ان کا کوئی حصہ دار نہیں، اور عیسائیوں میں جو یہ عقیدے پیدا ہوئے ہیں وہ لفظ کلمۃ اللہ اور لفظ روح اللہ سے پیدا ہوئے ہیں، یہیں سے ان کو دھوکہ ہوا ہے۔

روح اللہ کی حقیقت

آپ لوگ چونکہ عربی نہیں جانتے اس لئے ذرا تفصیل سے سمجھاؤں گا، روح اللہ میں روح کی اللہ کی طرف اضافت ہے، اور عربی میں اضافت مختلف مقاصد سے کی جاتی ہے، ان مقاصد میں سے ایک مقصد "تشریف" ہے، جیسے بیت اللہ میں اضافت تشریف کے لئے ہے، اللہ کے گھر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وہاں رہتے ہیں، وہ مکانیت سے پاک ہیں، بلکہ اس گھر کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے یہ اضافت کی گئی ہے، جیسے ہم مسجدوں کو "اللہ کا گھر" کہتے ہیں، اس سے ہم ان جگہوں کا بابرکت اور معزز ہونا ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کو جو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کا معزز و محترم ہونا بیان کرنا مقصود ہے، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اللہ نے اپنی روح کا کل یا بعض عیسیٰ کے جسم میں ڈالا۔

اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے بنایا

جیسے حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو تمام مخلوقات کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، پس

سب سجدہ ریز ہوگئے، یہاں تک کہ ملائکہ بھی سجدہ ریز ہوگئے جو سب سے بڑی اور اشرف مخلوق تھے، مگر ابلیس لعین نے سجدہ نہیں کیا، پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَامَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ، أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ؟﴾ (ص:۷۵): جس مخلوق کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، اس کے سامنے تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کیا تو غرور میں آگیا یا تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے؟ ارشادِ پاک: ''جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اوزار لے کر حضرت آدمؑ کو گھڑنے بیٹھے تھے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی خاص قدرت سے بنایا، معزز ومحترم مخلوق بنایا، پھر تو نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ یہاں بیدی میں اضافت تشریف کے لئے ہے، اسی طرح روح اللہ میں بھی اضافت تشریف کے لئے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اسی طرح حدیث میں ہے: إن الله خلق آدم على صورته (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۲۸) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ بعض لوگ علی صورتہ کی ضمیر آدمؑ کی طرف لوٹاتے ہیں، کیونکہ اقرب وہی ہے، یعنی آدم کو آدم کی صورت پر پیدا کیا، یہ مہمل بات ہے، ہر مخلوق اسی کی صورت پر پیدا کی گئی ہے، بھینس بھینس کی صورت پر پیدا کی گئی ہے، بیل بیل کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے، پس اگر آدمؑ آدمؑ کی صورت پر پیدا کئے گئے تو یہ کونسی نئی بات ہوئی؟ بلکہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، یعنی اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا، اور اضافت تشریف کے لئے ہے، یعنی نہایت شاندار صورت پر پیدا کیا، اپنی صورت پر پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جیسی ہماری صورت ہے ویسی ہی اللہ کی صورت ہے، بلکہ انسان کی عظمت، شرافت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اور یہ عربی کا مشہور قاعدہ ہے کہ کبھی ایک چیز کی دوسری چیز کی طرف نسبت: عظمت، شرافت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کی جو اللہ کی طرف اضافت ہے وہ عظمت وبزرگی ظاہر کرنے کے لئے ہے اور بس!

کلمۃ اللہ کی حقیقت

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انوکھے انداز پر پیدا کی ہے ﴿بَدِيْعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ وہ موجد ہیں آسمانوں اور زمین کے اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتے ہیں تو بس اس کو کہتے ہیں کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتا ہے۔

تفسیر:

اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انوکھے انداز پر پیدا فرمائی ہے۔ جب کبھی اللہ تعالیٰ کسی چیز کا فیصلہ فرماتے ہیں تو بس یہ کہتے ہیں کہ ہوجا، پس وہ ہوجاتی ہے، کسی مادّے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا حکم ہی سب کچھ ہوتا ہے، پس ساری کائنات اللہ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام بھی اسی طرح پیدا ہوئے ہیں۔ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی کچھ خصوصیت نہیں ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ، خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (آل عمران: ۵۹) عیسیٰ کی حالتِ عجیبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدمؑ کی حالتِ عجیبہ کی طرح ہے۔ ان کو مٹی سے بنایا پھر ان سے کہا: ہوجا پس وہ ہوگئے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کا حکم دیا تو وہ موجود ہوگئے، پس ساری ہی کائنات کلمۃ اللہ سے پیدا ہوئی ہے اور ﴿كَلِمَةٌ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی مادّے کے محض اللہ کے حکم سے مریم رضی اللہ عنہا کے بطن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود ہوگیا، آدم علیہ السلام بھی اسی طرح کلمۂ کن سے پیدا ہوئے ہیں، پس کلمۃ اللہ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کچھ تخصیص نہیں، مگر ان دو لفظوں سے عیسائیوں کو دھوکہ ہوا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کا مطلب

اور دوسری بات جس کی وجہ سے عیسائیوں کو غلط فہمی ہوئی، وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل میں ابن اللہ کہا گیا ہے، اور یہ لفظ اس وقت بھی بائبل میں موجود ہے، اس لفظ سے ان کو دھوکہ ہوا، انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا، حالانکہ یہود ونصاریٰ خود کو بھی اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، قرآن میں ان کا قول ہے: ﴿نَحْنُ أَبْنَاءُ اللّٰهِ وَأَحِبَّاؤُهُ﴾

(المائدہ آیت ۱۸): یہود ونصاری کہتے ہیں: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، جب یہود ونصاری خود کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، اور بیٹا کہنے کی وجہ سے وہ اللہ کے حقیقی بیٹے نہیں بن گئے تو عیسیٰ حقیقی بیٹے کیسے ہوگئے؟ درحقیقت یہ پیار کا لفظ ہے، جیسے چھوٹے بچے سے کہتے ہیں: بیٹا! ذرا پانی لانا، پس اس کو بیٹا کہنے سے وہ حقیقی بیٹا نہیں ہوجاتا، اور یہ استعارہ ہر زبان میں رائج ہے۔ مگر عیسائیوں کو اس لفظ سے بھی دھوکہ ہوا۔

عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی دھوکہ کا سبب بنا

تیسری چیز جس سے عیسائیوں کو دھوکہ ہوا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ہے، انھوں نے سوچا: بغیر باپ کے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ لامحالہ حضرت عیسیٰ کے باپ اللہ تعالیٰ ہیں، اور وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔

ایک لطیفہ: جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو انھوں نے سارے ملک کو عیسائی بنانے کا پلان بنایا، اس کے لئے انھوں نے انگلینڈ سے پادریوں کی ٹیم بلائی، اور ان کو سارے ہندوستان میں پھیلا دیا، پادری پولیس کے ساتھ شہر کی کسی بڑی مسجد میں کسی نماز کے وقت پہنچ جاتے تھے، جب نماز ختم ہوتی تو پولیس لوگوں کو زبردستی بٹھاتی کہ پادری صاحب کا بیان سن کر جاؤ، دہلی کی جامع مسجد کا واقعہ ہے: ایک پادری پولیس کے ساتھ آیا، نماز کے بعد پولیس نے سب لوگوں کو روک لیا، اور پادری نے ڈرامائی انداز میں تقریر شروع کی، مجمع میں سے دس پندرہ آدمیوں کو کھڑا کیا، ہر ایک سے اس کا اور اس کے باپ کا نام پوچھا، سب نے اپنا اور اپنے باپ کا نام بتایا، تب پادری نے کہا: ارے مسلمانو! تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں! تم میں سے کوئی بھی بغیر باپ کا نہیں، اور تم حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا رسول اور پیغمبر مانتے ہو، پھر کہتے ہو: ان کا کوئی باپ نہیں تھا! کیسی بھونڈی بات بکتے ہو! جاؤ اگلی نماز میں اپنے مولویوں سے پوچھ کر اس کا جواب لانا۔

مجمع میں سے ایک آدمی کھڑا ہوا، اس نے کہا: پادری صاحب! آپ بتائیں: عیسیٰؑ کا باپ کون ہے؟ پادری نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ ہیں، اس شخص نے پوچھا: اللہ کے کتنے بیٹے ہیں؟ پادری نے جواب دیا: صرف عیسیٰؑ! اس شخص نے

پوچھا: اور کوئی بیٹا نہیں؟ پادری نے کہا: نہیں، پس اس شخص نے کہا: تیرے اللہ سے تو میں اچھا، میرے دس لڑکے ہیں! جب اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہیں تو پھر ان کا ایک ہی بیٹا کیوں؟ ان کے تو ان گنت بیٹے ہونے چاہئیں، جا اگلی نماز میں اس کا جواب لانا۔ پس پادری کی سِٹّی گم ہوگئی، اور وہ اگلی نماز میں آیا ہی نہیں۔

اگر بغیر کے باپ کے پیدا ہونا خدائی کی دلیل ہے تو آدمؑ اسکے زیادہ مستحق ہیں:

خیر بات یہ چل رہی تھی کہ عیسائیوں کو لفظ ابن اللہ سے بھی دھوکہ ہوا ہے، انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا سمجھ لیا، اور بیٹا باپ کی جائداد میں حصہ دار ہوتا ہے اور اللہ کی جائداد ان کی ''خدائی'' ہے، اس طرح حضرت عیسیٰؑ خدائی میں شریک ہوگئے۔

قرآنِ کریم نے نہایت سادہ انداز میں اس بات کو سمجھایا ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے سے خدا ہونا یا خدائی میں حصہ دار ہونا لازم نہیں آتا، حضرت آدم علیہ السلام ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے ہیں، مگر تم ان کو خدا نہیں مانتے، پس جب آدمؑ ماں باپ کے بغیر پیدا ہونے کے باوجود خدا نہیں ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کہاں سے ہوگئے؟ ارشادِ پاک ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ﴾: حضرت عیسیٰؑ کا معاملہ اللہ کے یہاں آدمؑ جیسا ہے، ان کا معاملہ کیا ہے؟ ان کا پتلا مٹی سے تیار کیا اور حکم دیا ہوجا تو وہ ہوگئے، اور وہ مخلوق ہیں، خدا نہیں ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ (آل عمران ۶۰) اور یہ تیرے پروردگار کی طرف سے بالکل سچی بات ہے، اس میں ذرا شک نہیں، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، تجھے اس میں ذرا شک نہیں ہونا چاہئے، وہ بھی اللہ کے بندے اور رسول ہیں، اور بس!

ہر نوع کا پہلا جوڑا براہِ راست مٹی سے پیدا کیا گیا ہے

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ ہر نوع کا پہلا جوڑا بغیر کسی واسطہ کے مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، کوئی بھی نوع ہو: گائے ہو، بھینس ہو، بکری ہو یا اونٹ ہو، ہر نوع کے پہلے دو فرد (نر و مادہ) براہ راست مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ آدم وحواء علیہما السلام بھی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمین پر تین قسم کی مخلوقات ہیں: ایک: کیڑے مکوڑے: ان کی پیدائش براہِ راست مٹی سے ہوتی ہے۔ان میں توالد وتناسل نہیں ہوتا۔تمام حیوانات مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، اسی طرح کیڑے مکوڑے آج بھی مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، پھر جب وہ مرجاتے ہیں تو دوسرے پیدا ہوجاتے ہیں۔آج کچھ نہیں ہوتا، کل بارش ہوگئی اور پوری زمین کیڑوں سے بھرگئی، پھر ایک دن آتا ہے کہ سب مرجاتے ہیں۔غرض مخلوق کی ایک قسم تو یہ ہے کہ جو سیدھے مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، زمین میں اللہ تعالیٰ نے بے پناہ تخلیق کی صلاحیت رکھی ہے، ہمارا جسم بھی چونکہ مٹی سے بنا ہے، اس لئے اس میں بھی یہ صلاحیت ہے۔آدمی کے جسم میں زخم لگتا ہے تو وہاں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں، پیٹ میں کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں۔

دوسری قسم کی مخلوق وہ ہے جو مٹی سے بھی پیدا ہوتی ہیں اور ان میں توالد وتناسل بھی ہوتا ہے، جیسے مچھلی براہ راست کیچ سے بھی پیدا ہوتی ہے اور اس میں توالد وتناسل بھی ہوتا ہے۔ان میں نر ومادہ ہوتے ہیں، ان کے بچے بھی ہوتے ہیں اور براہِ راست مٹی سے بھی وہ پیدا ہوتی ہیں۔

تیسری قسم کی مخلوق وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے شروع میں مٹی سے بنایا، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوا، اب دوبارہ وہ سیدھے مٹی سے پیدا نہیں ہوتے، پہلی گائے اور پہلا بیل براہ راست مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوا، اسی طرح انسان کے پہلے دو فرد مٹی سے پیدا کئے گئے، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوگیا، اب انسان سیدھے مٹی سے پیدا نہیں ہوتے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں: وہ مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، اور دادی حواء رضی اللہ عنہا کے بارے میں روح المعانی (۴:۱۸۱) کے حاشیہ میں امام باقر رحمہ اللہ (جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد ہیں) کی طرف منسوب کرکے یہ قول لکھا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا بنانے کے بعد جو مٹی بچ گئی تھی، اس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت حواءؑ کو بنایا۔قیل: إنها خُلقت من فضل طينته، ونُسب للباقر اھ منہ اور یہ جو مشہور ہے کہ حضرت حواء حضرت آدمؑ کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں: یہ اسرائیلی روایت ہے۔اور آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو، کیونکہ عورتیں پسلی

سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی پسلی اوپر کی ہے، یعنی اس نہایت کج پسلی سے عورتیں پیدا کی گئی ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۳۸) اس حدیث میں عورت کی تخلیق کا بیان نہیں ہے، بلکہ نسوانی فطرت میں نہایت کجی کی تمثیل ہے۔اور یہ تصور کہ حضرت حواء حضرت آدمؑ کی بائیں جانب کی سب سے اوپر کی پسلی سے پیدا کی گئیں ہیں، یہ تصور بائبل (کتاب پیدائش باب ۲ آیات ۲۲-۲۴) کا ہے پھر وہاں سے اسلامی روایات میں آیا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ بغیر ماں باپ کے کیوں نہیں پیدا کئے گئے

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بغیر باپ کے کیوں پیدا کئے گئے؟ ان کو بھی بغیر ماں باپ کے مٹی سے کیوں پیدا نہیں کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ انسان کے صرف پہلے دو فرد مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں، پھر ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہوا ہے، اس کے بعد کوئی انسان براہِ راست مٹی سے پیدا نہیں ہوا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق اس طرح کیسے ہوتی؟

رہی چوتھی بات: یعنی ان کا آسمان پر اٹھایا جانا، جس سے عیسائیوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، اس کا جواب میں نے ایک دوسری تقریر میں تفصیل سے بیان کیا ہے، اس لئے اس کا ذکر چھوڑتا ہوں۔اب آخری بات عرض کرتا ہوں۔

الوہیت اور احتیاج میں منافات ہے

کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی خدائی میں شریک گردانتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کی نیک بندی تھیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ، كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ (المائدہ ۷۵) ان کی والدہ صدیقہ تھیں، دونوں کھانا کھاتے تھے، اور جو کھانا کھاتا ہے وہ کھانے کا محتاج ہوتا ہے، پھر جو کھانا کھاتا ہے اس کو بیت الخلاء کی بھی حاجت ہوتی ہے، اور اللہ کا کلام چونکہ نہایت فصیح وبلیغ ہے اس لئے یہ بات صراحۃً نہیں کہی گئی، مگر مراد ہے۔اور احتیاج خدائی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔پس ثابت ہوگیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف اللہ کے بندے اور اسکے رسول ہیں۔اور انکی والدہ صرف اللہ کی نیک بندی ہیں۔والحمد للہ رب العالمین۔

﴿۱۰﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام میں پورے آجاؤ، شیطان کی پیروی مت کرو

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿أَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ آیت ۲) ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِيْ السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ، إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِيْنٌ﴾ (البقرۃ آیت ۲۰۸)

بزرگو اور بھائیو! آج دنیا میں جو بھی مذاہب پائے جاتے ہیں، ان میں سے صرف ایک دین اپنی اُس حالت پر ہے، جو اللہ کے یہاں سے آیا ہے، باقی مذاہب یا تو اللہ کے یہاں سے آئے ہوئے دین کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں، یا وہ لوگوں کے گھڑے ہوئے ادیان ہیں۔ جیسے اکبر بادشاہ نے ایک دین: دینِ الٰہی کے نام سے چلایا تھا۔ اکبر بادشاہ کے درباریوں نے اس کے دماغ میں ایک خیال ڈالا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی مدت ایک ہزار سال ہے، اور انھوں نے: ﴿يُدَبِّرُ الأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (حم السجدة:۵) سے استدلال کیا تھا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يُدَبِّرُ الأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الأَرْضِ﴾: اللہ تعالیٰ انتظام کرتے ہیں معاملہ کا آسمان سے زمین تک۔ پھر اللہ کا وہ انتظام چڑھ جاتا ہے: ﴿ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ﴾ ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے دنوں کی گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال ہے: ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ﴾

اس آیت میں یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آسمان وزمین کے درمیان جو "تکوینی انتظام" ہے اس میں ہزار سال میں تبدیلی آتی ہے، ایک انتظام جو چل رہا ہے: چلتا رہتا ہے، پھر ہزار

سال کے بعد اس کی جگہ نیا انتظام آتا ہے، پھر اگلے ہزارے میں یہ انتظام بھی واپس چلا جاتا ہے اور تیسرا انتظام آتا ہے۔

اس کی مثال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذَا الدِّيْنِ عَلَى رَأْسِ كُلِّ مِأَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا أَمْرَ دِيْنِهَا**: اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو سال کے سرے پر ایک ایسی شخصیت بھیجتے ہیں جو دین کی تجدید کرتی ہے۔ دین کی تجدید کو ایک مثال سے سمجھیں:

دین کی تجدید

ہمارا ایک محل ہے، سو سال ہوتے ہوتے مکڑیاں اس میں جالے تن دیتی ہیں، دیواروں کا رنگ روغن پھیکا پڑ جاتا ہے، پلاسٹر اکھڑنے لگتا ہے، فرش میں جگہ جگہ کھڈے پڑ جاتے ہیں۔ کتنا بھی شاندار محل ہو، سو سال ہوتے ہوتے اس کے ساتھ یہ صورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح دین کے ساتھ بھی یہ صورت پیش آتی ہے، دین کے محل میں بھی مکڑیاں (شیطان اور اس کے بھائی بند) جالے (بدعات) تنتی ہیں، اور لوگ ان جالوں (بدعات) کو فانوس سمجھتے ہیں، دین کے محل کی دیوار کا پلاسٹر بھی اکھڑتا ہے، یعنی دین کی قدریں کمزور پڑتی ہیں، دین کے محل کے صحن میں جگہ جگہ کھڈے پڑتے ہیں، یعنی دین کی بعض اہم باتیں امت میں سے غائب ہو جاتی ہیں، جیسے بیوہ کے بارے میں اسلام کا حکم ہے کہ اس کا نکاح کر دیا جائے، مگر ہمارے بہت سے معاشروں میں شوہر کے مر جانے کے بعد عورت ایک یا دو بچوں کو لے کر زندگی بھر بیٹھی رہتی ہے اور نکاحِ بیوگان کو بڑا عیب سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ہندوانہ تصور ہے جو ہمارے معاشرہ میں در آیا ہے، یہ محل کے فرش میں کھڈے پڑنا ہے۔ مجدد جب آتا ہے تو تمام جالوں پر جھاڑو پھیرتا ہے، سب کو ایک طرف کر دیتا ہے اور محل کو اصلی شکل میں لوٹاتا ہے، اور جو دیوار کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے، اس پر پینٹ کرتا ہے، کھڈوں کو بھرتا ہے اور اسلام کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا ہے۔

غرض: دین کا محل بھی سو سال میں پھیکا پڑتا ہے اور صحن میں کھڈے پڑتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ ہر سو سال میں مجدد بھیجتے ہیں، جو دین کی تجدید کرتا ہے۔

اسی طرح کائناتی نظام بھی ہزار سال میں بدلتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ مضمون

ہے اور اکبر کے دربار کے گمراہ علماء نے اکبر کے دماغ میں یہ مطلب بٹھایا تھا کہ حضورؐ جو دین لائے ہیں وہ دین ایک ہزار سال تک کے لئے ہے، ایک ہزار سال پورے ہونے پر وہ دین اللہ کی طرف چڑھ جائے گا، پس اگلے ہزارے کے لئے نیا دین آپ تیار کریں، چنانچہ اس نے کچھ عیسائیوں سے لیا، کچھ یہودیوں سے لیا، کچھ ہندوؤں سے لیا، کچھ پارسیوں سے لیا اور بڑی مقدار اسلام سے لی اور مختلف مذاہب کو ملا کر چوں چوں کا مربہ تیار کیا، اور اس کا نام: دینِ الٰہی اور دین اکبری رکھا، مگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہزارے کے سرے پر مجدد الف ثانی کو بھیجا، انھوں نے اکبر کے دین کے ازالے کے لئے محنت کی، اکبر نے ان کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ پھر اکبر کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد حضرت نے اس کے لڑکے جہانگیر پر محنت کی، اس کے زمانے میں تھوڑی بہت اصلاح ہوئی، پھر شاہجہاں کا زمانہ آیا تو وہ پکا اور صحیح مسلمان ہو گیا اور شاہجہاں کے بیٹے عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ تو اولیاء میں سے تھے، دین کے بڑے مددگار تھے۔

الغرض: دینِ اکبری کے بارے میں ہم بالیقین جانتے ہیں کہ یہ انسانوں کا گھڑا ہوا دین تھا۔ ایسے ہی سکھوں کا دھرم ہے، اس کے بارے میں بھی ہم بالیقین جانتے ہیں کہ آج سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے گرونانک ہوئے ہیں، وہ شخصیت کیا تھی؟ اللہ جانے کیا تھی! وہ ہندوؤں کو آہستہ آہستہ اسلام سے قریب لا رہے تھے کہ درمیان میں ان کا انتقال ہو گیا، اور ان کے ماننے والے وہیں لٹک گئے اور سکھ دھرم وجود میں آ گیا۔

انبیاء کے طریقِ دعوت میں اور مصلحین کے طریقِ دعوت میں فرق:

نبی پہلے ہی دن ڈنکے کی چوٹ کہتا ہے کہ حق یہ ہے اور باطل یہ ہے، چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، اور بعض مصلحین آدھے پونے کا سودا کرتے ہیں، بدعات میں موافقت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ہم آہستہ آہستہ لوگوں کو دین کی طرف لا رہے ہیں، پھر لوگ کبھی آ بھی جاتے ہیں اور اکثر نہیں آتے، اکثر بیچ میں لٹک جاتے ہیں۔

بہر حال بعض دھرم وہ ہیں جن کے بارے میں ہم بالیقین جانتے ہیں کہ وہ نازل شدہ نہیں ہیں، لوگوں کے گھڑے ہوئے ہیں اور بہت سے ادیان وہ ہیں جن کے بارے میں ہم

بالیقین جانتے ہیں کہ وہ نازل شدہ ہیں، اگرچہ آج ان کی شکلیں بگڑی ہوئی ہیں، جیسے یہودیت اور عیسائیت۔ اور بہت سے مذاہب وہ ہیں جن کے بارے میں ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جیسے ہندو دھرم، پارسیوں کا دھرم، بدھسٹوں کا دھرم۔ یہ مذاہب ایسے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی دوٹوک بات نہیں کہی جا سکتی کہ یہ سماوی ادیان ہیں یا مصنوعی؟ بہر حال دنیا میں بے شمار مذاہب ہیں، ان میں سے صرف ایک مذہب ایسا ہے جو اپنی اصلی شکل پر ہے، جسے اللہ نے نازل فرمایا ہے۔

اسلامی فرقے اور فرقۂ ناجیہ:

مسلمان کہلانے والوں میں بھی مذاہب ہیں، فرقے ہیں، گروہ بندیاں ہیں۔ اور تمام فرقوں کے جو خیالات ہیں وہ سب ''اسلام'' نہیں ہیں۔ حدیث میں ہے: یہود کے اکہتر (۷۱) فرقے ہوئے، جو سب گمراہ تھے، عیسائیوں کے بہتر (۷۲) فرقے ہوئے جو سب گمراہ تھے، اور میری امت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے ان میں سے ایک فرقہ جنت میں جائے گا باقی جہنم میں جائیں گے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بہتر گمراہ فرقے بھی غلط ہیں، صحیح دین پر نہیں ہیں، صرف ایک جماعت حضورؐ کے لائے ہوئے صحیح دین پر ہے، اسی کے لئے جنت ہے اور یہی فرقۂ ناجیہ ہے۔

فرقۂ ناجیہ کی پہچان

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرقۂ ناجیہ کو ہم کیسے پہچانیں؟

جواب: ہمارے سامنے دھات کے بہت سے ٹکڑے ہیں، سونا کونسا ہے، چاندی کونسی ہے، تانبا کونسا ہے، پیتل کونسا ہے، اور سونے میں بھی کھرا کونسا ہے کھوٹا کونسا ہے، اس بارے میں کسوٹی سے فیصلہ کیا جاتا ہے، کسوٹی پر کسی بھی دھات کو ڈالا جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ وہ سونا ہے یا چاندی یا کوئی اور دھات۔ اور سونا ہے تو کتنے کیرٹ کا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسوٹی دی ہے اور وہ کسوٹی ہے: قرآن وسنت۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں: لَنْ تَضِلُّوْا

مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: ہرگز گمراہ نہیں ہوؤ گے جب تک تم ان دونوں کو مضبوط پکڑے رہو گے: كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ: اللہ کی کتاب اور میرا طریقہ۔ پس کتاب وسنت ایک کسوٹی ہے، لہٰذا مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہو اس کی باتیں قرآن وسنت سے ملائی جائیں، اگر قرآن وسنت کے مطابق ہیں تو وہ اللہ کے یہاں سے نازل شدہ دین ہے اور اگر قرآن وسنت اس کی موافقت نہیں کرتے تو وہ اللہ کا نازل کردہ دین نہیں ہے، وہ فرقے غلط فہمی کا شکار ہیں، جیسے ہمارے کچھ بھائیوں کو غلط فہمی ہے کہ کھلے سر نماز پڑھنا سنت ہے، حالانکہ اس کی کوئی دلیل نہیں، وہ لوگ ایسی کوئی حدیث پیش کریں جس میں یہ ہو کہ کپڑا موجود تھا اور آپؐ نے کوئی فرض نماز کھلے سر پڑھی، ایسی حدیث کے بغیر سنت کہاں سے ثابت ہوگی؟ مگر وہ لوگ قیامت تک ایسی کوئی حدیث پیش نہیں کر سکتے۔

دین ہمیشہ ایک رہا ہے اور شریعتیں مختلف:

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے حضور ﷺ تک جب بھی کوئی دین نازل کیا ہے تو دین اسلام ہی نازل کیا ہے، اس کے علاوہ کبھی کوئی اور دین نہیں آیا۔ البتہ شریعتیں نبیوں کی الگ الگ رہی ہیں، آدم علیہ السلام کے زمانہ کی شریعت اور تھی اور نوح علیہ السلام کے زمانہ کی شریعت اور، کیونکہ شریعت میں زمانہ کے احوال کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا، کیونکہ اس وقت بہن کے علاوہ عورتیں نہیں تھیں۔ پھر جب نسل انسانی آگے بڑھی اور عورتیں بہت ہوگئیں تو بہن سے اور قریبی رشتہ داروں سے نکاح حرام کر دیا گیا، اور دین: عقائد کا نام ہے، اور عقائد میں تبدیلی نہیں آتی، اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہٗ ہیں، انبیاء اور آسمانی کتابیں برحق ہیں، فرشتے واقعی مخلوق ہیں: اس میں کیا تبدیلی آسکتی ہے؟ اس لئے دین ہمیشہ ایک رہا ہے۔

غیر محرم قریبی رشتہ دار سے نکاح جائز ہے:

آپ کے ملک میں ایک نظریہ پایا جاتا ہے کہ اگر غیر محرم قریبی رشتے میں نکاح کیا جائے تو اولاد ڈِزیبل (معذور) پیدا ہوگی۔ یہ جینٹک (GENETIC) کا مسئلہ ہے، جینٹک

کے معنی ہیں: علم توالد وتناسل، یعنی اوپر سے نیچے اولاد میں کیا اثرات آتے ہیں۔ ڈاکٹری کا مذکورہ نظریہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر اس کی حد کہاں تک ہے؟ اس میں ڈاکٹروں کا خیال کچھ اور ہے اور اسلام کا نظریہ کچھ اور۔

رشتے کل چار ہیں اور ان رشتوں سے ساری دنیا ایک فیملی ہے:

۱- وہ لوگ جو آدمی سے پیدا ہوئے ہیں یعنی فروع حرام ہیں، جیسے بیٹا، بیٹی اور ان کی اولاد نیچے تک۔ اس رشتہ سے ساری انسانیت آدمؑ کی اولاد ہے، اور اس رشتہ سے نکاح حرام ہے، کیونکہ یہ قریبی رشتے ہیں، اور ان سے نکاح کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ ان رشتوں میں رغبت نہیں ہوتی، اور نکاح میں اگر رغبت نہ ہو تو نکاح بے فائدہ ہے۔

۲- وہ لوگ جن سے آدمی پیدا ہوا ہے یعنی اصول حرام ہیں، جیسے ماں، باپ پھر ان کے والدین اوپر تک۔ یہ بھی سب رشتے حرام ہیں، یہ بھی قریب ترین رشتے ہیں۔

۳- اصولِ قریب کی تمام فروع، یعنی ماں باپ کی ساری شاخیں حرام ہیں، جو ماں باپ دونوں سے نکلے ہیں وہ حقیقی بھائی بہن ہیں، اور اگر باپ کی دوسری بیوی سے اولاد ہے تو وہ علاتی بھائی بہن ہیں، اور اگر ماں کے دوسرے شوہر سے اولاد ہے تو وہ اخیافی بھائی بہن ہیں۔ یہ تینوں طرح کے بھائی بہن حرام ہیں اور ان کی اولاد بھی آخر تک حرام ہے۔

۴- اصلِ بعید کی صلبی فروع: دادا، دادی اور نانا، نانی کی پہلی شاخ حرام ہے، اور پہلی شاخ کی سب شاخیں حلال ہیں۔ دادا، دادی دونوں سے نکلنے والی پہلی شاخ حقیقی چچا اور حقیقی پھوپھی ہیں، صرف دادا سے نکلنے والے: علاتی چچا اور علاتی پھوپھی ہیں، اور صرف دادی سے نکلنے والے: اخیافی چچا اور اخیافی پھوپھی ہیں۔ اسی طرح نانا اور نانی کا حال ہے۔ دونوں سے نکلنے والے: حقیقی ماموں اور حقیقی خالہ ہیں، اور صرف نانا سے نکلنے والے: علاتی ماموں اور علاتی خالہ ہیں، اور صرف نانی سے نکلنے والے: اخیافی ماموں اور اخیافی خالہ ہیں۔ یہ سب رشتے حرام ہیں، مگر ان کی جو اولاد ہے وہ جائز ہے۔ اسی طرح پردادا پردادی اور پرنانا، پرنانی کا معاملہ ہے، ان کی جو پہلی شاخ ہے وہ حرام ہے، اور پہلی شاخ کی تمام شاخیں جائز ہیں۔ اسی طرح آدمؑ تک جتنے دادے، دادیاں اور نانے، نانیاں ہیں ان کی

پہلی شاخ حرام ہے اور شاخ در شاخ حلال ہیں۔

دلیل نقلی:

۱-حضور ﷺ سے خطاب ہے: ﴿وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ، وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ﴾ (الاحزاب: ۵۰) یعنی آپؐ کی چچا کی لڑکیاں، آپؐ کی پھوپھی کی لڑکیاں، آپؐ کے ماموں کی لڑکیاں اور آپؐ کی خالہ کی لڑکیاں آپ کے لئے حلال ہیں۔

۲-حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور آپؐ کے نکاح میں تھیں۔

دلیل عقلی:

چچا، ماموں، خالہ اور پھوپھی کی اولاد کو قریبی رشتہ دار قرار دے کر نکاح حرام کریں گے تو پھر نکاح کس سے کریں گے؟ ساری دنیا انہی چار رشتوں کا مجموعہ ہے، یہی وہ جگہ ہے جہاں اسلام اور غیر مسلم اطبائے زمانہ کا اختلاف ہے۔ اسلام تمام اولاد کو جائز قرار دیتا ہے۔ اور اطبائے زمانہ پہلی اصلِ بعید (دادا، دادی اور نانا، نانی) کو اصلِ قریب (ماں باپ) کے حکم میں رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی اولاد سے بھی نکاح کیا جائے گا تو اولاد معذور ہو سکتی ہے۔ اسلام اس کا قائل نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اصلِ قریب (ماں باپ) کا پھوپھی یا خالہ زاد بھائی: بھائی ہے، چچا یا ماموں نہیں ہے، جیسے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی والدہ اور حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ دونوں بہنیں تھیں، پس حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ: حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی خالہ ہوئیں۔ اور حضرت زکریا کے صاحبزادے حضرت یحیٰ: حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی ہوئے، یعنی حضرت مریم اور حضرت یحیٰ دونوں خالہ زاد بھائی بہن ہیں، پھر حضرت مریم کے صاحبزادے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ عیسیٰ اور یحیٰ علیہما السلام میں رشتہ کیا ہے؟ ہندوانہ خیال میں ماموں بھانجے ہیں، جو غلط ہے۔ معراج میں جب حضور ﷺ تیسرے آسمان پر پہنچے ہیں تو وہاں آپؐ کی حضرت عیسیٰ اور حضرت یحیٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی ہے۔ اور

حدیث میں ہے: ابنا الخالۃ یعنی خالہ کے دو لڑکوں سے ملاقات ہوئی، پس حضرت عیسیٰ اور حضرت یحیٰ علیہما السلام اسلامی تصور سے خالہ زاد بھائی ہوئے، ماموں بھانجے نہیں ہوئے۔

اسلام میں آدمؑ تک ہر دادا، دادی اور نانا، نانی کی جو پہلی نسل ہے وہ ہمارے لئے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ ہے، پھر اس پہلی نسل کی جو اولاد ہے وہ سب پھوپھی زاد، چچا زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد ہیں۔ اب جب آدمؑ تک سبھی چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ ہیں اور حرام ہیں، کیونکہ وہ قریبی رشتہ دار ہیں، تو اگر چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بھی حرام ہونگے تو نکاح کس سے کریں گے؟ جب حرمت چلے گی تو رُکے گی نہیں، آخر تک جائے گی، جیسے اصول میں آخر تک گئی ہے، فروع میں آخر تک گئی ہے، اور جیسے اصلِ قریب کی فروع بھائی بہن کی اولاد میں آخر تک گئی ہے۔ اور اگر حرمت کو ایک دو نسل پر روکیں گے تو روکنے کی دلیل کیا ہوگی؟ اور اصلِ بعید کی پہلی فروع کے ساتھ خاص کریں گے تو خاص کرنے کی دلیل کیا ہوگی؟ پس اسلامی تصور عقل کے مطابق بھی ہے اور اس کی دلیل بھی ہے۔ اور غیر مسلم اطباء جو کہتے ہیں ان کی بات نہ تو عقل کے مطابق ہے اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی دلیل ہے۔

بہر حال یہ نظریہ کہ قریب میں شادی نہیں ہونی چاہئے: صحیح ہے۔ مگر یہ کہ قریب کہاں تک ہے؟ اور دور کون ہے؟ اس میں اسلام اور اہل زمانہ مختلف ہیں۔

غرض: حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں اگر قریب میں شادی نہیں ہوگی تو دور کی عورتیں کہاں سے لائیں گے؟ اس وقت بہن کے علاوہ کوئی عورت نہیں تھی، پھر جب عورتیں بہت ہو گئیں تو نوح علیہ السلام کی شریعت میں قریبی عورتوں سے نکاح حرام کیا گیا، اور دور کی عورتوں سے نکاح جائز رکھا گیا۔ اس طرح کے احکام میں اختلاف سے شریعتیں مختلف ہو جاتی ہیں، لیکن دین تمام نبیوں کا ایک ہے: ﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾: اللہ کے یہاں سے جو بھی دین آیا ہے وہ اسلام ہے، اور اسی دین کو لے کر واپس جانا ہے، قبر میں پہنچتے ہی دوسرا سوال یہ ہوگا کہ مَادِيْنُكَ؟ مَاشَرِيْعَتُكَ؟ نہیں پوچھا جائے گا ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾: جو اسلام کے علاوہ کوئی دین چاہتا ہے یعنی اختیار کرتا ہے: وہ دین اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا، دنیا میں چاہے وہ

پھولے اور خود کو کامیاب سمجھے، مگر آخرت میں وہ ناکام رہنے والوں میں سے ہوگا۔

یہ دین جس کا نزول آدم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوا، یہ دین کامل ہوا خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر تیئیس سال کے عرصہ میں، اور آخر میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾: آج کامل کردیا میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو ﴿وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ اور پوری کردی میں نے تم پر اپنی نعمت۔ یہ نعمت بھی دین اسلام ہے، آیت کے دوسرے ٹکڑے میں کوئی نئی بات نہیں ہے ﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الإِسْلَامَ دِيْنًا﴾ پھر وہی مضمون تیسرے طریقہ پر بیان کیا ہے کہ پسند کرلیا میں نے تمہارے فائدے کے لئے دین اسلام کو۔ دنیا میں جب تک جیو دین اسلام پر رہو، مرنے کے بعد قبر میں بھی یہی دین اسلام کام آئے گا، قیامت کے دن بھی یہی دین اسلام کام آئے گا اور جنت میں جانے کے لئے بھی یہی دین اسلام ضروری ہے۔ میں نے تمہارے لئے ہر زندگی میں دین اسلام کو پسند کرلیا ہے۔

یہ آیت دو عیدوں کے موقعہ پر نازل ہوئی ہے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی نے کہا: تمہارے قرآن میں ایک آیت ہے، اگر وہ آیت ہماری تورات میں نازل ہوتی تو جس دن وہ آیت نازل ہوتی ہم اس دن میں فنکشن منایا کرتے، تقریب مناتے۔ حضرت نے پوچھا: وہ کونسی آیت ہے؟ اس نے یہی آیت پڑھی: ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ الآیة: حضرت عمرؓ نے کہا: یہ آیت اس دن نازل ہوئی ہے جب ہماری دو عیدیں اکٹھا تھیں۔ وہ دو عیدیں کیا تھیں؟ یوم عرفہ اور جمعہ کا دن۔ جب نبی پاک ﷺ ۱۰ ہجری میں حج کے لئے تشریف لے گئے اور عرفہ کے میدان میں وقوف کئے ہوئے تھے تو وہ اتفاق سے جمعہ کا دن تھا اور یہ آیت نازل ہوئی، پس اسلام میں عرفہ کا دن خود ایک عید ہے اور جمعہ کا دن دوسری عید ہے۔ اور دونوں عیدیں اکٹھا تھیں اس دن یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

عید کا تصور

میرے بھائیو! مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں عید کا تصور مختلف ہے، اسلام میں عید

کا تصور ہے: عبادت کرنا اور غیروں میں عید کا تصور ہے: اچھلنا کودنا۔ اب مسلمانوں میں بھی یہ تصور آگیا ہے کہ آج عید ہے اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اچھے اچھے کپڑے پہن کر مٹر گشتی کرتے ہیں، پارک میں جاتے ہیں، ساحل پر جاتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ اسلام میں عید کا یہ تصور نہیں، اسلام میں عید: عبادت کا نام ہے، عید کے دن اٹھو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ کر دوگانۂ شکر ادا کرو۔

اور عرفہ کا دن عبادت کا دن ہے، وہ ہمارے لئے عید کا دن اور خوشی کا دن ہے اور جمعہ بھی عبادت کا دن ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: یہ آیت جس دن نازل ہوئی ہے اس دن دو عیدیں اکٹھا تھیں، لہٰذا ہمیں اس آیت کے نزول کے وقت کو مستقل عید بنانے کی ضرورت نہیں، وہ عید کے دن ہی اتری ہے۔ اور ہماری یہ دونوں عیدیں آج تک مسلسل جاری ہیں۔

مجھے اس واقعہ سے یہ سمجھانا ہے کہ اس آیت کی کتنی اہمیت ہے، یہودی بھی کہہ رہا ہے کہ اگر یہ آیت ہماری تورات میں اترتی تو ہم اس دن فنکشن مناتے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ دین خاتم النّبیین ﷺ پر اتارا، پھر تصورات بگڑتے چلے گئے، امت محمدیہ میں بھی بہتر گمراہ فرقے وجود میں آئے، اور خرابی عقائد واعمال دونوں میں آئی، مثلاً قرامطہ (باطنیہ) فرقہ کہتا ہے کہ نماز جس کو مسلمان خاص طریقہ پر پڑھتے ہیں یہ اسلام میں نہیں ہے، نماز: دھیان گیان کا نام ہے، آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ، اللہ کا تصور کرلو: نماز ہوگئی، اور پاکستان میں ایک فرقہ نکلا ہے، وہ کہتا ہے: قرآن میں پانچ نمازیں نہیں ہیں۔ صرف دو نمازیں ہیں: ﴿وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالإِبْكَارِ﴾: صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرو، یہی دو نمازیں ہیں۔ پانچ نمازیں مولویوں نے گھڑی ہیں۔ یہ شریعت کو بگاڑنا ہے، اور اسی طرح اسلامی تصور میں بھی بگاڑ آیا، فرشتوں کے تصور میں بھی بگاڑ آیا، نبیوں کا کیا مقام ومرتبہ ہے اس میں بھی بگاڑ آیا، اللہ کی صفات میں بحثیں شروع ہوئیں اور اس میں بھی بگاڑ آیا۔ اس لئے میرے بھائیو! جو دین اسلام ہے وہ قرآن وحدیث میں ہے، اس دین کے مطابق اگر ہم رہے تو اللہ کی یہ نعمت ہم دست رہے گی، اور اگر ہم نے اس کا خیال نہیں رکھا تو پھر ہمارے پاس نام کا اسلام رہ جائے گا۔

خلاصہ کلام: اس آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو دین

اسلام دیا ہے اس کی قدر پہچانو، یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ نے کمپلیٹ کردی ہے، دین اسلام جو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے برابر نازل ہوتا رہا ہے وہ تمہیں پورا پورا دیدیا گیا ہے اور تمہارے جینے اور مرنے کے لئے اسی دین اسلام کو پسند کرلیا ہے۔

اسلام میں پورے آجاؤ:

دوسری آیت میں ہم سے کہا گیا ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا﴾: اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾: تم دین اسلام میں پورے آجاؤ۔ جب اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہو تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسی کے ہو کر رہو، ایک پیر اسلام میں اور ایک پیر اسلام سے باہر مت رکھو۔ مثلاً: آدمی کا جی چاہا جمعہ کے دن نماز پڑھنے کو تو پڑھ لی اور نوکری نے تقاضا کیا کہ چھ دن ظہر نہیں پڑھنی تو نہیں پڑھی، یہ اللہ کا بندہ کہاں ہوا، یہ تو نوکری کا بندہ ہوگیا۔ یا جی چاہا ختنہ کرانے کو تو ختنہ کرالی، اور اللہ کے حکم کی تعمیل کی اور جی چاہا ڈاڑھی منڈانے کو منڈالی یہ اللہ کا حکم کہاں ہوا؟ یہی ایک قدم اسلام میں اور ایک قدم باہر رکھنا ہے، یہ کوئی ایمان واسلام کا تقاضہ نہیں، یا ایک ہندو مسلمان ہوا وہ مسلمان ہونے کے بعد بھی گوشت نہیں کھاتا یا گائے کا گوشت نہیں کھاتا پس وہ اسلام میں پورا نہیں آیا، اس کی کو مسلمان ہونے کے بعد بھی دوسری طرف لگی ہوئی ہے۔

صرف خود کو دین دار بنالینا کافی نہیں

ہم اپنی دنیا میں مگن ہیں، اور ہم میں جو دین دار ہیں وہ دین پر شاداں فرحاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین دار بنایا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَايَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾: اے ایمان والو! اگر تم راہ یاب ہوگئے تو جو کھڈے میں گرے: گرے، تمہارا کیا بگڑتا ہے؟ مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگ اس آیت کو غلط سمجھتے ہیں، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم دین دار ہوگئے تو ہماری دنیاؤ آخرت کامیاب ہوگئی۔ حالانکہ خدا کی قسم! میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر تم ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑو گے تو اللہ تعالیٰ عذاب میں سب کو شامل کرلیں گے۔ اس لئے علماء

کرام فرماتے ہیں کہ مذکورہ آیت کا نمبر دین کی صحیح تبلیغ کے بعد ہے یعنی آدمی اپنی ذمہ داری پوری کرلے، تبلیغ کا حق ادا کردے پھر بھی کوئی نہ مانے تو اب ہماری ذمہ داری نہیں کہ زبردستی اس کو دین پر لے آئیں، لیکن اگر ہم دین پر ہیں اور اس پر خوش ہیں، مگر بے دینوں اور بددینوں کی ہمیں کوئی فکر نہیں تو ہم عذاب سے بچ نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾: اے ایمان والو! خود کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچاؤ۔ خود دین پر عمل کرکے اور بیوی بچوں کو بے دین چھوڑ کر دنیاؤ آخرت میں کامیابی نہیں مل سکتی، دنیا میں بھی اس کا وبال بھگتنا پڑے گا اور آخرت میں بھی بیوی بچوں کے سلسلہ میں مواخذہ ہوگا۔

میرے بھائیو! آپ کو ایسے مسلمان ہر جگہ ملیں گے جو دین سے دور ہیں، ان کو دین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، کیونکہ کوئی دین کی بات بتانے والا ان تک پہنچا ہی نہیں، صورت حال سینکڑوں سال سے بگڑتی چلی آرہی ہے، آج ستر فیصد مسلمان دین سے بے خبر ہیں۔ یہ ستر فیصد کی ذمہ داری کس پر ہے؟ ہم پر ہے! اگر ہم نے دین انہیں پہنچایا پھر بھی وہ دین کی طرف نہ آئیں تو اب ہماری ذمہ داری نہیں۔

غرض: حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ اس آیت کو غلط سمجھتے ہیں کہ ہم دین پر آگئے، اب دوسرے جو چاہیں کریں ہمارا کچھ نہیں بگڑتا، یہ مطلب صحیح نہیں۔

لا الہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کا مطلب

اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: جب تم ایمان لے آئے تو دین اسلام میں پورے پورے آجاؤ۔ لفظ اسلام کے معنی ہیں: سرافگندگی، سرڈال دینا۔ ہالی بیل لے کر جب ہل جوتنے کے لئے جاتا ہے تو ایک بیل کو دائیں طرف گھماتا ہے اور ایک کو بائیں طرف، اس کے بعد وہ جُوا اٹھاتا ہے۔ اب اگر شاندار بیل ہوتے ہیں تو فوراً سر ڈال کر جُوا اپنی گردن پر لے لیتے ہیں۔ یہ ہے اسلام: یہ ہے سرافگندگی۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾: امانت کو یعنی ذمہ داری کو انسان نے اٹھالیا۔ انسان کو جُوا دکھایا اس نے اپنی گردن پر اسے لے

لیا۔**لا إله إلا الله، محمد رسول الله** کا یہی مطلب ہے۔**لا إله إلا الله**: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس میں دو باتیں ہیں: ایک: اللہ کو معبود ماننا، دوسری: اللہ کے سوا سے معبودیت کی نفی کرنا۔ جب یہ بات کسی نے مان لی تو اب خود بخود یہ بات لازم آئی کہ وہی معبود ہیں اور ہم عابد ہیں، وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ہمیں بندگی کیسے کرنی ہے؟ یہ بات اگر انسانوں کی مرضی پر چھوڑ دی جائے تو کام نہیں چلے گا اس لئے اگلا جملہ بڑھایا: **محمد رسول الله**: حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے پیغامبر ہیں۔ وہ کیا پیغام لائے ہیں؟ انسان اللہ کی بندگی کیسے کریں؟ یہ بات اللہ نے حضور ﷺ کے ذریعہ ہمیں بتائی ہے، پس حضور نے اللہ کی بندگی کی جو جو شکلیں بتائی ہیں ان سب کو ماننا، ان سب پر چلنا اور ان سب کی تعمیل کرنا یہی اللہ کی بندگی ہے۔

لوگوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ نماز پڑھنے ہی کا نام بندگی ہے، ایسا نہیں ہے۔ بندگی: معبود کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہے، انھوں نے کہا: پانچ وقت کی نماز اس طرح پڑھو: پڑھی، یہ بندگی ہے، انھوں نے کہا: ہر سال مال میں سے اتنا حصہ غریبوں کو پہنچاؤ: پہنچایا: یہ بندگی ہے، انھوں نے کہا: سال میں ایک مہینہ کے روزے رکھو: رکھے: یہ بندگی ہے، انھوں نے حکم دیا کہ زندگی میں ایک مرتبہ میرے گھر آؤ اور اس طریقہ سے زیارت کرو: گئے اور زیارت کی: یہ بندگی ہے، انھوں نے حکم دیا کہ جب دوکان کھولو تو یوں بیچو، یوں مت بیچو، کرایہ پر دو تو اس طرح دو، اس طرح مت دو، زمین کسی کو بٹائی پر دو تو اس طرح دو، اس طرح مت دو، کمائی کے حلال ذریعے یہ ہیں اور حرام ذریعے یہ ہیں، یہ سب معاملات اللہ کے حکم کے مطابق کرنا اس کا نام ''بندگی'' ہے، اللہ پر ایمان لانے والوں کے اخلاق ایسے ہونے چاہئیں، یہی اسلامی اخلاق اختیار کرنا بندگی ہے اور ان اخلاق کی اضداد کو اختیار کرنا اللہ کی نافرمانی ہے۔ صرف نماز میں بندگی منحصر نہیں۔ سارا دین جو حضور ﷺ نے ہمیں پہنچایا ہے اس پر عمل پیرا ہونا: بندگی ہے اور اس دین کے احکام میں سے یہ بھی ہے: **بلغوا عني ولو آية**: پہنچاؤ میری طرف سے اگرچہ ایک آیت ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں: تبلیغ کرنا مولویوں کا کام ہے: یہ غلط ہے۔ بخاری کی مذکورہ حدیث کہہ رہی ہے کہ اگر کسی کو دین کی ایک بات یا ایک حکم معلوم ہے تو وہ بھی آگے پہنچائے،

ہاں جسے معلوم نہ ہو وہ خاموش رہے، اس کو علماء (جاننے والوں) کے حوالے کردے۔

حدیثِ جبرئیل علیہ السلام:

ایک حدیث ہے اور وہ بہت مشہور حدیث ہے، اس کو بار بار سننی چاہئے، اس میں دین کا پورا خلاصہ اور نچوڑ آگیا ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ صحابہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مجلس میں ایک نوجوان آیا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال کالے تھے، کپڑے نہایت اجلے اور سفید تھے، وہ مجمع کو چیرتے ہوئے حضور ﷺ کے قریب آکر بیٹھ گئے: اور اپنے گھٹنے آپؐ کے گھٹنوں سے لگادیئے۔ تمام صحابہ حیرت میں تھے کہ یہ کون ہے؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر سے نہا دھو کر کپڑے بدل کر آیا ہے یعنی مدینہ کا باشندہ ہے، اور مجمع میں سے کوئی اس کو پہچانتا نہیں تھا، اس سے معلوم ہوا کہ باہر کا آدمی ہے۔

اس نے پہلا سوال کیا: **ما الإيمان**؟ ایمان کیا ہے؟ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: سات باتیں ماننے کا نام ایمان ہے: ۱- اللہ کو ماننا۔ ۲- اللہ کے فرشتوں کو ماننا۔ ۳- اللہ کی کتابوں کو ماننا۔ ۴- اللہ کے رسولوں کو ماننا۔ ۵- آخری دن (قیامت کے دن) کو ماننا ۶- مرنے کے بعد زندہ ہونے کو ماننا۔ ۷- بھلی بری تقدیر کو ماننا۔ ان میں سے چھ کو تو آپ لوگ سمجھے ہوئے ہیں، البتہ تقدیر کا مطلب لوگ اچھی طرح نہیں جانتے، اس لئے اس کو مختصراً عرض کرتا ہوں:

بھلی بری تقدیر کا مطلب:

تقدیر کے معنی ہیں: پلاننگ، اندازہ ٹھہرانا۔ جیسے آپ کوئی بلڈنگ بنائیں تو پہلے آرٹیکیٹ سے نقشہ بنواتے ہیں، پھر اس کے مطابق بلڈنگ کھڑی کرتے ہیں، اسی طرح ازل میں جب کوئی چیز نہیں تھی: اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی جس کو وہ آگے پیدا کرنے والے ہیں: پلاننگ کی ہے، یہ دنیا پلاننگ کے بغیر پیدا نہیں کی ہے، اسی کا نام تقدیر ہے۔

اُس تقدیر میں یہ ہے کہ گھی انسان کے لئے مفید ہے، اور زہر جاں ستاں! یہی بھلی بری تقدیر ہے، چنانچہ سارے انسان اللہ کی اس تقدیر کو مانتے ہیں، انسان پیسے خرچ کرکے کریم لاتا ہے اور زہر سے ہزاروں کوس دور بھاگتا ہے، اسی طرح عقائد و اعمال میں بھی بھلی بری

تقدیر ہے۔ توحید (اللہ کو ایک ماننا) انسان کے لئے مفید ہے، اور شرک تباہ کن ہے۔ نماز پڑھے گا تو جنت میں جائے گا اور زنا کرے گا تو جہنم رسید ہوگا، صدقہ جنت میں لے جائے گا، چوری جہنم میں پہنچائے گی۔ یہ بھلی بری تقدیر ہے، اور جیسے زہر اور گھی میں اللہ کی تقدیر کا لحاظ کرتے ہوئے ہم زندگی گذارتے ہیں، ان عقائد واعمال میں بھی اللہ کی تقدیر کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

انسان کائناتی چیزوں کی حد تک اللہ کی تقدیر کی پوری پابندی کرتا ہے، اگر تجربہ سے معلوم ہوجائے کہ یہ چیز مضر ہے تو کبھی اس کے قریب نہیں جاتا، اور اگر تجربہ سے معلوم ہوجائے کہ یہ چیز مفید ہے تو اس کے پیچھے پڑجاتا ہے، مگر لوگ ایمان وکفر میں اس کا لحاظ نہیں کرتے، حسنات وسیئات میں بھی اس کا لحاظ نہیں کرتے، حالانکہ ایمان جنت میں لے جانے والا عمل ہے اور کفر جہنم میں لے جانے والا، جو جنت میں جائے گا وہ ایمان کی وجہ سے جائے گا اور جو جہنم میں جائے گا وہ کفر کی وجہ سے جائے گا۔ یہی حال اعمالِ حسنہ اور سیئہ کا ہے۔ یہی انسان کے لئے بھلی بری تقدیر ہے۔

تقدیر مفصل ہے، مجمل نہیں:

اور عالم کے لئے اللہ تعالیٰ کی پلاننگ تفصیل کے ساتھ ہے، محض اجمالی نہیں، جیسے انگریزوں نے ایک دفعہ ایک آنریری مجسٹریٹ ایک جاہل بدھو کو اس کے مالدار ہونے کی وجہ سے بنادیا، وہ ہفتہ میں ایک دن کچہری کرتا تھا۔ مقدمات کی ساری فائلیں لاکر پیش کاران کے سامنے رکھ دیتا تھا، مجسٹریٹ ایک فائل اٹھاتا اور دائیں طرف رکھتا اور کہتا: منجور (منظور) دوسری بائیں طرف رکھتا، اور کہتا: نامنجور (نامنظور) اس طرح سب مقدمات کو نمٹادیتا، آدھے منجور ہوجاتے اور آدھے نامنجور۔ اللہ کی تقدیر ایسی اندھادھند نہیں ہے کہ یہ جنت میں اور یہ جہنم میں، بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ ہے۔

ایک صحابی نے حضور ﷺ سے پوچھا: أَرَأَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيهَا، وَدَوَاءً نَتَدَاوَى بِهِ وَتُقَاةً نَتَّقِيهَا: هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ یارسول اللہ! بتائیں! یہ جو ہم جھاڑ پھونک کرتے ہیں، اور جو ہم دوائیں کرتے ہیں، اور جو ہم پرہیز کرتے ہیں، یہ چیزیں اللہ کی تقدیر کو ٹال سکتی

ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ: یہ چیزیں اللہ کی تقدیر میں شامل ہیں۔
(مشکوۃ شریف حدیث ۹۷)

اسی طرح اللہ کی تقدیر میں ہے کہ انسان اپنے جزوی اختیار سے کفر کرے گا، گناہ کرے گا اور توبہ نہیں کرے گا، اور اسی پر اس کی موت آئے گی، اس لئے وہ جہنم میں جائے گا۔ دوسرا بندہ اپنے جزوی اختیار سے ایمان لائے گا، صالح زندگی اختیار کرے گا اور اس طرح زندگی گذارتے گذارتے مرجائے گا اس لئے جنت میں جائے گا۔ یہ پورا سلسلہ اللہ کی تقدیر میں شامل ہے، اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کہ یہ لوگ جنت میں جائیں گے اور یہ لوگ جہنم میں جائیں گے، مگر یہ تقدیر کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ شمولِ علم کا مسئلہ ہے، اور دونوں مسئلوں کو گڈ مڈ کرنے سے اشکالات پیدا ہوتے ہیں، اللہ نے ازل میں طے کیا ہے کہ ایمان واعمال صالحہ انسانوں کے لئے مفید ہیں، وہ جنت میں لے جائیں گے، اور کفر اور اعمالِ سیئہ انسانوں کے لئے مضر ہیں۔ رہی یہ بات کہ کون اپنے جزوی اختیار سے کونسا عمل کرے گا اور کہاں پہنچے گا: یہ بات بھی اللہ تعالیٰ ازل سے جانتے ہیں، کیونکہ وہ غیب وشہادت کے جاننے والے ہیں، مگر یہ شمولِ علم کا مسئلہ ہے، تقدیر کا مسئلہ نہیں ہے۔

غرض: نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ سات باتیں دل سے قبول کرنے کا نام ایمان ہے۔ پھر انھوں نے پوچھا: ما الإسلام؟ اسلام کیا ہے؟ یہی آج کی تقریر کا موضوع ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: پانچ کام کرنے کا نام اسلام ہے:

۱- شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ: یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ گواہی دینا کہ آقائے دوجہاں تاجدار مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے پیغامبر ہیں، ان دو باتوں کو ماننا ایمان ہے، اور ان کی گواہی دینا اسلام ہے۔

گواہی کہاں دی جاتی ہے؟

جب مقدمہ کورٹ میں جاتا ہے اور کوئی آدمی دعوی کرتا ہے کہ یہ گھر میرا ہے، اور دوسرا انکار کرتا ہے تو جج مدعی سے کہتا ہے: گواہ لاؤ، گواہ اس مدعا علیہ کے خلاف گواہی دیتا ہے جو دعوی کا انکار کرتا ہے، اگر وہ انکار نہ کرے تو گواہی کی کوئی ضرورت نہیں۔ معلوم ہوا کہ گواہی

منکر کے سامنے دی جاتی ہے۔

میرے بھائیو! دنیا میں جو لوگ یہ دو عقیدے نہیں مانتے ان کے سامنے جاکر گواہی دینا: یہ اسلام کا پہلا کام ہے۔ پھر کورٹ میں جب گواہی دیتے ہیں تو گواہوں کا کام فیصلہ کرنا نہیں ہوتا، ان کا کام صرف گواہی دینا ہوتا ہے، فیصلہ جج کرتا ہے۔ یہاں بھی قیامت کے دن جب کورٹ قائم ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ فیصلہ کریں گے: ﴿اللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾: اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائیں گے (الحج آیت ۹۶) پس فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں، ہمارا کام: جو لوگ یہ دو عقیدے نہیں مانتے ان کے سامنے گواہی دینا ہے۔

امت کا حال یہ ہے کہ مسلمان ہی کلمہ سے محروم ہوگئے ہیں، ہم ان تک بھی کلمہ نہیں پہنچا سکے، جو لوگ ان دو عقیدوں کا انکار کرتے ہیں ان تک ہم کلمہ کیا پہنچائیں گے؟! ہم اذان وغیرہ میں شہادتین پکارتے ہیں، مگر ان کو سمجھتا کون ہے؟ جبکہ اس امت کا فریضہ ہے کہ ہر وہ انسان جو یہ دو عقیدے نہیں مانتا اس کے سامنے ان عقیدوں کی گواہی دی جائے۔

گواہی کس طرح دینی چاہئے؟

ہماری دوکان میں ایک غیر مسلم ملازم ہے، یا ہم ٹرین میں سفر کررہے ہیں، ساتھ میں غیر مسلم بیٹھا ہوا ہے، جہاز میں سفر کررہے ہیں، ساتھ میں غیر مسلم بیٹھا ہوا ہے۔ آپ اس سے پوچھیں: آپ جانتے ہیں: میرا مذہب کیا ہے؟ وہ کہے گا: ہاں جانتا ہوں: آپ مسلمان ہیں۔ یا کہے گا: نہیں جانتا: پس آپ کہیں: میں مسلمان ہوں، پھر آپ پوچھیں: کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ اسلام کس کو کہتے ہیں؟ وہ کہے گا: میں نہیں جانتا۔ پس آپ کہیں: میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ یہ ہے کہ معبود صرف اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور میں اسی کی بندگی کرتا ہوں، کسی اور کے سامنے سر نیاز خم نہیں کرتا۔ اور مکہ میں آج سے چودہ سو سال پہلے ایک شخصیت پیدا ہوئی تھی، جس کا نام پاک محمد ﷺ تھا، ان کو میں آخری پیغامبر مانتا ہوں، وہ جو اللہ کے یہاں سے پیغام لائے ہیں اس پر میں چلتا ہوں۔ بس اتنی بات آپ نے اس کے سامنے رکھ دی تو آپ نے گواہی دے دی۔ اب اگر وہ سمجھ دار ہے، اللہ نے اس کے

نصیب میں خیر رکھی ہے تو اس کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا ہوگا اور وہ اپنے عقیدوں کا ہمارے عقیدوں سے موازنہ کرے گا اور اللہ چاہیں گے تو وہ اور سوچے گا، مطالعہ کرے گا اور اگر نہیں کرے گا تو ہم نے اپنا فریضہ ادا کردیا۔ گواہی دینا بس اتنا ہی ہے، مگر ہماری کوتاہی یہ ہے کہ بیس سال سے ایک ہندو ہماری فرم میں ملازم ہے، مگر کبھی ہم نے اس کو سمجھایا نہیں کہ اسلام کے بنیادی عقیدے یہ ہیں۔

غرض: اسلام کا پہلا عمل توحیدِ باری اور رسالتِ محمدی کی گواہی دینا ہے اور گواہی ماننے والے (مسلمان) کے سامنے نہیں دی جاتی، انکار کرنے والے (غیر مسلم) کے سامنے دی جاتی ہے۔ دوسرا عمل: نمازوں کا اہتمام کرنا ہے، تیسرا عمل: زکات ادا کرنا ہے، چوتھا عمل: رمضان کے روزے رکھنا ہے، پانچواں عمل: زندگی میں ایک مرتبہ اللہ کے گھر کی زیارت کرنا (حج کرنا) ہے، اگر ہمارے اندر مالی وسعت ہے۔ ان پانچ چیزوں کا نام ''اسلام'' ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں، لیکن نجات کا مدار انہی پانچ اعمال پر ہے، جو یہ پانچ کام کرے گا وہ اسلام میں پورا آگیا، اور اگر نماز پڑھتا ہے مگر زکوۃ نہیں دیتا، یا نماز پڑھتا ہے مگر روزے نہیں رکھتا یا روزے رکھتا ہے، مگر نماز نہیں پڑھتا، سب کچھ کرتا ہے اور اللہ نے گنجائش دے رکھی ہے مگر حج کے لئے نہیں جاتا، حج کے لئے ہر سال جاتا ہے مگر نماز نہیں پڑھتا تو وہ اسلام میں ایک قدم آیا دوسرا قدم باہر ہی رہا، پورا اسلام میں نہیں آیا۔

انسان کا کمال کیا ہے؟

کبھی گناہ نہ کرنا یہ فرشتوں کی شان ہے، اور گناہ کرکے اس پر اڑ جانا، توبہ نہ کرنا یہ شیطان کی شان ہے، اور انسان کا کمال یہ ہے کہ اول تو گناہ کرے نہیں اور اگر ہوجائے تو فوراً توبہ کرے۔ آدم علیہ السلام نے گناہ نہیں کیا تھا، لغزش ہوگئی تھی، مگر پھر بھی فوراً ندامت کے آنسو بہائے اور اتنے بہائے کہ اللہ کی طرف سے مغفرت استقبال کے لئے آئی، اللہ تعالیٰ نے خود کلمات بھیجے کہ ان کے ذریعہ توبہ کرو ہم قبول کرلیں گے: ﴿فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ، فَتَابَ عَلَيْهِ﴾: پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کئے، پس اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ ان کی طرف توجہ فرمائی (البقرۃ آیت ۳۷)

بہر حال قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اللہ نے، اس کے رسولوں نے، اس کے نیک بندوں نے اللہ کی جو باتیں بتائی ہیں ان کو سنو، ان پر عمل کرو، اور اسلام کا جو امتیاز ہے اس کو باقی رکھو، جیسے سکھوں کے مذہب کا امتیاز ڈاڑھی اور پگڑی ہے، دنیا میں کہیں چلے جائیں، ان کی ڈاڑھی اور پگڑی کو کوئی نہیں چھو نہیں سکتا، اور اسلام کا امتیاز بھی ڈاڑھی ہے، مگر مسلمانوں نے اپنا امتیاز کھو دیا۔ شیطان نے اس کو پٹی پڑھائی کہ ڈاڑھی کے بغیر تیری ملازمت باقی نہیں رہے گی۔ ارے بھائی! ان سکھوں کی ملازمت باقی رہتی ہے، تیری کیوں ختم ہو جائے گی؟ اسی طرح کچھ لوگ نوکری کرتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے، کہتے ہیں: مالک اجازت نہیں دیتا۔ مالک کو کیا پریشانی ہے؟ کمی ہمارے اندر ہے، مسلمان نوکری کے ٹائم میں نماز پڑھنا چاہتا ہے اور نماز میں جو وقت خرچ ہوتا ہے اس کی بھی تنخواہ چاہتا ہے۔ ارے بھائی! تو نے اپنی عبادت کی ہے، پھر تنخواہ کس بات کی؟ تجھے چاہئے کہ اتنا اور ٹائم کرے یا تنخواہ کٹوائے، پھر دیکھ کونسا مالک نماز پڑھنے سے روکتا ہے؟ ہاں ہوسکتا ہے: کوئی مالک کمینہ ہو، جواب بھی نماز کی اجازت نہ دے تو ملازمت چھوڑ دے، ملکِ خدا تنگ نیست پائے گدا لنگ نیست! اللہ کا ملک تنگ نہیں اور ہمارے پیر میں لنگ نہیں، کسی اور جگہ نوکری مل جائے گی۔

خلاصۂ کلام:

پس میرے بھائیو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، اور شیطان کی پیروی مت کرو، شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ اللہ کے رسول نے جو دین پہنچایا ہے اس کو سیکھو، سمجھو اور تمام مسلمانوں تک پہنچاؤ، مقامی طور پر دعوت کی محنت کرو، وقت نکالو، اپنے اندر ذوق وشوق پیدا کرنے کے لئے جماعتوں میں نکلو، دوسرے مسلمانوں تک دین پہنچانے کے لئے گھر سے نکلو اور جب بھی موقعہ ملے تمام انسانوں کے سامنے توحید باری اور رسالت محمدی کی گواہی دو، یہی کامیابی کی راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

و آخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین

۱۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دنیا کی زندگی کس مقصد کے لئے ہے؟

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۞وَإِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾ (الکہف:۷و۸) ﴿الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲)

تین زندگیاں

۱- اس دنیا میں آنے سے پہلے عالم ارواح کی ایک زندگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے قیامت تک آنے والی تمام اولاد اس طور پر نکالی کہ اللہ نے اپنی قدرت کا ہاتھ حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں پیٹھ پر پھیرا تو تمام نیک اولاد نکل آئی، پھر بائیں پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو تمام بد اولاد نکل آئی، پھر اللہ نے تجلی فرمائی اور سب کو اپنی پہچان کروائی، پھر پوچھا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے بیک زبان کہا: بَلٰى! کیوں نہیں! آپ کے علاوہ ہمارا کوئی معبود نہیں، پھر بخاری کی حدیث (نمبر ۳۳۳۶) میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پیدا ہونے والی تمام روحوں کو عالم ارواح میں ایک خاص ترتیب سے گروپ بنا کر رکھ دیا جیسے آرمی (فوج) میں گروپ اور رجمنٹ[1] ہوتے ہیں، پھر جب کسی روح کے دنیا میں آنے کا وقت آتا ہے تو ماں کے پیٹ میں پہلے باڈی

(۱) رجمنٹ: پیدل سپاہیوں کا دستہ، پلٹن، رجمنٹ میں عام طور پر آٹھ سو سے ایک ہزار تک سپاہی ہوتے ہیں۔

(جسم) بنتی ہے، جب باڈی مکمل ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو حکم دیتے ہیں، وہ عالم ارواح سے اُس روح کو — جس کے لئے یہ باڈی تیار ہوئی ہے — لاکر پھونک دیتا ہے، پس بچہ ماں کے پیٹ میں زندہ ہوکر ہلنے لگتا ہے۔ ہماری ایک زندگی تو یہ ہے، عہدِ الست والی، اس میں ہم جب پیدا ہوگئے: ہوگئے، پھر مرے نہیں۔

۲- اور ایک زندگی قیامت سے شروع ہوکر ابد تک ہے۔ جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو تمام چیزیں فنا ہوجائیں گی اور حیوانات مرجائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ خاص بارش برسائیں گے اس سے ہمارا وہ بدن جو مٹی میں گل سڑ چکا ہوگا: دوبارہ بنے گا اور اس طرح زمین سے نکلے گا جس طرح گھاس نکلتی ہے، پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو ہماری وہ روحیں جو عالم برزخ میں ہونگی واپس اپنے اجسام میں داخل ہوجائیں گی۔ اس طرح مرنے کے بعد دوسری زندگی شروع ہوگی، پھر قیامت کے دن میں حساب ہوگا، حساب کتاب کے بعد دونوں دنیاؤں کے درمیان پل رکھا جائے گا جس کو پل صراط کہتے ہیں، صراط کے معنی پل کے ہیں اور تمام مکلّف مخلوقات اِس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہوجائے گی، جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور جہنمی جہنم میں، پھر جنت اور جہنم کی زندگی تا ابد ہے۔

۳- عالم ارواح اور عالم آخرت کے درمیان اس دنیا کی زندگی ہے، اس زندگی میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے۔ اور یہ جینا مرنا روح کا نہیں ہے، روح تو جب سے پیدا ہوئی ہے: ہوئی ہے، وہ مرتی نہیں، وہ فنا نہیں ہوتی، مرتا ہمارا جسم ہے، فنا وہی ہوتا ہے۔ جب جسم مرجاتا ہے تو روح آگے چلی جاتی ہے اور جسم چارپائی پر پڑا رہتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بندے کا ''انتقال'' ہوگیا، فلاں ''گذر'' گیا۔ اور یہ جسم عربی میں لاشیئ کہلاتا ہے اور اردو میں: لاش، یعنی یہ کوئی چیز نہیں۔ معلوم ہوا کہ پیدا بھی جسم ہوتا ہے اور مرتا بھی جسم ہے، رہی روح تو وہ پیدا ہونے کے بعد کبھی نہیں مرتی۔ شاعر کہتا ہے:

یہ نکتہ سیکھا میں نے بو الحسن[1] سے   کہ روح مرتی نہیں مرگِ بدن سے

(۱) بوالحسن یعنی حضرت امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ: اشاعرہ کے امام۔

دنیوی زندگی کیوں ہے؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالم ارواح کی زندگی کیوں ہے؟ اس کی تفصیل کا وقت نہیں[1] اور آخرت کی تا ابد زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا بھی وقت نہیں[2] البتہ درمیان میں اِس دنیا کی زندگی ہے، یہ کیوں ہے؟ یہ کس مقصد کے لئے ہے؟ یہ ہماری آج کی تقریر کا موضوع ہے:

قرآنِ کریم میں ایک آیت سورۂ کہف میں ہے اور اُسی مضمون کی دوسری آیت سورۂ ملک میں ہے۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ اور ہلکا سا مطلب سمجھ لیں: سورۂ ملک میں ہے: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاةَ﴾: اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے مرنا اور جینا پیدا کیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے موت کا حیات سے پہلے ذکر کیا ہے، حالانکہ ترتیب میں حیات پہلے ہے موت بعد میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو جب کسی چیز پر زور دینا ہوتا ہے تو اس کو پہلے بیان کرتا ہے، میں اس کی کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں:

قرض پر وصیت کی تقدیم کی وجہ

پہلی مثال: مرنے والے کے ترکہ میں سے پہلے اس کا کفن دفن ہوگا، کفن دفن کے بعد اگر ترکہ بچا تو پورے ترکہ سے اس کے قرضے ادا کئے جائیں گے، پھر اگر کچھ بچا تو تہائی مال سے اس کی وصیت نافذ کی جائے گی اور باقی دو تہائی ورثاء کا حق ہے۔

ترتیب اسی طرح ہے مگر قرآن نے سورۂ نساء کے دوسرے رکوع میں چار جگہ وصیت کو قرض پر مقدم کیا ہے حالانکہ ترتیب میں قرض وصیت سے پہلے ہے ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ یہاں وصیت کو قرض پر مقدم کرنے کی وجہ یہ بیان کی گئی

(۱) عالم ارواح کی زندگی سبق پڑھنے کے لئے تھی، توحید کا سبق اُس عالم میں پڑھا کر انسان کو اِس عالم میں پیدا (ظاہر) کیا گیا ہے۔

(۲) آخرت کی زندگی عمل کا بدلہ پانے کے لئے ہے، اِس عالم میں جو اچھا برا کیا ہے، اس کی جزاء وسزا آخرت میں ملے گی۔

ہے کہ قرض والے تو فوراً مطالبہ کرتے ہیں، اگر کسی کے مرنے کے بعد ایک ہفتہ ٹھہر جائیں تو بڑی بات ہے۔ اور وصیت والوں میں سے کون مانگنے آتا ہے؟ آدمی نے وصیت کی کہ میرے مال میں سے اتنا غریبوں کو دیا جائے یا کسی مدرسہ میں دیا جائے تو کون غریب مانگنے آتا ہے؟ کون مدرسہ والا مانگنے آتا ہے؟ اور قرض والے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وصیت پر زور دینے کے لئے اس کو چار جگہ قرض پر مقدم کیا تاکہ لوگ وصیت کو معمولی نہ سمجھیں، وہ جان لیں کہ یہ لازمی حق ہے اگر اس کو ادا نہیں کیا تو اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

عیسیٰؑ کی وفات کا پہلے تذکرہ کرنے کی وجہ

دوسری مثال: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ، روح اور جسم کے ساتھ آسمان پر اٹھایا ہے، پھر قیامت کے قریب زمین پر اُسی حیات کے ساتھ اتریں گے پھر شادی کریں گے اولاد ہوگی، حکومت چلائیں گے، قرآن وحدیث کے مطابق اس امت کی راہ نمائی فرمائیں گے اور چالیس سال حیات رہ کر وفات پائیں گے۔ مگر سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰىٓ إِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾: اور یاد کرو وہ وقت جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تمہیں موت دینے والا ہوں اور میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور کافروں کی شرارتوں سے تمہیں بچانے والا ہوں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی وفات بعد میں ہے اور رفع آسمانی پہلے ہے، مگر آیت میں ترتیب برعکس ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی موت پر زور دینا چاہتے ہیں کیونکہ رفع سماوی سے لوگوں کو غلط فہمی ہوسکتی تھی، بلکہ عیسائیوں کو غلط فہمی ہوئی بھی، انھوں نے خیال کیا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان تھے تو مرے کیوں نہیں؟ وہ زندہ آسمان پر کیسے چلے گئے؟ معلوم ہوا کہ وہ اللہ ہیں یا اللہ کا کوئی حصہ ہیں۔ اس لئے آیت میں متوفیک پہلے لایا گیا ہے، اور پہلے ہی بتادیا ہے کہ ان کو بھی موت آنی ہے۔

جسم اور روح کے ساتھ آسمان پر جانا خدا ہونے کی دلیل نہیں

حضرت آدم علیہ السلام اور دادی حواء رضی اللہ عنہا اسی زمین پر پیدا کئے گئے ہیں اور اسی زمین پر ساری مخلوقات نے ان کو سجدہ کیا ہے، پھر حضرت آدمؑ اور دادی حواءؑ یہاں سے روح وجسم کے ساتھ آسمانوں کے پار جنت میں لے جائے گئے ہیں، پس کیا جنت میں جانے سے وہ خدا ہوگئے؟ نہیں! وہ جنت سے واپس زمین پر آئے تھے اور وقت مقررہ پر ان کو موت آئی تھی، اسی طرح نبی کریم ﷺ معراج میں جسم اور روح کے ساتھ آسمانوں میں گئے ہیں، تو کیا حضور آسمانوں میں جانے سے خدا بن گئے؟ نہیں! حضور واپس زمین پر تشریف لائے اور وقت مقررہ پر حضور کو بھی موت آئی۔ پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھائے جانے کی وجہ سے خدا کیسے بن سکتے ہیں؟ ان کو بھی زمین پر واپس آنا ہے اور وقت مقررہ پر ان کو بھی موت آنی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی موت پر زور دیتے ہوئے متوفیک کا تذکرہ پہلے کیا تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔

بہرحال یہ دو مثالیں ہیں جن کی مدد سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی چیز ترتیب میں بعد میں ہو اور قرآن کو اس پر زور دینا ہو تو قرآن اس کو پہلے ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ زور دینے ہی کے لئے ﴿الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ﴾ میں موت کو حیات سے پہلے ذکر کیا ہے، کیونکہ موت کے آنے کو اگرچہ سبھی مانتے ہیں، مگر عملی طور پر انسان اس کو بھولے رہتا ہے۔

دنیا جہنم بھرنے کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے

آگے ارشاد ہے: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے موت وحیات (دنیوی زندگی) کے پیدا کرنے کا مقصد بیان کیا ہے کہ یہ دنیا کی زندگی جس میں موت وحیات ہے اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانچیں کہ تم میں سے شاندار عمل کون کرتا ہے، مدرسہ، اسکول، یونیورسٹی اور ہر تعلیمی ادارے کے قائم کرنے کا مقصد یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کون پہلی پوزیشن حاصل کرتا ہے، کوئی تعلیمی ادارہ طلبہ کو فیل کرنے کے لئے قائم نہیں کیا

جاتا، مگر قدرتی بات ہے کہ ہر ادارے میں کچھ نانجار طلبہ ہوتے ہیں جو محنت نہ کرنے کے نتیجہ میں فیل ہوجاتے ہیں، مگر کوئی ادارہ فیل کرنے کے لئے قائم نہیں کیا جاتا، اللہ تعالیٰ نے بھی یہ دنیا کی زندگی یہ دیکھنے کے لئے بنائی ہے کہ انسانوں میں شاندار عمل کون کرتا ہے؟ لیکن نانجار انسانوں کی دنیا میں کمی نہیں، وہ اپنے پیروں پر کلہاڑی ضرور ماریں گے اور جہنم کو بھریں گے۔ یہ ان کا اپنا عمل ہے، اللہ نے یہ دنیا ایسے لوگوں سے جہنم بھرنے کے لئے پیدا نہیں کی۔

زمین اتنی خوبصورت کیوں بنائی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی اتنی پر کشش اور دلچسپ بنائی ہے کہ آدمی بوڑھا ہوجاتا ہے، آنکھیں جواب دیدیتی ہیں، کانوں سے سنتا نہیں، منہ میں دانت نہیں، ٹانگوں میں طاقت نہیں، مگر بوڑھا دنیا چھوڑنے کو تیار نہیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا﴾: اس زمین کی ساری چیزوں کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے۔ ﴿لِنَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ تاکہ ہم جانچیں کہ اس زمین پر تم میں سے کون سب سے زیادہ شاندار عمل کرتا ہے۔

اس زمین میں جو کچھ ہے وہ سب انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے اور انسان کے پیدا ہونے سے بہت پہلے بنایا گیا ہے۔ یہ چاند، سورج، تارے، ہوا، دریا، درخت، حیوانات، چرندے، پرندے، درندے یہ سب انسان کے لئے ہیں اور انسان کے وجود میں آنے سے بہت پہلے بنائے گئے ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ مائدہ کے پانچویں رکوع میں یہ واقعہ آیا ہے کہ آدم علیہ السلام کے دولڑکوں میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا، چونکہ ابھی تک کوئی مرا نہیں تھا، یہ پہلا انسان تھا جو مرا، پس زندہ بھائی سوچنے لگا کہ مردہ بھائی کا کیا کیا جائے؟ قرآن میں ہے کہ اللہ نے دو کوّے بھیجے، وہ آئے، لڑے، ایک نے دوسرے کو مار ڈالا، پھر قاتل کوّے نے پیروں سے زمین میں کھڈا بنایا اور مرے ہوئے کوّے کو اس میں ڈالا، اور مٹی ڈال کر دبادیا اور اڑ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کے اس بیٹے کو سکھایا کہ اس طرح اپنے بھائی کو

مٹی میں دفن کر۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ انسان سے پہلے کوّے پیدا ہو چکے تھے، اور کوّے ہی نہیں ساری مخلوقات پہلے پیدا کردی گئی تھیں تاکہ انسان ان سے اپنی ضرورت پوری کرے۔ جیسے لڑکے کی شادی کرنی ہوتی ہے تو چھ مہینے پہلے سے گھر کا ساز وسامان تیار کیا جاتا ہے، ارادہ کرتے ہی دلہن کو گھر میں نہیں لے آیا جاتا، پہلے گھر کو سجایا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ارادہ کرتے ہی فوراً انسان کو زمین پر نہیں بسادیا، بلکہ پہلے زمین کو ساز وسامان سے زرق برق بنایا، پھر دنیا میں انسان کو پیدا کیا تاکہ اللہ تعالیٰ جانچیں کہ لوگوں میں سے شاندار عمل کرکے اللہ کے یہاں کون پہنچتا ہے۔ اور یہ زرق برق زمین ہمیشہ اسی طرح رہنے والی نہیں، ایک وقت آئے گا کہ زمین اجڑ جائے گی: ﴿وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا﴾ لہٰذا اس دنیا کے پیچھے اتنا مت پڑو کہ اپنی آخرت خراب کرلو، اپنی آخرت کو بناؤ اور اسی کے بقدر دنیا کے ساتھ دلچسپی رکھو۔ آگے قرآنِ کریم نے سات بزرگوں کا واقعہ ذکر کیا ہے، یعنی اصحاب کہف کا واقعہ۔ وہ سات نوجوان تھے، اللہ نے ان کو ایمان کی توفیق دی، وہ دعوت لے کر بادشاہ کے دربار میں پہنچے، بادشاہ نے دعوت قبول نہیں کی اور حالات سے ان کو اندازہ ہوا کہ اب بادشاہ ہم کو قتل کردے گا، پس انھوں نے دنیا کو لات ماری اور پہاڑوں میں نکل گئے، کیونکہ ملکِ خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست! اللہ کا ملک تنگ نہیں، اور فقیر کا پاؤں لنگڑا نہیں۔ چنانچہ شہر سے باہر ایک غار میں انھوں نے پناہ لی اور ستانے کے لئے لیٹے تو سوگئے، تین سو سال کے بعد ان کی آنکھ کھلی، ایک آدمی کو کھانا لانے کے لئے بازار بھیجا۔ جب اس نے تین سو سال پہلے کی کرنسی دیکھی تو دوکاندار کو شک ہوا کہ شاید اس کے ہاتھ خزانہ لگا ہے، بات بڑھی اور بادشاہ تک پہنچی۔ لوگ تین سو سال میں مسلمان ہوچکے تھے، بادشاہ بھی مسلمان تھا، اور شاہی خزانہ میں ایک تختی رکھی تھی جس میں ان سات اللہ کے نیک بندوں کے نام لکھے تھے۔ اُس تختی سے ملان کیا تو یہ وہی حضرات نکلے۔ یہ واقعہ دنیا کی رونق اور اس کی تباہی کے بعد بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا فی نفسہ مطلوب نہیں، انسان کا عمل اس دنیا میں آخرت کو پیش نظر رکھ کر ہونا چاہئے، پس جہاں حلال وحرام میں تعارض ہو وہاں حلال کو ترجیح دے، جہاں جائز اور ناجائز ہو وہاں

جائز کو اختیار کرے، چاہے گھاٹا ہو۔

خلاصۂ کلام: آج کل ہر جگہ فتنے ہی فتنے ہیں اور حرام سے بچنا بہت مشکل ہو رہا ہے، اور لوگوں میں پیسوں کی محبت اور خواہش اتنی ہے کہ ناجائز اور حرام سے آدمی بچنا چاہتا بھی نہیں، لہٰذا میرے بھائیو! اس مضمون کو یاد رکھو کہ ہم اس دنیا میں عمل دیکھنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اور اس دنیا کو ہمیشہ نہیں رہنا، اگر دنیا اور آخرت میں تعارض ہو جائے تو آدمی کو اصحاب کہف کی لائن اختیار کرنی چاہئے، اسی وجہ سے سورۂ کہف کے پہلے اور آخری رکوع کے بارے میں حدیثوں میں آیا ہے کہ اگر اسے پڑھتے رہو گے تو دجال کے فتنوں سے محفوظ رہو گے، دجالی فتنوں سے محفوظ رہنے کی بات اس وجہ سے کہی گئی ہے کہ ان دو رکوع میں یہی حقیقت سمجھائی گئی کہ یہ دنیا تو اس لئے ہے کہ اس سے آدمی اپنی آخرت بنائے، اور بہتر سے بہتر عمل کرے، اور جب دنیا و آخرت میں ٹکراؤ ہو تو آدمی آخرت کو ترجیح دے، اور دنیا کو پس پشت ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ اس مضمون کو یاد رکھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔ **و آخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین۔**

﴿۱۲﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیامت کے دن ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا، وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ﴾

انسان کی تین زندگیاں

بزرگو اور بھائیو! انسان کی زندگیاں تین ہیں: اس دنیا میں آنے سے پہلے کی زندگی: پڑھنے کی زندگی ہے، پھر یہ دنیا کی دوسری زندگی ہے، یہ پڑھے ہوئے پر عمل کرنے کی زندگی ہے، پھر ایک زندگی پھل کھانے کے لئے آگے آرہی ہے۔ ہماری پہلی جو زندگی تھی اس میں صرف ہماری روحیں تھیں، جسم نہیں تھے۔

روح کیا چیز ہے؟

جسم کے ساتھ اپنے وجود کو تو ہم سمجھتے ہیں، لیکن جسم کے بغیر صرف روح جو اصل انسان ہے وہ کیا چیز ہے؟ یہ اُن تین سوالوں میں سے ایک سوال ہے جو مکہ کے مشرکین نے مدینہ کے یہودیوں سے مشورہ کر کے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ یہ سچے نبی ہیں یا جھوٹے؟ مکہ سے باقاعدہ مدینہ آدمی بھیجے گئے تھے، وہاں یہودی آباد تھے، وفد نے اُن سے کہا کہ تمہیں اللہ کی کتابوں کا بہت زیادہ علم ہے۔

تورات جیسی بھی تھی اس کا علم یہودیوں کو عیسائیوں سے زیادہ تھا، اور آج بھی یہودی عیسائیوں سے زیادہ ان کتابوں کا علم رکھتے ہیں۔ عیسائی تو اپنی کتابوں کا بھی علم نہیں رکھتے،

لیکن یہودیوں میں آج بھی بڑے بڑے اپنے مذہب کے جاننے والے ہیں، اور اپنا مذہب ہی نہیں، اسلام کے بھی جاننے والے ہیں، یورپ اور امریکہ کی تمام یونیورسٹیوں میں جو اسلامک اسٹڈیز ہیں ان میں ننانوے فیصد یہودی پروفیسر ہیں، اور وہ مستشرقین جنھوں نے اسلام پر اعتراضات کئے ہیں: وہ سب یہودی تھے، عیسائی تو شاید و باید ہی ملے گا، ظاہر سی بات ہے کہ کسی مذہب کے خلاف اس وقت تک نہیں لکھا جاسکتا جب تک اس مذہب سے پوری واقفیت نہ ہو۔

علاوہ ازیں: ایک یہودی ہے جس کا نام ہے: ونسنک (Wensinch) اس نے حدیثوں کا ایک انڈیکس **المُعْجَمُ الْمُفَهْرَس لألفاظ الحديث الشريف** تیار کیا ہے، یہ حدیث کی چودہ کتابوں کا انڈیکس ہے۔ آج کوئی دارالعلوم ایسا نہیں جہاں اس کتاب سے استفادہ نہ کیا جارہا ہو، اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے مسند احمد چودہ مرتبہ پڑھی ہے، آج دنیا میں کوئی شیخ الحدیث بھی ایسا ملنا مشکل ہے جو یہ کہے کہ میں نے مسند احمد پوری ایک مرتبہ پڑھی ہے۔

بہرحال یہودی بڑے بڑے عالم ہوتے رہے ہیں، چنانچہ مکہ کا وفد یہودیوں کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ تم لوگ بڑے عالم ہو، ہمارے یہاں ایک نبی ظاہر ہوئے ہیں جو نبوت کا دعوی کرتے ہیں، ہم ان کو جانچنا چاہتے ہیں، تم ہمیں کچھ سوالات دو۔

یہودیوں نے تین سوال دیئے:

ایک: وہ چند نوجوان جو بادشاہ کے ڈر سے پہاڑوں میں نکل گئے تھے اور ایک غار میں جا کر سوگئے تھے اور کئی سال تک سوتے رہے تھے، وہ کون تھے؟ ان کا کیا واقعہ ہے؟ کیوں بھاگے تھے؟ کہاں چھپے تھے؟ کتنے دن سوئے تھے؟ —— قرآن میں جب سے یہ واقعہ نازل ہوا ہے: عام ہوگیا ہے، لیکن سوال کے وقت یہودیوں کے علاوہ اس واقعہ کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

دوسرا سوال: ایک بادشاہ گذرا ہے جو مشرق میں جہاں تک آبادی تھی وہاں تک گیا تھا، اور مغرب میں بھی جہاں تک آبادی تھی وہاں تک گیا تھا: یہ بادشاہ کون تھا؟

تیسرا سوال: جسم کے بغیر روح کیا چیز ہے؟

اور ان یہودیوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ سچے نبی ہیں تو ان تین سوالوں میں سے دو کے جواب دیں گے، ایک کا جواب نہیں دیں گے۔ چنانچہ اس وفد نے واپس آکر حضور اکرم ﷺ سے یہ تین سوال کئے، نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا: میں کل تمہیں ان کا جواب دوں گا، یہ خیال کرتے ہوئے کہ جب یہ سوال انھوں نے مجھ سے پوچھے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا جواب حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ مجھ پر بھیج دیں گے۔ اور آپؐ ان شاء اللہ کہنا بھول گئے، پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ پندرہ دن تک حضرت جبرئیل علیہ السلام نہیں آئے، ان پندرہ دنوں میں مکہ میں بہت شور مچا، حضور پر پھبتیاں کسی گئیں، شانِ اقدس میں گستاخیاں کی گئیں، آپؐ کو بڑا صدمہ ہوا۔ پندرہ دن بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، تینوں سوالات کے جوابات لائے اور تاخیر کی وجہ بھی لائے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا، إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ الآیۃ (الکہف: ۲۳و۲۴) چنانچہ سورۂ کہف کے شروع میں غار والوں کا واقعہ دو ڈھائی رکوع میں بیان کیا، اور اسی سورت کے ختم پر ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا، اور روح کے بارے میں جواب اس سے پہلے والی سورت (بنی اسرائیل) میں آیا ہے۔

فرمایا: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ لوگ آپؐ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ صرف انسان کی روح نہیں، کسی بھی حیوان کی روح، اور وہ بھی جسم کے بغیر: ﴿قُلِ: الرُّوْحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّيْ﴾ آپؐ جواب دیں: روح: میرے پروردگار کے حکم سے ایک چیز ہے۔ اور قرآن میں جگہ جگہ اللہ کی شان یہ بیان کی گئی ہے: ﴿وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ اللہ کی قدرت یہ ہے کہ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہتے ہیں ہوجا: پس وہ ہوجاتا ہے، بلکہ اللہ کو "ہوجا" بھی نہیں کہنا پڑتا، اللہ کے ارادے ہی سے وہ چیز وجود میں آجاتی ہے۔ یہ جو اللہ کے "ہوجا" کہنے سے کوئی چیز وجود میں آتی ہے اس کا نام روح ہے۔

اور کوئی کہے کہ ذرا کھول کر سمجھاؤ؟ تو فرمایا: ﴿وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا﴾: اور نہیں دیئے گئے تم علم میں سے مگر تھوڑا سا، یعنی اس سے زیادہ تمہیں روح کی حقیقت سمجھانا مشکل ہے، کیونکہ ہر مسئلہ کو سمجھنے کے لئے علم کا ایک مستویٰ (Level) چاہئے، اگر وہ مستویٰ ہے تو وہ مسئلہ اسے سمجھایا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔ جیسے حساب کے بڑے باریک مسئلے ہیں اور پروفیسر

کالج میں طلبہ کو یہ مسئلے سمجھا بھی دیتے ہیں، مگر کندۂ ناتراش کو وہ مسائل سمجھانا مشکل ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ پروفیسر مسئلہ سمجھانے کے قابل نہیں! سمجھانے کے قابل ہے اور کلاس میں وہ سمجھاتا بھی ہے، مگر اس کندۂ ناتراش کو نہیں سمجھا سکتا، اس کے پاس علم کا وہ مستویٰ نہیں جو مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ سائنس (علوم طبیعیات) کی تعلیم طلبہ کو کھول کھول کر سمجھائی جاتی ہے لیکن ایک ہل چلانے والے کو آپ وہ باتیں سمجھانا چاہیں تو کیسے سمجھا دیں گے؟ اور کیسے وہ سمجھ سکتا ہے؟ غرض کوئی بھی مسئلہ ہو اس کو سمجھنے کے لئے علم کی ایک سطح چاہئے۔

اس کی مثال: کسی بھی چیز کو دیکھنے کے لئے آنکھ میں قدرت چاہئے، اگر قدرت ہے تو آپ دیکھ سکتے ہیں، نہیں ہے تو نہیں دیکھ سکتے، یہ پنکھے چل رہے ہیں اور میری آنکھ ان کو دیکھ رہی ہے، کیونکہ میری آنکھ میں ان کو دیکھنے کی طاقت ہے، مگر اس ہال میں ہوا بھری ہوئی ہے اور ہوا مرئی ہے، وہ دِکھنے والی چیز ہے، لیکن وہ مجھے نظر نہیں آتی، کیونکہ میری آنکھ میں اس کو دیکھنے کی طاقت نہیں۔ اور جیسے جنات: ہم کو نظر نہیں آتے، کیونکہ جنات ہم سے لطیف ہیں اور جنات سے لطیف زمینی فرشتے ہیں۔ انسان، جنات اور زمینی فرشتے: سب آگ، پانی، ہوا اور مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، پھر انسان میں مٹی غالب ہے، اور مٹی کثیف ہے، اس لئے انسان بھی کثیف ہے۔ اور جنات میں آگ غالب ہے اور آگ مٹی سے لطیف ہے، اس لئے جنات ہم سے لطیف ہیں، اور زمینی فرشتے ان چاروں عناصر کی بھاپ سے بنے ہیں اور بھاپ آگ سے لطیف ہے، اس لئے زمینی فرشتے اور بھی لطیف ہیں، اسی وجہ سے ہمیں نہ جنات نظر آتے ہیں نہ فرشتے۔ اور جنات کو ہم نظر آتے ہیں مگر فرشتے نظر نہیں آتے اور زمینی فرشتوں کو جنات اور انسان دونوں نظر آتے ہیں۔ بہر حال جو کثیف ہے اسے لطیف نظر نہیں آئے گا اور جو لطیف ہے اسے کثیف نظر آئے گا۔

روح ایک لطیف چیز ہے، جب وہ جسم کے ساتھ ملتی ہے تو کثیف ہو جاتی ہے چنانچہ اب آپ کو بکری نظر آئے گی، گھوڑا نظر آئے گا، چوہا نظر آئے گا، لیکن جب وہ جسم سے الگ ہوگی تو لطیف ہو جائے گی اور نظر نہیں آئے گی، لیکن روح کو ہم نظر آئیں گے کیونکہ ہم کثیف ہیں۔

بہر حال دیکھنے کے لئے آنکھ میں طاقت چاہئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہ طور

پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تو ان کا اشتیاق اتنا بڑھا کہ درخواست کر بیٹھے: ﴿رَبِّ أَرِنِی أَنْظُرْ إِلَیْكَ﴾: پروردگار ایک جلوہ دکھا دیجئے۔ اللہ کی طرف سے جواب ملا: ﴿لَنْ تَرَانِی﴾: تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نہیں کہا کہ میں نہیں دکھ سکتا۔ اللہ مرئی ہیں دکھ سکتے ہیں اور جنت میں جنتی دنیا کے ہفتہ کی مقدار میں اللہ کا دیدار کریں گے۔ معلوم ہوا کہ اللہ دکھ سکتے ہیں مگر اس دنیا میں ہماری آنکھوں میں اللہ کو دیکھنے کی طاقت نہیں، پس جیسے کسی چیز کو دیکھنے کے لئے آنکھ میں طاقت چاہئے، اسی طرح کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے بھی علم کا ایک مستویٰ چاہئے، اگر وہ مستویٰ حاصل ہے تو مسئلہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ نہیں، پس قرآن نے مجمل جواب دیا کہ آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے ایک چیز ہے، اس سے زیادہ تم نہیں سمجھ سکتے۔

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارا وجود تین جہانوں میں ہے۔ ایک جہان وہ ہے جس میں آدمؑ کی پیٹھ سے تمام انسانوں کی ارواح نکالی گئیں تھیں، اس جہان کا نام عہد الست ہے، اس کو عالم ارواح بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ جہان پڑھنے کے لئے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کر کے ان کو اپنا دیدار کرایا اور اپنے آپ کو دکھا کر اپنی پہچان کرائی، پھر اللہ نے پوچھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟﴾: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟ سب نے بیک زبان جواب دیا: ﴿بَلٰی!﴾ کیوں نہیں، بیشک آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں کیونکہ جو چیز آنکھوں سے دیکھی تھی اس کا انکار کیسے کرتے!

پھر اُس جہان سے ہم اِس جہان میں آئے، اور وہ پروردگار جس کی ربوبیت کا ہم اقرار کر کے آئے ہیں اس کی مرضی کے مطابق ہمیں اِس دنیا میں زندگی گذارنی ہے۔ اور اِس جہان میں اللہ تعالیٰ اپنی تجلی فرمائیں اور سب کو اپنی پہچان کرائیں یہ بات ممکن نہیں، یہاں انسان سر کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتا، اور عہدِ الست میں جو اللہ کو دیکھا تھا وہ روح کی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور روح کی آنکھیں آج بھی اللہ کی معرفت حاصل کر سکتی ہیں، اللہ کے نیک بندے آج بھی اللہ کو پہچانتے ہیں اور ایسا پہچانتے ہیں جیسا مشاہدہ سے پہچانا جاتا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پہچانتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کو اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسے ایک فرماں بردار اور اطاعت شعار بیٹا جس نے اپنے باپ کو جان لیا ہے اور

پہچان لیا ہے، وہ ہمیشہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق زندگی گذارتا ہے، اس کی حرکات وسکنات ایسی ہوتی ہیں جن سے باپ خوش ہوجاتا ہے، ایسی نہیں ہوتی جن سے باپ ناراض ہوجائے، پس جب اللہ کو ہم پہچان چکے اور پہچان کر ہم اس دنیا میں آئے تو ہمیں وہ کام کرنے چاہئیں جن سے مولیٰ خوش ہو، ہمیں کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کن کاموں سے راضی ہوتے ہیں اور کن کاموں سے ناراض ہوتے ہیں یہ سب باتیں اللہ نے اپنے نبیوں اور کتابوں کے ذریعہ انسانوں کو بتادی ہیں، کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھی۔

پھر ایک وقت آئے گا کہ ہماری یہ دنیا کی زندگی ختم ہوجائے گی، آگے اگلی زندگی آرہی ہے اور وہ زندگی بہت لمبی ہے اور بہت طاقت ور ہے۔ اِس وقت ہماری جو باڈی ہے یہ باڈی ہماری اگلی زندگی میں کام نہیں آسکتی، چنانچہ اِس باڈی کو ختم کردیا جائے گا، تحلیل کردیا جائے گا، زمین کے حوالہ کردیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ﴾ ہم نے زمین سے تمہیں پیدا کیا: ﴿وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ﴾ اور اسی زمین میں ہم تمہیں واپس کردیں گے: ﴿وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَى﴾ پھر ایک مرتبہ اور ہم تمہیں مٹی سے نکالیں گے۔ جیسا پہلی مرتبہ مٹی سے پیدا کیا ہے دوسری مرتبہ بھی اِس مٹی سے پیدا کریں گے۔

البتہ پہلی مرتبہ پیدا کرنے کی شکلیں اور ہیں اور دوسری مرتبہ کی شکلیں اور ہیں۔ پہلی مرتبہ کی شکل یہ ہے کہ زمین سے کھانے پینے کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، انسان انہیں کھاتا ہے، ان سے خون بنتا ہے، خون سے مادّہ بنتا ہے، پھر دو مادّے رحم مادر میں پہنچ کر ملتے ہیں، اس سے انسان کی باڈی بنتی ہے، پھر اس میں روح ڈالی جاتی ہے، پھر ایک وقت تک رحم مادر میں رہ کر انسان دنیا میں آتا ہے، مگر قیامت کے دن جب دوبارہ جسم بنے گا تو اس طرح نہیں بنے گا۔ قرآنِ کریم نے جگہ جگہ دوسری مرتبہ جسم بننے کا طریقہ بتایا ہے کہ جیسے اُجڑی ہوئی اور مردہ زمین ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں اور آناً فاناً گھاس اگ آتی ہے اور سارا جنگل گھاس سے بھر جاتا ہے۔ اسی طرح اجسام دوبارہ بنیں گے۔ بس اتنا ہی ہم سمجھ سکتے ہیں اس سے زیادہ تفصیل جب ہم پیدا ہوں گے: سمجھ میں آئے گی۔

اور طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ قیامت کے دن ہر جسم تینتیس (۳۳) ہاتھ لمبا ہوگا، اور جب اتنا لمبا ہوگا تو موٹا بھی اسی کے بقدر ہوگا اور قُویٰ بھی اسی کے بقدر طاقت ور ہونگے۔

پھر تیسری زندگی شروع ہوگی، یہ نتیجہ حاصل کرنے کی زندگی ہے۔ میں نے جو آیت خطبہ میں پڑھی ہے اس میں اسی رزلٹ کا بیان ہے: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾: ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازوئیں رکھیں گے اور ہر عمل خواہ اچھا ہو یا برا: تولا جائے گا ﴿فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا﴾ پس کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ رہا گناہ معاف کردینا تو وہ ظلم نہیں ہے، وہ کرم ہے، احسان ہے، اور وہ ہوگا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بے شمار بندوں کے گناہ معاف کردیں گے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾: اللہ تعالیٰ ایک گناہ (شرک) تو ہرگز معاف نہیں کریں گے اور اس کے علاوہ جتنے گناہ ہیں وہ جس کے لئے منظور ہوگا اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔ مگر ہر گناہ گار کے گناہ معاف نہیں ہونگے، اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں گے معاف کریں گے۔

یہاں بعض لوگ کہتے ہیں: ہم گناہ نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ کس کو بخشیں گے؟ ہم گناہ کریں گے تبھی اللہ کی صفتِ غفاریت ظاہر ہوگی، یہ بے وقوفی کی بات ہے۔ جب شہر میں کوئی وبا آتی ہے تو سارے انسان وبا کے شکار نہیں ہوجاتے، کچھ ہوتے ہیں اور بہت سوں کو کچھ نہیں ہوتا، پس کیا یہ وبا ان کے حق میں نہیں آئی؟ ان کے حق میں بھی وبا آئی ہے، پھر اس نے ان پر اثر کیوں نہیں ڈالا؟ اس لئے کہ ان کے جسم میں دفاع کی طاقت ہے، اس نے وبا کو دفع کردیا اور جس میں دفاع کی طاقت کمزور ہے وہ وبا کی زد میں آگیا۔ یہ قدرت کا نظام ہے، جیسے دس بوریاں ہیں اور وہ گیہوں سے بھری ہوئی ہیں، ان سب کو اوپر تلے رکھو، کوئی بوری دبے گی نہیں، سب سے نیچے جو بوری ہے اور اس کے اوپر نو بوریاں ہیں وہ بھی دبتی نہیں، کیونکہ وہ بوری بھری ہوئی ہے، اندر مدافعت کی طاقت ہے۔ اور اگر بوری آدھی بھری ہوئی ہو اور اُسے اِن دس بوریوں کے بیچ میں رکھ دیا جائے تو فوراً دب جائے گی، کیونکہ اندر

مدافعت کی طاقت نہیں۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر قوتِ مدافعت ہے تو باہر کی وبا اثر انداز نہیں ہوتی، اور اگر مدافعت کی طاقت کمزور ہے تو وبا اثر انداز ہوجاتی ہے۔ پس کیا اس اعتماد پر کوئی زہر کھاتا ہے کہ میرے اندر جو قوتِ مدافعت ہے وہ زہر کے اثر کو دفع کردے گی؟ کوئی نہیں کھاتا، ہر آدمی یہ سوچتا ہے کہ معلوم نہیں میری یہ قوت مدافعت کام کرے یا نہیں؟ اگر نہ کیا تو میں مرجاؤں گا، پس جب قوتِ مدافعت پر بھروسہ کرکے کوئی زہر نہیں کھاتا تو اللہ کی رحمت پر بھروسہ کرکے گناہ کیوں کرتے ہو؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہیں گے گناہ معاف کریں گے اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہیں گے ان میں تمہارا نام بھی ہوگا اس کی کیا گارنٹی ہے؟ کسی کے پاس نہیں ہے، پھر کس برتے پر گناہ کرتے ہو۔

بہر حال اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بے شمار بندوں کو معاف فرمائیں گے اور یہ ظلم نہیں ہوگا۔ پھر ظلم کیا ہے؟ ظلم دو چیزوں کا نام ہے: ایک: نیکی کا اجر نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ ظلم نہیں ہوگا، کوئی نیک کام کرے اور اللہ تعالیٰ اس پر اجر نہ دیں ایسا نہیں ہوگا، ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾: اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ دوسری چیز: ناکردہ گناہ کی سزا دینا ظلم ہے، گناہ کیا نہیں اور مرغا بنا دیا، اس کا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گذر نہیں، ان کے یہاں انصاف کی ترازو رکھی جائے گی اور پورے انصاف سے اجر ملے گا اور کسی بے گناہ کی گردن نہیں ناپی جائے گی۔ اور ایک نیکی کا اجر دُوگنا، سہ گنا بلکہ دس گنا دینا یہ بھی ظلم نہیں، یہ کرم واحسان ہے اور اللہ تعالیٰ کا آخرت میں بے شمار کرم واحسان ہوگا۔

﴿وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا﴾: اور اگر کسی کا اچھا برا عمل رائے کے دانے کے برابر ہوگا تو اس کو بھی ہم لاکر ترازو میں رکھیں گے۔ سورۂ زلزال میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾: جس نے ذرہ بھر کوئی نیک عمل کیا: وہ قیامت کے دن اس کو دیکھ لے گا۔ ذرہ کیا چیز ہے؟ روشن دان سے کمرہ میں دھوپ آرہی ہو اور آپ قالین پر ہاتھ ماریں تو آپ کو دھوپ میں باریک گرد اڑتی نظر آئے گی، وہ گرد سایہ میں نظر نہیں آتی، دھوپ ہی میں نظر آتی ہے، یہی ذرے ہیں۔ پس آیتِ کریمہ کا

مطلب یہ ہے کہ اتنا چھوٹا عمل بھی اگر کسی نے کیا ہے تو وہ اس کو دیکھ لے گا۔ ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ اور اگر کسی نے ذرّہ بھر بُرا عمل کیا ہے تو وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔

ان آیات کا سبق یہ ہے کہ ہر نیکی کا کام کرو چاہے وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ یہ چھوٹے عمل بھی نجات کا سبب بن سکتے ہیں، حدیث میں ہے کہ ایک راستہ میں کانٹے دار ٹہنی تھی ـــــ کسی نے کاٹ کے ڈالی ہوگی یا درخت ہی ایسا ہوگا ـــــ ایک بندہ نے وہ ٹہنی وہاں سے دور کردی، تو حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جزائے خیر دی اور اتنے عمل پر اس کی بخشش کردی۔ اور دوسری طرف ہر برائی کو برائی سمجھو اور ہر برائی سے بچو چاہے وہ چھوٹی ہو۔ گھاس کے ڈھیر کو پھونکنے کے لئے ایک چنگاری کافی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے بلی کو باندھ دیا تھا ـــــ پریشان کرتی ہوگی ـــــ وہ بلی بیچاری بھوکی پیاسی مرگئی، اللہ تعالیٰ نے صرف اس گناہ کی وجہ سے اس عورت کو جہنم میں ڈال دیا۔ بہر حال رائے کے دانے کے برابر بھی اگر اچھا برا عمل ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کو حاضر کریں گے اور اس کا بدلہ دیں گے۔

اتنا چھوٹا عمل کیسے حاضر کیا جائے گا؟ فرمایا: ﴿وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ﴾: اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں! یعنی حساب کون لے رہا ہے؟ اللہ تعالیٰ لے رہے ہیں، یہ تمام ذرات اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان ذروں کو میزانِ عمل میں لے لانا اللہ تعالیٰ کے لئے کیا مشکل ہے؟

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ قیامت کے دن ذرّہ ذرّہ کا حساب ہوگا، پس عمل کی یہ زندگی غفلت میں نہ گذاری جائے، ہر نیکی کی جائے، چھوٹی نیکی کو بھی چھوٹا نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ قطرہ قطرہ مل کر دریا ہوجاتا ہے، اور ہر گناہ سے کنارہ کش رہا جائے، معمولی گناہ کو بھی معمولی نہ سمجھا جائے، معلوم نہیں کونسی چنگاری لاوا پھونک دے، اللہ تعالیٰ اس مضمون کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

وماذٰلك على الله بعزيز! والحمد لله رب العالمين.

۱۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا، فَأَحْيَاكُمْ، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ، ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ آیت پہلے پارے کے تیسرے رکوع کی ہے، پہلے اس کا ترجمہ اور مطلب سمجھ لیں: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾: تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ دنیا میں انکار کرنے والے دو قسم کے ہیں: ایک: وہ لوگ ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، مگر عبادت صرف اللہ کی نہیں کرتے، دوسروں کی بھی کرتے ہیں، یہ مشرک کہلاتے ہیں۔ مشرک یعنی عبادت میں دوسروں کو اللہ کا ساجھی بنانے والا۔ دوم: وہ لوگ ہیں جو اللہ کو مانتے ہی نہیں یعنی کافر ہیں، کافر کے معنی ہیں: انکار کرنے والا۔ آج بھی دنیا میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اس یونیورسل (عالم، جہاں) کے پیچھے کوئی مائنڈ (دماغ، قوت) نہیں، دنیا آٹو میٹک چل رہی ہے۔ جس رکوع کی یہ آیت ہے اس کے شروع میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو، دوسروں کو عبادت میں شریک مت کرو، پھر رکوع کے ختم پر یہ آیت ہے: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ اللہ کا تم کیسے انکار کرو گے جبکہ تم نیست تھے، کچھ بھی نہیں تھے ﴿فَأَحْيَاكُمْ﴾ پس اللہ نے تمہیں زندگی بخشی ﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ پھر اللہ تمہیں موت دیں گے ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ پھر اللہ تمہیں زندہ کریں گے ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ پھر تمہیں اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ اس آیت میں زندگی کے مراحل کا تذکرہ ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم اس دنیا میں نئے پیدا ہوئے ہیں یعنی عدم سے وجود میں آئے ہیں، حالانکہ پیدا: فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں: ظاہر ہونا۔ پردے کے پیچھے کوئی چیز ہو اور پردہ ہٹا دیا جائے تو اس کو ظاہر ہونا کہتے ہیں۔ عدم سے وجود میں آنا: پیدا ہونے کے معنی نہیں ہیں۔ جب بھی کوئی بچہ دنیا میں آتا ہے تو ہم کہتے ہیں: بچہ پیدا ہوا یعنی عدم سے وجود میں آیا، حالانکہ وہ عدم سے وجود میں آج نہیں آیا، وہ تو چار مہینے پہلے ماں کے پیٹ میں وجود میں آچکا ہے اور آج جو دنیا میں آیا ہے تو یہ عدم سے وجود میں آنا نہیں ہے، بلکہ ظاہر ہونا ہے، بلکہ ماں کے پیٹ میں بھی انسان عدم سے وجود میں نہیں آیا، انسان اس سے بہت پہلے عالم ارواح میں عدم سے وجود میں آچکا ہے۔ لہٰذا مراحل حیات کو سمجھو!

مراحلِ حیات:

اس آیت سے دو آیتوں کے بعد پورے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری زمین سے مٹھی بھری، اس کا گارا بنایا، پھر پتلا بنایا، اور دھوپ میں رکھ دیا جب وہ بجنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکی۔ پھر حدیث اور قرآن دونوں میں یہ مضمون ہے کہ حضرت آدم کو پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی دائیں پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو ان کی قیامت تک کی تمام نیک اولاد نکل آئی، پھر بائیں پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو ان کی قیامت تک کی بری اولاد نکل آئی۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہی ساری روحیں دھڑ دھڑ نکلی ہونگی۔ ایسا نہیں ہوا تھا، سورۂ اعراف میں یہ مضمون ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (اعراف:۱۷۲): یاد کرو جب لیا تیرے پروردگار نے آدم کی اولاد کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو۔ آیت میں آدم کے بیٹوں کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو لینے کا تذکرہ ہے، یہ آدھا مضمون ہے جو قرآن میں ہے، باقی آدھا مضمون حدیث میں ہے۔ آیت کو جب حدیث سے ملائیں گے تو مضمون مکمل ہوگا۔

روحوں کے نکلنے کی صورت کیا ہوئی؟

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ہاتھ پھیرا تو حضرت آدم علیہ السلام کی جو صلبی اولاد تھی وہ ان کی پیٹھ سے نکل آئی، پھر اس اولاد کی پیٹھ سے ان کی صلبی اولاد نکلی، پھر ان کی پیٹھ سے ان کی اولاد نکلی۔ جس طرح دنیا میں انسان پیدا ہو چکے ہیں، پیدا ہو رہے ہیں اور پیدا ہونگے اسی ترتیب سے ساری روحیں وجود میں آگئیں، حدیث میں ہے کہ اس وقت انسان كَأَمْثَالِ الذُّر: بھوری چیونٹیوں کی طرح تھے، جو بہت چھوٹی ہوتی ہے اور بہت زور سے کاٹتی ہے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ یہ انسانوں کی روحیں تھیں اور چیونٹی جیسی شکل ان کا مثالی بدن تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے سامنے تجلی فرمائی، اپنا دیدار کرایا، اپنی پہچان کرائی، پھر جب انسانوں نے اللہ کو پہچان لیا تو ان کا امتحان لیا اور پرچے میں صرف ایک سوال آیا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾: کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا: ﴿بَلٰی!﴾ کیوں نہیں! یعنی اگر آپ ہمارے پروردگار نہیں تو پھر اور کون ہمارا پروردگار ہے، سب نے یہی جواب دیا کیونکہ اللہ نے ان کو اپنا دیدار کرایا تھا، اب کوئی کیسے انکار کرتا؟

اخذ میثاق کے بعد روحوں کا مستقر:

اس کے بعد کیا ہوا؟ بخاری میں حدیث ہے: الْأَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ، وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ: پھر اللہ نے ان روحوں کو عالم ارواح میں گروپ بنا کر رکھ دیا، جیسے فوج کے گروپ ہوتے ہیں، ایسے ہی وہاں گروپ بنا کر ساری روحیں رکھ دی گئیں۔ الأرواح جنود مجندة کا یہی مطلب ہے۔ پھر وہاں جن روحوں میں تعارف ہو گیا، جان پہچان ہو گئی، ان میں اس دنیا میں آنے کے بعد ائتلاف ہوتا ہے، میل ملاپ ہوتا ہے، اور اگر عالم ارواح میں اوپرا پن رہا تو اس دنیا میں آنے کے بعد ان کے درمیان اختلاف ہوتا ہے، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ماں کے دو بیٹے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں۔ اور ایک ایران کا دوسرا توران کا: سر راہ ملتے ہیں اور ایسے دوست بن جاتے ہیں جیسے نسلوں سے ایک خاندان کے ہوں۔ مجھے اس حدیث سے یہ سمجھانا ہے کہ جب عہدِ الست میں امتحان

ہو گیا، اور سب نے اللہ کی ربوبیت کا اقرار کر لیا تو پھر روحوں کو پیٹھوں میں واپس نہیں کیا گیا بلکہ ان کو عالم ارواح میں خاص ترتیب سے رکھ دیا گیا۔

آدم علیہ السلام کی جنت میں کوئی اولاد نہیں ہوئی

پھر آدم علیہ السلام اور دادی حواء رضی اللہ عنہا جب تک جنت میں رہے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کتنے دن رہے؟ اللہ جانیں! ہزار سال بھی ہو سکتے ہیں، دس ہزار سال بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کیا معلوم کتنے سال رہے؟ لیکن اتنی بات ہم جانتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو جب جنت میں داخل کیا گیا تو ان سے فرمایا گیا تھا کہ فلاں درخت کے قریب مت جانا ﴿لَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ ورنہ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے ﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظَّالِمِيْنَ﴾ کسی خاص درخت سے روک دیا گیا تھا۔ وہ کونسا درخت تھا؟ اللہ جانے کونسا تھا! ہمیں اس کی تعیین کر کے کیا کرنا ہے؟ پھر قرآن میں ہے: ﴿فَنَسِيَ آدَمُ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾: حضرت آدمؑ اللہ کے اس حکم کو بھول گئے۔ آدمی دو دن میں بات نہیں بھول جایا کرتا، پھر اللہ کی بات اور بندہ بھول جائے اور بندہ بھی اللہ کا نبی! عرصۂ دراز گذرے گا تبھی بھولے گا۔ پس اس آیت میں اشارہ ہے کہ ایک لمبے وقت تک دادا، دادی جنت میں رہے، لیکن جب تک جنت میں رہے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اور اِن کی ساری اولاد کا اس زمین سے پیدا کیا جانا مقدر تھا، اللہ نے طے کر دیا تھا، پھر جنت میں اولاد کیسے ہوتی؟

حضرت آدمؑ کیا چیز بھولے تھے؟

حضرت آدم علیہ السلام یہ نہیں بھولے تھے کہ اللہ نے مجھے اس درخت کے کھانے سے منع کیا ہے، بلکہ یہ بھولے تھے کہ اگر درخت کے قریب جاؤ گے تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ابلیس نے آدمؑ سے کہا تھا: ﴿هَلْ أَدُلُّكُمَا عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَا يَبْلٰى﴾ اے آدم! اللہ نے تمہیں فلاں درخت کے قریب جانے سے جو منع کیا ہے: جانتے ہو کیوں منع کیا ہے؟ آدمؑ نے کہا: مجھے جاننے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ نے

کہا ہے کہ قریب مت جاؤ، میں نہیں جاتا۔ ابلیس نے کہا: سنو! تمہیں معلوم ہے کہ اللہ نے تمہاری پیدائش سے پہلے فرشتوں کے سامنے یہ بات ظاہر کی تھی کہ مجھے زمین میں خلیفہ بنانا ہے، وہ خلیفہ تم ہی بنائے گئے ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ چند دن کے بعد تمہیں جنت سے زمین میں بھیج دیں گے۔ لیکن یہ درخت ایسا ہے کہ اگر تم اسے کھالو تو ہمیشہ جنت میں رہو گے، یہ ''امر'' درخت ہے۔ اس کو کھا کر تم اللہ کی بارگاہ سے کبھی دور نہیں ہوؤ گے، اس وجہ سے اللہ نے اس درخت کے قریب جانے سے منع کیا ہے، کمبخت نے الٹی پٹی پڑھائی، وہ درخت ''امر'' نہیں تھا، ''مر'' تھا۔ آدمؑ دھوکہ کھا گئے اور ان سے لغزش ہوگئی ﴿نَسِیَ آدَمُ﴾ میں جو بھولنے کی بات ہے وہ یہی ہے۔ ابلیس کے پٹی پڑھانے سے وہ ''دور کرنے والے'' درخت کو ''قریب کرنے والا'' درخت سمجھ بیٹھے۔

انبیاء سے گناہ نہیں ہوتا، زلّت ہوتی ہے:

بزرگو اور بھائیو! یہاں یہ اہم مضمون بھی سمجھ لیں کہ انبیاء سے کوئی گناہ نہیں ہوسکتا، نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ نبوت سے پہلے نہ نبوت کے بعد۔ انبیاء معصوم ہوتے ہیں، معصوم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی گناہوں سے حفاظت فرماتے ہیں اس وجہ سے ان سے کوئی معصیت سرزد نہیں ہوسکتی، البتہ زلت ہوسکتی ہے۔ معصية: کے معنی ہیں: نافرمانی، بڑے کے فرمان کے خلاف چلنا۔ انبیاء ایسا نہیں کرسکتے، کیونکہ اگر وہی اللہ کے فرمان کے خلاف چلیں گے تو پھر کون اللہ کے فرمان پر چلے گا؟ اور زَلَّة: کے معنی ہیں: پھسلنا، آدمی پھسلن کی جگہ پر چل رہا ہو، اور بڑی احتیاط سے چل رہا ہو، پھر بھی پھسل جاتا ہے، اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ معصیت میں گناہ کے ارادے سے آدمی گناہ کرتا ہے، جان بوجھ کر گناہ کرتا ہے اور زلت میں گناہ کا ارادہ نہیں ہوتا اور گناہ ہوجاتا ہے۔

بالفاظ دیگر: زلّت میں نیت اچھی ہوتی ہے، مگر بعد میں پتہ چلتا ہے کہ گناہ ہوگیا، مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی یوسفؑ کو ابا سے حفاظت کا وعدہ کرکے لے گئے، کنویں میں ڈالا اور ابا سے کہہ دیا کہ بھیڑیا کھا گیا۔ وہ دس بھائی تھے ان میں سب سے بڑے یہودا تھے، ان کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ بعد میں نبی ہوئے ہیں، پس سوال یہ ہے کہ جو

آگے چل کر نبی بنا اس نے ایسا گناہ کیسے کیا؟ ایک تو بھائی کو کنویں میں ڈالا، پھر آکر جھوٹ بولا، ایسا آدمی نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ کریم میں ہے۔ بھائیوں کی میٹنگ ہوئی تھی کہ یوسف کا کانٹا بیچ میں سے نکالنا چاہئے، کیونکہ ابا کی پوری توجہ یوسف کی طرف ہے، ہماری طرف ابا دیکھتے ہی نہیں —— اور ابا نبی ہیں، نبی کی توجہ جدھر ہوگی آئندہ اُسے نبوت ملے گی —— چنانچہ میٹنگ میں یہ بات آئی: ﴿اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ أَوِ اطْرَحُوْهُ أَرْضًا یَّخْلُ لَکُمْ وَجْهُ أَبِیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صالِحِیْنَ﴾ ایک نے کہا: یوسف کو مار ڈالو۔ یہودا نے کہا: مارو مت، اُسے کہیں دور ملک میں بھیج دو، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ﴿یَخْلُ لَکُمْ وَجْهُ أَبِیْکُمْ﴾ تمہارے ابا کی پوری توجہ تمہاری طرف ہوجائے گی، نبوت جو اللہ کی رحمت ہے وہ تمہیں مل جائے گی۔ اور یہ جو یوسف کو دور ملک میں بھیجنے کا گناہ ہوگا تو توبہ تلا کرکے اللہ سے معافی مانگ لیں گے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے ﴿وَتَکُوْنُوْا مِنْ بَعْدِهٖ قَوْمًا صَالِحِیْنَ﴾ یہاں نیت یہ تھی کہ یوسف کا کانٹا بیچ میں سے نکلے گا تو ابا جو پیغمبر ہیں ان کی توجہ ہماری طرف ہوجائے گی اور پھر اللہ کی رحمت اور نبوت کے ہم حقدار ہوجائیں گے، اسی کو زلّت کہتے ہیں، ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام سے جو عمل ہوا یہ زلّت تھی، کیونکہ ان کی نیت اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کی اور ہمیشہ جنت میں رہنے کی تھی اور اس میں کوئی برائی نہیں۔

﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ کا مطلب

اور اگر کوئی کہے کہ قرآن میں ﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی﴾ ہے یعنی آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی، حکم عدولی کی، پس وہ گمراہ ہوگئے۔

جواب: میرے بھائیو! اس آیت کو سمجھنے کے لئے پہلے لوگوں کے حالات سمجھو!

دنیا کا دستور ہے کہ چھوٹے بڑوں کے ساتھ القاب برتتے ہیں اور بڑے کی غلطی نہیں پکڑتے، مشہور مقولہ ہے: خطائے بزرگاں گرفتن خطا است: بڑوں کی غلطی پکڑنا غلطی ہے۔ اور بڑا چھوٹے کے ساتھ القاب نہیں برتتا، اور اگر چھوٹا بڑے کے سامنے کوئی غلطی کرتا ہے تو وہ اس کو بہت پھٹکارتا ہے، پھر اس کو گلے بھی لگا لیتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام بندے ہیں، چھوٹے ہیں، اللہ: اللہ ہیں، آدمؑ کی معمولی کوتاہی

پر بھی اللہ نے ان کو سخت پھٹکارا اور فرمایا ﴿وَعَصٰى آدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ پھر اللہ نے ان کو برگزیدہ بھی بنالیا ﴿ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهٗ﴾ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ سے بڑے ہیں اور بے حد بڑے ہیں، پس وہ جو چاہیں کہیں ان کو حق ہے، مگر مجھے یا آپ کو اس کا حق نہیں کہ ہم یہ بات کہیں۔ جیسے ایک باپ ہے، اس کا بیٹا شیخ الحدیث ہے، وہ نام لے کر پکارتا ہے، اور کہتا ہے: او احمد یہاں آ! تو کیا شیخ الحدیث کے شاگردوں کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی یہی کہیں؟ وہ کبھی بھی ایسا نہیں کہیں گے، وہ احترام والقاب کے ساتھ نام لیں گے۔ اور اگر شیخ الحدیث باپ کے سامنے غلطی کرے تو وہ اس کو پھٹکارے گا لیکن اس کے شاگرد اس کی غلطی نہیں پکڑیں گے، وہ پکڑیں گے تو یہ شاگردوں کی غلطی ہوگی۔

زمین پر اترنے کے بعد آدمؑ کی اولاد ہوئی:

بہر حال آدمؑ زمین پر اتارے گئے اور اتر کر جب زمین کی پیداوار کھائی تو بدن میں خون بنا، خون مادّہ بنا، پھر دو مادے رحمِ مادر میں اکٹھا ہوئے، دونوں سے انسان کا جسم ماں کے پیٹ میں بننا شروع ہوا، پھر پانچ مہینوں میں انسان کی باڈی مکمل ہوئی۔ قرآن میں جو کہا گیا ہے کہ ہر انسان مٹی سے بنا ہے اس کی حقیقت یہی ہے، یہ نہیں ہے کہ ہر انسان گارے سے بنا ہے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ ماں کے پیٹ میں جب انسان کی باڈی مکمل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو حکم دیتے ہیں، فرشتہ عالم ارواح سے جس روح کے لئے یہ باڈی بنی ہے: وہ روح لا کر اس باڈی میں پھونک دیتا ہے، چنانچہ عورت رات کو سوتی ہے: پیٹ میں کوئی حرکت نہیں ہوتی، مگر جب صبح اٹھتی ہے تو بچے کو ہلتا ہوا پاتی ہے۔ یوں انسان عالم ارواح سے عالم اجساد میں آجاتا ہے۔

مگر ابھی بچہ دنیا کی آب وہوا برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوا، اس لئے چار مہینے ماں کے پیٹ میں رکھا جاتا ہے، پس یہ چار مہینے دو دنیاؤں کے درمیان کا مرحلہ ہے، دونوں کے درمیان کی آڑ ہے، کیونکہ جب بھی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جانا ہوگا تو بیچ میں ایک آڑ ہوگی، پس یہ چار مہینے عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان کا برزخ ہے۔ اور اس برزخ کا رخ عالم اجساد کی طرف ہے، عالم ارواح کی طرف نہیں، یعنی اس برزخ کا قُرب عالم اجساد

سے ہے، عالم ارواح سے نہیں۔ اسی لئے ماں کا حیض بچہ کی غذا بنتا ہے۔ خیر بچہ دنیا میں آگیا اور یہ جو دنیا میں آتا ہے: وہ پیدا ہوتا ہے، ظاہر ہوتا ہے، عدم سے وجود میں نہیں آتا وہ تو عالم ارواح میں بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔

عہدِ الست کی دلیل کیا ہے؟ کسی کو اس عہد کی باتیں یاد نہیں!

یہاں اگر کوئی سوال کرے کہ ہمیں تو وہ روحوں والی دنیا اور اس میں پیش آنے والے واقعات یاد نہیں۔ پس اس کا جواب یہ ہے کہ یاد نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا، پیدا ہونے کے بعد چار پانچ سال تک کے احوال کس کو یاد ہیں؟ ماں کے پیٹ سے نکلنا کسی کو یاد نہیں، حالانکہ ہم سب نکلے ہیں، پھر نکلنے کے بعد دو سال تک دودھ پیا ہے، کسی کو دودھ پینا یاد نہیں، ہم دوسرے بچوں کو پیدا ہوتا ہوا اور دودھ پیتا ہوا دیکھتے ہیں اس لئے اپنے بارے میں بھی اس کا یقین کرتے ہیں۔ اگر کسی نے یہ بات نہ دیکھی ہو تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس مرحلہ سے گذرا ہوں۔ پس جب ہم اس دنیا کے احوال نہیں جانتے تو دوسری دنیا کے احوال ہم کو کہاں سے یاد رہیں گے۔

دوسری مثال: ہم مدرسوں میں پڑھے ہوئے ہیں، میں نے چالیس پینتالیس سال پہلے پڑھا ہے، آج مجھے یہ تو یاد ہے کہ کونسی کتاب کس سے پڑھی ہے، لیکن کس دن کونسا سبق پڑھا تھا: میں نہیں بتا سکتا اور کس سبق میں استاذ نے کیا بتایا تھا: وہ بھی میں نہیں بتا سکتا۔ البتہ اتنا جانتا ہوں کہ شرح جامی حضرت مولانا صدیق احمد صاحب جموی قدس سرہ سے پڑھی تھی، اس سے آگے کچھ نہیں جانتا، مگر ہر آدمی جانتا ہے کہ میں نے مدرسہ میں پڑھا ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر استعداد موجود ہے، اگر ہم پڑھے ہوئے نہ ہوتے تو آج ہمارے اندر استعداد موجود نہ ہوتی۔ یہ استعداد دلیل ہے کہ ہم پڑھے ہوئے ہیں، چاہے ہمیں تفصیلات یاد نہ ہوں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں جو اپنا دیدار کرایا ہے اور اپنی پہچان کرائی ہے اس کی استعداد ہر انسان میں موجود ہے، ہر انسان کے دل میں اللہ کی یاد بسی ہوئی ہے، جو مانے اس کے دل میں بھی اور جو نہ مانے اس کے دل میں بھی، قرآن کہتا ہے: جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے جب وہ سمندر میں سفر کرتے ہیں اور موجوں میں گھرتے ہیں تو کس کی طرف

متوجہ ہوتے ہیں؟ کس کے سامنے گڑگڑاتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ اللہ کی یاد ہر دل میں موجود ہے اور آڑے وقت میں اللہ کی یاد: ضمیر کی آواز ہے۔ بہر حال عالم ارواح میں یہ سارے واقعات ہوئے ہیں اور یاد ہونا ضروری نہیں، ہاں علامت پائی جانی چاہئے۔ اور علامت موجود ہے، استعداد موجود ہے، اور جیسے پڑھنے کی استعداد دلیل ہے کہ ہم نے پڑھا ہے، ایسے ہی اللہ کی معرفت جو ہر دل میں بسی ہوئی ہے دلیل ہے کہ کبھی ہم نے اللہ کو پہچانا ہے۔

اصحابِ فترت اور شواہق جبال کے رہنے والوں کا حکم

ایک نبی کی تعلیمات ختم ہوگئیں، نیا نبی ابھی آیا نہیں۔ بیچ کے لوگوں کا آخرت میں کیا ہوگا؟ یہ اصحابِ فترت کہلاتے ہیں۔ ایسے ہی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو لوگ رہتے ہیں وہ متمدن دنیا سے کٹے ہوئے ہیں: وہ نہ یہاں آئے نہ یہاں کے لوگ وہاں گئے۔ آج بھی دنیا میں ایسی جگہیں ہیں جہاں کے رہنے والوں کا دوسری دنیا سے کوئی رابطہ نہیں، وہ لوگ کوئی مذہب نہیں جانتے، ان کا آخرت میں کیا حال ہوگا؟ یہ شواہق جبال کے رہنے والے کہلاتے ہیں۔

امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ توحید وکفر پر مدار ہوگا، اگر وہ اللہ کو پہچانتا تھا تو وہ ناجی ہوگا، جنت میں جائے گا اور اگر وہ اللہ کو نہیں پہچانتا تھا یا پہچانتا تو تھا مگر غیر اللہ کو پوجتا تھا تو وہ دوزخ میں جائے گا اور باقی مسائل: نماز روزہ وغیرہ پر گرفت نہیں ہوگی، کیونکہ ان کا علم آدمی کی فطرت میں نہیں ہے اور اللہ کی پہچان فطری ہے۔

تاریخ میں فترت کے زمانہ کے بہت سے لوگوں کے احوال آئے ہیں۔ عمرو بن نُفیل ایک شخص گذرے ہیں، بھلے آدمی تھے، ایک مرتبہ حضور ﷺ نبوت سے پہلے ان کے یہاں کسی ضرورت سے گئے، انھوں نے کھانا پیش کیا، حضورؐ نے انکار کردیا۔ عمرو بن نفیل نے کہا: دیکھو! میں بتوں کے نام پر جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں ان کو نہیں کھاتا، یہ میں نے اللہ کے نام پر ذبح کیا ہے۔ یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی معرفت انسان کی فطرت میں ہے، آدمی توجہ کرے تو اللہ کو پہچان سکتا ہے۔

بہر حال ایک دنیا سے دوسری دنیا میں جب بھی منتقل ہوں گے تو بیچ میں حد فاصل ہوگی، حد فاصل کے بغیر کود کر دوسری دنیا میں نہیں پہنچ سکتے، مرنے کے بعد جو قبر کی زندگی ہے

یہ اِس جہاں اور اُس جہاں کے درمیان حد فاصل ہے، اور یہ برزخ اِس دنیا کا حصہ ہے، کیونکہ قبر سے قیامت کے دن لوٹ کر ہمیں اِسی دنیا میں آنا ہے، عربی میں اس کو معاد کہتے ہیں یعنی واپس آنا، ہم جو آگے بڑھ گئے ہیں اور عالم قبر میں پہنچ گئے ہیں وہاں سے ہمیں اسی دنیا میں واپس لایا جائے گا، قیامت اسی دنیا میں قائم ہوگی، وہ اسی دنیا کا آخری دن ہوگی اور وہ پچاس ہزار سال کا دن ہوگا ﴿تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ إِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (المعارج: ۴) یہ جو پچاس ہزار سال کا دن ہے، وہی الیوم الآخر (آخری دن) ہے اور یہی قیامت کا دن ہے، پھر اس دنیا سے تمام لوگ آخرت میں منتقل ہوجائیں گے اور آخرت ہمیشہ رہے گی۔

غرض: اس دنیا میں چونکہ سب کو واپس آنا ہے، اس لئے عالم قبر ہماری اسی دنیا کا ضمیمہ ہے، جیسے ماں کے پیٹ کی زندگی عالم ارواح اور عالم اجساد کے درمیان کی حد فاصل ہے، اور وہ زندگی ہمارے اس عالم کا حصہ ہے، کیونکہ بچے کو وہاں سے اس دنیا میں آنا ہے۔

البتہ آدمی عالم قبر میں پہنچ کر آخرت سے بہت قریب ہوجاتا ہے، صرف ایک مہین (باریک) پردہ بیچ میں رہ جاتا ہے اور آخرت کے احکام قبر میں جھلکنے لگتے ہیں۔ حدیث میں اس کو یوں سمجھایا ہے کہ قبر میں جب سوال جواب ہوجاتے ہیں تو نیک بندے کے لئے جنت کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے، وہاں سے بھینی بھینی ہوائیں آنی شروع ہوتی ہیں، اور برے بندے کے لئے جہنم کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے، ادھر سے شرارے آنے لگتے ہیں اور ایک ایک شرارہ اونٹ جتنا بڑا ہوتا ہے۔ یہی آخرت کے احکام کا جھلکنا ہے۔

بہر حال: قیامت کے دن اسی دنیا کی طرف لوٹنا ہے، پھر حساب کتاب ہوکر دو دنیاؤں کے درمیان پل صراط رکھا جائے گا، جس سے گذر کر جہنمی جہنم میں جائیں گے اور جنتی جنت میں۔ پھر جب وہ آخری دن پورا ہوگا تو یہ دنیا ختم ہوجائے گی، اور نئی دنیا شروع ہوگی، جو ہمیشہ چلتی رہے گی۔

حساب کتاب اس دنیا میں ہوگا:

انسان نے اچھے برے عمل یہاں کئے ہیں اس لئے اس کے فیصلے بھی اسی زمین پر

ہونگے، قصہ ٔ زمیں برسرِ زمیں! ایک آدمی کہتا ہے: میں نے بہت ساری نمازیں پڑھی ہیں اور جھوٹ کہتا ہے، پس اس سے پوچھا جائے گا: بتا زمین کے کس حصہ پر نمازیں پڑھی ہیں؟ زمیں اس کی گواہی دے گی: اگر پڑھیں ہیں، ورنہ زمین تکذیب کرے گی۔ حدیث میں ہے: جہاں آدمی نے نماز پڑھی ہے: وہ زمین قیامت کے دن گواہی دے گی۔

اسی لئے مسئلہ ہے کہ جماعت ختم ہونے کے بعد جہاں فرض پڑھے ہیں وہیں نفلیں نہ پڑھے بلکہ جگہ بدل کر پڑھے تا کہ گواہ زیادہ ہوں۔

اس پر طالب علم کہتا ہے: پھر تو دو نفلیں یہاں اور دو وہاں پڑھنی چاہئیں اور اسی طرح پوری مسجد میں گھوم گھوم کر نفلیں پڑھنی چاہئیں، تا کہ گواہ زیادہ سے زیادہ ہوں!

اس کا جواب یہ ہے کہ جگہ بدلنے کی یہی ایک حکمت نہیں ہے ایک دوسری حکمت بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جہاں فرض پڑھے ہیں اگر سب لوگ وہیں سنتیں پڑھیں گے تو آنے والے کو دھوکہ ہوگا وہ سمجھے گا کہ جماعت ہو رہی ہے اور وہ اقتداء کرلے گا۔ اور جب لوگ بکھر جائیں گے تو آنے والا فوراً سمجھ جائے گا کہ جماعت ختم ہو چکی ہے۔ یہ حکمت نفلوں میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ اس میں آنے والے کو دھوکہ نہیں ہوتا، اس لئے نفلوں میں بار بار جگہ بدلنے کی ضرورت نہیں۔

غرض زمین کے خطوں کی گواہی دینے کی بات احادیث میں آئی ہے، اب اگر یہ حساب کتاب دوسری دنیا میں ہوگا تو گواہ یہاں رہ جائیں گے اور حساب کتاب وہاں ہوگا، پس وہاں گواہوں کے بغیر فیصلے کیسے کئے جائیں گے؟ اس لئے حساب کتاب اسی دنیا میں ہوگا تا کہ اس دنیا کے اعمال کا فیصلہ اسی دنیا میں ہو۔

مضمون یہ چل رہا تھا کہ ماں کے پیٹ کی زندگی اس دنیا کا حصہ ہے، کیونکہ بچہ کو یہاں آنا ہے اور قبر کی زندگی بھی اسی دنیا کا حصہ ہے، کیونکہ قبر سے پھر واپس یہیں آنا ہے، البتہ قبر میں پہنچ کر آدمی آخرت سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ دنیا وآخرت کے درمیان ایک مہین پردہ رہ جاتا ہے، اور آخرت کے احکام جھلکنے لگتے ہیں، اگر جہنم کے احکام جھلکیں تو یہ قبر کا عذاب ہے اور جنت کے احکام جھلکیں تو یہ قبر کی راحتیں ہیں۔

قبر میں جزاؤسزا روح اور جسم دونوں کو ہوتی ہے

عذابِ قبر روح کو بھی ہوتا ہے اور جسم کے اجزاء کو بھی۔ یہ معاملہ چونکہ دوسری دنیا کا ہے اس لئے وہاں کے معاملات ہم آنکھوں سے نہیں دکھا سکتے، ذہن سے قریب کر سکتے ہیں، اگر سمجھنے والا ہو تو سمجھ سکتا ہے۔

ٹیلی فون تین ہیں: لوکل، نیشنل اور انٹرنیشنل۔ گھر میں جو ٹیلی فون رکھا ہوا ہے اگر یہ لوکل ہے تو شہر کے ہر ٹیلی فون سے اس کا تعلق ہے، اور اگر یہ نیشنل ہے تو ملک کے ہر ٹیلی فون سے اس کا تعلق ہے، اور اگر انٹرنیشنل ہے تو پوری دنیا کے ہر ٹیلی فون سے اس کا تعلق ہے، مگر یہ تعلق تقدیری ہے یعنی مان لیا گیا ہے۔ پھر جب کسی نے کوئی خاص نمبر ڈائل کیا اور کسی شہر کے کسی خاص گھر میں گھنٹی بجنے لگی تو اُس ٹیلی فون سے تحقیقی تعلق قائم ہو گیا۔ پہلے تقدیری اور حکمی تعلق تھا اب جب گھنٹی بجی تو تحقیقی تعلق ہوا۔ اور اگر ٹیلی فون لوکل ہے اور کوئی ملک سے باہر ٹیلی فون کرنا چاہے تو فوراً آواز آئے گی: اس ٹیلی فون پر یہ سہولت موجود نہیں!

اب سنیں! قیامت کے دن جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سارے انسان ختم ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائیں گے اس سے انسانوں کے نئے اجسام اگیں گے اور یہ نئے اجسام پہلے والے اجسام کی مٹی ہی سے بنیں گے، اس میں کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ حدیث میں ہے کہ ختنہ کرتے وقت جو زائد چمڑی کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے وہ بھی اُس جسم میں شامل ہوگی، پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا اور روحیں اڑائی جائیں گی تو روحیں جو بھی جسم خالی ملے گا اس میں داخل نہیں ہونگی، بلکہ ہر روح اپنے ہی جسم میں جائے گی۔ یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ روح اپنے جسم کو پہچانتی کیسے ہے؟ اس کا جسم سے کوئی نہ کوئی تعلق ہونا چاہئے، جبھی ہر روح اپنے جسم میں جائے گی۔ جیسے انٹرنیشنل ٹیلی فون کا تمام ٹیلی فونوں سے کوئی نہ کوئی تعلق ہے، جبھی خاص نمبر ڈائل کرنے سے خاص جگہ گھنٹی بجتی ہے۔ اور اگر ٹیلی فون لوکل ہے تو نہیں بجتی، کیونکہ اس نمبر سے اس کا تعلق نہیں، اسی طرح ہر روح عالم برزخ میں اپنی جگہ پر ہے اور جسم قبرستان میں ہے، مگر اُس روح اور اِس جسم کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق قائم ہے، جبھی ہر روح اپنے ہی جسم میں جائے گی،

دوسرے جسم میں نہیں جائے گی۔

اور جب روح کا بدن کے ساتھ تعلق ہے تو پھر یہ مضمون سمجھنے میں کیا دشواری ہے کہ قبر میں جزاؤ سزا صرف روح کو نہیں ہوتی، روح کے ساتھ بدن کے اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بس ہم اتنا ہی ذہن کے قریب کر سکتے ہیں، اب اگر آپ کہیں کہ ہمیں آنکھوں سے دکھاؤ تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں، کیونکہ یہ مسئلہ اِس دنیا کا نہیں ہے اُس دنیا کا ہے، نیز موجودہ زمانے کا بھی نہیں ہے، آئندہ زمانے کا ہے۔

خلاصۂ کلام: میں نے خطبہ میں جو آیت پڑھی تھی اس میں کافروں سے خطاب ہے: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ تم اللہ کا انکار کیسے کرتے ہو؟ ﴿وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ جبکہ تم نیست تھے ﴿فَأَحْيَاكُمْ﴾ پھر تمہیں اللہ نے وجود بخشا ﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ پھر اللہ تعالیٰ تمہیں موت دیں گے۔ کافران تینوں چیزوں کو مانتا ہے وہ نیست سے ہست ہونے کو بھی مانتا ہے، اپنے وجود کو بھی مانتا ہے، اور پھر معدوم (موت) ہو جانے کو بھی مانتا ہے ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴾ پھر وہ تمہیں زندہ کریں گے اور تمہیں اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ کافروں کو یہی بات سنانی ہے کہ جب تم یہ تین حقیقتیں مانتے ہو، نیست سے ہست ہونے کو مانتے ہو، وجود کو مانتے ہو، موت کو مانتے ہو، تو پھر جو تمہیں ایک مرتبہ عدم سے وجود میں لا چکا وہ تمہیں دوبارہ عدم سے وجود میں کیوں نہیں لا سکتا۔ پہلی حیات تمہارے سامنے ہے، پس جیسے تم پہلے مرے ہوئے تھے ایسے ہی اِس وجود کے بعد تمہیں پھر مردہ ہو جانا ہے۔ پھر مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے، مگر تم اس دوسری حیات کو نہیں مانتے، عجیب بات ہے! آج ماننے کا وقت ہے، اِس حقیقت کو بھی مان لو، کل جب وقت ہاتھ سے نکل جائے گا تو خواہی نخواہی اُس دوسری حیات کو بھی ماننا پڑے گا، مگر اس وقت ماننے سے کیا فائدہ ہوگا؟ ایمان وعمل کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ والحمد لله رب العالمین!

۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخرت کی نعمتیں دنیا کی چیزوں سے بدرجہا بہتر ہیں

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ○ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ، لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ ○﴾ (آل عمران ۱۴-۱۷)

ترجمہ: خوش نما بنائی گئی لوگوں کے لئے مرغوب چیزوں کی محبت، یعنی عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نمبری گھوڑے، مویشی، اور کھیتی۔ یہ سب دنیا کی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں، اور انجام کی خوبی اللہ ہی کے پاس ہے ○ آپ پوچھیں: کیا میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں جو ان چیزوں سے بدرجہا بہتر ہیں؟ ان لوگوں کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور صاف ستھری بیویاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان بندوں کو خوب دیکھتے ہیں ○ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، پس آپ ہمارے گناہ بخش دیں، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیں ○ وہ صبر شعار، راست باز، اطاعت کرنے والے، مال خرچ کرنے والے، اور آخر رات میں گناہوں

کی معافی مانگنے والے ہیں○

دینی مجلس میں بیٹھنے کا ادب

یہ بیچ میں جو خلا ہے وہ نہیں رہنا چاہئے، سمٹ جانا چاہئے، اس سے برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور یہ میرے جوان بھائی جو دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں: کیا وہ مجھ سے زیادہ بوڑھے ہیں جو دیواروں سے لگے بیٹھے ہیں؟! ٹھیک ہے کوئی بوڑھا آدمی ہے اسے اجازت ہے، لیکن جو جوان ہیں وہ کیوں اس طرح بیٹھے ہیں؟ ان حضرات کو چاہئے کہ آگے تشریف لے آئیں۔ یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں دین کی بات سننے کا، دین کی بات رغبت سے سننی چاہئے، ہر چیز کا ایک ادب ہوتا ہے ادب کا لحاظ کیا جائے تبھی وہ چیز حاصل ہوتی ہے۔ دین کی بات اگر رغبت سے نہیں سنی جائے گی تو فائدہ کیسے ہوگا؟

لوگوں کے لئے دنیا کی چیزیں مرغوب بنائی گئی ہیں

میرے بھائیو! یہ قرآنِ کریم کی چند آیات ہیں جو آج نماز میں پڑھی گئی ہیں اور بالکل آخری رکعت میں پڑھی گئی ہیں۔ ان آیاتِ پاک میں اللہ جل شانہ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لوگوں کے لئے مزین کی گئی ہے، خوشنما بنائی گئی ہے، مرغوب چیزوں کی محبت! دل پسند چیزوں کی محبت! وہ دل پسند چیزیں کیا ہیں؟ عورتیں، بیٹے! اولاد نہیں، بلکہ بیٹے، ڈھیر لگا ہوا مال: سونے میں سے اور چاندی میں سے، نمبری گھوڑے، پہلے جو شاندار گھوڑے ہوتے تھے ان پر نمبر لگاتے تھے۔ اب کھیل ہوتے ہیں، کھلاڑی پر نمبر لگاتے ہیں، یہ سولہ نمبر کا، یہ سترہ نمبر کا، یہ اٹھارہ نمبر کا۔ پرانے زمانے میں گھوڑوں پر نمبر لگتے تھے، اب انسانوں پر لگنے لگے، یہ اس زمانہ کے گھوڑے ہیں! اب گھوڑوں کی سواری نہیں رہی، ان کی جگہ کاریں آگئیں ہیں، کاروں میں بھی اعلی درجہ کی کاریں ہوتی ہیں، معلوم نہیں ان کے کیا کیا نام ہیں؟ اور مویشی یعنی اونٹ، بکریاں، گائیں بھینسیں، یہ سب مویشی ہیں، اونٹ والوں کو اونٹ پسند ہیں، گائے بھینس والوں کو گائیں بھینسیں پسند ہیں، بکری والوں کو بکریاں پسند ہیں، جو لوگ جو مویشی پالتے ہیں، ان کے لئے وہ مویشی مزین کئے گئے ہیں، اور کھیتی: جو کسان ہیں ان کے لئے

کھیتی مزین کی گئی ہے، یہ چند مثالیں ہیں، یہ سب تفسیر ہے حب الشھوات کی۔

لوگوں کے لئے دنیا کی چیزیں مرغوب کیوں بنائی گئی ہیں؟

ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ اس میں مصلحت کیا ہے؟ اللہ کے ہر کام میں حکمت و مصلحت ہوتی ہے، وہ حکمت و مصلحت یہ ہے کہ اگر ان چیزوں کی محبت نہ ہوتی تو دنیا میں رہنے کے لئے کون تیار ہوتا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایسی شاندار اور بھلی بنائی ہے، اور مزین کر کے دکھائی ہے کہ کوئی یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ غور کرو: ایک طرف زندگی میں کیا کیا الجھنیں ہیں، پریشانیاں، مصیبتیں، آفتیں اور بلائیں ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ اور دوسری طرف اپنی پسندیدہ چیزوں کی فہرست بناؤ، تم دیکھو گے کہ انسان کی مرغوبات غالب رہتی ہیں، اس کی پریشانیوں پر۔ چنانچہ آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، آنکھیں کام نہیں کرتیں، کانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، ٹانگوں نے جواب دے دیا ہے، پھر بھی آدمی مرنے کے لئے تیار نہیں، کچھ بھی ہو رہنا دنیا ہی میں ہے، آخر کیوں؟ اللہ نے دنیا مرغوب بنائی ہے، اس کی ہر چیز مزین کی ہے، اس لئے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے، اور آدمی کو وہ پریشانیوں سے زیادہ محبوب اور مرغوب نظر آتی ہے، اسی کو ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس میں دو چیزیں جوان ہو جاتی ہیں: ایک زندگی کی محبت، دوسری مال کی محبت[1] جوں جوں آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے: یہ محبتیں جوان ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب یہ محبتیں جوان ہونگی تو دنیا کون چھوڑنا چاہے گا؟

دنیا کی چیزیں چند روز استعمال کے لئے ہیں!

مگر یہ ہری بھری دنیا، یہ دل پسند چیزیں جن کی محبت آدمی کے دل کو گھیرے ہوئے ہے: دنیا کی زندگی کا استعمالی سامان ہیں۔ عربی میں "متاع" ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے چند روز استعمال کر کے پھینک دیا جائے جیسے عورتیں چولھے پر دیگچی پکڑنے کے لئے ایک کپڑا (صافی) رکھتی ہیں، جو ہفتے میں میلا، چکنا اور کالا ہو جاتا ہے تو اُسے پھینک دیتی ہیں، اور دوسرا

(۱) يَهْرَمُ ابنُ آدمَ وَيَشِبُّ منه اثنان: الحرصُ على المال، والحرصُ على العمر (متفق علیہ مشکوۃ حدیث ۵۲۷۰)

کپڑا لاکر چولھے پر رکھ لیتی ہیں، یہ متاع ہے۔ یہ چند دن استعمال کی چیز ہے، یہ تو پرانی مثال ہے، نئی مثال نیپکین (Napkin) ہے، یعنی دست پاک، اس کاغذ کو ڈبّے سے نکالتے ہیں، ہاتھ منہ یا ناک صاف کر کے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ جتنی حیثیت اس دست پاک کی ہے اتنی ہی حیثیت اس پوری دنیا کی ہے، اس کو تھوڑی دیر کے لئے استعمال کرنا ہے، پھر وہ ہاتھ سے نکل جانے والی ہے۔ اور اچھا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، یعنی دنیا کا یہ مال سامان آخرت کے مقصد سے استعمال کیا جائے تو ہی وہ کارآمد ہوگا، دنیا کے فوائد وقتی ہیں، دیرپا فائدہ آخرت کا ہے۔ انسان زندگی بھر ہائے مال! ہائے مال! یہ میرا مال! یہ میرا مال! کرتا رہتا ہے، حالانکہ اس کے مال صرف تین ہیں: جو کھالیا اور ختم کردیا، جو پہن لیا اور پرانا کردیا، جو خیرات کیا اور اللہ کے یہاں جمع کرلیا، یہی تین مال: اس کے مال ہیں، باقی سب دوسروں کے لئے چھوڑ کر چل دینا ہے، پیچھے ورثاء استعمال کرتے ہیں، کتنے بلیوں کی نذر ہوجاتا ہے، یا تتر بتر ہوجاتا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں: اہل تعلق، میت کا مال (چارپائی وغیرہ) اور اس کا عمل، پھر دو چیزیں واپس آجاتی ہیں، صرف اس کا اچھا برا عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔

میرے بھائیو! جو آگے بھیج دیا ہے: اگر برا عمل بھیجا ہے تو اللہ کی پناہ! اور اگر اچھا عمل بھیجا ہے، خواہ کسی لائن کا اچھا عمل ہو، وہی اچھا مآلِ کار ہے، وہ چند دن کا استعمال کا سامان نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ کے لئے استعمال کا سامان ہے۔

اعمالِ صالحہ کا اجر دنیا میں کیوں نہیں ملتا؟

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اعمال کا اجر اس دنیا میں نہیں رکھا، آخرت میں رکھا ہے، اس دنیا میں اعمال کا اجر اگر دیا جائے گا تو مؤمن گھاٹے میں رہے گا۔ غور کرو! ایک آدمی نے پندرہ سال کی عمر میں نماز پڑھنی شروع کی، اس کی نماز کا بدلہ اگر اسی دنیا میں دے دیا جائے تو وہ کتنے دن ثواب استعمال کرے گا؟ ساٹھ سال، ستر سال، اسی سال، نوے سال، سو سال، پھر تو مرے گا؟ پس اس نے پچاسی سال اپنی نماز کے ثواب سے فائدہ اٹھایا۔ اور جو نماز اس نے

مرنے سے ایک دن پہلے پڑھی ہے: اس کے ثواب سے تو ایک ہی دن فائدہ اٹھائے گا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعمال کا اجر اس دنیا میں نہیں رکھا، سارا اجر آخرت میں رکھا ہے، تاکہ آخرت میں جب وہ اجر ملے تو اسے تا ابد استعمال کرے، اب وہ اجر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

اور یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف (آیت ۵۷) میں بیان کیا ہے: ﴿وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾: اور آخرت کا اجر کہیں زیادہ بڑھ کر ہے ایمان داروں اور تقوی شعاروں کے لئے۔

سوال: اگر اعمالِ صالحہ کا کچھ ثواب: دنیا میں بھی دیا جائے اور باقی آخرت میں دیا جائے تو کیا حرج ہے؟

جواب: ایسا بچند وجوہ نہیں کیا جاسکتا:

ایک: مزدوری کام پورا کرنے کے بعد ملتی ہے، عمل کے درمیان نہیں ملتی۔

دوم: اعتبار خاتمہ کا ہے، اور ابھی بندے کو معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ کس حال پر ہوگا؟ اور اگر اللہ کے علم کے مطابق معاملہ کیا جائے تو راز طشت از بام ہوجائے گا اور تکلیف شرعی کی بنیاد ختم ہوجائے گی، اس دنیا میں ایمان بالغیب ضروری ہے۔

سوم: اس دنیا کے ثواب کی اور آخرت کے ثواب کی نوعیت مختلف ہے، یہاں کا انگور اور ہے اور آخرت کا اور، پھر ثواب کے طور پر کونسا انگور دیا جائے گا؟ آخرت کا انگور یہاں کا جسم استعمال نہیں کرسکتا۔

چہارم: اعمالِ صالحہ کا کچھ اجر دیا جائے گا تو گناہ کی کچھ سزا بھی یہاں دی جائے گی، اور اس صورت میں کوئی کافر پنپ نہیں سکے گا۔ سورۃ الفاطر کی آخری آیت ہے: ﴿وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى، فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا﴾: اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کی ان کے اعمال (بد) کے سبب فوراً دار وگیر فرمانے لگیں تو روئے زمین پر ایک متنفس کو نہ چھوڑیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک مقررہ وقت (قیامت) تک مہلت دیئے ہوئے ہیں۔ پس جب ان کا مقررہ وقت آپہنچے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لیں گے!

آیتِ پاک کا خلاصہ

تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لوگوں کے لئے ایک مصلحت سے دنیا بھلی کی گئی ہے۔ اب اگر آدمی اُسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالے، اپنی ساری نظر اُسی پر روک لے، اسی دنیا کا ہوکر رہ جائے، اور انہی دل پسند چیزوں میں پھنس کر رہ جائے تو یہ دھوکہ ہے، یہ تو چند دن کا استعمالی سامان ہے، اس کے ذریعہ تیاری کرنی ہے، آخرت کے لئے حسن مآب تو وہاں ہے، یہ چیزیں ساری اس لئے ہیں کہ اس کے ذریعہ آپ اگلی زندگی بنائیں۔

دنیا کی چیزوں سے بہتر جنت کے سدابہار باغات ہیں

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذٰلِكُمْ؟﴾ آپ لوگوں سے پوچھئے: کیا بتلاؤں میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیزیں؟ یہ جو دنیا کا چند روزہ سامان ہے، جو تمہیں بڑا بھلا لگ رہا ہے، کیا میں تمہیں ان سے بہتر چیزیں بتاؤں؟ ان سے بہتر وہ باغات ہیں جو نیک مسلمانوں کو اللہ کے یہاں پہنچ کر ملیں گے۔ ان لوگوں کو ملیں گے جو پرہیزگار ہیں، پرہیزگار کس کو کہتے ہیں؟ نیک مؤمن کو! مؤمن بدکار بھی ہوسکتا ہے، گناہ گار بھی ہوسکتا ہے، لیکن نیک مؤمن اور متقی وہ شخص ہے جو فرض اور واجب احکام میں سے کوئی نہ چھوڑے، اور جو کسی گناہ کبیرہ کے قریب بھی نہ جائے، اور اگر کوئی گناہ ہوجائے تو پہلی فرصت میں توبہ کرلے، پھر فرائض وواجبات کے علاوہ سنتیں ہیں، سنت مؤکدہ بھی ہیں اور غیر مؤکدہ بھی، پھر مستحبات ہیں۔ ان سب اعمال سے درجے بڑھتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ آدمی ولی اللہ بن جاتا ہے۔ اولیائے کرام بھی یہی مؤمن ہوتے ہیں، البتہ وہ فرائض وواجبات سے آگے بڑھتے ہیں، سنت مؤکدہ ادا کرتے ہیں، سنت غیر مؤکدہ ادا کرتے ہیں، مستحبات ادا کرتے ہیں، نوافل ادا کرتے ہیں، اور اسی کے ذریعہ اللہ سے نزدیک ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے دوست بن جاتے ہیں۔

اسی طرح گناہوں میں سے کبیرہ گناہوں سے بچنا تو نیک مؤمن ہونے کے لئے شرط ہے، پھر گناہ کبیرہ کے بعد چھوٹے گناہ ہیں ان سے بچنا بھی ضروری ہے، پھر ان کے بعد وہ

چیزیں ہیں جن میں گناہ کا شبہ ہے، ان مشتبہ امور سے بھی جو بچتا ہے وہ ولی اللہ بن جاتا ہے۔

غرض: نیک مؤمنین کو جو باغات ملیں گے وہ دنیا کی ان تمام چیزوں سے بہتر ہیں، وہ باغات سدابہار ہیں، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اوپر دیکھو کچھ نظر نہیں آرہا، اور نیچے جڑوں میں نہریں بہ رہی ہیں، جس کی وجہ سے وہ باغات سدابہار ہیں، کبھی خشک نہیں ہوتے، ان کے پتے نہیں جھڑتے، ان باغات میں نیک لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ ایک نعمت تو باغات ہیں، پھر باغات سدابہار ہیں، پھر ان باغات میں ہمیشہ رہنا ہے، ان باغات سے کبھی نکلنا نہیں۔

جنت میں پاکیزہ عورتیں ملیں گی

اور دنیا کی مرغوبات میں عورتوں کا تذکرہ سب سے پہلے آیا ہے، وہ عورتیں جو دنیا میں پسندیدہ بنائی گئی ہیں، وہ عورتیں وہاں بھی ملیں گی، مگر وہ ہر طرح پاکیزہ ہونگی۔

زمانۂ حیض کے احکام:

مگر دنیا کی عورتوں کو کسی مصلحت سے حیض بھی آتا ہے، ہر مہینہ پانچ سات روز ایسی ہوجاتی ہیں کہ قریب جانا بھی منع ہے، الگ چارپائی پر لیٹنا ضروری ہے۔ آج ہی یہ آیتیں آئی ہیں کہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں: جب عورت حیض کی حالت میں ہو تو کیا معاملہ کیا جائے؟ آپؐ جواب دیں کہ حیض کی حالت تکلیف دہ حالت ہے، عورت اس زمانہ میں نارمل نہیں رہتی، لہٰذا اس حالت میں عورتوں سے جدا رہو، بیوی کے ساتھ نہ لیٹو، پھر مزید تاکید فرمائی کہ ان کے نزدیک بھی مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں۔ اور ابوداؤد میں حدیث ہے کہ ازواج مطہرات زمانۂ حیض میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں لیٹتی تھیں، نیچے چٹائی پر علاحدہ لیٹتی تھیں، البتہ ایک آدھ بار آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لٹایا ہے، وہ مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھا، پس وہ سنت نہیں ہے۔

جنت کی سب عورتیں پاکیزہ ہونگی

اور اس کے علاوہ معلوم نہیں کیا کیا انسان میں گندگیاں ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں ناک

میں ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں منہ میں ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں دانتوں پر ہوتی ہیں، کچھ گندگیاں بغل میں ہوتی ہیں، اور پتہ نہیں کیا کیا گندگیاں ہوتی ہیں، لیکن جنت میں جو ازواج ملیں گی، چاہے وہ دنیا والی ہوں یا جنت کی حوریں: وہ پاکیزہ ہونگی، اللہ تعالیٰ نے ان کو پاک صاف کر رکھا ہوگا۔

جن کا دنیا میں نکاح نہیں ہوا:

دنیا میں کچھ عورتیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی شوہر نہیں، اور کچھ مرد بھی ایسے ہیں جن کی کوئی بیوی نہیں، ایسی عورتوں اور ایسے مردوں کے وہاں نکاح ہوں گے، وہاں کوئی بے نکاح نہیں رہے گا۔

دنیا کی عورتیں بھی حور ہیں:

جنت کی ہر عورت حور ہے، حور عربی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں: گوری عورت، حور حوراء کی جمع ہے اور حوراء کے معنی ہیں: گوری، یورپ کی گوری نہیں، یہ تو ان کے ساتھ ایک لفظ لگ گیا ہے، چاہے وہ گوری نہ ہو، چاہے وہ کیسی ہی بدصورت ہو، مگر کھال سفید ہو تو لوگ اس کو ’’گوری‘‘ کہتے ہیں، مگر جنت کی عورتیں سب گوری اور نہایت خوبصورت ہونگی، یہ جو دنیا کی عورتیں ہیں وہ بھی وہاں حور ہونگی، بلکہ جنت کی حوروں کی سردار ہونگی، کیونکہ جنت کی حوریں تو جنت کی مخلوق ہیں، اور یہ ایمان وعمل کی برکت سے جنت میں گئی ہیں، ویسے مفت میں نہیں گئیں، اس لئے ان کا مقام وہاں بلند ہوگا۔

جس عورت کے چند نکاح ہوئے: وہ کس کو ملے گی؟

یہاں لوگ ایک مسئلہ پوچھا کرتے ہیں: ایک شخص کی بیوی تھی، پھر اس کا انتقال ہوگیا، اور بیوی کا دوسری جگہ نکاح ہوگیا، پھر اتفاقاً دوسرے شوہر کا بھی انتقال ہوگیا، پھر بیوی نے تیسرا نکاح کرلیا: پس یہ بیوی کس کو ملے گی؟ دنیا میں اس کے تین شوہر ہوئے ہیں۔ لوگ یہ سوال کرتے ہیں، آپ حضرات بھی سوچتے ہونگے کہ تقریر کے بعد پوچھیں گے۔ پس میں ابھی کیوں نہ بتادوں!

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم نہیں، دنیا میں آئندہ جو معاملات پیش آنے والے ہیں یا مرنے کے بعد آخرت میں جو معاملات پیش آئیں گے ان میں سے ہم انہی سوالوں کے جواب جانتے ہیں، جن کا تذکرہ قرآن وحدیث میں آیا ہے، اور جن کا تذکرہ قرآن وحدیث میں نہیں آیا اس کا جواب ہم نہیں جانتے، آخرت کے معاملات میں عقل کا گھوڑا نہیں دوڑایا جاسکتا، قیاس نہیں چلتا، قیاس اسی دنیا کے معاملات میں چلتا ہے۔ نصوص میں یعنی قرآن وحدیث میں اگر کوئی بات آئی ہے تو ہم بتاسکتے ہیں، اس کے بغیر نہیں بتاسکتے۔

اور یہ مسئلہ قرآن وحدیث میں نہ واضح طور پر آیا ہے، نہ اشارۃً آیا ہے، اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم نہیں! البتہ کتابوں میں چند قول لکھے ہیں، مگر وہ علماء کی باتیں ہیں، قرآن وحدیث کی باتیں نہیں ہیں، اس لئے قطعی نہیں ہیں:

ایک قول: یہ ہے کہ جو آخری شوہر ہے اسے وہ بیوی ملے گی، کیوں کہ جب پہلا شوہر مرگیا تو نکاح ختم ہوگیا، پھر جب دوسرا شوہر بھی مرگیا تو اس کا نکاح بھی ختم ہوگیا، جبھی اگلے سے نکاح جائز ہوا، پھر تیسرے سے نکاح ہوا، پس وہ آخری شوہر ہے، اس کے نکاح میں وہ بیوی آخر تک رہی ہے، اس لئے اسی کو ملے گی۔

مگر تیسرا ابھی تو کبھی نہ کبھی مرے گا یا بیوی مرے گی، کوئی بھی مرے گا نکاح ختم ہوجائے گا۔ پھر تیسرے کے لئے وجہ ترجیح کیا ہے؟

موت سے نکاح ختم ہوجاتا ہے

بیوی مرے تو بھی نکاح ختم ہوجاتا ہے، شوہر مرے تو بھی نکاح ختم ہوجاتا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ شوہر مرے تو نکاح عدت تک باقی رہتا ہے اور بیوی مرے تو نکاح فوراً ختم ہوجاتا ہے، بیوی کا انتقال ہوجائے تو شوہر اس کو ہاتھ نہیں لگاسکتا۔ بیوی کو کوئی نہلانے والا نہ ہو تو بھی شوہر بیوی کو نہیں نہلاسکتا، کیوں کہ نکاح ختم ہوگیا، اب وہ اجنبی بن گیا، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ شوہر بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے، جب جنازہ تیار ہوجائے تو ایک نظر بیوی کا چہرہ دیکھ سکتا ہے، ہاتھ نہیں لگاسکتا۔

غیر محرم میت کا چہرہ دیکھنا:

سوال: یہاں تو عورتیں غیر محرم مرد کا بھی چہرہ دیکھتی ہیں؟

جواب: یہ غلط طریقہ ہے، اور یہ طریقہ ہمارے یہاں (ہندوستان میں) بھی رائج ہے۔عورت کا انتقال ہوتا ہے تو اس کا چہرہ کوئی اجنبی مرد نہیں دیکھتا، جو اس کے محرم ہوتے ہیں جیسے بیٹا، بھائی وغیرہ یا عورتیں دیکھتی ہیں: یہ جائز ہے۔

مگر مرد کا انتقال ہوتا ہے تو اجنبی عورتیں بھی زیارت کے لئے آتی ہیں، اور چہرہ دیکھتی ہیں: یہ درست نہیں، پردے کے احکام زندگی کے ساتھ خاص نہیں: موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ایک موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا تھا: **لاتنظر إلی فخذ حی ولا میت**: نہ کسی زندہ کی ران دیکھو اور نہ کسی مردہ کی، جیسے زندے کی ران دیکھنا جائز نہیں، مردے کی ران دیکھنا بھی جائز نہیں۔اسی لئے جب میت کو نہلاتے ہیں تو ناف سے گھٹنے تک کوئی موٹا کپڑا ڈال لیتے ہیں، پردہ کر کے نہلاتے ہیں۔پس اجنبی مرد کا چہرہ دیکھنا جیسے زندگی میں جائز نہیں، مرنے کے بعد بھی جائز نہیں، اسی طرح اجنبی عورت کا چہرہ دیکھنا جیسے زندگی میں جائز نہیں، مرنے کے بعد بھی جائز نہیں، اس لئے یہ طریقہ کہ مرد کا جنازہ ہو جاتا ہے تو سارے محلے والے مرد اور عورتیں آ کر منہ دیکھتے ہیں: یہ شرعاً جائز نہیں۔ہاں محرم عورتیں چہرہ دیکھ سکتی ہیں۔

دوسرا قول: کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ قیامت کے دن عورت کو اختیار دیا جائے گا وہ جس کو پسند کرے گی، اس کو وہ عورت دی جائے گی۔

تیسرا قول: کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ ان تینوں شوہروں میں سے جس کا اخلاقی برتاؤ اس عورت کے ساتھ اچھا ہوگا اس کو وہ عورت ملے گی۔

لیکن یہ سب علماء کے اقوال ہیں، قرآن وحدیث میں یہ مسئلہ نہ صراحتاً آیا ہے نہ اشارۃً، اس لئے صحیح جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم نہیں، آخرت میں پتہ چلے گا کہ کس کو ملی؟ اور کوئی ضروری نہیں کہ سارے مسئلے یہیں طے کر لئے جائیں، اس دنیا میں وہی مسئلے طے کرنے ضروری ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے ہیں، کیونکہ یہ مسئلے طے کئے بغیر عمل کیسے کیا جائے گا؟

لیکن جن باتوں کا عمل سے تعلق نہیں ان کو اس دنیا میں طے کرنا ضروری نہیں، وہ دوسری دنیا میں سامنے آجائیں گے۔

جنت میں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی

اس دنیا میں تو اللہ کے فضل سے ہم مؤمن ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ پوری زندگی پرہیزگاری کے ساتھ گذرے، لیکن دل دھڑکتا رہتا ہے کہ اللہ جانے ہمارا انجام کیا ہوگا؟ اگر ایمان اور عمل صالح پر ہمارا خاتمہ ہوا تو اللہ خوش ہوں گے، اور اگر مرنے سے پہلے احوال بگڑ گئے تو انجام برا ہوگا۔حدیث میں ہے کہ ایک آدمی پوری زندگی جنت والے کام کرتا رہتا ہے، پھر جب جنت ایک ہاتھ باقی رہ جاتی ہے تو اس کی بدبختی غالب آتی ہے اور وہ اپنا ایمان کھو بیٹھتا ہے، کفر کے راستے پر پڑ جاتا ہے، اور کافر ہو کر مرتا ہے، اور جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ زندگی بھر جہنم کے راستے پر چلتا رہے، جب جہنم ایک ہاتھ رہ جائے تو نیک بختی غالب آجائے، اور اللہ تعالیٰ توفیق دیدیں، اور وہ ایمان لے آئے، اور اچھے احوال پر اس کی موت ہو، اور وہ جنت میں پہنچ جائے۔

اس لئے ہمارا آخری انجام کیا ہوگا؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اس دنیا میں تو دھڑکا لگا رہتا ہے۔اور ہم سب سے بڑی دعا یہ کرتے ہیں کہ یا اللہ! ایمان پر ہمارا خاتمہ ہو!

لیکن جس کا ایمان پر خاتمہ ہوا، اور وہ آخرت میں جنت میں پہنچ گیا، اس سے اللہ تعالیٰ ایسے خوش ہو جائیں گے کہ پھر کبھی ناراض نہیں ہونگے، اور یہ آخرت میں جنت سے بھی بڑی نعمت ہوگی، سورۃ توبہ (آیت ۷۲) میں ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾: اور اللہ کی رضامندی سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے!

آخرت کی نعمتیں کس کو ملیں گی؟

آخرت کی یہ تین نعمتیں (باغات، ازواج مطہرات اور اللہ کی خوشنودی) جن کو ملیں گی ان کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں: ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ﴾: ان بندوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں! مگر ہمیں بھی تو کچھ بتلاؤ کہ وہ بندے کونسے ہیں؟ تا کہ ہم بھی ان کی صف میں

کھڑے ہوجائیں، پس سنو! وہ بندے وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لائے ہیں، پس آپ ہمارے گناہوں کو بخش دیں، اور ہمیں جہنم سے بچالیں۔

یہ ایک بات ہوئی یعنی وہ بندے مؤمن ہونے چاہئیں، اور جو کوتاہیاں ان سے ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہیں، اور جہنم سے بچے رہنے کی دعائیں کرتے رہیں۔

ایمان پر غرّہ نہیں چاہئے

اور ایمان کے ساتھ یہ غرّہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے جنت ہمارے باپ کی جاگیر ہے۔ آج عام طور پر مسلمانوں کا یہی گمان ہے، نہ نماز پڑھتے ہیں، نہ زکات دیتے ہیں، مگر مسلمانوں کی لسٹ میں ان کا نام ہے، اس لئے مطمئن ہیں کہ جنت ہمارے لئے ریزرو ہے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم جنت میں نہیں جائیں گے تو اور کون جائے گا! اور اللہ ہمیں نہیں بخشیں گے تو اور کس کو بخشیں گے!

میرے بھائیو! جنت کسی کے باپ کی جاگیر نہیں، پہلے پارے میں ایک آیت ہے جو کل پڑھی گئی ہے: ﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا أَوْ نَصٰرٰى، تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ، قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○ بَلٰى، مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ آیات ۱۱۱و۱۱۲):
یہودی کہتے ہیں: جنت میں وہی جائے گا جو یہودی ہے، یہی بات عیسائی بھی کہتے ہیں یعنی مسلمان جنت میں نہیں جائیں گے، ہم ہی جائیں گے (یہی بات آج مسلمان بھی کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ دل بہلانے کی باتیں ہیں، یہ ان کی جھوٹی آرزوئیں ہیں! آپ ان سے کہئے: اگر تم سچے ہو تو دلیل لاؤ، تمہارے پاس تورات ہے، تمہارے پاس انجیل ہے، ان میں سے کوئی دلیل لاؤ کہ محض نام کے یہودیوں ہی کے لئے اور نام کے عیسائیوں ہی کے لئے جنت ہے، ان کے علاوہ کوئی جنت میں نہیں جائیگا، مسلمانوں کے لئے جنت نہیں ہے، جنت یہود و نصاریٰ کی جاگیر ہے، اس بات کی اگر تمہارے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کرو! کہاں سے پیش کریں؟ کوئی دلیل نہیں ہے!

آج جاہل مسلمان بھی اسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں، ان سے بھی یہی کہا جائے گا کہ تم جو

گمان باندھے بیٹھے ہو، اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن سے یا حدیث سے دلیل لاؤ کہ جو بھی مسلمان کہلاتا ہے وہ ضرور جنت میں جائے گا، ان کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں، یہود و نصاریٰ کی طرح محض خوش فہمی ہے۔

پھر آگے قرآن معیار بتلاتا ہے کہ جنت میں کون جائے گا؟ فرمایا: ﴿بَلٰى، مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ﴾ کیوں نہیں! یعنی مسلمان جنت میں کیوں نہیں جائیں گے، جنت میں جانے کا معیار یہ ہے کہ آدمی اپنی پوری ذات اللہ کے حوالے کردے، درانحالیکہ وہ مؤمن بھی ہو۔ ایمان کے ساتھ جو کرنے کے احکام اللہ نے دیئے ہیں: وہ بجالائے، اور جو رکنے کے احکام دیئے ہیں ان سے باز رہے، ایسا شخص ضرور جنت میں جائے گا، اور یہ معیار تمہارے اندر نہیں پایا جاتا، اور کھرے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے، پس جو اس معیار پر پورا اترے گا وہ جنت میں ضرور جائے گا۔

جو بندے کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! بیشک ہم ایمان لائے ہیں، پس ہمارے ایمان کی برکت سے ہمارے گناہ بخش دے اور جہنم کے عذاب سے ہماری حفاظت فرما وہ لوگ ایمان کے ساتھ پاکبازی کی زندگی گذارتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگتے ہیں، اور جہنم سے بچنے کی دعائیں کرتے ہیں وہ ضرور جنت میں جائیں گے۔

دعائیں ضروری ہیں:

دعائیں عبادتوں کا مغز ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے اور نماز میں کئی جگہ دعائیں رکھی گئی ہیں، بلکہ نماز کا آخری جزء تو دعا ہی کے لئے خاص ہے، مگر جب اسلام عربوں سے بڑھ کر عجمیوں تک پہنچا، تو صحابہ جہاں تک گئے، اور انھوں نے جو ممالک فتح کئے وہ تو عرب ملک بن گئے، یہ عراق، یہ شام، یہ مصر، یہ خلیج کے ممالک: سب صحابہ نے فتح کئے ہیں، وہ سب عرب ملک بن گئے، لیکن بعد میں جہاں اسلام پہنچا: وہاں اسلام کمزور رہا، وہ ممالک عرب ملک نہیں بنے، ہم بھی انہی ملکوں میں سے ہیں، ہندوستان میں اسلام بہت دیر میں پہنچا، اس لئے ہندوستان عرب ملک نہیں بنا، یہاں کے لوگ عربی نہیں جانتے، یہ عجمی لوگ جو عربی زبان نہیں جانتے: نماز میں دعا نہیں مانگ سکتے، وہ اپنی زبان میں دعا مانگیں گے، لیکن اگر نماز میں

اپنی زبان میں دعا مانگیں گے تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

ان بے چاروں نے بچپن میں ایک دعا یاد کی ہے: اللّٰھم اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ بس وہی یاد ہے، روزانہ وہی پڑھتے ہیں، اور سمجھتے کچھ نہیں، حالانکہ دعا دل کی مراد مانگنے کا نام ہے، مگر عجمی مسلمان عربی نہ جاننے کی وجہ سے اس پر قادر نہیں!

جب یہ ضرورت پیش آئی تو علمائے کرام نے کہا: سلام کے بعد جو متصل وقت ہے وہ بھی نماز کے ساتھ ملحق ہے، پس سلام کے بعد متصلاً دعائیں مانگو، اور اپنی زبان میں مانگو، یہ بھی نماز ہی میں مانگنا ہے۔

آج کل کچھ لوگ کہتے ہیں: حضورؐ اور صحابہ سے سلام کے بعد دعا مانگنا ثابت نہیں، اس لئے نمازوں کے بعد دعا مانگنا بدعت ہے، یہ بیچارے بدعت کی حقیقت نہیں جانتے، قولاً اور فعلاً دعا ثابت ہے، ہاں ہیئت اجتماعیہ اور التزام کے ساتھ ثابت نہیں، پس ان باتوں سے احتراز کیا جائے، نفس دعا کو بدعت کیوں کہا جائے؟

اور خاص خاص عربوں کو آج بھی ضرورت نہیں، انہیں جو دعائیں کرنی ہوتی ہیں وہ نماز میں کر لیتے ہیں، مگر جاہل عرب اور عجمی کیا کریں؟ وہ تو نماز میں دعا نہیں کر سکتے، بگڑی ہوئی عربی میں دعا کرنے سے نماز فاسد ہوجائے گی، پس اگر ان کو نماز کے بعد دعا مانگنے کے لئے نہیں کہا جائے گا تو بندے کا اللہ سے مانگنے کا تعلق ختم ہوجائے گا۔

دعا کی رسم:

مگر اب فرضوں کے بعد دعا رسم بن کر رہ گئی ہے، امام صاحب نے چند رَبَّنَا یاد کر لئے ہیں، وہ ہمیشہ انہی کو بالترتیب پڑھتے ہیں، اور شاید وہ بھی سمجھتے نہیں، جہاں ان کا سانس ٹوٹتا ہے: مقتدی آمین کہتے ہیں، یہ دعا نہیں ہے، دعا کی رسم ہے! دعا تو یہ ہے کہ ہر بندہ اپنے دل کی مراد اپنی زبان میں اللہ سے مانگے، محض دعا کا پڑھ لینا دعا نہیں، اس کو زیادہ سے زیادہ ذکر کہہ سکتے ہیں۔

دعا میں ہیئتِ اجتماعی اور التزام ختم کیا جائے

بہرحال نماز کے بعد دعا تو عجمی مسلمانوں کی ضرورت ہے، اس لئے ضروری ہے، مگر یہ

ضروری نہیں کہ سب کے ہاتھ ایک ساتھ اٹھیں اور سب ایک ساتھ دعا ختم کریں جو جس وقت چاہے دعا شروع کردے اور جب اس کی دعا پوری ہوجائے: منہ پر ہاتھ پھیر کر جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جب امام صاحب دعا ختم کردیں تو مقتدی بھی ختم کردیں، اگر ان کی دعا باقی ہے تو مانگتے رہیں۔

اور اگر کسی کو کوئی ضرورت ہو تو وہ دعا مانگے بغیر بھی جا سکتا ہے۔ ذہنوں میں اس کی گنجائش رہنی چاہئے، بلکہ امام صاحب کو کوئی ضرورت ہو تو وہ بھی جا سکتے ہیں، کیونکہ امام اور مقتدیوں کا رابطہ سلام پر ختم ہوجاتا ہے۔

دعا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے:

اور اللہ تعالیٰ کو وہی بندے پسند ہیں جو اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں جو لوگ اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتے وہ اللہ کو پسند نہیں، سورۃ المؤمن کی (آیت ۶۰) ہے: ﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ، إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾: اور تمہارے پروردگار نے فرمایا: مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری درخواست قبول کرونگا۔ جو لوگ میری عبادت (دعا) سے سرتابی کرتے ہیں: وہ عنقریب ذلیل ہوکر جہنم رسید ہونگے!

باقی آئندہ!

مضمون یہ چل رہا تھا کہ دنیا کی چیزوں سے بہتر آخرت کی تین نعمتیں ہیں، بہشتِ بریں، پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی خوشنودی، اور یہ نعمتیں ان لوگوں کو ملیں گی جن میں چھ باتیں پائی جاتی ہیں: پہلی بات: وہ مؤمن ہیں اور اللہ سے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور جہنم سے پناہ چاہتے ہیں۔ باقی پانچ باتیں آئندہ کل بیان کروں گا۔ آج ان کا تذکرہ چھیڑونگا تو بات لمبی ہوجائے گی، اس لئے یار زندہ صحبت باقی! والحمدللہ رب العالمین.

۱۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخرت کی نعمتیں کن لوگوں کوملیں گی؟

خطبۂ مسنونہ کے بعد:﴿قُلْ أَؤُنَبِّئُكُم بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ، لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْأَسْحَارِ ○﴾

(آل عمران ۱۵-۱۷)

ترجمہ: آپ پوچھیں: کیا میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں جو ان چیزوں سے بہ درجہا بہتر ہیں؟ ان لوگوں کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور صاف ستھری بیویاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان بندوں کو خوب دیکھتے ہیں ○ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، پس آپ ہمارے گناہ بخش دیں، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالیں ○ وہ صبر شعار، راست باز، اطاعت کرنے والے، مال خرچ کرنے والے، اور آخرِ رات میں گناہوں کی معافی مانگنے والے ہیں ○

دنیا کی بہار چندروزہ ہے:

بزرگو اور بھائیو! مضمون کل سے یہ چل رہا ہے کہ یہ دنیا لوگوں کے لئے خوشنما بنائی گئی ہے اور اس کی وجہ سورۃ الکہف میں بیان کی ہے:﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا

لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ○ وَإِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾: ہم نے ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں: زمین کے لئے زینت بنایا ہے، تاکہ ہم تمہیں جانچیں کہ تم میں سے شاندار عمل کر کے کون آتا ہے؟ پھر زمین کی یہ زیبائش ختم ہوجانے والی ہے، ہم اس کو چٹیل میدان بنادینے والے ہیں، یہ دنیا سدابہار نہیں ہے، چندروز کی بہار ہے! ہمیشہ کی آبادی اس دنیا کے لئے مقدر نہیں، مگر بلبل موسم بہار میں باغ کی رعنائیاں اور دل فریبیاں دیکھ کر وجد میں آتا ہے، اور وہ یہ بھول جاتا ہے کہ یہ بہار چندروزہ ہے، اس کا انجام خزاں ہے، ایک دن سب کچھ اجڑ جانے والا ہے، اور بلبل کی خوشی بھی ختم ہوجانے والی ہے، اس کی خوشی محض عارضی ہے، حقیقی خوشی وہی ہے جو ہمیشہ رہنے والی ہے، جس خوشی کا کوئی خاتمہ نہیں: وہی خوشی خوشی ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے:

اور اللہ تعالیٰ نے یہ خوشنما دنیا اس لئے پیدا کی ہے کہ اس کے ذریعہ آنے والی دنیا کے لئے تیاری کی جائے مگر انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ اسی دنیا میں پھنسا رہتا ہے، اس سے بالاتر نہیں ہوتا، اس لئے اُس آیت میں جس کی تفسیر گذشتہ کل بیان کی تھی: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لوگوں کے لئے خوشنما بنائی گئی ہیں دل پسند چیزیں، یعنی عورتیں، بیٹے، ڈھیر لگے ہوئے اموال، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں۔ یہ سب دل پسند چیزیں ہیں، یہ سب چیزیں لوگوں کے لئے مزین کی گئی ہیں، لیکن اچھا انجام اللہ ہی کے پاس ہے، بہترین انجام دنیا میں نہیں ہے۔ البتہ اُس اچھے انجام کے لئے یہیں تیاری کرنی ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یہ جو دل لبھانے والی چیزیں ہیں ان میں عمل کر کے اُس دنیا کو آباد کرنا ہے۔

حدیثوں میں اس مضمون کو اس طرح سمجھایا ہے کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے، انسان کا عمل اس میں باغ لگاتا ہے، ہم یہاں بارہ سنن مؤکدہ پابندی سے پڑھتے ہیں تو وہاں ایک بلڈنگ تیار ہوتی ہے، ہم یہاں سبحان اللہ کہتے ہیں تو وہاں ایک درخت لگتا ہے، ہم اس دنیا میں اللہ کے لئے گھر بناتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جنت میں ہمارے لئے سونے چاندی کا محل تیار کرتے ہیں، ورنہ جنت چٹیل میدان ہے، ہر انسان کی جنت اس کے عمل سے آباد ہوتی ہے، سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔

جنت کے لئے کونسے اعمال ضروری ہیں؟

جنت حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ایمان ضروری ہے، پھر گناہوں کی بخشش طلب کرنا ضروری ہے، اور دوزخ کے عذاب سے پناہ مانگنا ضروری ہے، اس کا تذکرہ کل کے بیان میں آچکا ہے۔

دوسری چیز: صبر ہے، اعمالِ اسلام میں صبر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے مذکورہ آیت میں سب سے پہلے اسی کا تذکرہ کیا ہے اور قرآنِ کریم میں دسیوں جگہ اس کا تذکرہ آیا ہے اور احادیث شریفہ بھی اس کے بیان سے بھری پڑی ہیں، معلوم ہوا کہ صبر ایک بہت بڑا اور بہت اہمیت والا عمل ہے۔

صبر کیا چیز ہے؟

صبر: عربی لفظ ہے اور ص، ب، ر کے معنی ہیں: روکنا۔ پرانے زمانے میں ظالم بادشاہ کسی کو قتل کرتے تھے تو دربار میں اس کو کھڑا کر کے گردن مارتے تھے، اس کو عربی میں کہتے تھے: قَتَلَهُ صبراً: روک کر مارا، پس صبر کے لغوی معنی ہیں: روکنا۔

اور اصطلاح میں نفس کو گناہوں سے روکنا صبر ہے، اور نیکیوں پر روکنا بھی صبر ہے آج ہی یہ آیت پڑھی گئی ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو اور سرحد کا پہرہ دو، اور اللہ سے ڈرو، یہی کامیابی کا راستہ ہے۔

غرض: جنت کی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ اللہ کے احکام پر خود کو روکے، اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بھی خود کو روکے: یہی صبر ہے اور یہ اولوالعزمی کا کام ہے، پختہ ارادے والا ہی یہ کام کرسکتا ہے، ہر آدمی کے بس کی بات نہیں، آج ہی یہ آیت کریمہ پڑھی گئی ہے: ﴿وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو یہ پختہ عزمی کے کاموں میں سے ہے، یہ ہمت کا کام ہے، ہر آدمی کے بس کا نہیں۔

اور حدیث شریف میں ہے: الصبر ضیاء: صبر ایک روشنی ہے، اگر انسان کو یہ روشنی حاصل ہوجائے تو اس کی زندگی درخشاں ہوجائے اور اس کا بیڑا پار ہوجائے، لیکن صبر آسان نہیں، اس کے لئے تھوڑی ریہرسل کرنی پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے: مَنْ يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللّٰه: جو بہ تکلف صبر کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو صبر شعار بنادیں گے، شروع میں ہمت سے کام لینا پڑے گا، پھر طبیعت عادی ہوجائے گی، اور صبر کا ملکہ پیدا ہوجائے گا، اور زندگی روشن ہوجائے گی۔

قرآنِ کریم میں کل یہ آیت بھی پڑھی گئی ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر سے اور نماز سے مدد طلب کرو، صبر کو پہلے ذکر کیا ہے اور نماز کو بعد میں، اس سے صبر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

صبر کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟

جب آدمی کسی آفت میں گھر جاتا ہے، پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے تو کسی سے مدد مانگتا ہے۔ مدد کس سے مانگنی چاہئے؟ پہلے صبر سے پھر نماز سے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں، نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہیں: یہ بات نہیں فرمائی، اس سے صبر کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اور دوسری وجہ تخصیص یہ ہے کہ نماز وہی پڑھے گا جو صبر کرے گا، جو صبر نہیں کرسکتا وہ نماز بھی نہیں پڑھے گا۔ کیونکہ اللہ کے احکام پر اپنے آپ کو روکنا بھی صبر ہے، اور اللہ کے احکام میں سے ایک حکم نماز ہے، اس لئے نماز کے لئے اپنے آپ کو وہی تیار کرتا ہے جو صبر شعار ہوتا ہے۔ جس کے اندر یہ کیفیت نہیں ہوتی وہ کٹھنائیوں میں بھی نماز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اپنی الجھنوں میں پھنسا رہتا ہے، جبکہ حضور ﷺ کو کوئی بات پیش آتی تھی: آندھیاں چلتیں، بادل گرجتے، ہوا کے جھکڑ چلتے تو آپ فوراً نماز شروع کردیتے، نماز سے قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور صبر سے بھی قلب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، آدمی اللہ کے فیصلوں پر راضی ہوجاتا ہے، یہی وہ روشنی ہے جو صبر سے حاصل ہوتی ہے۔

جب آدمی میں صبر نہیں ہوتا تو وہ بہت سی مرتبہ پریشان ہوجاتا ہے، آپ روز اخباروں میں اور ریڈیو میں خودکشی کے واقعات پڑھتے سنتے ہیں، جاہل مسلمان بھی اس میں مبتلا ہیں،

ان میں بھی جب صبر نہیں ہوتا اور وہ اللہ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتے، تو جب وہ پریشان ہوجاتے ہیں، دنیا کی تکلیفوں سے گھبراجاتے ہیں تو مصیبت سے رستگاری کے لئے خودکشی کرلیتے ہیں، مگر اس طرح مصیبتوں سے نجات کہاں ملتی ہے؟ اگر مر کر نیست (No Thing) ہوجاتا تو بیشک مصیبت سے مُکت ہوجاتا، جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ مر کر ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوجاتا ہے، اور دوسری دنیا میں نہ جانے کیا احوال پیش آئیں؟ کوئی ضروری نہیں کہ یہاں کے احوال سے بہتر احوال سامنے آئیں، یہاں سے برے احوال سے بھی سابقہ پڑسکتا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اور احادیثِ شریفہ میں صبر پر بہت زور دیا گیا ہے، لوگوں کو چاہئے کہ اللہ کے فیصلوں پر راضی رہیں، جو بھی حالات پیش آئیں ان کا سینہ سپر ہوکر مقابلہ کریں، بیماری آئے، دشمن کی طرف سے کوئی مصیبت آئے، دین پر کوئی آفت آئے، کیسے بھی احوال پیش آئیں: ہر حال میں انسان پامردی کے ساتھ رہے، یہی صبر شعار لوگوں کا طریقہ ہے۔

سچ بولنا جنت میں لے جاتا ہے:

تیسری صفت: سچ بولنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے: الصدقُ يَهْدِيْ إلى الْبِرِّ، وَالْبِرُّ يَهْدِيْ إلى الْجَنَّةِ: سچ بولنا نیک کاموں کا راستہ دکھاتا ہے، اور نیک کام جنت میں پہنچاتے ہیں۔ اور فرمایا: آدمی برابر سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے، صدیق: نہایت سچا، بہت زیادہ سچ بولنے والا یعنی سچ بولنے کی مسلسل مشق صدیق بنادیتی ہے۔ اور فرمایا: جھوٹ بدکاری کا راستہ دکھاتا ہے اور بدکاری جہنم میں پہنچاتی ہیں، اور آدمی برابر جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔ کذاب: بڑا جھوٹا، مہا جھوٹا۔ اور مشہور ارشاد ہے: الصدق يُنْجِيْ، والكذبُ يُهْلِكُ: سچ نجات دیتا ہے اور جھوٹ تباہ کرتا ہے۔ مگر آج دنیا والوں کا ذہن بدل گیا ہے، لوگ کہتے ہیں: جھوٹ بولے بغیر کام نہیں چلتا، جھوٹ ہی سے راستہ کشادہ ہوتا ہے، مصیبتوں سے بچنے کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ آج جھوٹ بولنا ایک فیشن ہوگیا ہے، جھوٹ کو آدمی کمال سمجھتا ہے۔

مگر اسلام یہ کہتا ہے کہ سچ بولو، سچ ایک نیکی ہے، اور ایک نیکی سے دوسری نیکی پیدا

ہوتی ہے، اور جب نیکیاں بہت جمع ہوجاتی ہیں تو آدمی جنت میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جھوٹ ایک برائی ہے، اور ایک برائی سے دوسری برائی پیدا ہوتی ہے، اور جب برائیاں بہت ہوجاتی ہیں تو آدمی جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔

مقصد کی پردہ پوشی (توریہ) جائز ہے:

اس لئے میرے بھائیو! آج جو دنیا کا مزاج بن گیا ہے: وہ صحیح نہیں، اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے یہ ہے کہ سچ بولو، یہ الگ بات ہے کہ آدمی کسی موقعہ پر بات اس طرح کرے کہ وہ نہ سچ ہو نہ جھوٹ، کسی مصیبت میں آدمی پھنس گیا: ایسا کرنے کی اجازت ہے، صریح جھوٹ بولنے کی کسی حال میں اجازت نہیں، مگر یہ کہ جان بچانی ہو، لیکن آدمی اس طرح بات کرسکتا ہے کہ نہ سچ ہو نہ جھوٹ! یوں بھی مطلب ہوسکتا ہو اور یُوں بھی، ایسا کہنے کی گنجائش ہے۔

عربی میں اس کو توریہ کہتے ہیں، یعنی کذب بیانی سے بچ کر مقصد کی پردہ پوشی کرنا۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ جب کسی سفر کا ارادہ فرماتے تو کسی دوسرے سفر سے توریہ کرتے، تاکہ دشمن کو نقل و حرکت کا پتہ نہ چل سکے۔

حضرت نانوتویؒ کا توریہ:

دارالعلوم دیوبند جو آپ کا ادارہ ہے، اس کے بانی ہیں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ، انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی تھی، شاملی کے میدان میں، اس جنگ میں مسلمان ناکام ہوگئے تھے، انگریز جن کی حکومت تھی کامیاب ہوگئے تھے، جنگ ختم ہونے کے بعد چند لوگوں کے نام وارنٹ نکلے، ان میں مولانا محمد قاسم صاحب کا نام بھی تھا۔ پولیس ان کی تلاش میں سرگرداں تھی، ایک دن پولیس کو کسی نے خبر کردی کہ مولانا محمد قاسم صاحب اپنے گھر میں ہیں، پولیس نے آکر گھر کو گھیر لیا، حضرت مولانا سادہ مزاج اور سادہ لباس تھے، جیسے گھر کا نوکر ہوتا ہے، ان کو کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے آدمی ہیں۔ حضرت کو جب معلوم ہوا کہ پولیس نے مکان گھیر لیا ہے تو حضرت اطمینان سے

کندھے پر چادر ڈالے ہوئے نکلے، پولیس والوں نے ان کو روکا اور پوچھا: مولوی قاسم کہاں ہیں؟ ان کو یہ تو گمان ہی نہیں تھا کہ ایسا سیدھا سادہ آدمی بھی مولوی قاسم ہوسکتا ہے، انھوں نے سمجھا کہ گھر کا کوئی نوکر ہے، حضرت جہاں کھڑے تھے وہاں سے ایک قدم آگے بڑھ گئے، اور فرمایا: ابھی یہاں تھے، معلوم نہیں کہاں گئے! یہ کہہ کر آپ چل دیئے، اور پولیس کھڑی رہ گئی، جب پولیس گھر میں گھسی تو اندر کوئی نہیں تھا۔

غرض آدمی ایسی بات کہے جو نہ جھوٹ ہو نہ سچ اور سامنے والا دھوکہ کھا جائے تو اس کو توریہ کہتے ہیں، اور وہ جائز ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی سادگی کا ایک واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ تفریح کرتے ہوئے دیوبند کے قریب ایک گاؤں مانکی میں پہنچے، وہاں مغرب کا وقت ہوگیا، مسجد میں امام صاحب نہیں تھے، لوگوں نے آپ سے پوچھا: تو نماز پڑھانا جانے؟ آپ نے فرمایا: پڑھا دیتا ہوں، انھوں نے کہا: پھر پڑھا دے! پھر اللہ جانے کیا ہوا: دونوں رکعتوں میں ﴿قُلْ يٰاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ پڑھ دی، انسان سے بھول ہوجاتی ہے، حضورؐ سے بھی بھول ہوئی ہے، سلام پھیرنے کے بعد لوگوں نے شور مچایا: نماز نہیں ہوئی! نماز نہیں ہوئی! حضرت نے فرمایا: نماز تو ہوگئی! لوگ خاموش ہوگئے اور حضرت لوٹ گئے، عشاء کے بعد لوگوں میں چرچا ہوا کہ مغرب کی نماز اللہ جانے ہوئی یا نہیں؟ صبح دیوبند کے مدرسہ میں جا کر فتوی پوچھنا چاہئے، گاؤں کا ایک وفد اگلے دن مدرسہ آیا، مدرسہ میں آکر لوگوں سے پوچھا: یہاں بڑا مولوی کون ہے؟ طالب علموں نے ان کو حضرت کے کمرے میں پہنچا دیا۔ اب وہ سارے دیکھتے ہیں کہ اسی نے تو نماز پڑھائی تھی، اب سب چپ چاپ بیٹھ گئے، کوئی بولتا نہیں، حضرت نے پوچھا: آپ حضرات کیوں تشریف لائے ہیں؟ مگر کوئی بولتا نہیں، جب بہت دیر ہوگئی تو ایک بولا: اجی مولبی جی! تو کل ہی بتا دیتا کہ میں ہی سب سے بڑا مولبی ہوں، تو ہم یہاں نہ آتے! غرض ایسا ہی آپ کا حال تھا، ایسی سادگی تھی کہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آپ کوئی عالم ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی سادگی کا دوسرا واقعہ:

ایک مرتبہ حضرت نانوتویؒ تفریح سے لوٹ رہے تھے، راستہ میں ایک دیہاتی گنّے کا گٹھر زمین پر رکھ کر سستا رہا تھا، جب حضرت وہاں سے گذرے تو اس نے کہا: او چودھری! یہ گٹھر میرے سر پے دَھر دے! حضرت نے جب گٹھر اٹھوانے کے لئے ہاتھ لگایا تو کہا: اگر تجھے بھار لگ رہا ہے تو میں اٹھالوں! اس نے کہا: اٹھا لے نہ! آپ نے اٹھالیا، اور آپ آگے اور وہ پیچھے چلنے لگے۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے، کہاں سے آیا ہے، گنا کیوں لایا ہے اور کس کے لئے لایا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ فلاں گاؤں کا ہے، اور گنا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے لئے ہدیہ لایا ہے، تا کہ وہ اس کا رس نکلوا کر کھیر پکا کر کھائیں۔ حضرت یہ بات سن کر چلتے رہے، جب شہر قریب آیا تو اس سے کہا: لے بھئی! اپنا گٹھر، اس نے لے لیا اور حضرت دوسرے راستہ سے اپنی مسجد (مسجد چھتہ) میں اپنے کمرے میں آگئے۔ وہ بندہ اسی مسجد میں گنا لے کر پہنچا اور آپ ہی سے دریافت کیا: مولبی قاسم کہاں ہیں؟ آپ نے جواب دیا: مجھے ہی مولوی قاسم کہتے ہیں۔ اس نے آپ کو پہچان لیا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے ابھی گنا اٹھا کر اس کا تعاون کیا تھا۔ چنانچہ کہنے لگا: جی ہاں! تجھے گنا کی کھیر کھانی ہوگی! (اس لئے مولوی قاسم بن رہا ہے) وہ مسجد سے باہر نکلا، اور طلبہ سے دریافت کیا، طلبہ نے اس کو بتایا کہ یہی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہیں، پس اس نے معذرت چاہی کہ میں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی کہ آپ کو گنا اٹھوایا۔ غرض: حضرت ایسے سادہ تھے کہ جلدی کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ آپ کوئی بڑے عالم ہیں۔

توریہ کا ایک واقعہ:

ایک بڑے واعظ گذرے ہیں: عبدالرحمٰن بن جوزی۔ زور کا وعظ کہتے تھے، وعظ کی ایک مجلس میں شیعہ بھی تھے اور سنی بھی، (پہلے شیعہ سنیوں کی مجلس میں آتے تھے اور بات سنتے تھے، اب بالکل نہیں آتے، انھوں نے خود کو علاحدہ کرلیا ہے، اس لئے ان کی اصلاح رک گئی ہے، اب کوئی شیعہ سنی نہیں بنتا، اب ان کی فیلڈ الگ ہوگئی ہے۔ جیسے رضاخانیوں نے

دیوبندیوں کے ناپاک ہونے کا اتنا شور مچایا ہے کہ مسجد تک دھوتے ہیں، اور ہندو مسجد میں آجائے تو نہیں دھوتے، اس طرح انھوں نے اپنا ریوڑ الگ کرلیا ہے، اس لئے ان کی اصلاح نہیں ہوتی، کیونکہ وہ ہمارے بیان میں نہیں آتے، ہماری بات نہیں سنتے اور جو رضاخانی نہیں ہیں، جہالت کی وجہ سے بدعتی ہیں، وہ ہماری مجلسوں میں آتے ہیں، اور جب ان کو قرآن وحدیث کی روشنی دکھائی جاتی ہے تو ان کی اصلاح بھی ہوتی ہے، مگر رضاخانی محروم رہتے ہیں، کیونکہ انھوں نے بدعات کو دین سمجھ لیا ہے) پس اُس ملی جلی مجلس میں کسی نے سوال کیا: ابوبکر افضل ہیں یا علی؟ بڑا نازک سوال تھا، اگر صحیح جواب دیں تو شیعہ شور مچائیں گے اور غلط جواب دیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ افضل ہیں تو ضمیر کے خلاف بھی ہوگا اور سنی ناراض ہوجائیں گے۔ پس آپ نے جواب دیا: أفضلُ الناس من کان بنتُه في بیته: لوگوں میں سب سے افضل وہ ہیں جن کی بیٹی ان کے گھر میں ہے۔ سنیوں نے سمجھا کہ ابوبکرؓ کی بیٹی (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) حضورؐ کے گھر میں ہیں، اس لئے ابوبکرؓ افضل ہیں، اور شیعوں نے سمجھا کہ حضورؐ کی بیٹی (حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا) حضرت علیؓ کے گھر میں ہیں، اس لئے حضرت علی افضل ہیں، اس طرح دونوں کی ناراضگی سے بچ گئے، اور ایسا جواب دیا کہ نہ سانپ بچے نہ لاٹھی ٹوٹے، اس کو توریہ کہتے ہیں، اور اس کی گنجائش ہے۔

توریہ کا دوسرا واقعہ:

جب نبی ﷺ نے ہجرت فرمائی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ساتھ تھے، مکہ والوں نے چاروں طرف اعلان کر رکھا تھا کہ جو ان کو زندہ پکڑ کر لائے یا ان کے سر لائے: اس کو سو اونٹ دیئے جائیں گے۔ طالع آزما چاروں طرف تلاش کر رہے تھے، ایک جگہ کچھ لوگوں نے آپؐ کو اور ابوبکرؓ کو دیکھ لیا، وہ حضرت ابوبکرؓ کو جانتے تھے، مگر آپؐ کو نہیں پہچانتے تھے، انھوں نے ابوبکرؓ سے پوچھا: یہ تمہارے ساتھ کون آدمی ہے؟ آپؓ نے جواب دیا: رجلٌ یَّھْدِیْنِي السبیل: ایک آدمی ہے جو مجھے راستہ دکھا رہا ہے۔ آپؓ کی مراد یہ تھی کہ یہ ہمارے نبی ہیں جو ہمیں دین کا راستہ دکھاتے ہیں۔ مگر وہ لوگ سمجھے کہ یہ ابوبکر کا گائڈ (راہ نما) ہے جو پہاڑی علاقہ میں راہ نمائی کر رہا ہے، اس طرح کا جملہ توریہ کہلاتا ہے، جس کی گنجائش ہے، یہ جھوٹ نہیں۔

چوتھی صفت: اطاعت شعاری:

قَنَتَ قُنُوْتًا کے لغوی معنی ہیں: اطاعت شعاری، فرمانبرداری، انکساری، فروتنی اور عاجزی۔ قَنَتَ لَهُ: کسی کے سامنے عاجزی وانکساری کرنا، اور آیت میں معنی ہیں: خدا کا فرمانبردار ہونا، اللہ کے سامنے کمال انکساری سے اظہار بندگی کرنا۔ قَانِت: اطاعت شعار اور فرمانبردار۔

اللہ پر ایمان رکھنے والے بندے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر بھی اس کی فرمانبرداری پر جمے رہتے ہیں، اور معصیت سے رُکے رہتے ہیں، اور لوگوں کے ساتھ بھی انکساری سے پیش آتے ہیں، تکبر وغرور اللہ کو ہرگز پسند نہیں۔ حدیث میں ہے: جو سر اونچا کرتا ہے: ذلیل کیا جاتا ہے، اور جو اپنے آپ کو نیچا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اونچا کرتے ہیں، بہرحال تکبر اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے۔

تکبر کیا ہے؟

مگر تین چیزیں الگ الگ ہیں:

ایک: ہے نفاست اور نظافت۔ آدمی کو یہ پسند ہو کہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، گھر صاف ستھرا رکھے، اس کی کار صاف ستھری ہو، اس کی ہر چیز عمدہ ہو، گندگی اور بے ترتیبی اسے پسند نہ ہو: یہ تکبر نہیں ہے، یہ تو نظافت و پاکیزگی ہے اور یہ ایمان کا حصہ ہے۔

دوسری چیز: ہے خودداری۔ خودداری بھی تکبر نہیں۔ خودداری یہ ہے کہ آدمی خود کو پہچانے کہ میں کیا ہوں؟ اپنے آپ کو کسی جگہ ذلیل نہ کرے، خود کو پہچانے کہ میں مؤمن ہوں، مجھے ایک مؤمن کی حیثیت سے باوقار رہنا چاہئے، مجھے خود کو کسی کے سامنے ذلیل نہیں کرنا چاہئے، اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے بچنا خودداری ہے، خودداری تکبر نہیں۔

تیسری چیز: تکبر ہے، تکبر کیا ہے؟ بَطَرُ الحقِّ وَغَمْطُ الناسِ: حق کے سامنے اکڑنا اور لوگوں کو ذلیل سمجھنا: تکبر ہے۔ حق بات سامنے آئے تو اسے نہ ماننا، گھمنڈ کرنا کہ مجھے کون کہنے والا ہے! اور لوگوں کو نظروں سے گرا دینا، اور یہ سمجھنا کہ ہم چوں دیگرے نیست! میں

ہی سب سے اچھا اور سب سے بڑا ہوں، میں تو دوسروں سے کہہ سکتا ہوں، مگر دوسروں کو کیا حق ہے کہ مجھ سے کچھ کہیں! سوچنے کا یہ انداز تکبر ہے جو اللہ کو ناپسند ہے۔

حدیث شریف میں ہے: **من تواضع للہ رفعہ اللہ**: جو خود کو اللہ کے لئے چھوٹا بناتا ہے: اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے: نہد شاخِ پُر میوہ سر برزمیں: جو ٹہنی میووں سے لدی ہوئی ہوتی ہے وہ زمین کی طرف جھکتی ہے اور جو ٹہنی میووں سے خالی ہوتی ہے وہ اوپر کو اٹھتی ہے۔ باکمال آدمی بھی خود کو بڑا نہیں سمجھتا۔ کھوکھلا ڈھول ہی بجتا ہے۔

پس جب بھی کوئی حق بات سامنے آئے: فوراً قبول کر لینی چاہئے، خواہ حق بات کہنے والا معمولی آدمی کیوں نہ ہو، کیونکہ حق بات معمولی نہیں ہوتی، حق بات بڑی ہوتی ہے، اس لئے جب حق بات سامنے آئے تو فوراً مان لینی چاہئے۔ یہی آدمی کا کمال ہے۔

اللہ کے راستے میں خرچ کرنا جنت نشیں بناتا ہے:

پانچویں صفت: انفاق ہے۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا بھی جنت میں پہنچاتا ہے۔ ہر انسان دنیا میں کماتا ہے، لیکن جو پانی آرہا ہو اگر وہ جمع ہوتا رہے، اس کے نکلنے کا راستہ نہ ہو تو پانی سڑ جائے گا، اور اگر اس کے نکلنے کا راستہ ہو تو آنا بھی بند نہیں ہوگا اور پانی بھی تازہ رہے گا۔ اس لئے آخرت کو آباد کرنے کا بہترین راستہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے، مال اناپ شناپ نہیں اڑانا چاہئے، اپنی ضروریات میں خرچ کرے، اللہ نے اس سے منع نہیں کیا، اپنے گھر والوں پر خرچ کرے اور اپنی حاجتیں پوری کرے: اس سے اللہ نے نہیں روکا۔

قارون کو اہل علم نے سمجھایا تھا کہ تیرا جو دنیا میں سے حصہ ہے اسے مت بھول، جو اللہ نے تجھے مال دیا ہے اس کو اپنی ضروریات میں خرچ کر، اور جو بچے اسے اللہ کے راستہ میں خرچ کر، اور جان لے کہ اللہ کے راستہ میں تو جو خرچ کر رہا ہے وہ اپنے ہی لئے خرچ کر رہا ہے۔

آخرت کو آباد کرنے کی راہیں:

عبادتیں دو ہیں: بدنی اور مالی۔ یہی دو بنیادی عبادتیں ہیں، لوگ بدنی عبادتیں تو آسانی

سے کر لیتے ہیں، مگر جب مال خرچ کرنے کا وقت آتا ہے تو ہزار بار سوچتے ہیں، ٹھیک ہے اگر کسی کی اپنی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، اور وہ سوچ کر خرچ کرتا ہے تو بہتر کرتا ہے، لیکن ایک کے پاس اتنا مال پس انداز کیا ہوا ہے کہ اس پر زکوۃ واجب ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ضروریات سے زائد ہے، اس وقت بھی اگر آدمی قدر واجب خرچ کرنے سے ہاتھ روک لے تو وہ جنت کیسے حاصل کر سکتا ہے۔

مال خرچ کرنا مشکل کیوں ہے؟

مگر مال خرچ کرنا مشکل ہوتا ہے، ایک تو مال کی محبت فطری ہے: ﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾: اور وہ (انسان) مال کی محبت میں بڑا مضبوط ہے (العادیات ۸) پھر انسان مایہ ناز ہے، مال اس کے لئے فخر کی چیز ہے، اس لئے وہ سوچتا ہے کہ اس کے پاس مال زیادہ سے زیادہ جمع رہنا چاہئے، تاکہ اس کا سراونچا ہو جائے۔

پھر انسان کے ساتھ وقتی اور ناگہانی حاجتیں لگی ہوئی ہیں، وقتی حاجتوں کا تو خود شریعت نے لحاظ کیا ہے، اور ایسے شخص پر زکات واجب نہیں کی، مگر جو صاحب نصاب ہے اس کے پاس مال حاجتوں سے بچا ہوا ہے اور سال بھر بچا رہا ہے: وہ بھی ناگہانی حاجتوں سے ڈرتا ہے۔ سوچتا ہے: آگے معلوم نہیں کیا خرچ کرنا پڑے، شریعت نے اس کا بھی لحاظ کیا ہے، چنانچہ نصاب کا تھوڑا سا حصہ ہی خرچ کرنے کے لئے کہا ہے۔

خرچ کرنے کی درمیانی راہ:

اور یہ بھی شریعت کا حکم ہے کہ ہاتھ بالکل کھول نہ دو، ورنہ پریشان ہو کر رہ جاؤ گے، اور ہاتھ گلے سے باندھ بھی نہ لو، ورنہ ساری دنیا تم پر پھٹکار بھیجے گی، کہے گی: بڑا مکھی چوس ہے! اس کی مٹھی کبھی کھلتی ہی نہیں، پس درمیانی راستہ اختیار کرو۔

مال لوگوں کے لئے سہارا ہے:

سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال کو مایۂ زندگی بنایا ہے، وہ لوگوں کے لئے سہارا ہے، جیسے یہ ستون چھت کے لئے سہارا ہیں، ایسے ہی مال لوگوں کے لئے

سہارا ہے، اگر مال نہ رہے تو آدمی ہمت ہار جاتا ہے، لیکن اگر چھت کے نیچے ضرورت سے زائد ستون کھڑے کرر کھے ہوں، اوران میں سے بعض نکال دیئے جائیں جو فالتو (ضرورت سے زائد) ہیں: تواس میں کیا حرج ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

مال اللہ کا ہے: بندے اس میں نائب ہیں:

میرے بھائیو! قرآنِ کریم میں اللہ پاک کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَأَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾: اور جس مال میں اس نے تم کو اپنا قائم مقام کیا ہے: اس میں سے خرچ کرو (الحدیدے) یعنی یہ مال اللہ کا ہے تم کو اس کا منیجر (منتظم) بنایا ہے، اپنا نائب بنایا ہے۔ اب اللہ حکم دیتے ہیں کہ میرا جو مال تمہارے پاس ہے اس میں سے اتنا خرچ کرو، تو تم کیوں ہچکچاتے ہو؟ مال تمہارا کہاں ہے؟

پھر تم اس میں سے جو خرچ کرو گے: اللہ تعالیٰ اس کا عوض دیں گے: ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾: تم جو کچھ خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کا عوض دیں گے (سبا ۳۹) عوض کدھر سے آئے گا؟ معلوم نہیں کدھر سے آئے گا! قرآنِ کریم میں ہے: ﴿يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾: اللہ اس کو ایسی جگہ سے روزی پہنچاتے ہیں جہاں گمان بھی نہیں جاتا (الطلاق ۳)

ایک معاملہ شرعاً ناجائز ہے، اس میں سودوسو ڈالر کا فائدہ ہے، مگر ایک آدمی وہ معاملہ ناجائز ہونے کی وجہ سے نہیں کرتا، نقصان برداشت کر لیتا ہے، پس اللہ تعالیٰ معلوم نہیں کہاں سے اس کا عوض دیدیں گے، اسے گمان بھی نہیں ہوگا، ایسی جگہ سے وہ مل جائے گا۔

سحری کا وقت قیمتی وقت ہے:

چھٹی اور آخری صفت ہے: سحری کے وقت اٹھ کر اللہ کے سامنے گڑگڑانا، اور معافی مانگنا کہ خدایا میرے گناہ معاف فرما! یہ قبولیتِ دعا کا وقت ہے، سحری کا وقت تہجد کا وقت ہے، آج کل ماہِ مبارک میں ہر کوئی اٹھتا ہے، کیونکہ سحری سنت ہے، سحری کرنے کی فضیلتیں آئی ہیں، مگر اٹھنے کے بعد سارا وقت کھانے پینے کی نذر ہو جاتا ہے، دو رکعات نفلیں پڑھنے کی

ہمیں توفیق نہیں ہوتی، کیوں نہیں ہوتی؟ ہم چاہتے ہی نہیں، چاہیں گے تو توفیق ملے گی۔

میرے بھائیو! یہ بہت قیمتی وقت ہے، اور رمضان میں تو مفت میں یہ وقت ہاتھ آجاتا ہے، لہٰذا جو شخص سحری میں اٹھے وہ دو یا زیادہ نفلیں پڑھے، اور نفلیں پڑھنے کے بعد خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں کرے۔ ہماری زندگی کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ پس تمام گناہوں سے اللہ سے معافی مانگے۔

گناہوں کی معافی کے لئے تین شرطیں:

مگر گناہوں کی معافی کے لئے تین شرطیں ہیں، اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں گی تو توبہ ہے، ورنہ زبانی جمع خرچ ہے:

پہلی شرط: جو گناہ ہو گیا ہے اس پر پشیمانی ہو۔

دوسری شرط: عہد کرے کہ آئندہ وہ یہ گناہ نہیں کرے گا۔

تیسری شرط: پھر اللہ سے قول سے یا فعل سے معافی مانگے، زبان سے معافی طلب کرنا تو ظاہر ہے، اور فعل (طرزِ عمل) سے معافی مانگنا یہ ہے کہ زندگی کا ورق پلٹ دے، بری زندگی چھوڑ کر اچھی زندگی اختیار کر لے، یہی اصل توبہ ہے، زندگی کا رخ پھیرے بغیر محض زبان سے توبہ تلّا کرنا بے معنی ہے۔

بھائیو! اپنی زندگیوں کا جائزہ لو، اپنی زندگیوں میں جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، عبادتوں میں جو کمیاں ہوئی ہوں، معاملات میں جو کمیاں ہوئی ہیں، اخلاق میں، کاروبار میں، لباس میں، چہرے کی تراش خراش میں جو خلاف شرع کام کئے ہیں، ان پر انفعال کے آنسو بہاؤ اور آئندہ ان معاملات کو سنوارو، اور ان غلط باتوں سے دور رہنے کا عہد و پیمان کرو، اور اللہ سے معافی مانگو، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اللہ کی بارگاہ مایوسی کی بارگاہ نہیں، ان کے دروازے پر جو دستک دیتا ہے تو وہ کھل جاتا ہے، ان کی چوکھٹ پر جو جا پڑتا ہے اس کو وہ دھتکارتے نہیں۔

ایں درگہ مادرگہ نو امیدی نیست ❁ اگر صد بار توبہ شکشتی باز آ!

اگر ہزار مرتبہ بھی توبہ توڑی ہے پلٹ آ! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ ناامیدی کی بارگاہ نہیں!

خلاصہ: فرمایا: دنیا کی یہ دل خوش کرنے والی چیزیں جن پر تم ریجھتے ہو، جن پر تم رال

ٹپکاتے ہو، جن کے پیچھے تم رات دن پڑے ہوئے ہو، اور جن کے پیچھے تم اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہے ہو: ان سے بہتر بہشتِ بریں کی نعمتیں ہیں، وہ سدا بہار ہیں، وہاں پاکیزہ حوریں ملیں گی اور ان سے بھی بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ مگر یہ چیزیں ان مؤمنین کو ملیں گی جو اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں، جہنم سے رستگاری کی دعائیں کرتے ہیں، صبر شعار، راست باز، فرمانبردار، مال خرچ کرنے والے اور آخر شب میں اٹھ کر گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔ آخرت کی یہ نعمتیں صرف دنیا میں پھنسے رہنے والوں کے لئے نہیں ہیں، بلکہ ان بندوں کے لئے ہیں جو دنیا میں رہ کر آخرت کی تیاری کرتے ہیں۔ پھر دنیا کی یہ چیزیں دنیا کی چیزیں نہیں رہتیں، آخرت کی چیزیں بن جاتی ہیں۔

میرے بھائیو! اسے خوب سمجھ لو! اللہ جل شانہ وعم نوالہ نے ہمیں اس دنیا میں جو نعمتیں دی ہیں، وہ اپنی آخرت کو آباد کرنے کے لئے دی ہیں۔ اللہ ہمیں اس مضمون کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں، اور ہمارا مطمح نظر دنیا کو نہ بنائیں، بلکہ اس دنیا کے ذریعہ آخرت کو آباد کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین) وآخر دعوانا أن الحمد لله العالمين.

۱۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیکیوں کا پورا اجر آخرت میں ملے گا

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ﴾

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے، اور انھوں نے نیک کام کئے، ان کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی موقوف ہونے والا نہیں [حٰم السجدة ۸]

ایمان کے بغیر نیک کام کی آخرت میں کوئی قیمت نہیں

بزرگو اور بھائیو! یہ حٰمٓ السجدة کی آیت ہے، اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ﴾ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے۔ ایمان کے بغیر نیک کام کی آخرت میں کوئی قیمت نہیں، حدیث میں ہے: ایمان کے بغیر نیک کام کرنے والوں کو ان کی نیکی کا اجر دنیا میں کھلا دیا جاتا ہے، آخرت میں ان کے نیک کام کی کوئی قدر و قیمت نہیں، وہاں ایمان کے ساتھ کی ہوئی نیکی کی قدر و قیمت ہے۔

قرآنِ کریم میں غیر مسلموں کے نیک کاموں کی کئی تمثیلیں آئی ہیں، ان میں سے ایک تمثیل ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً﴾: وہ لوگ جنھوں نے اللہ کا اور اس کے رسول کا انکار کیا: ان کے (نیک) اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے لق ودق میدان میں چمکتی ریت۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، مگر آدمی اس کو پانی سمجھتا ہے اور خوش خوش وہاں پہنچتا ہے ﴿حَتّٰى إِذَا جَاءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا﴾ یہاں تک کہ

جب وہ وہاں پہنچتا ہے تو وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ کفار جنھوں نے نیک اعمال کر رکھے ہیں اور ان سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں اُن کو ان اعمال کی مرنے کے بعد ضرورت پیش آئے گی، مگر جب وہ امید لے کر قیامت میں آئیں گے ﴿لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا﴾ تو وہاں کچھ بھی نہیں پائیں گے ﴿وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهُ فَوَفّٰهُ حِسَابَهُ﴾ اور وہ اس سراب کے پاس اللہ پاک کو پائیں گے، پس اللہ پاک اس کو اس کا پورا پورا حساب چکائیں گے، یعنی موت کے بعد لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

قرآنِ کریم میں ایسی متعدد مثالیں آئی ہیں، سب کا حاصل یہ ہے کہ نیک اعمال ایمان کے ساتھ ہی آخرت میں کار آمد ہیں، اگرچہ ایمان کے بغیر بھی نیک اعمال: نیک اعمال ہیں، برے نہیں ہیں، لیکن ان کا صلہ اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے کو دنیا ہی میں دیدیتے ہیں، آخرت میں اس کے لئے کچھ نہیں بچتا، البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے ان کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا بدلہ ہے، اس آیت میں دو باتیں ہیں: ایک: ان کو نیک اعمال کا بدلہ آخرت میں ملے گا، دوسری: وہ بدلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

نیکی اور برائی میں تین فرق:

انسان بشر ہے، وہ اچھے اعمال بھی کرتا ہے اور برے اعمال بھی، اور نیکی اور برائی میں تین فرق ہیں:

پہلا فرق: برائی مٹنے والا عمل ہے اور نیکی جب وجود میں آجاتی ہے تو وہ نہ مٹنے والا عمل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّآتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾: بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں، ختم کر دیتی ہیں، یہ نصیحت پذیر ہونے والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔ نصیحت یہ ہے کہ نیکیاں کرو، نیکیوں سے دانستہ یا نادانستہ کی ہوئی برائیاں مٹ جاتی ہیں، اور حدیث میں ہے کہ وضوء میں چہرہ دھوتے وقت چہرے کے گناہ نکل جاتے ہیں، ہاتھ دھوتے وقت ہاتھ کے گناہ نکل جاتے ہیں، مسح کرتے وقت سر کے گناہ نکل جاتے ہیں، اور پیر دھوتے وقت پیر کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ نماز پڑھتے ہیں تو ایک نماز سے دوسری نماز تک کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، جمعہ سے جمعہ تک کے

گناہ جمعہ کی وجہ سے معاف ہوجاتے ہیں، عرفہ کا روزہ رکھنے سے دو سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، عاشوراء کا روزہ رکھنے سے ایک سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ایسی اور بھی حدیثیں ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہ مٹنے والا عمل ہے، حتی کہ سب سے بڑا گناہ کفر وشرک بھی توبہ سے اور ایمان لانے سے مٹ جاتا ہے: **إن الإسلام يهدم ما كان قبله**: اسلام سابقہ تمام گناہوں کو ڈھا دیتا ہے۔

الغرض اگر آدمی مٹانا چاہے تو ہر برائی مٹ سکتی ہے اور برائیوں کے مٹنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بے شمار اسباب رکھے ہیں۔ اور نیکی وجود میں آنے کے بعد نہیں مٹتی، بس ایک ہی صورت میں مٹتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ، لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾: اور آپؐ کی طرف اور ان پیغمبروں کی طرف جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں: یہ وحی بھیجی جاچکی ہے کہ اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کرا کرایا سب اکارت ہوجائے گا، اور تو ٹوٹا پانے والوں میں سے ہوجائے گا (الزمر ۶۵)

دوسرا فرق: نیکی کا اجر مضاعفۃً دیا جاتا ہے، دو چند کر کے دیا جاتا ہے اور برائی کی سزا بڑھائی نہیں جاتی، جتنی برائی کی ہے اتنی ہی سزا دی جاتی ہے۔

نیکی کا اجر کتنا بڑھتا ہے؟

عام ضابطہ یہ ہے کہ ایک نیکی کا اجر دس گنا تو ملتا ہی ہے، یہ کم از کم ہے، اور زیادہ سے زیادہ سات سو گنا ملتا ہے، مگر اس میں دو استثناء ہیں: ایک روزہ مستثنیٰ ہے، دوسرا: انفاق فی سبیل اللہ مستثنیٰ ہے۔ روزہ کا بھی کم از کم تو دس گنا ہی ہے، لیکن زیادہ سات سو پر نہیں رکتا۔ کہاں تک جاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُسے ڈکلیر (ظاہر) نہیں کیا۔ حدیث میں ہے: **للصائم فرحتان: فرحة عند فطره، وفرحة عند لقاء ربه**: روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی: اس کو افطار کے وقت ہوتی ہے، اور دوسری خوشی: جب اس کی اس کے پروردگار سے ملاقات ہوگی، اور وہ اس کو روزے کا ثواب عطا فرمائیں گے تو وہ ثواب وہم وگمان سے بھی زیادہ ہوگا، اور وہ خوش خوش ہوجائے گا۔

جو فرشتے اچھائیاں اور برائیاں لکھتے ہیں وہ ادھورا رجسٹر تیار نہیں کرتے، کامل رجسٹر تیار کرتے ہیں، نیکی بھی لکھتے ہیں، اور اس کے مقابل اجر کے خانہ میں اجر بھی لکھتے ہیں، لیکن نیکی لکھنے والے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت دی ہے کہ **الصوم لی وأنا أجزیٰ به**: میرے بندے نے روزہ میرے لئے رکھا ہے اور میں ہی اس کے روزے کا ثواب دونگا، پس تم روزے کے مقابل ثواب کا جو خانہ ہے اس کو خالی چھوڑ دو، غرض فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ کس کے روزے کا کتنا ثواب ہے۔ پس ایک استثناء تو یہ ہے۔

دوسرا: انفاق فی سبیل اللہ مستثنیٰ ہے یعنی اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جو محنتیں ہوتی ہیں ان میں خرچ کرنا مستثنیٰ ہے، اس کا کم از کم ثواب دس گنا نہیں ہے بلکہ سات سو گنا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ، فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّأَةُ حَبَّةٍ﴾: اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کے ثواب کی مثال بیان کی ہے کہ گیہوں کا ایک دانہ ہے، اس کو بویا تو اس میں سے سات بالیاں نکلیں ہر بالی میں سو دانے ہیں، پس کل سات سو دانے ہوئے۔ غرض جو مال اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے خرچ کیا جاتا ہے اس کا ثواب سات سو سے شروع ہوتا ہے۔ پھر فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾: اور اللہ جس کے لئے چاہتے ہیں اجر بڑھا دیتے ہیں مگر زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا۔ اور حدیث میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میرے صحابہ نے ایک مد (ساڑھے چار سو گرام) جو جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے خرچ کئے ہیں: اگر بعد کے لوگ احد پہاڑ کے بقدر خرچ کریں تو بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ اندازہ کیجئے: صحابہ کے ایک مد کا ثواب کہاں تک پہنچے گا۔

ثواب کیسے بڑھتا ہے؟

اور ثواب بڑھنے کا بھی ایک ضابطہ ہے اور وہ یہ ہے کہ موقعہ اور محل کے تقاضے سے ثواب بڑھتا ہے۔ آپ نے یہ حدیث سنی ہوگی کہ ایک رنڈی نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا اور اس کی جان بچائی تو اللہ نے اُسے جنت دیدی، ہم بوتلیں بھر بھر کر پلائیں تو بھی یہ ثواب نہیں مل سکتا، وہ موقعہ کی بات تھی، ایک کتے کی جان جا رہی تھی اور اس کے پاس پانی

نکالنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی، اس نے کنویں میں اتر کر موزے میں پانی بھرا، اور موزے کو دانتوں میں پکڑ کر باہر نکلی اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے تھینک یو کہا: **فشکر اللہ لها**: اللہ کا تھینک یو کہنا یہ ہے کہ اللہ نے اس کو جنت عطا فرما دی، اس طرح کہ اس کی زندگی بدل گئی، وہ اللہ کی نیک بندی بن گئی اور اعمالِ صالحہ پر اس کی زندگی ختم ہوئی، اور مری اور جنت میں پہنچ گئی۔ پس یہ موقع کے اعتبار سے ثواب بڑھنا ہے۔ اسی طرح صحابہ کا ایک مد جو ثواب میں بڑھ گیا ہے: وہ موقع ہی کی بات ہے، فتح مکہ سے پہلے کیا ہوا خرچ اور فتح مکہ کے بعد کیا ہوا خرچ یکساں نہیں۔ سورۃ الحدید (آیت ۱۰) میں ہے۔ ﴿لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، أُولٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾: تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کیا اور لڑے وہ برابر نہیں، وہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور لڑے، اور یوں اللہ نے بھلائی (ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے۔

تیسرا فرق: مؤمن کو نیکی کا بدلہ آخرت میں ملتا ہے، دنیا میں نہیں ملتا، اور گناہ دنیا میں مٹتا ہے یا اس کی سزا ملتی ہے، کیونکہ اگر دنیا میں نیکی کا اجر دیدیا جائے تو مؤمن کا بڑا نقصان ہوگا، دنیا کی زندگی چند دن کے بعد ختم ہونے والی ہے، اب اگر دنیا میں نیکی کا اجر دیدیا جائے جیسے نمازوں کے بدلے میں ایک محل مل جائے تو جب وہ اسّی سال میں مر جائے گا تو محل یہیں پڑا رہ جائے گا۔ پس مؤمن کا بڑا نقصان ہوگا، اور آخرت میں اجر ملے گا تو وہ ابد تک باقی رہے گا۔

غرض: نیکی کا کچھ بھی اجر اس دنیا میں نہیں ملتا وہ آخرت میں ملے گا اور یہ مضمون سورۂ یوسف میں آیا ہے: حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں دو جگہ تبدیلی آئی ہے، دونوں جگہ قرآنِ کریم نے واقعہ روک کر عبرت ابھاری ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیل میں ڈال دیئے گئے تھے، نو سال جیل میں رہے، پھر بادشاہ نے خواب دیکھا، اس کی تعبیر حضرت یوسفؑ نے بتائی، اور تدبیر بھی بتائی، بادشاہ تعبیر سن کر بڑا عقیدت مند

ہوگیا اور حکم دیا کہ ان کو میرے پاس لاؤ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے حاضری سے انکار کردیا، اور کہا: جس مقدمہ میں مجھے جیل میں ڈالا گیا ہے، پہلے اس مقدمہ کو فائنل کرو، میرا جرم ہے یا نہیں؟ یہ واضح کرو، بادشاہ نے کورٹ سے وہ مقدمہ اپنے پاس منگوالیا، اور مقدمہ دوبارہ شروع ہوا، اور الزام لگانے والی تمام عورتوں کو بادشاہ نے طلب کیا اور پوچھا: بتاؤ معاملہ کیا ہے؟ سب نے کہا: ﴿حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ﴾: سبحان اللہ! ہم نے ان میں کوئی برائی نہیں جانی! اور خاص الزام لگانے والی عورت عزیز مصر کی بیوی نے کہا: وہ سچا ہے، جھوٹ میں نے گھڑا تھا۔ پس مقدمہ فائنل ہوگیا کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ ہیں، مصر کی عورتوں نے ان پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اب حضرت یوسفؑ بلائے گئے، حضرت تشریف لائے، اور ایک بات عجیب کہی کہ یہ جو میں نے مقدمہ چلوایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیز مصر جو میرا آقا ہے، اس نے مجھے اولاد کی طرح پالا ہے، عزت کے ساتھ گھر میں رکھا ہے، اس کا ذہن صاف ہوجائے کہ میں نے اس کے حرم میں ہاتھ نہیں ڈالا، کیونکہ لکڑی کا گھوڑا چلا نہیں کرتا، اور کاٹھ کا الّو بولا نہیں کرتا، یہ مقدمہ میں نے کچھ اپنی براءت کے لئے نہیں چلوایا کہ میں دودھ کا دھلا ہوا ہوں۔ میں اپنے نفس کو کچھ پاک نہیں سمجھتا، ہر نفس برائی کا حکم دینے والا ہے، ہاں اللہ جس کی حفاظت فرمائیں وہ گناہ سے بچ جاتا ہے۔

غرض: میں نے یہ مقدمہ اپنے آقا کا ذہن صاف کرنے کے لئے چلوایا ہے، اپنے آپ کو دودھ کا دھلا ہوا ثابت کرنے کے لئے نہیں چلوایا۔

پھر جب بادشاہ سے براہ راست گفتگو ہوئی تو وہ اور عقیدت مند ہوگیا اور اس نے کہا کہ آپ نے جو تعبیر بتائی ہے اس پر عمل درآمد مشکل ہے۔ حضرت نے فرمایا: یہ کام میں کرسکتا ہوں، پورے ملک کی پیداوار میرے کنٹرول میں دیدو، میں سب انتظام کرلوں گا۔ چنانچہ بادشاہ نے ملک کی تمام پیداوار آپ کے کنٹرول میں دیدی۔

یہاں قرآن نے قصہ روک کر نصیحت فرمائی ہے کہ دیکھو! ابھی ایک قیدی کال کوٹھری میں سالوں سے سڑ رہا تھا، اب وہ ملک مصر کی ساری پیداوار کا مالک ہوگیا ہے، اور پورا ملک اس کا گھر بن گیا ہے کہ جہاں چاہے رہے! ﴿وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْأَرْضِ

يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ﴾

پھر ایک سوال کا جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نیک کام کرنے والے بندے کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں نہیں کرتے جیسا اللہ نے یوسفؑ کے ساتھ کیا؟ جواب یہ دیا ہے کہ یہ یوسفؑ کے ساتھ خاص معاملہ تھا، ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر نیک بندے کے ساتھ ایسا معاملہ کریں کیونکہ نیکی کا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا ﴿نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَاءُ﴾: ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت سے ہمکنار کرتے ہیں ﴿وَلَا نُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور نیکوکاروں کا اجر ہم ضائع نہیں کرتے۔ یعنی جن کو دنیا میں اجر نہیں دیا جاتا ان کا اجر ضائع نہیں ہوتا، ان کو آخرت میں اجر ملتا ہے۔ ﴿وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾: اور جو لوگ ایمان لائے اور پرہیزگار بنے ان کے لئے اس دنیا میں اجر دینے سے بہتر آخرت میں اجر دینا ہے۔ کیونکہ دنیا کا اجر ختم ہونے والا ہے اور آخرت کا اجر ہمیشہ رہنے والا ہے۔ بہرحال ان آیات میں یہ بتایا کہ نیکیوں کا اجر دنیا میں نہیں دیا جاتا، البتہ کسی کو دیگ کے چند چاول چکھائے جاتے ہیں، اور وہ بھی اللہ کی مصلحت ہوتی ہے، تب!

صحابہ میں حضورؐ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے ہیں تو ان کی ملکیت میں صرف ایک چادر تھی، اسی میں کفن دیا گیا اور وہ چادر اتنی چھوٹی تھی کہ سر کی طرف کھینچتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے، اور پیر کی طرف کھینچتے تھے تو سر کھل جاتا تھا، حضورؐ نے فرمایا: سر ڈھانک دو اور پیر پر گھاس ڈال دو۔

ایک تو یہ صحابی ہیں، اور ایک دوسرے صحابی ہیں حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ، جب ان کا انتقال ہوا تو ترکے کا ایک بڑا حصہ وصیت میں جانے کے بعد اتنا سونا بچا تھا کہ چار بیویوں میں سے ایک بیوی کو (جس کو آٹھویں حصہ کا چوتھائی ملتا ہے) اتنا ملا تھا کہ بخاری میں ہم اس کا فیگر پڑھتے پڑھتے تھک جاتے ہیں، یہ بھی صحابی ہیں اور وہ بھی صحابی ہیں، مگر ایک صحابی کے ساتھ اللہ کا برتاؤ وہ ہے اور دوسرے صحابی کے ساتھ اللہ کا معاملہ یہ ہے، یہ اللہ کی شان ہے، اور اس میں مصلحت ہوتی ہے جس کوئی نہیں جان سکتا!

نبیوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت ایوب علیہم السلام کو دیکھو، بے حساب دولت اللہ نے ان کو دی تھی، اور کیسے دی تھی؟ بخاری میں قصہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ایوبؑ گھر کے صحن میں بارش میں نہا رہے تھے۔ اچانک سونے کی ٹڈیاں برسنے لگیں، حضرت ایوبؑ فوراً ٹوکرے میں ٹڈیاں بھرنے لگے، اللہ کے یہاں سے وحی آئی کہ ایوب ہم نے تو تمہیں بے حساب دولت دے رکھی ہے، پھر بھی تم دولت کے اتنے حریص ہو۔ حضرت ایوبؑ نے بہت اچھا جواب دیا: عرض کیا: پروردگار! آپ کی طرف سے جو چیز آئے اس سے میں کیسے صبر کر سکتا ہوں!

ایک طرف یہ انبیاء ہیں، دوسری طرف ہمارے آقا ہیں، دو دو مہینے گھر میں پکانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا، نہ آٹا نہ گوشت، بس کھجوروں اور بکریوں کے دودھ پر گذارہ ہوتا تھا!

اور حدیثوں میں یہ واقعہ بھی آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اللہ کا ایک فرشتہ آیا، اس نے اللہ کا سلام پہنچایا اور کہا: اللہ پاک آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ آپ عبد رسول بننا چاہتے ہیں یا ملک رسول؟ غلام رسول بننا چاہتے ہیں یا بادشاہ رسول؟ حضورؐ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کی طرف دیکھا، حضرت جبرئیلؑ نے اشارہ کیا کہ اپنے آپ کو چھوٹا کرو، چنانچہ حضورؐ نے اللہ کی بارگاہ میں جواب بھیجا کہ میں عبد رسول بننا چاہتا ہوں، ایک دن کھانا ملے تا کہ اللہ کا شکر بجالاؤں اور ایک دن فاقہ رہے تا کہ صبر کروں اور ثواب پاؤں۔ تو اللہ کا اُن نبیوں کے ساتھ یہ معاملہ تھا اور اپنے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ، یہ اللہ کی حکمتیں ہیں وہ جانیں ہم کون حکمتوں میں دخل دینے والے ہیں۔

تو فرمایا: ﴿نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ﴾ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچاتے ہیں۔ بہر حال تیسرا فرق یہ ہے کہ نیکی کا بدلہ آخرت میں ملتا ہے دنیا میں نہیں ملتا اور گناہ دنیا میں مٹتا ہے یا اس کی سزا مل جاتی ہے۔

اور سزا کا یہ سلسلہ اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے، اللہ کے جو بہت خاص بندے ہیں ان کا حساب اسی زندگی میں نمٹا دیا جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ جس بندے کے ساتھ اللہ کو

خیر منظور ہوتی ہے اس کو زندگی کے آخر میں الاؤں بلاؤں میں مبتلا کیا جاتا ہے اور صبر کی توفیق دی جاتی ہے، پھر جب وہ الاؤں بلاؤں کے ذریعہ تمام گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح قبض کرتے ہیں، غرض خاص بندوں کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ ہے کہ دنیا ہی میں قصہ نمٹ جاتا ہے۔

پھر اگر برائیاں بچ جائیں تو قبر میں عذاب ہوتا ہے، وہاں گناہ دھل جاتے ہیں، وہاں بھی اگر برائیاں بچ جائیں تو میدانِ محشر میں عذاب ہوتا ہے اور وہاں قصہ ختم ہو جاتا ہے اور اگر کسی بدنصیب کے گناہ اب بھی بچ جائیں تو اس کو سزا پانے کے لئے جہنم میں جانا ہوگا۔ پھر ایمان کی برکت سے جہنم سے نکل کر جنت میں آئے گا۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک حدیث لکھی ہے، وہ حدیث اب تک مجھے نہیں ملی مگر ہوگی کہیں، ان کی نظر ہماری نظر سے بہت وسیع تھی۔ حدیث یہ لکھی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کا اکثر عذاب قبر میں نمٹا دیا جاتا ہے۔

عذابِ قبر کا تذکرہ قرآن کریم میں:

یہاں کچھ بھائی کہتے ہیں کہ عذابِ قبر کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں نہیں تو کیا آسمان ٹوٹ پڑا؟ کیا ہر بات کا قرآن میں ہونا ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو پھر حدیثوں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ وہ فرقہ ہے جو خود کو اہل قرآن کہتا ہے، مگر حقیقت میں وہ اہل قرآن نہیں، منکر حدیث ہے۔

غرض: عذابِ قبر کا تذکرہ قرآن میں دکھانے کا ان کا مطالبہ صحیح نہیں، مگر ہم بتا دیتے ہیں۔ آج تراویح میں وہ آیات پڑھی گئی ہیں جن میں عذابِ قبر کا بیان اتنا صاف اور دوٹوک ہے کہ اس سے زیادہ واضح آیت نہیں ہو سکتی۔ جب فرعون اور اس کی قوم سمندر میں غرقاب ہو گئی تو ڈوبتے ہی نہایت سخت عذاب نے ان کو گھیر لیا ﴿فَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ﴾ وہ عذاب کیا ہے؟ ﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا﴾ وہ عذاب دوزخ کی آگ ہے جس کے پاس فرعونیوں کو صبح وشام لے جایا جاتا ہے اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تمہارا انجام ہے۔ ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ﴾ اور جس دن قیامت برپا ہوگی ﴿اَدْخِلُوْٓا

آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ فرشتوں سے کہا جائے گا: فرعونیوں کو سخت عذاب میں ڈالو۔

صبح وشام ان کو جہنم کی زیارت کرائی جاتی ہے، آگ پر لیجایا جاتا ہے، یہی عذاب قبر ہے۔

مگر قبر میں صرف عذاب ہی نہیں ہوتا، راحتیں بھی پہنچتی ہیں، یاد کرو وہ حدیث کہ جب مؤمن بندہ تینوں سوالوں کے جواب دیدیتا ہے تو جنت کی طرف کھڑکی کھول دی جاتی ہے، اُدھر سے ہوائیں آنی شروع ہوتی ہیں، قبر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے اور فرشتہ کہتا ہے: دلہن کی طرح سوجا، دلہن جو پہلی رات میں سوتی ہے تو وہ سوتی نہیں، کسی کا انتظار کرتی ہے، شوہر کے انتظار میں سوتی ہے جو اس کی محبوب ترین شخصیت ہے، وہی اب کمرے میں آئے گا، اور وہی اس کو جگائے گا۔ پس فرشتے کہتے ہیں: دلہن کی طرح سوجا، اب تجھے تیری محبوب ترین شخصیت اللہ پاک ہی جگائیں گے، پس پورا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کے لئے قبر میں راحتیں ہیں اور بدکاروں کے لئے عذاب ہے۔

الغرض: دنیا میں مؤمن کی سزا اگر نمٹ گئی تو آخرت میں کوئی سزا نہیں، اور اگر نہیں نمٹی تو قبر میں سزا ہے، وہاں نمٹ گئی تو قیامت کے دن کوئی سزا نہیں اور اگر وہاں بھی نہیں نمٹی تو قیامت کے بڑے دن میں سزا ہوگی، وہاں نمٹ گئی تو پھر آگے دوزخ میں نہیں جانا، اور پچاس ہزار سال کے دن میں بھی سزائیں نہیں نمٹیں تو اگر اللہ نے نہ بخشا اور سفارش کرنے والوں کی سفارش بھی اس کے حق میں قبول نہ ہوئی تو اسے باقی سزا پانے کے لئے جہنم میں جانا ہوگا۔

بہرحال میں مضمون یہ سمجھا رہا تھا کہ ہر مسئلہ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں، اسی لئے تو حدیثیں حجت ہیں کہ جو باتیں قرآن میں نہیں ہیں وہ حدیثوں میں ہیں، اور عذابِ قبر کے سلسلے میں حدیثیں اتنی ہیں کہ تواتر معنوی تک پہنچی ہوئی ہیں، مگر جن کو یہ حدیثیں ماننی ہی نہیں وہ مرغ کی ایک ٹانگ ہی گاتے رہیں گے! چونکہ آج تراویح میں عذابِ قبر سے متعلق یہ آیتیں پڑھی گئی تھیں اس لئے میں نے سوچا کہ آپ حضرات کی توجہ اس کی طرف منعطف کروں تاکہ آپ کا ذہن صاف رہے۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

مسائل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) بے روزگاری کے وظیفہ کا حکم:

سوال: حکومت کی طرف سے بے روزگاروں کو جو وظیفہ ملتا ہے: اس کا لینا کیسا ہے؟

جواب: بے روزگاری کا وظیفہ (ویلفیر) لینے کی دو صورتیں ہیں:

ایک: مستحق کا لینا یعنی واقعی بے روزگار ہے تو لے سکتا ہے، اور وہ اس رقم کو ہر مصرف میں خرچ کرسکتا ہے۔

دوسری: غیر مستحق کا لینا، یعنی جو برسر روزگار ہے، ویلفیر کا مستحق نہیں، مگر اپنا ذریعہ معاش چھپا کر اور جھوٹ بول کر وظیفہ لیتا ہے تو یہ حکومت کے خزانے پر ایک طرح سے ڈاکہ ڈالنا ہے، اور اس کا حکم واضح ہے۔

(۲) حکومت بوڑھوں کو جو وظیفہ دیتی ہے: اس کا لینا جائز ہے:

سوال: یہاں (برطانیہ میں) ساٹھ سال کے بعد حکومت بوڑھوں کو وظیفہ دیتی ہے تو کیا اس رقم کو حج یا عمرہ میں استعمال کرسکتے ہیں؟ اور مسجد کے چندہ میں دے سکتے ہیں؟

جواب: حج بھی کرسکتے ہیں، عمرہ بھی کرسکتے ہیں اور مسجد کے چندے میں بھی دے سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ یہ ایک قانون ہے کہ جو ساٹھ سال کا ہوجائے اسے وظیفہ دیا جائے، پس اس قانون سے جو وظیفہ ملتا ہے: اسے لے کر استعمال کرسکتے ہیں۔

اور اگر کسی کے ذہن میں شبہ ہو کہ حکومت کا مال: معلوم نہیں کن ذرائع سے حاصل ہوتا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہوا ہو! ایسا مال ہمارے پاس آتا ہے، اس لئے اس کو حج یا عمرہ میں یا مسجد میں دینا کیسے مناسب ہوگا؟

اگر یہ شبہ ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ملکیت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے، مثلاً ٹیکس کی

رقم گورنمنٹ نے لوگوں پر ظلم کر کے لی، یا جرمانہ کر کے لی تو گورنمنٹ مالک ہوگئی، پھر وہ بوڑھے کو دیتی ہے تو ملکیت بدل گئی، اور ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

دلیل: حدیث شریف میں ہے: حضور اکرم ﷺ گھر میں تشریف لائے اور کچھ کھانے کو مانگا، چنانچہ روٹی اور سرکہ پیش کیا گیا، آپؐ نے فرمایا: گوشت پکنے کی خوشبو آرہی ہے، کیا ہمارا اس میں حصہ نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ گوشت کسی نے بریرہؓ کو صدقہ دیا ہے (حضرت بریرہؓ ایک باندی تھیں ان کو حضرتِ عائشہؓ نے خرید کر آزاد کیا تھا، وہ آزاد ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہتی تھیں اور ان سے پڑھتی تھیں، ان کو کسی نے خیرات دی تھی، وہ گوشت پک رہا تھا، اور حضورؐ کے لئے صدقہ حلال نہیں تھا) آپ نے فرمایا: **لها صدقة، ولنا هدية**: بریرہ کے لئے وہ گوشت صدقہ ہے، اور جب بریرہ ہمیں دیں گی تو وہ ہمارے لئے ہدیہ ہوگا یعنی اب ہمارے لئے اس کا استعمال جائز ہوگا۔

یہاں سے مسئلہ سمجھ میں آیا کہ ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

دوسری مثال: زکوٰۃ دینے والے نے غریب کو زکوٰۃ دی، جب تک وہ رقم زکوٰۃ دینے والے کے پاس تھی: زکوٰۃ تھی، پھر جب وہ غریب کو دیدی اور وہ اس کی ملکیت میں چلی گئی تو وہ زکوٰۃ نہیں رہی، ملکیت بدل گئی، اب وہ غریب کسی مالدار کی دعوت کرسکتا ہے، اور کسی مالدار کو ہدیہ بھی دے سکتا ہے۔

لیکن اگر کوئی چوری کر کے مال لایا، اور اس نے کسی کو ہدیہ دیا یا دعوت کی درانحالیکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چوری کا مال ہے تو وہ ہدیہ لینا اور دعوت کھانا جائز نہیں، حرام ہے، کیونکہ آدمی چوری کے پیسے کا مالک نہیں ہوتا، پس اگر وہ دعوت کرتا ہے یا کسی کو ہدیہ دیتا ہے تو جائز نہیں۔

البتہ اگر چوری کا مال یا سود کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا دیا، اور اس طرح ملا دیا کہ کوئی امتیاز باقی نہ رہا تو دیکھا جائے گا کہ غالب مال کونسا ہے؟ حلال یا حرام؟ اگر غالب مال حلال ہے تو دعوت یا ہدیہ لینا جائز ہے، ورنہ جائز نہیں۔

اسی لئے کہتے ہیں: سود کی رقم غریب کو ثواب کی نیت کے بغیر دینا ضروری ہے، کیوں؟ اس لئے کہ سود کی رقم لینے والے کا مال کہاں ہے؟ کسی کی اپنی رقم ہو، اور وہ کسی غریب کو دے

اور ثواب کی نیت کرے تو ایک بات بھی ہے، مگر بینک سے جو سود ملتا ہے، لینے والا اس کا مالک نہیں ہوتا، جب مالک ہی نہیں ہوتا تو ثواب کی نیت کیسے درست ہوسکتی ہے؟

غرض میں بات یہ سمجھا رہا تھا کہ حضرت بریرہؓ کی حدیث سے یہ ضابطہ نکلا کہ ملکیت بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں اور میں نے یہ بھی سمجھایا کہ چوری کے مال میں اور سود کے مال میں ملکیت نہیں بدلتی، اس لئے اس کے احکام علاحدہ ہیں، جہاں ملکیت بدلتی ہے جیسے زکوٰۃ، صدقہ میں تو وہاں احکام بدلتے ہیں۔ پس گورنمنٹ کا جو فنڈ ہے وہ اگرچہ مختلف طرح سے اکٹھا ہوتا ہے: جائز جگہوں سے بھی مال آتا ہے اور ناجائز جگہوں سے بھی، مگر پہلے گورنمنٹ اس کی مالک بنتی ہے، استیلاء سے حکومت مالک ہوجاتی ہے، پھر وہ بوڑھوں کو وظیفہ دیتی ہے، اس لئے اس کا لینا جائز ہے، اور ہر مصرف میں اس کو خرچ کرسکتے ہیں، حج بھی کرسکتے ہیں، عمرہ بھی کرسکتے ہیں اور مسجد کے چندے میں دے سکتے ہیں۔

(۳) غریب کے پاس جب تک مال بعینہٖ موجود ہو زکوٰۃ کی نیت کی جاسکتی ہے

سوال: ایک شخص بیمار ہے، ایک ماہ پہلے اس کا فون آیا، اور اس نے مدد طلب کی، وہ رشتہ دار ہے، یہاں سے کسی نے اس کو کچھ رقم بھیج دی، جب رقم بھیجی اس وقت کچھ نیت نہیں تھی، جس طرح رشتے داروں کا تعاون کرتے ہیں: اس طرح رقم بھیجی تھی، اب رمضان آیا، اس نے اپنا زکوٰۃ کا حساب کیا، اب وہ یہ چاہتا ہے کہ پہلے جو رقم بھیجی ہے اُسے زکوٰۃ میں گن لے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: زکوٰۃ کی نیت تین موقعوں پر ہوسکتی ہے:

ایک: جب حساب کیا، اور معلوم ہوگیا کہ ایک ہزار روپے زکوٰۃ واجب ہے۔ اس نے ہزار روپے نکال کر کسی ڈبے میں رکھ دیئے تو یہ نیت ہوگئی، اب وہ اس میں سے کسی کو پچیس روپے، کسی کو پچاس روپے دیتا رہا تو زکوٰۃ ادا ہوگئی، کیونکہ اس نے ڈبے میں جب رقم علاحدہ کی تھی اس وقت نیت کرلی تھی، اب خرچ کے موقع پر نیت ضروری نہیں۔

دوسرا موقعہ: کسی نے حساب کیا، اس کے ذمہ ایک ہزار روپے زکوٰۃ واجب نکلی، مگر اس نے رقم علاحدہ نہیں کی، پھر کسی کو پچاس روپے دیئے، اور دیتے وقت نیت کی، اور ڈائری میں

لکھ لیا کہ فلاں تاریخ کو پچاس روپے دیئے، اسی طرح پھر پندرہ دن کے بعد کسی غریب کو سو روپئے دیئے تو زکوٰۃ کی نیت کی اور لکھ لئے تو یہ صورت بھی صحیح ہے، اس کو کہتے ہیں: زکوٰۃ کی ادائیگی کے ساتھ نیت۔

تیسرا موقعہ: رقم علاحدہ بھی نہیں کی اور جب دی اس وقت بھی نیت نہیں کی، مگر غریب کے پاس ابھی دی ہوئی رقم بعینہٖ موجود ہے، خرچ نہیں ہوئی تو جب تک وہ رقم بعینہٖ غریب کے پاس موجود ہے: نیت کرسکتا ہے۔ البتہ اگر رقم اس کے پاس سے ہلاک ہوگئی یا خرچ ہوگئی تو اب زکات کی نیت نہیں کی جاسکتی۔

بہر حال یہ تین مواقع ہیں نیت کرنے کے۔ اور صورتِ مسئولہ میں بظاہر وہ بھیجی ہوئی رقم بعینہٖ موجود نہیں ہوگی، کیونکہ یہ پرانا قصہ ہے، اس لئے اب زکات کی نیت نہیں ہوسکتی۔

اضافہ: درمختار میں ہے: **وشرطُ صِحَّةِ أَدَائِها: نيةٌ مقارنة له أى للأداء، ولو كانت المقارنة حكما، كما لو دفع بلانية، ثم نوى، والمالُ قائم فى يد الفقير:** زکات کی ادائیگی کی صحت کے لئے شرط: اداء کے ساتھ نیت کا مقارن ہونا ہے، اگرچہ مقارنت حکمی ہو، جیسے بغیر نیت کے دیا، پھر نیت کی درانحالیکہ مال غریب کے پاس (بعینہٖ) موجود ہے (تو یہ مقارنت حکمی ہے اس لئے زکات اداء ہوجائے گی)

(۴) سونے چاندی کے دانتوں کے ساتھ نماز درست ہے:

سوال: اگر دانت سونے کے ہوں تو نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟

جواب: ہوسکتی ہے۔ دانت خواہ سونے کا ہو، چاندی کا ہو، لوہے کا ہو، پیتل کا ہو، کانسے کا ہو، کسی بھی دھات کا ہو نماز درست ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور یہ ایسا ہے: جیسے جیب میں سونے، چاندی یا لوہے وغیرہ کا کوئی ٹکڑا رکھ لیا جائے تو نماز درست ہے۔

اور اگر شبہ اس لئے ہے کہ سونے کا استعمال مرد کے لئے جائز نہیں، تو جاننا چاہئے کہ ضرورت کے وقت دانت میں سونے کا استعمال جائز ہے۔ حدیث میں ہے: ایک صحابی کی ایک جنگ میں ناک کٹ گئی تھی، انھوں نے چاندی کی ناک بنوائی، مگر اس میں بدبو ہوجاتی تھی۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ان کو سونے کی ناک بنوانے کی اجازت دی، اس پر دانت کو

قیاس کیا گیا ہے، کیونکہ چاندی کا دانت کالا پڑجاتا ہے، اس لئے دانت پر سونے کا خول چڑھانا جائز ہے۔

(۵) حرام گوشت کا پیسہ بھی حرام ہے:

سوال: کسی کا اپنا ریسٹورنٹ ہو، اس میں گوشت حرام ہو، مرغی اور گائے کا، تو کیا اس کا پیسہ بھی حرام ہے؟

جواب: یقیناً حرام ہے! جب حرام بیچے گا تو اس سے جو پیسہ آئے گا وہ بھی حرام ہوگا۔ وہ پیسے کیسے حلال ہوسکتے ہیں؟

اور یہ مسئلہ کہ اگر حلال آمدنی بھی ہو تو غالب کا اعتبار ہے: یہ مسئلہ ہوٹل والے کے لئے نہیں ہے، بلکہ وہ اگر کسی کی دعوت کرے یا ہدیہ چندہ دے تو اس دعوت کھانے والے کے لئے اور ہدیہ لینے والے کے لئے ہے کہ وہ ہدیہ قبول کرے یا نہ کرے؟ چندہ لے یا نہ لے؟ مگر ہوٹل والے کے لئے تو ایک پیسہ بھی حرام ہے، کیونکہ مٹکا بھرا ہوا دودھ ہو اس میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈال دیا جائے تو سارا دودھ ناپاک ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر آدمی کی آمدنی میں ایک ڈالر بھی حرام کا آجائے گا تو ساری آمدنی گندی ہوجائے گی۔

(۶) ایسی ہوٹل میں ملازمت کرنا جہاں حرام چیزیں بیچی جاتی ہیں:

سوال: کوئی ایسی ریسٹورنٹ میں مزدوری کرتا ہو جہاں حرام چیزیں (غیر مذبوحہ گوشت یا شراب) بیچی جاتی ہوں تو اس کا کیا حکم ہے؟ تنخواہ جائز ہے یا نہیں؟ اور ایسی ہوٹل میں ملازمت کرنی چاہئے یا نہیں؟

جواب: تنخواہ خبث (گندگی) کے ساتھ جائز ہے، مگر ایسی جگہ نوکری نہیں کرنی چاہئے، دوسری متبادل نوکری تلاش کرنی چاہئے: جب مل جائے تو یہ نوکری چھوڑ دے، جیسے کوئی بینک میں ملازم ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے، کیونکہ بینک کی ملازمت جائز نہیں، وہاں سودی کاروبار ہوتا ہے، اور سود کے معاملہ میں جو کسی طرح کا بھی عمل دخل رکھتا ہے اس پر لعنت آئی ہے۔ لیکن اگر کوئی ملازمت کرتا ہے تو وہاں سے جو تنخواہ ملتی ہے وہ جائز ہے، کیونکہ بینک کے پاس

صرف سود ہی نہیں ہوتا، اور بھی ذرائع آمدنی ہوتے ہیں۔ بینک ڈرافٹ بناتا ہے اور فیس لیتا ہے جو جائز ہے، ایسے اور بھی کام ہیں، مگر بینک کا بڑا کاروبار سود پر رقمیں دینا ہے، اس لئے اس کی آمدنی میں سود بھی شامل ہوتا ہے اور ملازم کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ مجموعہ سے ملتی ہے، اس لئے تنخواہ جائز ہے، مگر اس میں خبث (گندگی) ہے، جیسے کھڑکی پر پیلا گلاس ہو تو سورج کی جو دھوپ آئے گی وہ پیلی آئے گی، اسی طرح بینک کی جو رقم تنخواہ میں ملے گی وہ خبث لے کر آئے گی، اسی طرح جس ہوٹل میں حرام چیزیں بیچی جاتی ہیں: اس کا بھی یہی معاملہ ہے۔

اور بینک کی ملازمت کے بارے میں مفتیانِ کرام نے یہ فتوی دیا ہے کہ فوراً وہ ملازمت نہ چھوڑے، دوسری متبادل ملازمت تلاش کرے، جب دوسری ملازمت مل جائے تو بینک کی ملازمت چھوڑ دے، اسی طرح اس ہوٹل کی ملازمت سے کنارہ کش ہو جائے، مگر پہلے دوسری ملازمت تلاش کرلے، پھر اس ملازمت کو چھوڑ دے۔

(۷) کوٹ پتلون کے ساتھ مسجد میں نماز کے لئے آنا:

سوال: ان ملکوں میں لوگ عام طور پر کوٹ پتلون پہنتے ہیں، یہاں کا عام لباس یہی ہے، پس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے آنے کا کیا حکم ہے؟ کیا اس لباس میں نماز پڑھنے میں کوئی کراہیت تو نہیں؟

جواب: لوگ کام پر جانے کے لئے الگ کپڑے رکھتے ہیں، کوٹ، پتلون اور ٹائی باندھ کر جاتے ہیں، میں اس کو منع نہیں کرتا کہ یہ ایک مجبوری ہے، مگر لوگ جب مسجد میں آتے ہیں تو بھی یہی کپڑے پہن کر آتے ہیں: یہ ٹھیک نہیں، مسجد (اللہ کے گھر) میں اسلامی لباس پہن کر آنا چاہئے، اگر اس لباس میں ڈیوٹی پر نماز پڑھ لی تو کوئی حرج نہیں، مگر جب آپ کام سے فارغ ہو گئے، اور اپنے گھر آ گئے تو اب لباس بدل دینا چاہئے، پھر جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہو تو اسلامی لباس پہن کر آنا چاہئے۔

اور یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جیسے آفس میں جانے کے لئے یونیفارم ہے، اللہ کے دربار میں آنے کے لئے بھی ایک یونیفارم ہے، اور وہ اسلامی لباس ہے، کیونکہ انگریزی لباس کھڑے ہوئے ہونے کی حالت میں تو اچھا لگتا ہے، لیکن جب آدمی سجدے میں جاتا ہے تو

آدھا ننگا ہو جاتا ہے، اس لئے ایسا لباس پہن کر اللہ کے گھر میں نہیں آنا چاہئے۔

(۸) روزے میں بھول معاف ہے: نماز میں کیوں معاف نہیں؟

سوال: روزے میں بھول کر کوئی کھا پی لے تو روزہ نہیں ٹوٹتا، مگر نماز ٹوٹ جاتی ہے، فرق کیوں ہے؟

جواب: فرق اس لئے ہے کہ روزے کے سلسلہ میں حدیث ہے، اور نماز کے سلسلہ میں کوئی حدیث نہیں، اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ٹوٹ جائیں، مگر حدیث کی وجہ سے روزہ استحساناً نہیں ٹوٹتا۔ اور وہ یہ حدیث ہے: عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: إذا نَسِيَ أحدُكم، فأكل أو شَرِبَ، فليُتِمَّ صومَه، فإنما أَطْعَمَهُ الله وَسَقَاه: (متفق علیہ یعنی بخاری ومسلم کی حدیث ہے) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص بھول کر کھا پی لے تو وہ اپنا روزہ پورا کرے یعنی بھول کر کھانے پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اس کو اللہ ہی نے کھلایا پلایا ہے، یعنی وہ بے اختیار بھول گیا ہے، اور ایسی صورت میں کوئی مواخذہ نہیں۔

مگر بھول کب ہوتی ہے؟ جب روزہ لگا ہوا نہ ہو، بھوک پیاس لگی ہوئی نہ ہو، اور جب گرمیوں میں دوپہر کے بعد روزہ لگتا ہے تو بھول نہیں ہوتی۔ ہاں دو آدمیوں کو ہوتی ہے:

ایک: رمضان کے شروع میں بھول ہو جاتی ہے، پھر جب عادت ہو جاتی ہے تو بھول نہیں ہوتی۔

دوسرا: نفل روزے میں بھول ہو جاتی ہے۔ جو لوگ اللہ کے فضل سے نفل روزے رکھتے ہیں وہ کبھی بھول جاتے ہیں، کسی دوست کے یہاں گئے، چائی آئی، سب کے ساتھ اس نے بھی پی ڈالی، اور روزہ یاد نہیں رہا۔

لوگ نفل روزے کم کیوں رکھتے ہیں؟

مگر اب لوگوں نے نفل روزوں کی چھٹی کر دی ہے، بیڑی، سگریٹ، پان، گٹکا، چائے وغیرہ لغویات کی جو عادت ہمیں پڑ گئی ہے یہ نفل روزے نہیں رکھنے دیتی۔ یہ عادتیں سر پر

ایسی سوار رہتی ہیں کہ گیارہ مہینے گذر جاتے ہیں اور ہم کوئی نفل روزہ نہیں رکھتے، ورنہ سردیوں میں تو روزہ غنیمت باردہ ہے، نہ لگے بھوک نہ لگے پیاس اور ثواب ملے چوکھا! اور ٹھنڈی غنیمت وہ ہے جو لڑے بھڑے بغیر حاصل ہو۔ مگر ہائے رے بری عادتیں! وہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں!

نماز میں لاعلمی اور بھول معاف نہیں:

بہرحال: بھول کر کھا پی لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، بلکہ روزہ مکروہ بھی نہیں ہوتا، اور نماز میں بھول ہوجائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے، اگر بھول کر یا مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے کوئی کام نماز کے منافی کرلیا تو نماز فاسد ہوجائے گی۔ حدیث میں ہے: حضرت معاویہ بن الحکم السُّلمی جو نومسلم تھے جماعت میں آکر کھڑے ہوئے، نماز میں کسی نے چھینک لی تو انھوں نے کہا: یرحمك الله یعنی اللہ آپ پر مہربانی کرے۔ لوگوں نے انہیں گھورا، وہ پھر بولے: مجھے کیوں گھورتے ہو! لوگوں نے ران پر ہاتھ مارے، عربوں کے یہاں یہ اشارہ ہے کہ خاموش رہو، جیسے ہم لوگ منہ پر انگلی رکھتے ہیں، جب نماز پوری ہوئی تو نبی ﷺ نے ان کو بلایا، وہ فرماتے ہیں: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! آپؐ نے نہ مجھے ڈانٹا، نہ جھڑکا، بلکہ فرمایا: إن هذه الصلاةَ: لَايَصْلُحُ فيها شيئ من كلام الناس: نماز میں لوگوں کے کلام کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں، یعنی جان بوجھ کر بات ہو، بھول کر ہو، تھوڑی ہو یا زیادہ: اس سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، پس دیگر منافی نماز چیزوں کو 'کلام' پر قیاس کیا جائے گا، ان سے بھی نماز فاسد ہوجائے گی مگر روزہ بھول کر کھانے پینے سے فاسد نہیں ہوگا۔

نماز اور روزے میں عقلی فرق:

اور عقلاً فرق یہ ہے کہ آدمی جب نماز پڑھتا ہے تو ایک خاص حالت میں ہوجاتا ہے، اس حالت میں بھول نہیں ہوتی، اور روزہ میں ایسی کوئی حالت نہیں ہوتی جو روزہ یاد دلائے، اس لئے روزہ میں بھول ہوجاتی ہے، اور اگر آپ کہیں کہ رمضان میں تو بھول نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ رمضان میں عادت پڑجاتی ہے، اس لئے بھول نہیں ہوتی، مگر رمضان کے

بھی شروع میں اور نفل روزوں میں بھول ہوجاتی ہے، اس لئے شریعت نے بھول کو معاف کیا ہے اور نماز میں چونکہ ایسی حالت ہوتی ہے جو نماز کو یاد دلاتی ہے اس لئے نماز میں کلام کی گنجائش نہیں رکھی، کچھ بھی کلام کرے گا تو نماز فاسد ہوجائے گی۔

(۹) وضوء کے تین ضروری مسئلے:

عن لَقِيْطِ بْنِ صَبِرَةَ رضی الله عنه قال: يارسولَ اللّٰهِ! أخبرنی عن الوضوءِ؟ قَال: أَسْبِغِ الوضوءَ، وَخَلِّلْ بين الأصابع، وبالِغْ فی الاِسْتِنْشَاقِ، إلا أن تكون صائماً.

ترجمہ: حضرت لقیطؓ نے وضوء کے بارے میں پوچھا یعنی وضوء کا طریقہ پوچھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

۱- وضوء کامل کرو، وضوء کامل کرنے کے لئے دھونے کے اعضاء کو تین مرتبہ دھونا سنت کیا ہے، تاکہ ایک مرتبہ دھونا جو فرض ہے: کامل ہوجائے اور مسح میں چوتھائی سر کا مسح فرض ہے، مگر پورے سر کا مسح سنت کیا ہے، تاکہ ڈھنگ سے چوتھائی سر کا مسح ہوجائے۔

۲- اور انگلیوں کے درمیان خلال کرو، ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان بھی اور پیروں کی انگلیوں کے درمیان بھی۔ اور یہ حکم ان ملکوں میں جہاں پانی بہت کم ہے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے یہاں (برطانیہ میں) پانی بہت ہے، لیکن مفت نہیں ہے، پانی کے پیسے دینے پڑتے ہیں، پھر پانی کو گرم کرنے کے بھی پیسے دینے پڑتے ہیں۔

مگر میں دیکھتا ہوں: ایک آدمی وضوء میں پانچ آدمیوں کے بقدر پانی استعمال کرتا ہے، نل کھلا ہے، بیٹھا ہوا باتیں کررہا ہے یا مسواک کررہا ہے، اور پانی برابر جارہا ہے، مسواک سے فارغ ہونے تک ایک بالٹی پانی گرجاتا ہے، مگر اسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ نل بند کرے، حالانکہ پانی جو آتا ہے اس کے پیسے دینے پڑتے ہیں، پھر اس کو گرم کرنے کے الگ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔

اسی طرح مسجد میں بتیاں کھلی ہیں، جو پیشاب کرنے جاتا ہے: بتی کھلی چھوڑ کر آجاتا ہے، پوری رات بتیاں جلتی رہتی ہیں، جبکہ چاہئے یہ تھا کہ جب آدمی بیت الخلاء جائے تو بٹن

کھولے اور اپنی ضرورت پوری کر کے نکلے تو بتی بند کر دے، بجلی مفت نہیں آتی، اس کے پیسے دینے پڑتے ہیں، اور آپ ہی دیتے ہیں، آپ کے چندے سے پیسے جاتے ہیں۔

میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا مصیبت ہے کہ یہاں کوئی بتی بند ہی نہیں کرتا! مسجد کا خادم بھی نہیں کرتا تو اس آدمی نے مجھے وجہ بتائی، اور وہ میری سمجھ میں آئی، اس نے کہا: بات در اصل یہ ہے کہ ہم لوگ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور اس کی بجلی کرایے میں شامل ہوتی ہے، اس لئے وہاں سے بری عادت پڑگئی ہے کہ جلنے دو ہمارا کیا بگڑتا ہے! یہ بات میری سمجھ میں آئی، جب بری عادت پڑ جاتی ہے تو وہ سب جگہ چلتی ہے۔ اس لئے میرے بھائیو! اپنے کرایے کے مکان میں جو چاہو کرو، مگر مسجد میں مسجد کے مال کی حفاظت کرو۔

غرض: جہاں پانی زیادہ ہے اگر وہاں خلال کا اہتمام نہ کیا جائے تو بھی انگلیوں کے درمیان خشک رہنے کا احتمال کم رہتا ہے، مگر جن ملکوں میں پانی بہت کم ہے وہاں ذرا سے پانی سے وضوء کیا جاتا ہے، پس اگر وہاں انگلیوں کے بیچ میں دوسری انگلی ڈال کر رگڑ کر بھگائیں گے نہیں تو خشک رہنے کا احتمال رہے گا۔

۳- اور ناک اچھی طرح صاف کرو، جب ناک میں پانی ڈالو تو اس کو سانس کے ذریعہ اوپر چڑھاؤ، پھر ناک جھاڑو۔ مضمضہ اور استنشاق کا مقصد یہ ہے کہ منہ اور ناک صاف ہو جائیں، مسواک کر کے منہ اچھی طرح دھوؤ، تاکہ منہ کی بدبو زائل ہو جائے، پھر ناک کی آلائش صاف کرو، تاکہ اس کا تعفن ختم ہو جائے۔ پھر اللہ کی بارگاہ میں کھڑے ہوؤ۔

البتہ اگر کوئی روزے سے ہو تو پانی چڑھانے میں مبالغہ نہ کرے، پہلے سانس روک لے، پھر ناک میں پانی ڈالے، اگر سانس جاری ہوگا اور پانی چڑھائے گا تو پانی اوپر چلا جائے گا، اس لئے نبی ﷺ نے فرمایا: اگر روزہ ہو تو پانی ناک میں احتیاط سے چڑھاؤ کیونکہ پانی اگر دماغ میں چڑھ گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اسی طرح کبھی روزے کی حالت میں آدمی ندی کنویں میں اترتا ہے پھر ڈبکی لگاتا ہے، پس جو عادی ہے وہ تو عادی ہے وہ ناک نہیں بھی پکڑے گا: تو بھی پانی دماغ میں نہیں چڑھے

گا، لیکن اناڑی ایسا کرے گا: تو ممکن ہے پانی دماغ میں چڑھ جائے، اور پانی دماغ میں چڑھ گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔

(۱۰) اگر علاج کے لئے بڑی رقم کی ضرورت ہو تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں؟

سوال: ایک شخص کا پڑوسی کھاتا پیتا آدمی ہے، لیکن اس کے لڑکے کا گردہ فیل ہو گیا ہے، اس لئے فوری گردہ بدلنے کی ضرورت ہے، مگر اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ وہ گردہ خرید سکے، پس کیا اُسے زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہے؟

جواب: مالدار ہونے کی حالت میں زکوٰۃ کی رقم دینا جائز نہیں، اگر اس حالت میں دی جائے گی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، اور جس پر قربانی، صدقۂ فطر واجب ہے یعنی چھوٹے نصاب کا مالک ہے: وہ مالدار ہے، اُسے زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ اگر وہ مقروض ہو جائے تو پھر دے سکتے ہیں۔ پس وہ کہیں سے قرض لے کر گردہ خرید لے، اور وہ مقروض ہو جائے تو اب زکوٰۃ کی رقم اس کو دے سکتے ہیں۔

(۱۱) قضاء عمری پہلے پڑھے یا سنتیں نفلیں؟

سوال: ایک آدمی کی زندگی میں بہت سی نمازیں قضا ہوئی ہیں تو ایسے شخص کو نفلیں اور سنتیں پڑھنی چاہئیں یا قضاء عمری پڑھنی چاہئے؟

جواب: ایسے آدمی کو پہلے قضاء عمری پڑھنی چاہئے! پھر جب قضاء عمری سے فارغ ہو جائے تو نفلیں، سنتیں پڑھے، کیونکہ فرض: فرض ہے۔ جو پچھلی نمازیں چھٹی ہیں ان کی قضا ضروری ہے۔ اور نفل: نفل ہے، اس کا مقام و مرتبہ بعد میں ہے، اس لئے اس شخص کو پہلے اپنی چھٹی ہوئی نمازوں کی تلافی کرنی چاہئے۔ سنتوں کی جگہ، نفلوں کی جگہ، تحیۃ الوضوء کی جگہ اور تحیۃ المسجد کی جگہ قضائے عمری پڑھے، پھر جب وہ اپنے اندازے کے مطابق فرض نمازیں قضا کر چکے تو دوسری نفلیں پڑھے۔

۱

سورۂ فاتحہ کی تفسیر

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○ إِهْدِنَاالصِرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ○ غَيْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَاالضَّالِّيْن ○﴾ آمین

بزرگو اور بھائیو! یہ سورت قرآن کریم کی سب سے پہلی سورت ہے، یہ سورت قرآن کریم کا دیباچہ ہے، پورے قرآن کی تمہید ہے، اسی لئے اس سورت کو کسی پارے میں شامل نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم کی پاروں میں تقسیم

قرآن کریم کے تیس پارے حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے، پارہ: فارسی لفظ ہے اس کے معنی ہیں: ٹکڑا، حصہ، یہ جو تیس پارے یعنی تیس ٹکڑے قرآن کریم کے کئے گئے ہیں یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھے، بعد میں کئے گئے ہیں، قرآن کریم میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھیں، جیسے حوض سے باہر عین (ع) لکھا ہوا ہے یہ عین رکوع کا عین ہے، پھر ایک ہندسہ اس کے اوپر ہے، ایک اس کے پیٹ میں، اور ایک اس کے نیچے، اوپر والا ہندسہ سورت کا سیریل نمبر ہے، پیٹ والا رکوع کی آیتوں کی تعداد بتاتا ہے، اور نیچے والا پارے کا سیریل نمبر ہے، اسی طرح کہیں وقفِ لازم لکھا ہے، کہیں وقفِ غفران، اور آیتوں کے درمیان باریک قلم سے رموز اوقاف لکھے ہیں یہ سب کچھ حضور ﷺ کے زمانہ میں نہیں تھا، گول دائرے والی آیت تھی مگر جو اس میں عدد لکھا ہوا ہے وہ نہیں تھا۔

غرض یہ جو تیس پارے بنائے گئے ہیں یہ بعد میں بنائے گئے ہیں، جب یہ پارے

بنائے گئے تو سورۂ فاتحہ کو کسی پارے میں نہیں لیا، پہلا پارہ الم سے شروع ہوتا ہے، کیونکہ اگر سورۂ فاتحہ کو پہلے پارہ میں لیں گے تو وہ پہلے پارہ کا دیباچہ بن جائے گا، باقی انتیس پاروں سے اس کا تعلق ختم ہو جائے گا، جبکہ یہ سورت پورے قرآن کا دیباچہ ہے۔

سورۂ فاتحہ کے مضامین کی ہمہ گیری

جب یہ سورت پورے قرآن کا دیباچہ، نچوڑ اور خلاصہ ہے تو اس میں کتنے مضامین ہونگے اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ امام رازیؒ ایک بڑے عالم گزرے ہیں ان کی تفسیر: تفسیر کبیر ہے، انہوں نے اپنی تفسیر کے شروع میں لکھا ہے کہ میں نے ایک مجلس میں کہا کہ سورۂ فاتحہ میں دس ہزار مسائل ہیں، اس پر بعض حاسدوں نے کہا کہ سورۂ فاتحہ میں دس ہزار الفاظ نہیں، دس ہزار مسائل کیسے ہونگے؟ جب امام رازی رحمہ اللہ کو یہ بات پہنچی تو انہوں نے تفسیر کبیر لکھی اور صرف تعوذ ﴿أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ سے دس ہزار سے زیادہ مسائل مستنبط کئے۔ اور یہ دس ہزار مسائل بھی ایک شخص کی سمجھ میں آئے ہیں، جب ساری امت کے علماء مل کر بیٹھیں گے اور ہر ایک اپنے اپنے علم کے مطابق مسائل نکالے گا تو معلوم نہیں کتنے مسائل نکلیں گے، اس لئے میرے بھائیو! یہ سورت ام الکتاب ہے، قرآن کریم کی ماں ہے، اس لئے یہ بحر ناپیدا کنار ہے، ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں، اس لئے اس سورت کے سارے مضامین بیان نہیں کئے جاسکتے، چند موٹی موٹی باتیں بیان کرتا ہوں۔

سورۂ فاتحہ کی اہمیت

سب سے پہلی بات اس سورت کی اہمیت ہے، ایک حدیث قدسی میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: میں نے سورۂ فاتحہ کو اپنے اور بندوں کے درمیان تقسیم کیا ہے، سورۂ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں، ساڑھے تین آیتیں اللہ سے تعلق رکھتی ہیں اور ساڑھے تین آیتیں بندوں سے، جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کے پالنہار ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: حمدني عبدي: میرے بندے

نے میری تعریف کی، پھر جب بندہ کہتا ہے ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اللہ بے حد مہربان نہایت رحم والے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: أثنى عليَّ عبدي: میرے بندے نے میری ستائش کی، پھر جب بندہ کہتا ہے: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ وہ جزاء کے دن کے مالک ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: مجّدني عبدي: میرے بندے نے میری بزرگی (بڑائی) بیان کی، غرض ہر آیت پر اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں۔

چنانچہ جب نبی پاک ﷺ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے تو ہر آیت پر ٹھہرتے تھے، اب لوگ دو تین سانسوں میں پوری سورۂ فاتحہ پڑھ ڈالتے ہیں یہ ٹھیک نہیں، یہ لوگ گویا اللہ کو جواب دینے کا موقع نہیں دیتے، پس یہ حضور ﷺ کی سنت نہیں، کبھی جلدی ہو تو کوئی بات نہیں، باقی اگر جلدی نہ ہو تو تنہا پڑھے یا جماعت سے، ہر آیت پر ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ کا جواب دل کے کان سے سنے۔

پھر جب بندہ کہتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ ہم آپ ہی کی بندگی کرتے ہیں، اس ٹکڑے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ اور ہم آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں، اس کا تعلق بندے سے ہے، بندہ اللہ سے مدد مانگتا ہے تو اللہ کی طرف سے جواب آتا ہے: هذا بيني وبين عبدي: یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، یعنی دونوں سے تعلق رکھتی ہے، آدھی آیت کا تعلق اللہ سے ہے اور آدھی آیت کا تعلق بندے سے: ولعبدي ما سأل: اور میرے بندے نے جو کچھ مانگا ہے میں ضرور اس کو دوں گا یعنی اپنے بندے کی ضرور مدد کروں گا، پھر بندہ کہتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ ہمیں سیدھا راستہ دکھا! جو راستہ اللہ تک پہنچتا ہے، جنت تک پہنچتا ہے وہی سیدھا راستہ ہے، اس میں اینچ پینچ نہیں جو سیدھا راستہ ہے وہ ہمیں دکھا، ابھی جواب نہیں آتا، تین آیتوں کے بعد جواب آئے گا۔

اور سیدھا راستہ جو اللہ تک اور جنت تک پہنچنے والا ہے وہ ہمیں نظر نہیں آتا، یہ معنوی چیز ہے، اس لئے اس کو مثبت پہلو سے مشخص کیا جا رہا ہے ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ہمیں وہ راستہ دکھا جس پر آپ کے وہ بندے چلتے رہے ہیں جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، پھر منفی پہلو سے سیدھے راستہ کو مشخص کیا ہے، فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا

الضَّالِّيْنَ﴾ خدایا! ہمیں دو شخصوں کے راستہ سے بچا، ایک: جن پر آپ کا غضب بھڑکا، دوسرے: وہ جو گمراہ ہوئے، سیدھے راستہ کو انہوں نے گم کر دیا، ان کے راستہ سے بھی ہمیں بچا! تینوں آیتیں مل کر ایک مضمون مکمل ہوا، اب اللہ کی طرف سے جواب آتا ہے: هذا لعبدي ولعبدي ما سأل: یہ میرے بندے کی دعا ہے اور میں اپنے بندے کی دعا پوری کروں گا، میں اس کو وہ راستہ دکھاؤں گا جو میرے منعم علیهم بندوں کا راستہ ہے اور اس کو اس راستہ سے بچاؤں گا جو گمراہوں کا راستہ ہے۔

یہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ ہے، اس کی شروع کی تین آیتوں میں اللہ کی تعریف اور حمد وثنا ہے اور آخری تین آیتوں میں بندوں کی دعا ہے اور بیچ کی آیت آدھی اللہ سے تعلق رکھتی ہے اور آدھی بندوں سے۔

اور حدیث میں ہے: سلوا الله: اللہ سے مانگو، اگر تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور ہدایت بڑی چیز ہے جو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں دے سکتا، سرورِ کونین ﷺ بھی یہ چیز نہیں دے سکتے، قرآن کریم میں ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ﴾ آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے، ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ﴾ اللہ جس کو چاہتے ہیں منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔

اس دنیا میں بہت سے بھیڑئے انسان کی شکل میں ہوتے ہیں، وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں، ان کی باتیں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں، مگر وہ حقیقت میں ہدایت کا راستہ نہیں، اس لئے ہر شخص کو سمجھ کر چلنا ہے، اندھا دھند نہیں چلنا، دین کے معاملہ میں اندھا پن مضر ہے، قرآن وحدیث دو روشنیاں ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر چلنا ہے، اور دنیا میں جو نظریئے پائے جاتے ہیں ان کو قرآن وحدیث سے ملانا ہے، جو راستے منعم علیهم کے ہیں ان کو اپنانا ہے اور گمراہوں کے راستہ سے بچنا ہے، یہ سورۂ فاتحہ کا خلاصہ ہے اب تھوڑی تفصیل کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں: پہلی صفت: ربوبیت

سورۂ فاتحہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی تین صفتیں بیان کی گئی ہیں، جن کا انسان کے ساتھ

خاص تعلق ہے، پہلی صفت کا دنیا کے ساتھ تعلق ہے اور تیسری کا آخرت کے ساتھ اور دوسری کا دونوں جہانوں کے ساتھ۔

پہلی صفت: ربوبیت ہے۔فرمایا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کے 'رب' ہیں، پوری کائنات کے پالنہار ہیں، انسان کے بھی پروردگار ہیں۔

رب کے معنی

رب: اس ہستی کو کہتے ہیں جس میں تین باتیں جمع ہوں:

۱- جو کسی چیز کو وجود بخشے، نیست سے ہست کرے، نہ تھنگ سے تھنگ بنائے، ایسی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، وہی ذرے ذرے کو وجود بخشتے ہیں، اور کوئی نہیں ہے جو کسی چیز کو موجود کر سکے۔

۲- مخلوق کے وجود پزیر ہونے کے بعد اس کی بقاء کا سامان کرے، اگر بقاء کا سامان نہیں کیا جائے گا تو چیز موجود ہوتے ہی ختم ہو جائے گی، منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں رہ سکے گی، اور یہ کام بھی صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، وہی ہر مخلوق کو پیدا کر کے اس کی بقاء کا سامان کرتے ہیں، آپ غور نہیں کرتے جانور کا بچہ دانت لے کر آتا ہے اور پیدا ہوتے ہی گھاس چگنے لگتا ہے، اور انسان کا بچہ ناتواں پیدا ہوتا ہے، چنانچہ اس کی بقاء کے لئے تین سامان کئے:

انسان کی بقاء کے لئے تین سامان

(الف) بچہ کے پیدا ہونے کے بعد ماں کی چھاتی میں دودھ کی دو نہریں جاری کر دیں، مگر ایک دو دن کے بعد دودھ اترتا ہے، اتنے میں بچہ کا پیٹ صاف ہو جاتا ہے، تمام آلائش جو بچہ کے پیٹ میں تھی نکل جاتی ہے، اب دودھ اترتا ہے، اور چینی اس میں ملی ہوئی ہوتی ہے، اور لوفیٹ (کم دُہنیت) کا دودھ ہوتا ہے، اور لڑکے کا حصہ لڑکی سے دوگنا ہوتا ہے یعنی اس کے دودھ میں دُہنیت زیادہ ہوتی ہے، اور لڑکی کے دودھ میں کم، اور بچہ دانت لے کر نہیں

آتا، کیونکہ ابھی اس کا معدہ سخت چیز کو ہضم نہیں کر سکتا، جب معدہ کسی قابل ہو جاتا ہے تو دانت نکلنے شروع ہوتے ہیں۔

(ب) اللہ تعالیٰ بچے کو دنیا میں چوسنا اور نگلنا سکھا کر بھیجتے ہیں، اگر بچہ یہ دو چیزیں نہ جانتا تو ماں کی چھاتی سے کیسے استفادہ کرتا؟ چوسنا بچہ کی فطرت میں ایسا رکھ دیا کہ جو بھی چیز منہ میں دی جاتی ہے اسے چوستا ہے، اور جو بھی چیز منہ میں ڈالی جائے نگل جاتا ہے، یہ بچہ کے بقاء کا سامان کیا، غور کرو! اگر اللہ تعالیٰ بچے کو یہ دو باتیں نہ سکھاتے تو کون سی درسگاہ تھی جو اس کو یہ باتیں سکھاتی؟ کوئی نہیں سکھا سکتا تھا پھر بچہ زندہ کیسے رہتا؟

(ج) اللہ تعالیٰ نے بچہ کو انٹرنیشنل زبان سکھا کر پیدا کیا، جس کے ذریعہ وہ دل کی بات کہتا ہے، اور وہ زبان 'رونا' ہے، دنیا کے سب بچے ایک طرح روتے ہیں، عربوں کا بچہ عربی میں، انگریزوں کا بچہ انگریزی میں، اور اردو والوں کا بچہ اردو میں نہیں روتا، سب بچے ایک ہی طرح روتے ہیں، یہی ان کی انٹرنیشنل زبان ہے، چنانچہ بچہ دنیا میں قدم رکھتے ہی چلّاتا ہے، اس طرح وہ اپنے زندہ ہونے کا اعلان کرتا ہے، پھر بھوک لگے گرمی لگے یا سردی لگے بچہ روتا ہے اور ماں اس کی حاجت سمجھ جاتی ہے، پیٹ میں درد ہوتا ہے تو بچہ بے تحاشہ روتا ہے، گھر والے بے چین ہو جاتے ہیں، آخری چارہ ڈاکٹر ہوتا ہے، وہ بچہ کے پیٹ کو دباتا ہے تو وہ اور روتا ہے، ڈاکٹر سمجھ جاتا ہے کہ اس کے پیٹ میں تکلیف ہے، وہ دوا دیتا ہے اور بچہ رونا بند کر دیتا ہے، غرض بچہ ہر بات رونے کے ذریعہ ڈکلیر کرتا ہے، سوچو! اگر اللہ تعالیٰ بچہ کو رونا نہ سکھاتے تو کوئی طاقت تھی جو بچہ کی دل کی بات سمجھا دیتی۔

علاوہ ازیں: ماں باپ کے دلوں میں بچے کی الفت رکھ دی، وہ اس کو دو سال تک اٹھائے پھرتے ہیں، اور جانور کا بچہ پیدا ہوتے ہی اپنے پیروں سے چلنے لگتا ہے، غرض یہ ایک مثال ہے، اسی طرح ہر مخلوق کو وجود بخشنے کے بعد اس کی بقاء کا سامان کیا جو ایک ضروری چیز ہے۔

۳- اور رب ہونے کے لئے تیسری چیز یہ ضروری ہے کہ ہر مخلوق کو تدریجی طور پر آہستہ آہستہ ترقی دے کر آخری منزل تک پہنچایا جائے، چنانچہ آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں پیدا

کیا، کن فیکونی طاقت سے دفعۃً پیدا نہیں کیا، کیونکہ ربوبیت کے لئے تدریج ضروری ہے، پھر ہر مخلوق کا ایک آخری پوائنٹ ہے اس آخری حد پر جا کر اس مخلوق کی ترقی رک جاتی ہے، مرچی کا پودہ اپنے لیول پر پہنچ کر رک جاتا ہے، آم کی امرود کی بلکہ ہر نبات کی ایک آخری حد ہے اس پر پہنچ کر اس کو رک جانا ہے، پھر ہر سال پتے جھڑتے ہیں، نئی کونپلیں نکلتی ہیں مگر درخت اس حد پر رکا رہتا ہے، یہی حال تمام حیوانات کا ہے، بلکہ تمام جمادات کا ہے، وہ آہستہ آہستہ بڑھ کر اپنی آخری حد پر رک جاتے ہیں، یہ بات ربوبیت میں شامل ہے، اور اللہ تعالیٰ سارے جہانوں کے رب ہیں، پس ہر تعریف انہی کے لئے ہے (۱)

رحمتِ عامہ اور خاصہ

دوسری صفت رحمتِ عامہ وخاصہ ہے، فرمایا: ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بے حد مہربان نہایت رحم والا! یہ دو صفتیں ایک ساتھ ہیں، ہماری درمیانی زندگی کے اعتبار سے ہیں، ہماری زندگی کی ابتداء کے اعتبار سے اللہ کی صفت ربوبیت کام کرتی ہے اور ہماری زندگی کی نہایت سے ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کا تعلق ہے اور ہماری زندگی کے درمیانی مرحلہ سے یہ دو صفتیں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہیں، پس ہمیں بھی دنیا کی زندگی میں دوسروں پر مہربانی کرنی چاہئے تا کہ اللہ تعالیٰ ہم پر مہربانی فرمائیں، حدیث میں ہے: الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ: جو لوگوں پر مہربانی کرنے والے ہیں ان پر نہایت مہربان مہربانی فرماتے ہیں، پھر فرمایا: اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ: مہربانی کرو ان مخلوقات پر جو زمین میں ہیں، مہربانی کرے گا تم پر وہ اللہ جو آسمانوں میں ہے۔

(۱) جب میں نے یہ تقریر مرتب کی تو والد محترم سے پوچھا: آپ نے رب کے جو معنی بیان کئے ہیں اس کا کوئی حوالہ ہے؟ فرمایا: یہ معنی امام راغبؒ نے مفردات میں بیان کئے ہیں، میں نے مفردات دیکھی تو اس میں یہ عبارت ہے: هو إنشاء الشيئ حالا فحالا إلى حد التمام: اس عبارت کا یہی مفہوم ہے جو والد محترم نے پھیلایا ہے، اور لغات القرآن لفظ ربّ میں بھی اس کی تفصیل ہے، ۱۲ محمد سعید پالن پوری۔

اللہ کی بعض صفات خاص ہیں اور بعض عام

اللہ کی صفتیں دو طرح کی ہیں، ایک: وہ جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں، دوسری وہ جو ہمارے اندر بھی ہو سکتی ہیں مگر درجے الگ الگ ہوں گے، اللہ میں اللہ کے درجہ کی صفت ہوگی اور ہمارے اندر ہمارے درجہ کی۔

پھر اللہ کی جو صفتیں مخلوق میں بھی ہو سکتی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں، ایک: وہ جو خود بخود پیدا ہوتی ہیں جیسے اللہ سمیع (سننے والے) ہیں تو ہم بھی سمیع ہیں، اللہ بصیر (دیکھنے والے) ہیں تو ہم بھی بصیر ہیں، یہ صفات ہمارے اندر خود بخود پیدا ہوتی ہیں ہم نے اپنے اختیار سے ان کو پیدا نہیں کیا، مگر اللہ کا سننا اللہ کا سننا ہے اور ہمارا سننا ہمارا سننا ہے، اللہ کا دیکھنا اللہ کا دیکھنا ہے اور ہمارا دیکھنا ہمارا دیکھنا ہے، مخلوق اور خالق کی صفات کے درمیان نام کے علاوہ کوئی اشتراک نہیں ہوتا۔

دوسری قسم: وہ صفات ہیں جو اختیاری ہیں یعنی اگر ہم کوشش کریں تو ہمارے اندر وہ صفات پیدا ہونگی ورنہ نہیں، جیسے اللہ کی صفت عدل ہے، اللہ انصاف کرنے والے ہیں، پس ہم اگر کوشش کریں گے، اپنے آپ کو انصاف کا خوگر بنائیں گے تو ہمارے اندر بھی یہ صفت پیدا ہوگی ورنہ نہیں، اللہ رحمان ورحیم ہیں، رحمان عام ہے رحیم خاص ہے، رحمان کے معنی میں زیادتی ہے اس لئے کہ اس میں حروف زیادہ ہیں، پس رحمان کا تعلق دنیا سے ہے، اس دنیا میں ہر کسی کو مومن کو بھی اور کافر کو بھی رحمت سے حصہ ملتا ہے، کوئی محروم نہیں رہتا، اور رحیم کا تعلق آخرت سے ہے، آخرت میں مؤمنین پر ہی مہربانی ہوگی، وہی جنت میں جائیں گے، پس اللہ تعالیٰ کی دو مہربانیاں ہیں، ایک عام اور ایک خاص، اگر ہم کوشش کریں تو ہم بھی یہ دو مہربانیاں اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں، خاص مہربانی مسلمانوں کی حد تک ہوتی ہے اور عام مہربانی تمام مخلوقات کے ساتھ ہوتی ہے، اس میں مسلم غیر مسلم حیوانات چرند وپرند سب داخل ہیں، قرآن کریم میں صحابہ کی شان میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾: صحابہ غیر مسلموں کے سامنے تیز ہیں اور آپس میں نرم، یہ جو فرق ہے کہ

ایک کے سامنے تیز ہیں اور دوسرے کے سامنے نرم، یہ وہی خاص مہربانی ہے اور وہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ، ایسی خاص مہربانیاں ہر ایک میں ہوتی ہیں ، ماں باپ کی اولاد پر خاص مہربانی ہوتی ہے، اور رشتہ داروں اور محلّہ والوں کے ساتھ عام مہربانی ہوتی ہے، استاذ کی اپنے طالب علموں کے ساتھ خاص مہربانی ہوتی ہے، یہ مہربانی دوسرے طالب علموں کے ساتھ یا دوسرے انسانوں کے ساتھ نہیں ہوتی ، ایسی ہی مسلمانوں کی مسلمانوں کے ساتھ ایک خاص مہربانی ہونی چاہئے ، اسی مہربانی کو قرآن نے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾ سے تعبیر کیا ہے، اور ایک مہربانی ہر مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے، ایک موقع پر نبی پاک ﷺ نے فرمایا: جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرو، صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ: ہم جو جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں کیا اس میں بھی اجر وثواب ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: فی کل ذاتِ کَبِدٍ رَطْبٍ أَجْرٌ: ہر زندہ مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں اجر وثواب ہے، پس جب ہر مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اجر ہے تو غیر مسلموں کے ساتھ جبکہ وہ ضرورت مند بھی ہوں اچھا سلوک کرنے میں اجر کیوں نہیں ہوگا؟

بہر حال اللہ کی ایک مہربانی مؤمنین کے ساتھ خاص ہے، اسی کی وجہ سے آخرت میں مؤمنین کو جنت ملے گی ، کافروں کو نہیں ملے گی ، اور ایک مہربانی عام ہے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ سب پر مہربان ہیں ، پس ہمارے اندر بھی دو مہربانیاں ہونی چاہئیں ، ایک خاص مہربانی جو مسلمانوں کے ساتھ ہو اور ایک عام مہربانی جو ہر مخلوق کے ساتھ ہو۔

الغرض اللہ کی بعض صفات وہ ہیں جو انسانوں میں بھی ہوسکتی ہیں اگر چہ درجے دونوں کے الگ الگ ہونگے۔

اور کچھ صفتیں وہ ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں ، جیسے اللہ احد ہیں، تنہا ہیں ، یہ صفت اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کوئی تنہا نہیں اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے، ﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ کُلَّهَا﴾: اللہ تعالیٰ (جوڑا ہونے سے) پاک ہیں ، جنھوں نے سبھی چیزوں کو جوڑا جوڑا بنایا۔ اللہ تعالی متکبر (بڑی شان والے) ہیں ، یہ صفت بھی اللہ کے ساتھ خاص ہے، ہمیں تکبر کرنے کی یعنی بڑا بننے کی اجازت نہیں ، حدیث قدسی میں ہے: اَلْعَظَمَةُ

إِزَارِیْ، وَالْکِبْرِیَاءُ رِدَائِی فَمَنْ نَازَعَنِیْ کَبَّبْتُه فِی النَّارِ: عظمت میری لنگی ہے، اور بڑائی میرا کرتا ہے، جو یہ دو کپڑے مجھ سے چھیننا چاہے گا میں اس کو جہنم میں اوندھے منھ ڈال دوں گا ، لہٰذا بڑے مت بنو، حدیث میں ہے: من تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ: جو شخص اللہ کے لئے خاکساری اختیا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اونچا کرتے ہیں ، بلند مرتبہ عطا فرماتے ہیں ، پس انسان کو اپنے اندر تکبر نہیں ، خاکساری اور تواضع پیدا کرنی چاہئے۔

بات کا خلاصہ: یہ ہے کہ اللہ کی کچھ صفات اللہ کے ساتھ خاص ہیں ، اور کچھ صفات عام ہیں ان میں سے کچھ ہمیں خود بخود ملتی ہیں اور کچھ کوشش کر کے اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہیں ، اور اللہ کی صفتیں بے شمار ہیں ، ایک حدیث میں نبی پاک ﷺ نے اللہ کے ننانوے نام بیان کئے ہیں پھر فرمایا: مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ: جو ان کا احاطہ کرے گا جنت میں جائے گا ، احاطہ کرنا کیا ہے؟ احاطہ کرنا یہ ہے کہ پہلے ان کو یاد کرے پھر ان کا مطلب سمجھے پھر ان ناموں میں سے جو نام اللہ کے ساتھ خاص ہیں ان کو خاص رہنے دے اور جو خاص نہیں ان کو اپنے اندر پیدا کرے، یہ تین باتیں جمع ہونگی تب احاطہ کرنا پایا جائے گا۔

دین کے بنیادی عقیدے تین ہیں

دین کے دو حصے ہیں عقیدے اور اعمال ، عقیدے جڑ ہیں جن سے اعمال کی شاخیں نکلتی ہیں ، اگر جڑ اچھی ہوگی تو اس پر شاخیں اچھی نکلیں گی اور جڑ خراب ہوگی تو شاخیں خراب نکلیں گی ، اور بنیادی عقیدے تین ہیں باقی عقیدے ان میں سے نکلتے ہیں۔

اسلام کے بنیادی عقیدے: توحید، رسالت اور معاد ہیں ، مکی دور میں جو پچاسی سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں یہی تین عقیدے سمجھائے گئے ہیں:

پہلا عقیدہ: توحید ہے: لا إلٰه إلا اللّٰه: اللہ ہی معبود ہیں: ان کے علاوہ کوئی معبود نہیں ، باطل مذاہب صرف اللہ کو معبود نہیں مانتے ، اللہ کے علاوہ کو بھی معبود مانتے ہیں ، عیسائی اللہ کے علاوہ 'بیٹے' کو اور 'پاکیزہ روح' کو بھی معبود مانتے ہیں ، ہندو اللہ کے علاوہ بے حساب معبود مانتے ہیں ، یہودیوں کا ایک فرقہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتا ہے اور مسلمانوں میں

بھی ایسے لوگ ہیں جو قبروں کے سامنے سجدے کرتے ہیں، طواف کرتے ہیں اور قبر والوں سے مرادیں مانگتے ہیں یہ باتیں توحید کے منافی ہیں، یہ شرک ہے، اللہ کے علاوہ کسی کو معبود ماننا یا اس کے سامنے مراسم عبادت بجالانا شرک ہے۔

دوسرا عقیدہ: رسالت ہے رسالت کے معنی ہیں: بھیجنا، اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام انسانوں کے پاس بھیجا ہے کہ میری بندگی کرو، میرے یہ احکام ہیں ان کی پیروی کرو، یہی اللہ کا پیغام بھیجنا رسالت ہے۔

اور اللہ اپنا پیغام فرشتوں کے ذریعہ بھیجتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان سے رو در رو بات نہیں کرتے، اس کو انسان برداشت نہیں کرسکتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پہاڑ اللہ کی تجلی کو برداشت نہیں کرسکا تھا، ریزہ ریزہ ہوگیا تھا، پس انسان تو پہاڑ سے کمزور ہے وہ تجلی کیسے برداشت کرسکتا ہے، اس لئے اللہ اپنا پیغام فرشتوں کے ذریعہ بھیجتے ہیں، فرشتے انسانوں کی اصلاح کا کام کریں ایسا نہیں ہوسکتا، فرشتے اللہ کا پیغام انسانوں میں سے کسی انسان کو پہنچاتے ہیں، اللہ انسان کو رسول بناتے ہیں، رسول: اللہ کا یہ پیغام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔

پھر جب رسالت کے عقیدے کی تفصیلات سامنے آئیں تو ایک عقیدے کے چار عقیدے بن گئے، پیغام بھیجنے والے (اللہ) پر ایمان لانا، جن کے ذریعہ پیغام بھیجا گیا یعنی فرشتوں پر ایمان لانا، اور جس نے پیغام وصول کیا یعنی نبی پر ایمان لانا، اور خود پیغام کو ماننا جس نے اللہ کی کتاب کی شکل اختیار کی۔

تیسرا عقیدہ: معاد ہے، معاد کے معنی ہیں: پیچھے لوٹنا، ریوس آنا، یہ دنیا جو چل رہی ہے، اس کا آخری دن ہے، اس آخری دن میں تمام حیوانات پہلی مرتبہ صور پھونکنے پر ختم ہوجائیں گے، پھر چالیس سال کا وقفہ گزرے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک بارش برسائیں گے جس کے اثر سے تمام حیوانات کے بدن زمین سے اُگ آئیں گے، جیسے برسات میں زمین سے گھاس اُگ آتی ہے، پھر دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو تمام روحیں جو عالم برزخ میں ہیں لوٹ کر اس دنیا میں آئیں گی اور اپنے اپنے جسموں میں داخل ہوجائیں گی، یہی نشأۃ

ثانیہ ہے، دوسری مرتبہ کی پیدائش ہے، پس روحیں چونکہ عالم برزخ سے واپس آئیں گی اس لئے اس کو معاد کہتے ہیں، اور اس کو آخرت بھی کہتے ہیں، یہی تیسرا بنیادی عقیدہ ہے۔

قیامت کے دن اللہ کے علاوہ کوئی مالک نہیں ہوگا

اس دنیا میں ہم میں سے ہر شخص مالک بنا بیٹھا ہے، کہتا ہے: یہ گھر میرا ہے، یہ زمین میری ہے، یہ دوکان میری ہے، یہ سب اس دنیا کی ملکیتیں ہیں، اور یہ سب ملکیتیں مجازی ہیں، حقیقی نہیں، جب قیامت کا دن آئے گا تو کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا، آج کی سب ملکیتیں ختم ہوجائیں گی، اس دن ہر چیز کے مالک اللہ تعالیٰ ہونگے اللہ کے علاوہ کوئی کسی چیز کا مجازی مالک بھی نہیں ہوگا، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ تم جانتے ہو کہ جزاء کا دن کیسا ہے؟ ﴿ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ﴾ پھر دوبارہ سوال کیا کہ تم جانتے ہو جزاء کا دن کیسا ہے؟ ﴿يَوْمَ لَاتَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ﴾ وہ ایسا دن ہے کہ اس میں کوئی کسی کے لئے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا، ہر چیز کا اختیار اللہ کے لئے ہوگا، اور سورۂ مؤمن میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کا منظر کھینچا ہے، میدان محشر میں جہاں اولین وآخرین جمع ہونگے اللہ تعالیٰ اہل محشر سے سوال کریں گے ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ آج حکومت کس کی ہے؟ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی سانس لینے والا نہیں ہوگا، سب سناٹے میں آجائیں گے، جب کوئی جواب نہیں دیگا تو اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دیں گے ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ آج حکومت صرف اللہ کی ہے جو ایک ہیں اور غالب ہیں، ان کے علاوہ کسی کی حکومت نہیں، اللہ پاک نے سورۂ فاتحہ میں تیسری صفت یہی بیان کی ہے، ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ وہ جزاء کے دن کے مالک ہیں، اس دنیا کے اختتام پر جو پچاس ہزار سال کا دن آئے گا اس دن میں سب کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا اور جزا وسزا سے دوچار کیا جائے گا، اگر اچھے کام کئے ہیں تو اچھا بدلہ ملے گا، اور برے کام کئے ہیں تو برا بدلہ ملے گا، اور یہ بدلہ اللہ ہی دیں گے۔

سورۂ فاتحہ میں دین کے تینوں بنیادی عقیدوں کا ذکر

اسلام کے تینوں بنیادی عقیدے سورۂ فاتحہ میں ذکر کئے گئے ہیں، پہلا عقیدہ توحید اس

طور پر ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالی سارے جہانوں کے رب ہیں انہی کے لئے تمام تعریفیں اور تمام کمالات ہیں اور جب سارے کمالات انہی کے لئے ہیں تو بندگی بھی انہی کیلئے ہے، بندگی کرنا ایک عاجزی ہے اور معبود ہونا آخری درجہ کا کمال ہے، پس اگر ہم کسی اور کی بھی بندگی کریں تو جو کمال ہم نے اللہ کے لئے ثابت کیا ہے اس کو دوسرے کے لئے ثابت کر دیا، یہی شرک ہے جو توحید کی منافی ہے، پھر اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ﴿رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ ذکر کی گئی جس کی وجہ سے ہم عدم سے وجود میں آتے ہیں، پھر ایک ساتھ دو صفتیں ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ذکر کیں، پھر تیسری صفت ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ذکر کی جس کا تعلق تیسرے عقیدے سے ہے، اور دوسرا عقیدہ رسالت کا آخری تین آیتوں میں مذکور ہے۔

فرمایا: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم﴾ دکھلایئے ہمیں سیدھا راستہ، دکھلانے کے دو مطلب ہیں: إراء ۃ الطریق اور: إیصال إلی المطلوب راستہ میں آپ کو کوئی آدمی ملا، اس نے کہا: مجھے فلاں جگہ جانا ہے، آپ نے کھڑے کھڑے بتا دیا کہ آگے جا کر دائیں طرف مڑ جانا پھر چوراہا آئے گا وہاں بائیں طرف مڑ جانا، یہ إراء ۃ الطریق ہے: راستہ دکھلانا، اس میں ضروری نہیں کہ وہ شخص منزل تک پہنچ جائے، بھٹک بھی سکتا ہے، اور راستہ دکھانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے اس سے کہا: میرے پیچھے آؤ، آپ آگے جا رہے ہیں اور وہ پیچھے آ رہا ہے، ایک جگہ پہنچ کر آپ نے کہا: تمہاری منزل یہ ہے، اس میں گمراہ ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں، یہ إیصال الی المطلوب ہے۔ پہلے معنی کے اعتبار سے انبیاء بھی راستہ دکھاتے ہیں، ان کے وارثین بھی دکھاتے ہیں، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے صرف اللہ تعالی راستہ دکھاتے ہیں، وہی ایک ہستی ہے جو منزل تک پہنچاتی ہے اسی منزل تک پہنچنے کی دعا ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں مانگی گئی ہے، ہم اللہ کے فضل سے منزل تک پہنچے ہوئے ہیں، مگر منزل پر پہنچنے کے بعد آگے ایک مرحلہ اور آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم منزل پر ٹھہرے رہیں، بھٹک نہ جائیں، جب منزل تک پہنچانا اللہ کا کام ہے تو منزل پر جمانا بھی اللہ ہی کا کام ہے، اس لئے جب ہم ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کہیں گے تو اس کے دوسرے معنی بھی ہونگے کہ اے اللہ ہمیں سیدھے راستہ پر جمائے رکھ، بچلنے سے بچا۔

سیدھا راستہ کونسا ہے؟ فرمایا: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ان بندوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام فرمایا، سورۂ نساء میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَأُوْلٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِيْنَ﴾: جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ آخرت میں ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، اللہ نے چار قسم کے لوگوں پر انعام فرمایا ہے، نبیوں پر، صدیقوں پر، شہیدوں پر اور نیک لوگوں پر، یہ درجہ بدرجہ ہیں، نبیوں کا درجہ سب سے بلند ہے، پھر صدیقین کا پھر شہداء کا اور آخر میں نیک لوگوں کا درجہ ہے، انہیں کے راستہ پر ہم چلنے کی دعا مانگتے ہیں۔

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں سبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارا راستہ اللہ کے یہاں سے آیا ہے اور ہم اللہ تک پہنچیں گے، اس لئے آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ کے یہاں سے آئے ہوئے راستہ پر سب لوگ برقرار نہیں رہے، کچھ لوگ اللہ کے راستہ پر رہے اور کچھ لوگ پھسل گئے، گمراہ ہوگئے اور گمراہی میں اتنی دور نکل گئے کہ اللہ کا غصہ ان پر بھڑکا، اور کچھ راستہ سے ہٹے مگر کم ہٹے دور تک نہیں نکلے فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ﴾ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر آپ کا غصہ بھڑکا اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو راستہ سے ہٹ گئے۔

اسٹیشن پر آپ دیکھیں گے: جب ایک پٹری دوسری پٹری سے علاحدہ ہوتی ہے تو ایک انچ کے فاصلہ سے علاحدہ ہوتی ہے پھر ایک مغرب میں جاتی ہے اور ایک مشرق میں مگر شروع میں ایک انچ کے فاصلہ سے الگ ہوتی ہے، اسی طرح اللہ کے یہاں سے جو دین آیا ہے اس سے بھی لوگ جب الگ ہوتے ہیں تو ایک انچ کی فاصلہ سے الگ ہوتے ہیں، ذرا سا الگ ہوتے ہیں، بہت دنوں تک ان کو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ دوسرے راستہ پر پڑ گئے، پھر اتنا دور نکل جاتے ہیں کہ دین حق سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا، تب ان پر اللہ کا غصہ بھڑکتا ہے، اور کچھ لوگ ابھی اتنے دور نہیں چلے گئے، مگر وہ بھی صحیح راستہ سے نکل گئے، اللہ کے راستہ پر نہیں رہے، ان دونوں کا راستہ ہمیں نہیں چاہئے، ہمیں تو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا راستہ چاہئے جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے۔

اب آخر میں ایک خاص مضمون سمجھ لینا چاہئے، حدیث میں مغضوب علیہم کی تفسیر یہود

سے آئی ہے اور ضالین کی نصاری سے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت اس امت میں اس کی مثالیں نہیں تھیں، اس لئے گفتہ آید در حدیث دیگراں کے اصول کے مطابق نبی ﷺ نے یہ مثالیں دی ہیں، مگر آگے چل کر امت میں افتراق ہوا، امت کے تہتّر فرقے بنے، جن میں سے اہل حق کی ایک جماعت رہی، باقی بہتّر فرقے گمراہ قرار پائے تو اب مغضوب علیھم اور ضالین کی مثالیں اس امت میں سے تلاش کی جاسکتی ہیں، جو فرقے اختلاف میں اتنے دور نکل گئے ہیں کہ مفتیانِ کرام نے بالاتفاق ان کے دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا فتوی دیا ہے: وہ فرقے مغضوب علیھم کی مثالیں ہیں، اور جن کے کفر کا فتوی نہیں یا بالاجماع ان کو کافر قرار نہیں دیا گیا وہ ضالین کا مصداق ہیں۔

اور ہماری دعا کا حاصل یہ ہے کہ الٰہی! ہمیں گمراہ فرقوں میں شامل نہ فرما، ان کے سائے سے بھی بچا، ہمیں اہل السنۃ والجماعۃ کے راستہ پر مضبوط رکھ، اس سے ہٹنے نہ دے۔

یہی دوسرا عقیدۂ رسالت ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنے اور اپنے صحابہ کے راستہ کو فرقۂ ناجیہ کا راستہ بتلایا ہے، وہی راستہ اہل السنۃ والجماعۃ نے اپنایا ہے، بھائیو! اسی راستہ سے چپکے رہو، اِدھر اُدھر نہ بھٹکو، لوگوں کی باتوں میں مت آؤ، بہت دوست نما دشمن ہوتے ہیں، بھیڑیے انسانوں کی شکل میں ہوتے ہیں، ان کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤ، اللہ تعالی ہم سب کی حفاظت فرمائیں، اور ہمیں صراط مستقیم پر گامزن رکھیں (آمین یارب العالمین)

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

۲

سورۃ الاخلاص کی تفسیر

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿**قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ○ اللّٰهُ الصَّمَدُ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ○**﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ قرآن کریم کی وہ سورت ہے جو شاید ہی کوئی کم نصیب مسلمان ایسا ہوگا جسے یہ یاد نہ ہو، چھوٹی سی سورت ہے اور اہم اتنی ہے کہ نہایت اعلی درجہ کی صحیح حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ سورہ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے۔ اس حدیث سے آپ اس سورت کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

قرآن میں چھوٹی سورتیں تین کیوں ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تین بہت ہی چھوٹی سورتیں نازل کی ہیں جن کو ایک سانس میں بے تکلف پڑھا جاسکتا ہے، ایک: سورہ اخلاص، دوسری: سورۂ کوثر، تیسری: سورۃ العصر، سوال یہ ہے کہ تین ہی چھوٹی سورتیں کیوں اتاری گئی ہیں، دو یا چار چھوٹی سورتیں کیوں نہیں اتاریں؟ اس کی دو وجہ ہیں، ایک وجہ صرف ہنسنے کی ہے اور ایک وجہ حقیقی ہے۔

ہنسے کی وجہ تو یہ ہے کہ ہر فرض نماز کی دو رکعتوں میں قراءت فرض ہے، تیسری اور چوتھی خالی ہیں، اور نفل کی ہر رکعت میں قراءت فرض ہے، اگر آپ نفل کی چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھیں تو ہر رکعت میں قراءت کریں کیونکہ نفل کی ہر دو رکعت الگ نماز ہے، اور نماز در اصل ایک رکعت ہے دوسری رکعت میں تو وہی ہوتا ہے جو پہلی رکعت میں ہوتا ہے اور دو رکعتوں کو عربی میں شفعہ (جوڑی) کہتے ہیں۔

دو رکعتوں سے کم نفل پڑھنا جائز کیوں نہیں؟

دو رکعتوں سے کم نفل پڑھنا جائز نہیں، کیوں جائز نہیں؟ آپ اپنے احوال پر غور کریں،

تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک پوری توجہ اللہ کی طرف رہے ذرا بھی ادھر ادھر نہ ہو، یہ بہت مشکل کام ہے، اور اگر کوئی ذہن کو حاضر کرنے کی کوشش کرے کہ نماز میں کوئی خیال نہیں لانا چاہئے تو یہ بھی ایک خیال ہے یہی شروع ہوجائے گا، اللہ کے لئے کما حقہ نماز پڑھنا ممکن نہیں، پس اس کی تلافی کیسے کی جائے؟ ایک آدمی ٹماٹر لینے گیا، ایک کلو لئے، دوکاندار نے تول کر تھیلے میں ڈالے، اب وہ ٹماٹر دیکھتا ہے اور کہتا ہے: ارے بھئی اس میں داغ ہے، اس میں یہ ہے، اور یہ ایسا ہے۔ دوکاندار دو تین ٹماٹر اس کو اور دیتا ہے اور کہتا ہے: لے بھئی! اب جا، یعنی وہ جو ٹماٹروں میں کمی تھی زائد ٹماٹر دے کر اس کو پورا کردیا۔ کمی پوری کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، اس لئے شریعت نے ایک رکعت نماز ہی نہیں رکھی، جب بھی نماز پڑھنی ہو دو دو رکعتیں پڑھو تاکہ دونوں مل کر ایک کامل نماز بن جائیں، دو رکعت سے کم نماز نہ پڑھنے کی یہ حکمت ہے۔

اور یہ وجہ حدیث میں آئی ہے، نبی پاک ﷺ نے دم کٹی نماز پڑھنے سے منع کیا، یعنی صرف ایک رکعت پڑھنے سے منع کیا، جانور کی دم کٹ جائے تو جانور ناقص ہوجاتا ہے، ایسے ہی دم کٹی نماز بھی ناقص ہوتی ہے، اس حدیث میں دو اشارے ہیں: ایک اشارہ تو یہ ہے کہ صرف ایک رکعت بھی نماز ہے، دوسرا یہ کہ وہ ناقص ہے، اس لئے شریعت نے ایک رکعت نماز پڑھنے سے منع کیا، کم از کم دو پڑھنی چاہئیں تاکہ ایک کی خوبی سے دوسری کی کمی پوری ہوجائے۔

الغرض نفلیں چاہے آپ چار ایک سلام سے پڑھیں، یا چھ یا آٹھ پڑھیں ہر دو رکعت الگ نماز ہے، البتہ وتر ایک ایسی نماز ہے جس میں تین رکعتیں ہیں اور ہر رکعت میں قراءت ضروری ہے، پس اگر کوئی شخص کاہل ہے، سست ہے یا ایمرجنسی ہے اور آدمی جلدی نماز پڑھ کر فارغ ہونا چاہتا ہے تو اللہ نے چھوٹی تین سورتیں نازل کی ہیں کہ لے جلدی پڑھ لے۔ اس سے آگے چار رکعتوں میں چونکہ قراءت نہیں کیونکہ ہر دو رکعت الگ نماز ہے، صرف وتر ایک ایسی نماز ہے جس کی تینوں رکعتوں میں قراءت ہے، اس لئے تین چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل کیں تاکہ ایمرجنسی میں کوئی جلدی نماز پڑھنا چاہے تو پڑھ سکے۔ یہ وہ وجہ ہے جو ہنسنے کی ہے۔

صحیح وجہ یہ ہے کہ تین عوامل ہیں، اللہ ہمارے خالق و مالک ہیں، ہم ان کے بندے ہیں،

جب ہم ان کے بندے ہیں تو ان کی بندگی کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ہم ان کی بندگی کیسے کریں؟ یہ چیز سکھانے کے لئے اللہ نے اپنا دین رسولوں کے واسطہ سے ہمارے پاس بھیجا کہ دیکھو بندگی اس طرح کرنی ہے، تو دو باتیں ہوئیں، ایک: اللہ نے رسولوں کے واسطہ سے اپنا دین بھیجا، اور دوسرے: ہم انسانوں کی طرف بھیجا، تو عوامل تین ہوگئے: اللہ، رسول اللہ اور انسان، پس سورتیں بھی اللہ نے تین نازل کیں، ان تین سورتوں میں انہی تین عوامل کا تعارف ہے، سورہ اخلاص میں اللہ کا پورا تعارف ہے، سورہ کوثر میں نبی پاک ﷺ کے احوال کا ذکر ہے اور سورہ عصر میں انسانوں کے لئے اصلاح کا پروگرام ہے، انسان اپنے آپ کو سنوارنا چاہیں تو کیا فارمولہ ہے؟ یہ فارمولہ سورہ عصر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ تین چھوٹی سورتیں ہیں، لمبی سورت ہو تو ہوسکتا ہے ہر انسان یاد نہ کرسکے، چھوٹی چھوٹی سورتیں نازل کیں تاکہ ہر مرد اور عورت، شہری اور دیہاتی، بچہ اور بوڑھا ان کو یاد کرسکے اور سمجھ سکے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا مقولہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پورا قرآن نازل نہ فرماتے، صرف والعصر نازل فرماتے تو قیامت تک انسانوں کی اصلاح کے لئے یہ سورت کافی تھی۔ یہ کسی معمولی آدمی کا قول نہیں حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا ارشاد ہے، اس سے والعصر کی اہمیت سمجھو، اور سورہ اخلاص کی اہمیت تو نبی پاک ﷺ نے بیان کی ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ تہائی قرآن کے برابر ہے۔ یہ چھوٹی تین سورتوں کے نازل کرنے کی حقیقی وجہ ہے۔

سورۂ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے

عام طور پر اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا جاتا ہے کہ تہائی قرآن پڑھنے کا جتنا ثواب ہے اتنا ثواب ایک بار قل هو اللہ پڑھنے کا ہے، پس اگر کوئی تین مرتبہ قل هو اللہ پڑھے تو ایک قرآن پڑھنے کا ثواب مل جائے گا، عام طور پر حدیث کا یہی مطلب بیان کیا جاتا ہے، آپ حضرات نے بھی یہی سن رکھا ہوگا۔

لیکن اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی ہے اور وہی زیادہ فٹ ہے۔ وہ مطلب یہ ہے کہ دین دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے: عقائد اور اعمال کا، اور عقیدوں میں بنیادی عقیدے

تین ہیں: (۱) توحید، یعنی اللہ ایک ہیں (۲) رسالت محمدی یعنی آخری نبی ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں (۳) معاد یعنی آخرت، دنیا میں رہنے والے ہر انسان کی زندگی ختم ہونے والی ہے، اور خود دنیا کی زندگی بھی ایک دن ختم ہونے والی ہے، الیوم الآخر میں تمام روحوں کو عالم برزخ سے اپنے اپنے اجسام میں واپس آنا ہے، تو آپ اس آخری دن کو معاد (واپس آنا) بھی کہہ سکتے ہیں اور آخرت بھی، یہ تین بنیادی عقیدے ہیں اور دین انہی تین عقیدوں کا نام ہے، اور انہی تین عقیدوں کو پورے قرآن کریم میں طرح طرح سے بیان کیا گیا ہے، ان تین عقیدوں میں سے توحید کا مکمل بیان قُل ھو اللہ میں ہے، پس گویا ایک تہائی مضمون قل ھو اللہ میں آ گیا، اس لئے قل ھو اللہ کو تہائی قرآن کے برابر کہا گیا۔

یہ حدیث شریف کا دوسرا مطلب بیان کیا گیا ہے اور پہلے والا بھی بیان کیا گیا ہے، اور دوسرا مطلب زیادہ راجح اور بہتر ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں سورہ زلزال ﴿إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ﴾ کے بارے میں آیا ہے کہ وہ سورت آدھے قرآن کے برابر ہے، یہاں کسی نے یہ مطلب بیان نہیں کیا کہ ایک مرتبہ اذا زلزلت الارض پڑھو تو آدھے قرآن کا ثواب ملے گا، دو مرتبہ پڑھو تو سارا قرآن پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ سب نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ زندگیاں دو ہیں، اس دنیا کی زندگی اور آخرت کی زندگی اذا زلزلت میں آخرت کا بیان ہے اور پورا قرآن کریم اس دنیا کی زندگی سے بحث کرتا ہے اور یہ سورت مکمل طور سے آخرت کی زندگی سے بحث کرتی ہے، اس لئے آدھا قرآن ہے۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث شریف ہے کہ ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ چوتھائی قرآن کے برابر ہے، اس کا بھی کسی نے یہ مطلب بیان نہیں کیا کہ چار مرتبہ ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ پڑھو تو ایک قرآن پڑھنے کا ثواب مل جائے گا، سب نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ دین کے بنیادی عقیدے تین ہیں، توحید، رسالت محمدی اور معاد اور چوتھا: عمل ہے، میں نے کہا تھا کہ دین عقائد اور اعمال کا مجموعہ ہے پس اعمال ایک، اور عقائد میں بنیادی عقائد تین، تو کل چار ہوئے، اور ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ میں اخلاص فی العبادت کا بیان ہے کہ بندگی کرو تو صرف اللہ کی کرو، کسی اور کو حصہ دار مت بناؤ، پس ﴿قُلْ يٰأَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ چوتھائی قرآن

کے برابر ہوا۔ اسی شاکلہ اور انداز پر ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ کا بھی یہی مطلب بیان کرنا چاہئے کہ بنیادی عقیدے تین ہیں اور ان میں سے ایک کا مکمل بیان قل ھو اللہ میں ہے پس قل ھو اللہ تہائی قرآن کے برابر ہوا۔

الغرض جب اس میں بنیادی تین عقیدوں میں سے ایک عقیدہ کا بیان ہے تو اس کی اہمیت واضح ہے، جیسے والعصر کی اہمیت امام شافعی کے قول سے واضح ہے، لہٰذا آج مختصر وقت میں اس سورت کو سمجھ لینا چاہئے۔

سورہ اخلاص کا شان نزول

اس سورت کے شان نزول میں ایک روایت ہے، مشرکین مکہ نے نبی پاک ﷺ سے ایک مرتبہ کہا: أنسب لنا ربك: آپ ہمارے لئے اپنے پروردگار کا نسب بیان کیجئے کہ آپ کا پروردگار کون ہے؟ ان کے والد کون ہیں، ان کی اولاد کون ہے؟ مشرکین اپنے خداؤں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، قرآن میں ہے: ﴿ءَ أَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾: یوسف علیہ السلام نے کہا: کیا یہ جو تم نے بہت سارے خدا مان رکھے ہیں یہ بہتر ہیں یا اللہ، جو واحد وقہار ہے؟ معلوم ہوا کہ مشرکین اپنے خداؤں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، اور عیسائی تو آج بھی لفظ رب استعمال کرتے ہیں، رب تو عربی لفظ ہے وہ اس کی جگہ لارڈ استعمال کرتے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے لفظ لارڈ استعمال کرتے ہیں، ان سے نیچے اور لوگوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح مشرکین اللہ کے علاوہ دیگر معبودوں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام دعوت لے کر فرعون کے پاس پہنچے اور رب پر ایمان لانے کی دعوت دی تو فرعون نے پوچھا: ﴿مَنْ رَبُّكُمَا يَا مُوْسٰى﴾: تم دونوں کا رب جس کی جانب تم مجھے بلا رہے ہو کون ہے؟ کیونکہ فرعون خود اپنے آپ کو رب کہلاتا تھا: ﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى﴾: تمہارا سب سے بڑا رب میں ہوں، میرے علاوہ اور بھی رب ہیں، چھوٹی چھوٹی مورتیاں ہیں مگر ان سب مورتیوں کا لیڈر میں ہوں۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ مشرکین بھی اپنے گھڑے ہوئے معبودوں کے لئے لفظ رب استعمال کرتے تھے، پس جب قرآن کریم کی

پہلی آیت نازل ہوئی: ﴿اِقْرَأْ بِسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ تو قرآن نے بھی لفظ رب استعمال کیا، اس لئے قدرتی طور پر سوال پیدا ہوا کہ ہمارے جوارباب ہیں ان کو تو ہم جانتے ہیں، تم جس رب پر ہمیں ایمان لانے کے لئے کہہ رہے ہو ذرا اس کا تعارف کراؤ، ہمارے یہ یہ رب ہیں، یہ یہ ان کے باپ ہیں، یہ یہ ان کی اولاد ہے، اب تم ہمیں کسی اور رب کی طرف بلا رہے ہو تو ذرا اس کا تعارف کراؤ کہ وہ کون ہے؟ اس کے والد کون ہیں؟ اس کی اولاد کون ہے؟ یہ سوال تھا اور اس کے پیدا ہونے کی یہ وجہ تھی، چنانچہ قرآن کی یہ سورت نازل ہوئی اور جواب دیا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ﴾: کہو: وہ اللہ ہے، یعنی قرآن نے جس رب کی طرف بلایا ہے اس کا ذاتی نام اللہ ہے۔ اور اللہ کو مشرکین جانتے تھے، وہ اپنی مورتیوں کے لئے لفظ اللہ استعمال نہیں کرتے تھے، کلمہ اللہ کو اللہ ہی کے لئے استعمال کرتے تھے، جیسے ہمارے ہندوستان کے ہندو ایشور اور پرمیشور اللہ ہی کے لئے استعمال کرتے ہیں، وہ اپنی مورتیوں میں سے کسی کو ایشور (خالق) نہیں کہتے، پرمیشور (مخلوق سے محبت کرنے والا) نہیں کہتے۔ اسی طرح یہودیوں کے یہاں اللہ کے لئے اصل نام یہووا ہے، یہودیوں میں ایک فرقہ ہے جو یہوواوٹنیس کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں شہادۃ اللہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ان کے عقائد اسلام سے قریب قریب ہیں، پس جیسے اِن کے یہاں یہووا لفظ ہے، اور اُن کے یہاں ایشور لفظ ہے، عربی میں اللہ کا اصل نام: اللہ ہے، اور اس لفظ کو مشرکین جانتے تھے اور استعمال بھی کرتے تھے، ان کے اشعار اور خطبے موجود ہیں جن میں انہوں نے اللہ کے لئے لفظ اللہ استعمال کیا ہے، پس ان کو بتلایا کہ: ھو: وہ، جن کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو ان کا اصل نام اللہ ہے، اور اللہ کی دو صفتیں ہیں: ایک ہے: أحد: یگانہ، تنہا، یہ اللہ کی پہلی صفت ہے وہ تنہا ہیں، یگانہ ہیں، بے ہمہ ہیں ان کے ساتھ اور کوئی نہیں۔

جوڑے کا مطلب نر اور مادہ نہیں

قرآن کریم میں یہ مضمون کئی جگہ آیا ہے کہ اللہ نے کائنات کی ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے، اکیلی ذات صرف اللہ کی ہے، اللہ کے علاوہ اکیلا کوئی نہیں، سب چیزیں جوڑا جوڑا ہیں، مگر لفظ جوڑا سن کر ہمارے ذہن میں مذکر و مونث اور نر مادہ کا تصور ابھرتا ہے، جوڑے کا یہ مطلب

نہیں، جوڑا ایسی دو چیزوں کو کہتے ہیں جو مل کر کسی مقصد کو پورا کریں پھر وہ دو چیزیں اگر اتفاق سے نر مادہ ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا، باقی جوڑے کے لئے نر مادہ ہونا ضروری نہیں، جیسے دو چپل جوڑا ہیں کیونکہ دو چپل مل کر ایک مقصد کو پورا کرتے ہیں، تو اللہ نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَالسَّمَآءَ بَنَیْنَاهَا بِأَیْدٍ وَإِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ﴾: قسم ہے آسمان کی جس کو ہم نے لمبا چوڑا بنایا ہے۔ ﴿وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾: اور زمین کو دیکھو جس کو ہم نے بچھایا پس کتنا شاندار بچھایا۔ ﴿وَمِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ﴾: اور ہم نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی، کیوں بنائی؟ ﴿لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ تاکہ تم ایک بات یاد کرو، وہ بات کیا ہے؟ یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں اس کا بھی ایک جوڑا ہے، جب اللہ نے ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے تو یہ دنیا اکیلی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ دنیا اکیلی مقصد کی تکمیل کیسے کر سکتی ہے؟ اس دنیا کے ساتھ دوسری دنیا آخرت ہے اور یہ دنیا اور وہ دنیا جوڑا ہیں اور دونوں مل کر مقصد کی تکمیل کرتے ہیں، وہ مقصد کیا ہے؟ مقصد یہ ہے کہ اچھا کرو جزائے خیر پاؤ، برا کرو پاداش عمل سے دوچار ہوؤ، یہ مقصد جب دو دنیا ہونگی تبھی پورا ہوگا۔

دنیا وآخرت مل کر مقصد کی تکمیل کرتے ہیں

ہم اس دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اچھائیاں کرنے والے اور برائیاں کرنے والے برابر ہیں، اچھائیاں کرنے والے اگر دولت مند اور صحت مند ہیں تو برائیاں کرنے والے بھی دولت مند اور صحت مند ہیں، اور اگر برائیاں کرنے والے اندھے لولے اور معذور ہیں تو اچھائیاں کرنے والے بھی اندھے لولے اور معذور ہیں، ہمیں اس دنیا میں کوئی فرق نظر نہیں آتا پس کیا اللہ کی یہ کائنات اندھیر نگری ہے؟ نہیں، اللہ تعالی اپنے معاملات میں نہایت حکیم ہیں، پھر اچھائیاں کرنے والوں کو اچھا بدلہ اور برائیاں کرنے والوں کو سزا کب ملے گی؟ اس کے لئے آخرت ہے، آخرت میں دودھ الگ کر دیا جائے گا اور پانی الگ، نیکیاں کرنے والوں کو تا ابد جزائے خیر ملے گی اور برائیاں کرنے والوں کو سزا ملے گی، پس اس دنیا میں عمل کرنا ہے، اور وہاں ثمرہ اور پھل کھانا ہے دونوں دنیا مل کر مقصد زندگی کی تکمیل کرتے ہیں، صرف اس دنیا سے مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔

دیکھو ہم کھیت میں گیہوں بوتے ہیں، گیہوں اُگے، بڑھے اور بڑھے، تیار ہوئے، تیار ہونے کے بعد ہم کھیت میں چاروں طرف گھومتے ہیں تو کہیں گیہوں کا ایک دانہ نظر نہیں آتا، گھاس ہی گھاس نظر آتی ہے بھوس ہی بھوس نظر آتا ہے، پس اگر یہ کھیت ہی کھیت رہے تو ہمارے اناج بونے کا فائدہ کیا؟ ایک دن آئے گا کہ پورا کھیت کٹ جائے گا، کھیت خالی ہوجائے گا، اور یہ سارا اناج کھلیان میں پہنچے گا، اس پر بیل گھومیں گے، اناج گاہا جائے گا پھر ہوا میں برسایا جائے گا تو گیہوں الگ ہوجائیں گے اور بھوسا الگ، ہمارے کھیت بونے کا ثمرہ اب ظاہر ہوا۔

میرے بھائیو! دنیا بھی اسی طرح ایک کھیت ہے، یہ کھیت ایک دن سارا کٹ جائے گا اور سارا اناج (انسان) کھلیان (میدان محشر) میں پہنچے گا، اور وہاں گاہنے کے بعد برسایا جائے گا اناج (جنتی) ایک طرف ہوجائے گا اور بھوسا (جہنمی) ایک طرف، اناج کو کوٹھری (جنت) میں بھرا جائے گا، اور بھوسے کو یا تو آگ لگا کر جلا دیں گے جیسا کہ آپ کے یہاں ہوتا ہے کیونکہ یہاں لوگوں کے پاس جانور نہیں، یا بیل بھینسوں کو کھلا دیں گے جیسا ہمارے یہاں ہوتا ہے، بہرحال دونوں الگ الگ کردئے جاتے ہیں، یہی اس دنیا کا حال ہے کہ اس میں جو اچھے اور برے رلے ملے ہیں ان کو ایک دن الگ الگ کردیا جائے گا۔

پس اللہ نے فرمایا: یہ دنیا اور دوسری دنیا دونوں مل کر جوڑا ہیں یہ بات تم یاد کرو اس لئے ہم نے کائنات کی ہر چیز جوڑا جوڑا بنائی ہے، اکیلے صرف اللہ ہیں ان کے علاوہ کوئی اکیلا نہیں سورہ یٰس میں ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾: پاک ہے وہ ذات، کس بات سے پاک ہے؟ جوڑا ہونے سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا، زمین میں سے جتنی چیزیں اگتی ہیں ان میں بھی جوڑا ہے، انسانوں میں بھی جوڑا ہے اور جن مخلوقات کو لوگ نہیں جانتے ان کو بھی اللہ نے جوڑا جوڑا بنایا ہے۔

اور بنیادی بات یہ جاننی چاہئے کہ جوڑے کا مطلب مذکر و مونث نہیں ہیں، بلکہ دو چیزیں مل کر کسی ایک مقصد کی تکمیل کریں تو وہ جوڑا ہے۔ غرض اللہ کی پہلی صفت یہ بتائی کہ وہ

تنہا ہیں، اکیلے ہیں، ان کا جوڑا ممکن ہی نہیں، ورنہ وہ آدھے خدا ہونگے، جب دو خدا مل کر ایک مقصد کی تکمیل کریں گے تو وہ اکیلے باکمال خدا کہاں ہوئے؟

چنانچہ دوسری صفت ہے: ﴿اَللّٰهُ الصَّمَدُ﴾: اللہ بے نیاز ہیں، یعنی کسی چیز کے محتاج نہیں، وہ باہمہ ہیں، وہ باکمال ہیں کسی کمال کی ان میں کمی نہیں، مشرکین نے جو شرک شروع کیا تو ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک شخص بڑا کارخانہ اکیلا نہیں چلاسکتا مختلف شعبوں کے لئے منیجر مقرر کرنے پڑتے ہیں، ایک بادشاہ پورا ملک اکیلا نہیں چلاسکتا، وزارتیں قائم کرنی پڑتی ہیں تو اتنا بڑا جگت اللہ اکیلے کیسے چلاسکتے ہیں؟ اللہ نے بھی ہوا کا خدا الگ، دولت کا خدا الگ، بارش کا خدا الگ تجویز کیا ہے، یہ اللہ کو ان لوگوں نے ناقص اور محتاج مان لیا، یہ جو کارخانہ کا مالک ہے اکیلا اپنا کارخانہ نہیں چلاسکتا، یہ جو ملک کا بادشاہ ہے وہ اپنا ملک اکیلا نہیں چلاسکتا کیونکہ یہ دونوں کمزور ہیں پس کیا اللہ تعالیٰ بھی کمزور ہیں؟ وہ تو بے نیاز ہیں ان میں کوئی کمی نہیں، قرآن کریم میں سات جگہ یہ مضمون آیا ہے کہ اللہ نے آسمان وزمین اور ان کے درمیان کی چیزیں چھ دنوں میں پیدا کیں: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾: پھر اللہ تعالیٰ بذات خود عرش نشیں ہوئے اور انہوں نے معاملہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، یعنی کائنات کا انتظام اللہ نے کسی کو نہیں سونپا۔

غرض: اللہ کی یہ دوسری صفت آئی کہ اللہ صمد ہیں، بے نیاز ہیں، باکمال ہیں ان کا کوئی کمال منتظر نہیں جو آگے اللہ کو حاصل ہو، کوئی کمی اللہ کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتی۔

اور عربوں میں تعارف کا ایک طریقہ ہے، کسی سے پوچھیں گے: تمہارا فلاں دوست کون ہے؟ وہ کہے گا: ابوفلان، فلاں کا ابا ہے، یہ عربی میں کنیت ہے جس کو وہ آج بھی استعمال کرتے ہیں، پھر دوسرے درجہ کی کنیت ہے: ابن فلان: فلاں کا بیٹا ہے، جیسے حضور ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی اور عبداللہ بن عمر کی کنیت ابن عمر تھی۔ یہ دو کنیتیں عربوں میں چلتی ہیں اور زیادہ ابوفلان چلتی ہے، لہٰذا اللہ کا تعارف کراؤ کہ وہ کس کے ابا ہیں، اور کس کے بیٹے ہیں، قرآن نے کہا: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾: اللہ نے کسی کو جنا نہیں، جب کسی کو جنا نہیں تو ابوفلان کیسے ہونگے؟ ﴿وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ اور وہ جنے نہیں گئے، جب جنے نہیں گئے تو ابن فلان کہاں

سے ہوں گے؟ وہ ابوفلان اور ابن فلان نہیں ہو سکتے؟ اس لئے کہ وہ احد ہیں اور صمد ہیں، اکیلے ہیں اور بے نیاز ہیں، اگر اللہ نے کسی کو جنا ہوتا تو وہ بیٹا بھی اللہ ہوتا تو اللہ احد کہاں رہے، دو اللہ ہو گئے۔ اور باپ بیٹوں کا محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ بوڑھاپے میں سہارا بنیں۔

علاوہ ازیں ہر ایک کو اولاد چاہئے تو یہ چاہئے بھی ایک احتیاج ہے، اللہ میں ایسی کمی نہیں ہو سکتی، اور اگر اللہ کے ابا اور امی ہوتے تو ابا اور امی بھی خدا ہوتے، کیونکہ اولاد ہم جنس ہوتی ہے، انسان کے گھر میں بلی پیدا ہو جائے تو کیسا معلوم ہوگا؟ اور جب ایک انسان جنا گیا ہے تو اس کے ابا اور امی کو بھی انسان ماننا پڑے گا، تو جب اللہ اللہ ہیں تو ان کے ابا اور امی کو بھی اللہ ماننا پڑے گا، پس اللہ احد کہاں رہے؟ اور وہ صمد کہاں رہے؟

آگے چلو اور باپ ہونے کے اعتبار سے اور بیٹا ہونے کے اعتبار سے ہم سری اور برابری نہیں تو کسی اور اعتبار سے ہوگی؟ فرمایا: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾: اور نہیں ہے اللہ کے لئے کوئی ہم سر، کسی اعتبار سے بھی اللہ کا کوئی ہم سر نہیں، جب ان کے برابر کوئی نہیں تو معبود ان کے علاوہ دوسرا کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ اس سورت پاک میں اللہ کا تعارف کرایا گیا ہے، اور اس میں سے سبق یہ نکلتا ہے کہ اللہ ہی اکیلے ہیں اور بے نیاز ہیں، پس ان کے ساتھ کسی کو پکارنے کا کوئی سوال نہیں، چاہے پکارنے کی نوعیت کچھ بھی ہو، مشرکوں میں جو نوعیت ہے وہ ہو، یا مسلمانوں میں جو نوعیت ہے وہ ہو کہ اللہ کے علاوہ کی منت مان رہا ہے، اللہ کے علاوہ کو اپنی عبادت دکھا رہا ہے، دکھاوا بھی شرک ہے اگرچہ نہایت نیچے درجہ کا شرک ہے اور اوپر کے درجہ کا شرک یہ ہے کہ دو یا تین یا ہزار خدا مان لئے جائیں، تو اوپر سے نیچے تک یہ سب صورتیں شرک کی ہیں، اس لئے صرف ایک اللہ سے لو لگاؤ، کسی اور کی طرف کوئی دھیان مت دو، یہی توحید ہے، مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہر کا ایک شعر ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا خود حشر میں کہہ دے ❁ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے تھا

میرے بھائیو! اسی کا نام توحید ہے اور یہی اس سورت کا مضمون ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۳

تراویح کی بیس رکعتیں سنت ہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ﴾ وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: " من صام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه. ومن قام رمضان إيمانا واحتسابًا غفرله ما تقدم من ذنبه" (متفق علیہ) وقال أنس رضی اللہ عنہ: فرض اللّٰہ صیامَ رمضان وسَنَّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامہ.

بزرگو اور بھائیو! یہ ماہ مبارک چل رہا ہے، اس مہینے کا قرآنِ کریم سے، اور قرآنِ کریم کا اس مہینے سے خاص تعلق ہے، اس مہینے میں قرآنِ کریم نازل ہوا ہے، ارشادِ پاک ہے: رمضان کا مہینہ ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ہے، اس لئے قرآنِ کریم کا حق ادا کرنے کے لئے اس مہینے میں دو اعمال رکھے گئے ہیں: دن میں روزے، اور رات میں سونے سے پہلے نفلیں (تراویح) اور یہ دونوں اعمال چونکہ لمبے ہیں، پورا مہینہ پابندی سے کرنے ہوتے ہیں اس لئے دونوں کو آسان بنانے کے لئے بخاری ومسلم کی روایت میں ایک فارمولہ (آسان طریقہ) بیان کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا: من صام رمضان إيمانا واحتساباً غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن قام رمضان إيمانا واحتسابًا غفرله ما تقدم من ذنبه: یعنی جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے نفلیں پڑھے تو ہر ایک عمل کا ثواب یہ ہے کہ اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

یہ جو ثواب بیان کیا گیا ہے اس کا یقین ہو اور اس ثواب کو پیش نظر رکھے تو دونوں کام آسان ہو جائیں گے، اس حدیث میں لفظ ایمان شرعی اصطلاح نہیں، بلکہ لغوی معنی میں ہے، یعنی ثواب کا یقین کرنا، اسی لئے عطف تفسیری کے طور پر احتساباً لائے ہیں، احتساب کے معنی ہیں ثواب کی امید رکھنا یعنی اس کو پیش نظر رکھنا۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے اور رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے نوافل مسنون کئے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دن کے مزاج میں انقباض ہے اور رات کے مزاج میں انبساط ہے، اور روزہ چونکہ علاحدہ علاحدہ رکھنا ہے جو انقباض کے ساتھ بھی رکھا جاسکتا ہے۔ اور قرآنِ کریم رمضان میں پورا پڑھنا ہے، اور ہر ایک کو قرآنِ کریم حفظ نہیں ہوتا پس جو حافظ ہے وہ جہراً پڑھے گا اور دوسرے سنیں گے۔ اور پڑھنے اور سننے کے لئے طبیعت میں انبساط چاہئے، اس لئے تراویح رات میں رکھی گئی ہے۔

یہاں سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ تراویح رمضان کی زائد نماز ہے، اور **صلاة الليل** یعنی تہجد جو پورے سال کی نماز ہے وہ انفرادی نماز ہے، کیونکہ رات کے آخر میں لوگوں کا اجتماع مشکل ہے، پس جو لوگ دونوں نمازوں کو ایک سمجھتے ہیں وہ غلط ہیں، بلکہ یہ دو نمازیں بالکل ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں، ایک: صلوٰۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز ہے، یہ نماز سال بھر پڑھی جاتی ہے، رمضان اور غیر رمضان ہر زمانہ میں پڑھی جاتی ہے، تہجد کے معنی ہیں: **تَرْكُ الهُجود**: نیند چھوڑنا۔ چونکہ یہ نماز رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے، آدمی پہلے سوجاتا ہے پھر اٹھ کر اس نماز کو پڑھتا ہے اس لئے اس کا نام 'تہجد' ہے، دوسرا نام اس کا 'صلوۃ اللیل' ہے۔ دوسری: قیام رمضان یعنی تراویح ہے، یہ رمضان المبارک کی خصوصی نماز ہے، یہ نماز صرف رمضان المبارک میں پڑھی جاتی ہے باقی گیارہ مہینوں میں یہ نماز نہیں پڑھی جاتی۔

اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ تو تراویح کی رکعتوں کی تعداد متعین تھی اور نہ یہ نماز باجماعت پڑھی جاتی تھی، صرف اس کی ترغیب دی جاتی تھی کہ یہ ایسی نماز ہے جو گذشتہ گناہوں کا کفارہ بنتی ہے۔ چنانچہ لوگ رمضان میں سونے سے پہلے اپنے طور پر یہ نماز پڑھتے تھے، اللہ جس کو جتنی توفیق دیتا وہ اتنی رکعتیں پڑھتا، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی یہی طریقہ رہا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال سخت آزمائش کے تھے، مسلمان بیک وقت دو سپر پاور: ایران وروم کے ساتھ جنگوں میں مصروف تھے، جب یہ دونوں طاقتیں ٹوٹیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت

کے آخری سالوں میں ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے بہت سے کام کئے ہیں ان میں سے ایک کام باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح کا نظام بنانا بھی ہے۔ شروع میں امام تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھاتا تھا اور سحری کے وقت تک پڑھاتا تھا۔ موطا مالک میں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے گیارہ رکعتیں (آٹھ تراویح اور تین وتر) پڑھانے کا حکم دیا جن سے لوگ فجر سے کچھ ہی دیر پہلے فارغ ہوتے تھے (موطا مالک ص: ۴۰) اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ تہجد کی نماز ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بات آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو دو یا تین راتیں جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی ہے وہ بیس رکعتیں پڑھائی ہیں اور آنحضرت ﷺ تنہا بھی سونے سے پہلے بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک میں بغیر جماعت کے بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے (بیہقی ۲:۴۹۶) اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے **التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير** (۱:۱۹۹) میں یہ روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن جماعت سے جو نماز پڑھائی تھی وہ بیس رکعتیں پڑھائی تھیں، حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس روایت کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے، (فتاوی رحیمیہ)

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نظام بدل دیا اور دونوں اماموں: حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ بیس رکعتیں پڑھائیں اور مختصر پڑھائیں اور لوگوں کو سونے کا موقع دیں، پھر آخری پہر لوگ اٹھ کر تہجد پڑھیں، بخاری شریف (حدیث ۲۰۱۰) میں ہے کہ اس نئے نظام کے شروع ہونے کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے، لوگوں کو ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: **نعم البدعة هذه**: یعنی لوگ جو اس نماز کو بدعت کہتے ہیں وہ صحیح نہیں، یہ تو شاندار نئی بات ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس نماز کو لوگوں کے خیال کے مطابق بدعت (نئی بات) کہا ہے اور نِعم سے اس کی تردید کی ہے، جب تراویح کا باقاعدہ نظام بنا تو لوگوں میں چہ می گوئیاں ہوئیں کہ یہ کیا نئی بات شروع ہوئی، جیسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی پختہ بنائی تو بعض لوگوں نے کہا: یہ تو کسری کا محل بن گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اس خیال کی تردید کی کہ یہ اگر

نئی چیز ہے تو نہایت شاندار نئی چیز ہے، کیونکہ اس کی اصل موجود ہے اور وہ آپؐ کا دو دن یا تین دن باجماعت نوافل پڑھانا ہے، آپؓ نے لفظ بدعت اس کے لغوی معنی میں استعمال کیا ہے اور بالفرض کلام کیا ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے بدعت: بدعت حسنہ بھی ہوتی ہے اور بدعت سیئہ بھی، اور بدعتِ اصطلاحی صرف بدعت سیئہ ہوتی ہے، وہ حسنہ نہیں ہوتی۔

پھر دوسری بات آپؓ نے یہ فرمائی: والتی ینامون عنها أفضلُ من التی یقومون: جس نماز سے لوگ سوتے رہتے ہیں وہ اس نماز سے افضل ہے جس کو وہ پڑھتے ہیں، یعنی تراویح سے افضل تہجد ہے۔ لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ جس طرح تراویح اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں تہجد کی نماز بھی پڑھیں، اس ارشاد سے یہ بات صاف ہوگئی کہ تراویح: تہجد کی نماز نہیں، بلکہ یہ دونوں الگ الگ نمازیں ہیں، ایک کا وقت سونے سے پہلے ہے اور دوسری کا سونے کے بعد، ایک کی بیس رکعتیں ہیں اور دوسری کی آٹھ، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے آج تک امت شرقاً غرباً تراویح جماعت کے ساتھ بیس رکعتیں پڑھتی چلی آرہی ہے، صرف غیر مقلدین اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: تراویح کی آٹھ رکعتیں ہیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ (حدیث ۷۷۷۴ طبع محمد عوامہ) میں ہے اس کو ضعیف بتاتے ہیں۔ مگر غیر مقلدین کا یہ خیال صحیح نہیں اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث قیام رمضان (تراویح) سے متعلق نہیں ہے، بلکہ قیام لیل (تہجد) سے متعلق ہے، رسول اللہ ﷺ یہ آٹھ رکعتیں سال بھر پڑھتے تھے، اور تراویح صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں بیس رکعت تراویح پر چاروں ائمہ، تمام صحابہ، تابعین اور تمام علماء کا اجماع ہے، اگر بالفرض حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو تراویح سے متعلق کیا جائے تو غیر مقلدین سے عرض ہے کہ آنحضور ﷺ اس نماز کو سال بھر پڑھتے تھے، آپ بھی سال بھر پڑھیں تو ہم جانیں کہ آپ 'اہل حدیث' ہیں، یہ کیا کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو!

اور اگر وہ کہیں کہ نبی ﷺ نے صرف تین دن یا دو دن رمضان میں جماعت سے نماز پڑھی ہے اس لئے ہم اس پر عمل کرتے ہیں تو سنیں: اس حدیث پر عمل کرنا ہے تو تراویح جماعت کے ساتھ صرف دو دن یا تین دن پڑھو، پھر مسجدوں سے جاؤ تا کہ فتنہ ختم ہو، اور وہ بھی مہینہ کی آخری تاریخوں میں آؤ، تا کہ پورا رمضان مسجدوں میں سکون رہے۔

خلاصۂ کلام: باجماعت تراویح کا نظام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت سے شروع ہوا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے گیارہ رکعت پڑھانے کا حکم دیا تھا، جس کو تہجد کے وقت تک جاری رکھا جاتا تھا اور اس کا مدار تہجد کی روایت پر تھا مگر بعد میں یہ بات واضح ہوئی کہ رمضان میں بھی تہجد اپنی جگہ پر ہے اور قیام رمضان (تراویح) اس کے علاوہ نماز ہے، چنانچہ آپؓ نے اس روایت کی بنا پر جس کو حضرت ابن عباسؓ نے روایت کیا ہے: رکعتوں کی تعداد بڑھا دی اور قراءت میں تخفیف کردی تا کہ لوگ تراویح سے فارغ ہو کر سو جائیں اور آخر شب میں اٹھ کر حسب معمول تہجد پڑھیں، چنانچہ اس وقت سے آج تک شرقاً غرباً یہی نظام چل رہا ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع ہے، صرف غیر مقلدین اختلاف کرتے ہیں مگر گمراہ فرقوں کا اختلاف اجماع پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ حافظ رحمہ اللہ نے فتح الباری شرح صحیح البخاری میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تراویح کی بیس رکعتوں کے لئے آنحضرت ﷺ کی جانب سے کوئی عہد تھا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: حضرت عمرؓ اپنی طرف سے ایجاد کرنے والے نہیں تھے، یقیناً ان کے پاس اس کا ثبوت تھا (فتح الباری ۲: ۴۲۰) چنانچہ حافظ رحمہ اللہ نے **التلخیص الحبیر** میں یہ روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن جماعت کے ساتھ جو نماز پڑھائی تھی وہ بیس رکعتیں پڑھائی تھیں، حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بیہقی کے حوالہ سے میں نے ابھی بیان کی کہ نبی ﷺ ماہِ رمضان میں بلا جماعت بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے، یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے مگر تعامل سے اس کی تائید ہوتی ہے، بلکہ تعامل کی صورت میں سرے سے روایت کی ضرورت نہیں رہتی، مثلاً کلمہ طیبہ: لا إله

إلا الله محمد رسول الله کسی روایت سے ثابت نہیں، اگرچہ اس کے دونوں اجزاء قرآن کریم میں ہیں، مگر دونوں کا مجموعہ کلمۂ طیبہ ہے، یہ بات کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں، مگر چونکہ پوری امت کا اس پر تعامل ہے اور اجماع قوی دلیل ہے اس لئے سند کی مطلق حاجت نہیں۔

اور غیر مقلدین اس بات کا اس لئے انکار کرتے ہیں کہ وہ 'اہل حدیث' ہیں، وہ قرآن کے بعد صرف حدیثوں کو حجت مانتے ہیں، اس سے نیچے اجماع امت کو بلکہ اجماع صحابہ کو بھی حجت نہیں مانتے، نہ آثار صحابہ (صحابہ کی انفرادی آراء) کو حجت مانتے ہیں، حتی کہ خلفائے راشدین کی آراء کو اور ان کے زمانہ میں جو باتیں صحابہ کے اجماع سے طے ہوئی ہیں ان کو بھی حجت نہیں مانتے، اس لئے وہ گمراہ فرقہ ہے، اور کسی بھی گمراہ فرقہ کا اختلاف اجماع کو متاثر نہیں کرتا، ورنہ شیعہ بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تو کیا ان کی خلافت بھی اختلافی ہوجائے گی؟ توبہ! اس لئے سلفیوں کی اس بات سے واقف رہنا ضروری ہے اور وہ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بخاری کی حدیث پیش کرتے ہیں اس کا تراویح کے مسئلہ سے کچھ تعلق نہیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۴

نمازوں کے بعد دعاؤں کا حکم

خطبہ مسنونہ کے بعد: **﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا﴾**

بزرگانِ محترم: یہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی ایک آیتِ کریمہ ہے، جو امام صاحب نے آج نماز میں پڑھی ہے، اور مسلمان عام طور پر بطور دعا یہ آیتِ کریمہ پڑھتے ہیں، جو عربی جانتے ہیں اور اس کا مضمون سمجھتے ہیں وہ سمجھ کر دعا مانگتے ہیں مگر ہم عربی سے ناواقف ہیں، ہم کچھ نہیں سمجھتے، بس اتنا جانتے ہیں کہ جن آیات کے شروع میں ربنا ہے ان میں کوئی دعا ہے، اس لئے جن آیتوں کے شروع میں ربنا ہے وہ آیتیں ہم نے یاد کرلی ہیں، اور ان کو ہم پڑھتے ہیں مگر سمجھتے نہیں، اس سے دعا کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اصل دعا یہ ہے کہ ہم سمجھ رہے ہوں کہ ہم اللہ سے کیا مانگ رہے ہیں، اگر ہم نے کچھ آیتیں اور کچھ حدیثیں یاد کرلیں جواز قبیل دعا ہیں اور ہاتھ اٹھا کر ان کو پڑھ لیا اور سمجھا نہیں تو یہ کامل دعا نہیں۔

نمازوں کے بعد دعا مانگنا اچھا ہے

آج کل عربوں میں اور عجمیوں میں یہ مسئلہ بڑا اختلافی ہے کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنی چاہئے یا نہیں؟ آپ حضرات حرمین شریفین میں دیکھتے ہونگے کہ وہاں ائمہ نمازوں کے بعد دعا نہیں مانگتے، حرمین شریفین کے علاوہ عربوں کی جو دوسری مسجدیں ہیں ان میں بھی ائمہ نمازوں کے بعد دعا نہیں مانگتے، وہ کہتے ہیں: نمازوں کے بعد ہیئتِ اجتماعی سے دعا مانگنا بدعت ہے، نہ آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے اور نہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے

اس طرح دعا مانگی ہے۔ دوسری طرف چاروں فقہوں میں (۱) جن کی مسلمانوں کی اکثریت پیروی کرتی ہے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا حسن (اچھا) ہے، سنت نہیں لکھا۔

اور نمازوں کے بعد دعا مانگنے کو علماء نے حسن اس لئے کہا ہے کہ دورِ اول میں اسلام صرف عربوں میں تھا، عربی ان کی مادری زبان تھی، اور قرآن عربی میں ہے، احادیث شریفہ بھی عربی میں ہیں، اور ان میں جو دعائیں آئی ہیں وہ بھی عربی میں ہیں، دورِ اول کے مسلمان قرآن کو سمجھتے تھے، احادیثِ شریفہ کو سمجھتے تھے اور دعاؤں کو بھی سمجھتے تھے، اور خود نماز میں دعائیں مانگنے پر قادر تھے، اور وہ نماز کے آخری قعدہ میں سب دعائیں مانگ لیا کرتے تھے،

---

(۱) چار فقہیں چار مکاتبِ فکر ہیں، معین اشخاص کی رائیں نہیں ہیں، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبِ حنفی یعنی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائیں، مذہب شافعی یعنی امام شافعی رحمہ اللہ کی رائیں، مذہبِ مالکی یعنی امام مالک رحمہ اللہ کی رائیں، مذہبِ حنبلی یعنی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی رائیں۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں، یہ معین اشخاص کی رائیں نہیں ہیں، بلکہ یہ چار مکاتبِ فکر ہیں، قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کے لئے چار اصول ہیں، چنانچہ فقہ حنفی میں صرف امام اعظم کے قول پر فتوی نہیں دیا جاتا، متعدد مسائل میں امام اعظم کا قول موجود ہوتا ہے مگر فتوی ان کے شاگردوں کے قول پر دیا جاتا ہے، یہی حال باقی فقہوں کا ہے، مثلاً: مزارعت جائز ہے یا نہیں؟ مزارعت کے معنی ہیں: زمین بٹائی پر دینا، ہم نے اپنی زمین کسی کو دی کہ اس میں غلّہ بوؤ اور پیداوار آدھی آدھی، یا ایک تہائی تمہاری دو تہائی میری، یا برعکس، اس کو مزارعت کہتے ہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مزارعت جائز نہیں، امام شافعیؒ بھی یہی فرماتے ہیں، مگر فقہ حنفی میں فتوی امام اعظم کے قول پر نہیں، صاحبین کے قول پر ہے، صاحبین مزارعت کو جائز کہتے ہیں، اور فقہ شافعی میں بھی فتوی امام شافعیؒ کے قول پر نہیں، بلکہ ان کے شاگردوں کے قول پر ہے۔ غرض چاروں فقہوں میں قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کے لئے اصول ہیں جو اصولِ فقہ کہلاتے ہیں ان کی روشنی میں قرآن وحدیث سے خاص نہج پر مسائل مستنبط کئے جاتے ہیں، پس جو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ معین اشخاص کی رائیں ہیں، اور ان کی اتباع تقلید شخصی ہے وہ غلط سوچتے ہیں، یہ معین اشخاص کی تقلید نہیں بلکہ معین مکتب فکر کی تقلید ہے۔

اور نوافل وسنن میں رکوع وسجود اور قومہ وجلسہ میں بھی دعائیں مانگتے تھے، آنحضور ﷺ کی نماز تہجد کے بارے میں مروی ہے کہ آپ سجدہ پچاس آیتوں کے بقدر فرماتے تھے اور اس میں خوب دعائیں مانگتے تھے، صحابہ کا بھی یہی حال تھا بلکہ آج بھی عرب علماء نماز میں اپنی ساری ضرورتیں مانگ لیتے ہیں، آپ حضرات نے رمضان میں ائمہ حرمین کو وتروں میں پون گھنٹہ دعا کرتے سنا ہوگا، وہ دعائیں ان کی پہلے سے رٹی ہوئی اور یاد کی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ فی البدیہہ مانگی ہوئی ہوتی ہیں، ان کو اس پر قدرت ہے پس جب انھوں نے وتروں میں قعدہ میں، رکوع وسجود میں سب دعائیں مانگ لیں تو اب نمازوں کے بعد الگ سے دعا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے آنحضور ﷺ اور حضراتِ صحابہ کرام نمازوں کے بعد اجتماعی طور پر دعا نہیں مانگتے تھے۔

مگر جب اسلام عربوں سے نکل کر عجمیوں میں پہنچا تو ان کے لئے پریشانی کھڑی ہوئی، اللہ سے مانگنا ان کو بھی ہے، نہیں مانگیں گے تو بندوں کا اللہ سے مانگنے کا تعلق ٹوٹ جائے گا، پھر عبادتوں کا مغز دعا ہے نبی ﷺ کا ارشاد ہے: **الدعاء مُخُّ العبادة**: دعا عبادت کا مغز ہے، اگر بادام میں گری نہ ہو تو بادام بے کار ہے، اس بادام کی کوئی قیمت نہیں، اصل چیز گری ہے، اسی کی وجہ سے بادام کی قیمت ہے، اسی طرح عبادت میں اصل دعا ہے اس کی وجہ سے عبادت: عبادت ہے، دعا کے بغیر عبادت بے گری کی مونگ پھلی ہے اور عجمی لوگ نمازوں میں دعا مانگ نہیں سکتے، اپنی زبان میں مانگیں گے تو نماز ٹوٹ جائے گی، اور قرآن واحادیث کی دعائیں مانگیں گے تو عجمیوں کے حق میں وہ اذکار ہیں، اس لئے کہ وہ ان دعاؤں کو سمجھتے نہیں، جب وہ بے سمجھے دعائیں پڑھیں گے تو وہ دعا نہیں ہوگی اذکار ہونگے، دعا وہ ہے جسے بندہ سمجھ کر اللہ سے مانگے، یہ ایک بہت بڑی ضرورت عجمیوں کے سامنے تھی، اس لئے چاروں مکاتبِ فکر کے علماء نے اس کا حل یہ نکالا کہ نمازوں کے بعد دعائیں مانگ لیا کریں، البتہ اجتماعی ہیئت کو لازم نہ بنایا جائے، گاہ بہ گاہ ناغہ بھی کیا جائے، اور کوئی سلام پھیر کر چلا جائے تو اسے مطعون نہ کیا جائے، کوئی امام سے پہلے دعا شروع کردے یا امام کے بعد تک دعا میں مشغول رہے تو اس میں توسع برتا جائے، امام کے ساتھ دعا شروع کرنے کو اور

امام کے ساتھ دعا ختم کرنے کو لازم نہ بنایا جائے، ان باتوں کا خیال رکھ کر نمازوں کے بعد دعا مانگنا مستحب ہے، یہ چاروں فقہوں کے علماء کی رائے ہے اور عجمیوں کی ضرورت ہے، اس لئے اس کو حسن قرار دیا ہے۔

اللہ کو بندوں کا مانگنا پسند ہے

غرض میں یہ بیان کر رہا تھا کہ نمازوں کے بعد دعا مانگنا حسن اور اچھا ہے اس لئے کہ دعا عبادت کا خلاصہ، نچوڑ اور مغز ہے اور دعاؤں ہی کے ذریعہ بندوں کا اللہ کے ساتھ تعلق جڑتا ہے۔ اور اللہ کو بندوں کی سب سے زیادہ پسند چیز دعا ہے، اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ بندے اپنی تمام چھوٹی بڑی حاجتیں اپنے مولیٰ سے مانگیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو۔ ظاہر ہے چپل کی پٹی معمولی چیز ہے، کوڑیوں کے دام مل جاتی ہے مگر اسے بھی اللہ سے مانگنا ہے کیونکہ اللہ کو بندوں کا مانگنا پسند ہے، وہی بندہ اللہ کو پیارا ہے جو اللہ سے مانگتا ہے، چاہے اوندھا مانگے چاہے سیدھا، مگر مانگے ضرور!

اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ساتھ اس کی عقل وفہم کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں

مولانا روم رحمہ اللہ نے ایک واقعہ لکھا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کوہِ طور پر تشریف لے جا رہے تھے تو انھوں نے ایک چرواہے کو دیکھا، جو اپنی بکریاں چرا رہا تھا، وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اللہ سے دعا مانگ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا اے میرے خدا! تو کہاں ہے؟ اگر تو مجھے مل جائے تو میں تجھے اپنی بکریوں کا دودھ پلاؤں، اے میرے مولیٰ! تیرے سر میں جوئیں پڑ گئی ہوں گی میں تیرے سر میں سے جوئیں نکالوں، اے میرے خدا! ہوسکتا ہے تیرے گریبان میں بٹن نہ ہو میں ببول کے کانٹوں کا اس میں بٹن لگاؤں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اس کو اس طرح دعا کرتے سنا تو ڈانٹا، اس نے دعا بند کر دی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر پہنچے اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تو پہلی بات اللہ نے یہ فرمائی کہ موسیٰ! میرا ایک بندہ مجھ سے راز ونیاز کی باتیں کر رہا تھا تم نے اس کو کیوں روک دیا؟ اس

کا مبلغ علم اتنا ہی تھا، وہ اپنی دانست اور علم کے مطابق میری تعریف کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں۔

ایک گناہ گار کی بخشش کا واقعہ

خیر یہ تو ایک بے سند قصہ تھا مگر ایک اعلیٰ درجہ کی حدیث ہے، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: پچھلی امتوں میں ایک شخص تھا جس کی زندگی بہت خراب تھی، اس نے وصیت کی کہ مجھے جلا کر میری آدھی راکھ سمندر میں ڈال دینا اور آدھی ہوا میں اڑا دینا، تاکہ میں اللہ کے ہاتھ نہ آؤں، اگر میں اللہ کے ہاتھ آ گیا تو وہ مجھے اتنی سخت سزا دیں گے کہ اتنی سخت سزا کسی کو نہیں دی ہوگی، چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء نے اس کی وصیت کی تعمیل کی، اس کو جلا دیا، آدھی راکھ سمندر میں ڈال دی اور آدھی ہوا میں اڑا دی، اللہ نے راکھ کو حکم دیا اکٹھی ہو جا: ہو گئی، اور وہ زندہ ہو کر اللہ کے روبرو کھڑا ہو گیا، اللہ نے اس سے پوچھا: میرے بندے! تو نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس نے عرض کیا: پروردگار! آپ کے ڈر سے! اللہ نے اس کو بخشش دیا۔

یہ واقعہ حدیث میں ہے، اگر ایسا عقیدہ اللہ کے بارے میں کوئی سمجھ دار اور عقلمند رکھے تو وہ کافر ہو جائے گا، کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کے منافی عقیدہ ہے مگر وہ شخص زیادہ سمجھ دار نہیں تھا، اس لئے اس کے خیال کو کفر قرار نہیں دیا اور اللہ نے اس کو معاف کر دیا۔

اس حدیث کی وجہ سے علماء کرام نے فرمایا: ہر شخص کے ساتھ اس کی عقل وفہم کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔

جو خوش حالی میں مانگے وہ اللہ کو زیادہ پسند ہے

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ جل شانہ سے مانگا نہ جائے تو اللہ ناراض ہوتے ہیں، اللہ کو وہی بندہ پسند ہے جو مانگتا ہے اور خوب مانگتا ہے، بلکہ جو بندہ خوشحالی میں اللہ سے مانگتا ہے اللہ کو وہ بندہ زیادہ پسند ہے، تنگ حالی میں اللہ اس کی سنتے ہیں، اور جو لوگ خوشحالی میں اللہ سے نہیں مانگتے، اس کے سامنے نہیں روتے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے، کھانا

پینا، مکان، کپڑا اور ضرورت کی ہر چیز ہے، اللہ نے ان کو سب کچھ دے رکھا ہے اس لئے وہ مانگتے نہیں، وہ لوگ جب بیماریوں میں اور آفتوں میں پھنسیں گے اور یا اللہ یا اللہ پکاریں گے تو اللہ ان کی نہیں سنیں گے، اللہ کا بہترین بندہ وہ ہے جو خوشحالی میں اللہ کو پکارے، اس سے تعلق رکھے، اس سے دعائیں مانگے، اس کے سامنے گڑگڑائے تو مصیبتوں میں اللہ تعالیٰ اس کی پکار سنیں گے اور اس کی مراد پوری کریں گے۔

غرض اللہ سے اپنی آرزوئیں اور خواہشیں مانگنا بہت ضروری ہے اور یہ عبادت کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، جب عجمیوں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ وہ نماز میں اپنی مرادیں نہیں مانگ سکتے اور دعائیں نہیں کر سکتے تو علماء نے اس کا حل یہ نکالا کہ نماز کے بعد دعائیں مانگیں، اپنی اپنی زبانوں میں مانگیں، علماء نے اس کو مستحب کہا ہے۔

حسن ہونے کی دلیل

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ما رآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسنٌ: جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھی ہے۔ نمازوں کے بعد دعا کرنے کو چاروں مکاتبِ فکر کے علماء نے جن کی مسلمانوں کی بڑی تعداد تقلید کرتی ہے اچھا سمجھا ہے، پس نمازوں کے بعد دعا کرنا حسن ہے، اس کو بدعت کہنا صحیح نہیں۔

نمازِ جنازہ کے بعد دعا

بعض لوگوں نے نماز جنازہ کے بعد بھی دعا شروع کردی ہے، حالانکہ نماز جنازہ خود دعا ہے، میت کے لئے دعا کرنے ہی کے لئے نماز جنازہ مشروع کی گئی ہے، مگر جب لوگوں نے اس دعا کو سمجھا نہیں تو نماز جنازہ کے بعد بھی دعا شروع کردی۔ امام صاحب جہراً دعا کرتے ہیں، انھوں نے چند ربنا یاد کر رکھے ہیں جن کو نہ امام صاحب سمجھتے ہیں نہ لوگ، بس جہاں سانس ٹوٹتا ہے لوگ آمین کہتے ہیں، یہ ایک رسم بن کر رہ گئی ہے، حالانکہ نماز جنازہ خود کامل دعا ہے، اس کے بعد کسی دعا کی ضرورت نہیں، جنازہ کی ایک چھوٹی سی دعا

ہے ہر شخص اس کو یاد کر سکتا ہے، پس وہ دعا کافی ہے اس کے بعد میت کو دفن کر دینا چاہئے، اب دوسری دعا کی ضرورت نہیں۔

تدفین کے بعد دعا

پھر تدفین کے بعد دعا ہے، ابوداؤد میں حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب ایک میت کی تدفین سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: اپنے بھائی کے لئے مغفرت طلب کرو، اور خاص طور پر یہ دعا کرو کہ اب جو سوال وجواب ہونگے اللہ تعالیٰ ان میں اس کو ثابت قدم رکھیں اور صحیح جواب دینے کی توفیق عطا فرمائیں۔ لوگوں کے قبر سے ہٹتے ہی سوال وجواب شروع ہونگے، لہٰذا میت کے لئے دو دعائیں کرنی چاہئیں، ایک: اس کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ بخش دیں دوسری: اس سے جو تین سوال ہونگے ان کے صحیح جواب دینے کی اللہ توفیق عطا فرمائیں۔ اور ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا ضروری نہیں۔ ابوداؤد کی حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ نبی ﷺ تدفین کے بعد اجتماعی اور جہری دعا نہیں کرتے تھے، ورنہ صحابہ کو تلقین کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیوبند سہارن پور میں یہی معمول ہے، میں پچاس سال سے دیکھ رہا ہوں، جب قبر بھر جاتی ہے تو ایک آدمی قبر کے سرہانے اور پائینتی کھڑے ہو کر سورۂ بقرہ کا اول وآخر پڑھتا ہے، اس وقت سب لوگ قبر کے پاس آجاتے ہیں اور ہر شخص اپنے طور پر مذکورہ دو دعائیں کرتا ہے، پھر لوگ چل دیتے ہیں۔

ایک مقصد ہو تو جہراً اجتماعی دعا مانگنا جائز ہے

فرض نمازوں کے بعد دعا مانگنی چاہئے، اللہ تعالیٰ سے اپنی آرزوئیں مانگنی چاہئیں، اور ہر شخص اپنی دعا خود مانگے، مقتدیوں کا امام کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سلام پر ختم ہو جاتا ہے، اب ہر شخص آزاد ہے، اس کو اپنے لئے دعا کرنی ہے، اور اپنی آرزوئیں مانگنی ہیں اور اپنی زبان میں مانگنی ہے اور سمجھ کر مانگنی ہے، البتہ اگر حاضرین کا ایک مقصد ہو مثلاً بارش نہیں ہو رہی اور بارش طلبی کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں، یا کوئی آفت اور مصیبت آئی ہے اس کے لئے دعا

مانگنی ہے تو چونکہ سب کی مراد ایک ہے اس لئے اجتماعی طور پر جہراً دعا کرنا جائز ہے، حدیث سے ثابت ہے۔

نمازوں کے بعد دعا کب کی جائے؟

اور یہ بات بھی جان لی جائے کہ جن تین نمازوں کے بعد سنتیں اور نوافل ہیں، ان میں فرض کے بعد مختصراً اذکار ہیں۔ دعا نوافل سے فارغ ہو کر ہر ایک کو کرنی چاہئے، اس کے لئے ہیئتِ اجتماعی نہ بنائی جائے، کیونکہ سب نمازی نوافل سے ایک ساتھ فارغ نہیں ہوتے، ہر شخص جب فارغ ہو دعا کرے، سب کا ایک ساتھ دعا کرنا جس کو دعائے ثانیہ کہتے ہیں بدعت ہے۔ اور فجر اور عصر کے بعد چونکہ نوافل نہیں، اس لئے تسبیحات سے فارغ ہو کر دعا کریں، اور ہر شخص جب فارغ ہو جائے دعا شروع کر دے، امام صاحب کے ہاتھ اٹھانے کا انتظار نہ کرے، ہیئتِ اجتماعی نہ بنائیں، اور جب کسی کی دعا ختم ہو تو منہ پر ہاتھ پھیر لے، امام صاحب کے فارغ ہونے کا انتظار نہ کرے۔ اور کسی کو یا امام کو یا مقتدی کو کوئی ضرورت ہو تو وہ دعا کے بغیر بھی جا سکتا ہے، پس التزام اور ہیئتِ اجتماعی نہ ہو، مگر دعا ضرور کی جائے، سری کی جائے، اور ہر شخص اپنی زبان میں اپنے دل کی مراد مانگے۔

دعا بند کرنا غلطی کی اصلاح نہیں، بلکہ دوسری غلطی ہے

سلفی کہتے ہیں: اب نمازوں کے بعد دعا کا التزام ہو گیا ہے، اس لئے اس کو بند کر دینا ضروری ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے عدم دعا کا التزام شروع کر دیا ہے، لہٰذا اس کو بھی بند کرنا ضروری ہے۔

ثانیاً: اصلاح کا یہ طریقہ نہیں کہ اللہ سے مانگنا بند کر دیا جائے، یہ تو دوسری غلطی ہے، پہلی غلطی التزام دعا تھی، دوسری غلطی ترک دعا ہے، بلکہ اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ امام صاحب وقتاً فوقتاً لوگوں کو مسئلہ سمجھائیں اور گاہ بہ گاہ اس پر عمل کر کے بھی دکھائیں۔ ان شاء اللہ ایسا کرنے سے لوگ صحیح بات سمجھ لیں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

﴿۵﴾

جمعہ وعیدین کے خطبے عربی میں کیوں ضروری ہیں؟

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ جمعہ کا خطبہ عربی میں کیوں ضروری ہے؟ عربی کے بجائے اگر انگلش میں خطبہ دیا جائے تو اس میں حرج کیا ہے؟ اس میں انگلش کی تخصیص کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں بے شمار زبانیں ہیں، لہٰذا انگلش کی تخصیص نہ کی جائے مسئلہ عام پوچھا جائے کہ عربی کے علاوہ دنیا کی کسی بھی زبان میں جمعہ کا خطبہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور جمعہ کی تخصیص کی بھی ضرورت نہیں، عیدین کا بھی یہی حکم ہے، اور اگر دائرہ ذرا وسیع کیا جائے تو نماز میں قرآن پڑھنے کے بارے میں بھی یہی سوال ہو سکتا ہے کہ عربی کے علاوہ دوسری زبان میں نماز میں قرآن کریم پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ قرآن کریم لوگوں کے لئے راہ نما کتاب بن کر نازل ہوا ہے اور ساری دنیا کے لوگ عربی نہیں جانتے الگ الگ زبانیں بولتے ہیں، پس اگر ان کے سامنے نمازوں میں قرآن کریم عربی میں پڑھا جائے گا تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا، بس ہاتھ باندھے کھڑے رہیں گے، پس کیوں نہ ان کی زبان میں ترجمہ پڑھا جائے، تا کہ وہ کچھ سمجھیں اور اس پر عمل کریں، لہٰذا سوال میں دو تعمیم کرنی چاہئیں، ایک: انگلش کے ساتھ مسئلہ خاص نہیں کرنا چاہئے، دوسرا: جمعہ کے خطبہ کے ساتھ بھی خاص نہیں کرنا چاہئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مسئلہ کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو یہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ دنیا کی کسی بھی زبان میں پڑھا جائے تو تعامل، اجماع امت اور توارث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ غیر عربی زبان میں خطبہ پڑھنے کی صورت میں اللہ کا

ذکر متحقق ہوا یا نہیں؟ اگر ہوا تو جمعہ صحیح ہے اور نہیں ہوا تو جمعہ صحیح نہیں، جیسے آج کل سیاسی تقاریر میں شروع سے آخر تک کہیں اللہ کا نام نہیں آتا تو اگر امام نے ایسا خطبہ دیا جس میں اللہ کا کہیں کوئی ذکر نہیں آیا، خواہ عربی میں دیا یا غیر عربی میں، تو مسئلہ یہ ہے کہ خطبہ نہیں ہوا اور جب خطبہ نہیں ہوا تو جمعہ کی نماز بھی صحیح نہیں ہوئی، وقت کا فرض: ظہر ذمہ پر باقی رہے گا، کیونکہ قرآن کریم میں ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَيْعِ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن تمہیں نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور جس کاروبار میں ہو اس کو چھوڑ دو۔ اس آیت میں اللہ نے ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (اللہ کے ذکر کی طرف چلو) فرمایا ہے، بلایا گیا ہے نماز کی طرف ﴿إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ﴾ اور چلایا جا رہا ہے اللہ کے ذکر کی طرف ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾، اور اللہ کا ذکر: خطبہ ہے، اور یہ خطبہ چونکہ نماز سے پہلے دیا جاتا ہے اس لئے جلدی چلو اور جا کر خطبہ سنو، پھر جس نماز کے لئے بلایا گیا ہے اس کو پڑھو۔

غرض اس آیت میں اللہ نے خطبہ کو ذکر اللہ سے تعبیر کیا ہے، اس لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر خطبہ میں اللہ کا ذکر آیا تو خطبہ محسوب ہوگا اور جمعہ کی نماز صحیح ہوگی اور اگر سیاسی تقریر کی طرح پورے خطبہ میں کہیں اللہ کا ذکر نہیں آیا تو خطبہ نہیں ہوا اور جب خطبہ نہیں ہوا تو جمعہ بھی نہیں ہوا، اور جب جمعہ نہیں ہوا تو وقت کا فرض باقی رہ گیا، اور اگر ایک دو جملے ذکر کے آگئے تو خطبہ محسوب ہوگا، حساب میں آئے گا اور جب خطبہ حساب میں آئے گا تو جمعہ بھی صحیح ہو جائے گا، اور غیر عربی میں خطبہ چونکہ تعامل اور توارث کے خلاف ہے، اس لئے تعامل و توارث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہوگا یعنی غیر عربی میں خطبہ دینے کا گناہ ہوگا البتہ نماز صحیح ہو جائے گی۔

خطبہ کا مقصد کیا ہے؟

یہ جو میں نے دو مسئلے بتائے ان کو اکثر لوگ جانتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جب اکثر لوگ جانتے ہیں تو بتائے کیوں؟ اس لئے بتائے کہ لوگوں کے ذہنوں میں خطبہ کے پس منظر کو لے

کر ایک اشکال ہے، اور وہ اشکال یہ ہے کہ خطبہ نماز تو نہیں، پس اگر عربی کے بجائے کسی اور زبان میں خطبہ دیا جائے، درانحالیکہ خطبہ کا مقصد لوگوں کو ہر ہفتہ نصیحت کرنا ہے، تو اس مقصد کے پیش نظر اگر کسی بھی زبان میں خطبہ دے دیا جائے تو مکروہ تحریمی کیوں ہے؟ جائز ہونا چاہئے اور نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہونا چاہئے، یہ لوگوں کے ذہن میں بیٹھا ہوا ہے، جب تک اس اشکال کا جواب نہیں دیا جائے گا تب تک سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آئے گا۔

تلاوت قرآن اور نماز کا اصل مقصد ذکر اللہ ہے

بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ جو ہم نے طے کیا ہے کہ جمعہ کے خطبہ کا مقصد ہر ہفتہ لوگوں کو نصیحت کرنا ہے یہ بات غلط ہے، بتاؤ قرآن کریم کا اصل مقصد کیا ہے؟ اصل مقصد یہ ہے کہ قرآن اللہ کا ذکر ہے، چاہے قرآن سمجھو یا نہ سمجھو قرآن پڑھنا ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾: بلاشبہ قرآن ہم نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْر﴾ کہا، إنا نحن نزل القرآن: نہیں کہا، قرآن کو الذکر سے تعبیر کیا کیونکہ قرآن کریم کا اصل مقصد اللہ کا ذکر ہے، چنانچہ جو عربی سمجھتا ہے اسے بھی قرآن پڑھنا ہے اور جو نہیں سمجھتا اسے بھی قرآن پڑھنا ہے، اور دونوں کو ہر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملیں گی۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ قرآن کا اصل مقصد اللہ کی جانب راہ نمائی کرنا ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ﴾: قرآن لوگوں کے لئے گائڈ بک بنا کر اتارا گیا ہے اور میرے پاس گائڈ بک اگر انگلش میں ہوگی تبھی میں سمجھوں گا عربی میں ہوئی تو کیا خاک سمجھوں گا عربی تو مجھے آتی نہیں، قرآن سمجھے گا تبھی وہ کتاب ہدایت ہوگی، ایک بندہ بغیر سمجھے پڑھ رہا ہے اور ایک بندہ سمجھ کر پڑھ رہا ہے دونوں کے پڑھنے میں آسمان و زمین کا فرق ہوگا، اگرچہ نیکیاں دونوں کو برابر ملیں گی مگر اِس کے لئے قرآن راہ نما بنے گا اور اُس کے لئے نہیں بنے گا، پس معلوم ہوا کہ قرآن کا اصل مقصد لوگوں کے لئے راہ نما بننا ہے۔

جواب: راہ نما بننا یعنی قرآن سے نصیحت حاصل کرنا ثانوی مقصد ہے، دوسرے درجہ کا مقصد ہے، اور نصیحت براہ راست بھی حاصل ہوتی ہے اگر آدمی عربی جانتا ہے اور اگر عربی نہیں جانتا تو بالواسطہ حاصل ہوتی ہے، دنیا کی ہر زبان میں ترجمے ہوگئے ہیں وہ اسی لئے کئے گئے ہیں کہ جو عربی نہیں جانتے وہ ان کی مدد سے نصیحت حاصل کریں، معلوم ہوا کہ نصیحت براہ راست حاصل کرنا ضروری نہیں بالواسطہ ترجمہ کی مدد سے بھی نصیحت حاصل کی جاسکتی ہے، اس لئے کہ نصیحت حاصل کرنا دوسرے درجہ کا مقصد ہے پہلے درجہ کا مقصد ذکر ہے، اسی لئے فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾: پس جب ذکر مقصود ہے تو عربی میں ہی قرآن پڑھنا ضروری ہے، چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور جہاں نصیحت مقصود ہو وہاں اگر عربوں کا مجمع ہے تو آپ عربی پڑھ کر سنائیے، اردو انگریزی کا مجمع ہو تو ترجمہ پڑھ کر اردو انگریزی میں سنائیے لوگوں کو نصیحت حاصل ہوگی۔

اسی طرح نماز کا مقصد قرآن میں مختلف جگہوں پر بیان کیا گیا ہے، سورہ طٰہ کے شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے، اس میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنایا تو کوہ طور پر اللہ تعالیٰ اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان مکالمہ ہوا، اس میں اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي﴾: مجھے یاد کرنے کے لئے نماز کا اہتمام کیجئے، یہاں سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل مقصد اللہ کو یاد کرنا ہے، اکیسویں پارے کے شروع میں حضور اکرم ﷺ کو اللہ نے حکم دیا ہے: ﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾: نماز کا اہتمام کریں، ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾: نماز بے حیائی کے کاموں سے اور بری باتوں سے روکتی ہے، یہ نماز کا ایک فائدہ ہوا اور یہ ثانوی درجہ کا فائدہ ہے، ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾: اور اللہ کی یاد اس سے بڑا فائدہ ہے، یعنی فحشاء اور منکر سے روکنے کے فائدہ سے بڑا فائدہ نماز کا یہ ہے کہ یہ اللہ کی یاد ہے۔ ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ نماز کا اصل مقصد ذکر اللہ ہے، اور جب ذکر اللہ مقصد ہے تو آپ نماز میں غیر عربی میں قرآن نہیں پڑھیں گے، اور نماز سے باہر جیسے میں وعظ کہہ رہا ہوں اس کا مقصد چونکہ ذکر اللہ نہیں بلکہ نصیحت کرنا ہے اس لئے ضروری نہیں کہ میں عربی ہی میں قرآن پڑھوں، آیت کریمہ کا ترجمہ بھی کافی ہے۔

خطبہ کا مقصد بھی ذکر اللہ ہے

جیسے نماز اور تلاوت کا مقصد ذکر اللہ ہے ایسے ہی خطبہ کا مقصد بھی ذکر اللہ ہے، میں نے خطبہ میں آیت پڑھی: ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾: اللہ کے ذکر کی طرف چلو، اللہ نے اس آیت میں ﴿فَاسْعَوْا إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ کہا، فاسعوا إلى الخطبة نہیں کہا، اسی وجہ سے خطبہ میں ذکر اللہ ضروری ہے اگر سیاسی تقریر کی طرح خطبہ دیا تو وہ نہیں گنا جائے گا، حالانکہ عربی میں اسے بھی خطبہ کہتے ہیں، مگر اس سے جمعہ کا خطبہ ادا نہیں ہوگا، تو جب آیت کریمہ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ خطبہ کا بنیادی مقصد اللہ کا ذکر ہے تو اب آپ کو خطبہ عربی میں دینا ہوگا اور خطبہ کا جو ثانوی مقصد ہے نصیحت حاصل کرنا اس کو کسی اور طرح حاصل کرنا ہوگا خطبہ سے پہلے خطیب صاحب منبر کے پاس کھڑے ہوجائیں اور مقامی زبان میں نصیحت کریں، جب خطبہ کا یہ ثانوی مقصد کسی اور طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے تو ضروری نہیں کہ آپ حضور ﷺ کے زمانہ سے جو سلسلہ چلا آرہا ہے اس کو بدل دیں، اور اگر اس کو بدلنا ہے تو پھر نماز میں بھی بدل دو، نماز میں بھی انگریزی میں قراءت کرو تاکہ لوگ قرآن کو سمجھیں اور نصیحت حاصل کریں۔

صحابہ نے اپنے سوسالہ دور میں کبھی غیر عربی میں خطبہ نہیں دیا

جزیرۃ العرب حضور ﷺ کے زمانہ میں فتح ہوگیا تھا، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾: اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ اللہ کے دین میں جوق جوق داخل ہو رہے ہیں۔ اس سے جزیرۃ العرب کے لوگ مراد ہیں، جزیرۃ العرب کے لوگ اس بات کے انتظار میں تھے کہ مکہ اور مدینہ والوں میں جو جنگ ہو رہی ہے، اس میں جیت کس کی ہوتی ہے؟ وہ یہ سمجھتے تھے کہ کعبہ شریف پر جس کا قبضہ ہے وہ برحق ہے، اور اب تک کعبہ شریف پر قبضہ قریش کا چلا آرہا ہے اس لئے ان کا ہاتھ اوپر ہے، لیکن اب جو جنگ شروع ہوئی ہے وہ کہاں جا کر رکے گی؟ یہاں پہنچ کر رکے گی کہ کعبہ پر ایک کا قبضہ ہوگا اور

دوسرا قبضہ کرنے کے لائق نہیں رہے گا، جب آٹھ ہجری میں مکہ مکرمہ فتح ہوا اور سارا مکہ مسلمان ہوگیا تو سارے عرب نے دیکھ لیا کہ اگر مشرکین حق پر ہوتے تو حضور ﷺ کا قبضہ نہ ہوتا اور مکہ والے مسلمان نہ ہوتے لیکن حضور ﷺ کا قبضہ ہوگیا اور مکہ والے مسلمان بھی ہوگئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام برحق ہے، اس کے بعد پورے جزیرۃ العرب سے مسلمان ہونے کے لئے پے درپے وفود آنے لگے، بعض دفعہ اسّی اسّی وفود آئے ہیں، یہی وہ ﴿وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا﴾ ہے، لیکن جزیرۃ العرب سے باہر کے لوگوں سے ابھی تک کوئی معاملہ نہیں ہوا تھا، نبی پاک ﷺ نے اپنی وفات سے ایک سال پہلے جزیرۃ العرب سے باہر کے تمام ملکوں کے سربراہوں کی طرف دعوتی خطوط ارسال فرمائے ہیں، چھوٹا ہو یا بڑا، سپر پاور ہو یا غیر سپر پاور، کوئی ملک باقی نہیں رہا تھا پھر ایک سال مشکل سے گذرا تھا کہ حضور ﷺ کی وفات ہوگئی، حضور ﷺ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے زمانہ میں ان ممالک کے ساتھ جنگیں شروع ہوئیں، بعض بغیر جنگ کے تابع ہوگئے اور بعض کے ساتھ بڑے سخت معرکے پیش آئے، بالآخر ایران جو سپر پاور تھا وہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور دوسرا سپر پاور روم پیچھے ہٹتے ہٹتے قسطنطنیہ تک چلا گیا، پھر صحابہ آگے نہیں بڑھے کیونکہ آگے ٹھنڈے علاقے تھے اور صحابہ گرم ملکوں کے رہنے والے تھے۔

مجھے بتانا یہ ہے کہ صحابہ نے یہ جتنے ملک فتح کئے ہیں، یہ سب غیر عربی ملک تھے یہاں عربی نہیں بولی جاتی تھی اور صحابہ کے زمانہ میں ملک فتح ہونے کے بعد اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیلا تھا مگر صحابہ نے اپنے سوسالہ دور میں کبھی مقامی زبان میں خطبہ نہیں دیا حالانکہ اس وقت مقامی زبان میں خطبہ دینے کی ضرورت تھی، علاقے کے علاقے نئے مسلمان ہوئے تھے ان کو ان کی زبانوں میں دین پہنچانا ضروری تھا مگر کسی صحابی نے ایک جگہ بھی غیر عربی میں خطبہ نہیں دیا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا طرز عمل

ترمذی شریف میں ابواب السیر کی سب سے پہلی روایت ہے، ایک لشکر تھا جس کے

کمانڈر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تھے، فارسی حضرت کی مادری زبان تھی، اس لشکر نے فارس کے ایک قلعہ کا محاصرہ کیا، قلعے والے بھی فارسی بولنے والے تھے اور مسلمانوں کا کمانڈر بھی فارسی جانتا تھا، فوج نے کہا: ألا ننهد إليهم: آپ اجازت دیں ہم ان پر دھاوا بول دیں، حضرت سلمانؓ نے فرمایا: ابھی رکو، مجھے نبی پاک ﷺ کے طریقہ پر عمل کرنے کا موقعہ دو، جنگ شروع کرنے سے پہلے آپؐ اسلام کی دعوت دیتے تھے، میں بھی پہلے ان کو اسلام کی دعوت دوں گا، چنانچہ حضرت سلمانؓ ساتھیوں کی ایک جماعت لے کر قلعے کے پاس گئے، وہ اوپر تھے یہ نیچے ہیں، آپس میں بات چیت ہوئی، وہ لوگ فارسی میں بول رہے ہیں اور حضرت عربی بول رہے ہیں، اِس کا ترجمہ اُدھر ہو رہا ہے اور اُس کا ترجمہ اِدھر ہو رہا ہے، حضرت سلمانؓ فارسی جانتے تھے مگر فارسی نہیں بول رہے، دوران گفتگو جب جزیہ کی دعوت دی تو آیت جزیہ پڑھی، حضرت نے خود پڑھی، اس آیت میں ﴿وَأَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ آیا ہے، لوگ اس کا ترجمہ ایسا کرتے ہیں کہ سنتے ہی سامنے والے کے دماغ پر ہتھوڑا پڑتا ہے، ترجمہ یہ کرتے ہیں: درانحالیکہ تم ذلیل ہو، تو ذلیل ہونا کون پسند کرے گا؟ جب حضرت نے یہ آیت پڑھی تو ساری آیت کا ترجمہ تو مترجم نے کیا مگر ﴿وَأَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ کا ترجمہ حضرت نے خود فارسی میں کیا جس کا عربی ترجمہ حدیث میں وَأنتم غير محمودين آیا ہے، یعنی تمہیں اسلام قبول کرنا چاہئے تا کہ ہمارے اور تمہارے حقوق برابر ہوجائیں، جزیہ قبول کر کے ہمارے ملک میں رہنا کوئی پسندیدہ بات نہیں، کتنا شاندار ترجمہ کیا، پھر آگے لمبی حدیث ہے۔ مجھے اس حدیث سے یہ بتانا ہے کہ حضرت سلمانؓ فارسی جانتے ہیں اور ﴿وَأَنْتُمْ صَاغِرُوْنَ﴾ کا ترجمہ وہ خود فارسی میں کر رہے ہیں، لیکن فارسی جاننے کے باوجود گفتگو آپ عربی میں فرما رہے ہیں، اس میں کوئی حکمت ہے تبھی آپ ایسا کر رہے ہیں، ایسا آپ بلاوجہ ایسا نہیں کر سکتے۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا واقعہ

جس زمانہ میں ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ جنگ آزادی چل رہی تھی کانگریس

کے صدر مولانا ابو الکلام آزاد کسی معاملہ میں گفتگو کے لئے ہندوستان کے وائسرائے کے پاس تشریف لے گئے، وائسرائے بہترین اردو جانتا تھا اور مولانا ابو الکلام آزاد بہترین انگریزی جانتے تھے، گفتگو شروع ہوئی، مولانا اردو میں بول رہے ہیں، اور مترجم انگریزی میں ترجمہ کر کے وائسرائے کو سنا رہا ہے، وائسرائے انگریزی میں جواب دے رہا ہے، اور مترجم اردو میں ترجمہ کر کے مولانا کو سنا رہا ہے، سوچو آخر دونوں ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ مولانا انگریزی جانتے ہیں تو انگریزی میں کیوں نہیں بولتے ان کو انگریزی میں گفتگو کرنی چاہئے تھی تاکہ وائسرائے پر رعب پڑے، اور وائسرائے اردو جانتا تھا تو وہ اردو میں کیوں نہیں بولتا؟ اس کو اردو بولنی چاہئے تھی تاکہ مولانا آزاد پر اس کی قابلیت کا کچھ اثر پڑے، مگر نہ تو وائسرائے اردو بولتا ہے اور نہ مولانا انگریزی بولتے ہیں، دوران گفتگو مترجم نے مولانا کی کسی بات کا صحیح ترجمہ نہیں کیا مولانا نے اسے ٹوکا کہ آپ ترجمہ میں جو بات کہہ رہے ہیں وہ میں نہیں کہہ رہا، میں یہ کہہ رہا ہوں، وائسرائے بھی سب سمجھ رہا تھا کیونکہ وہ اردو جانتا تھا وائسرائے نے کہا: مولانا! جب آپ انگریزی جانتے ہیں تو مجھ سے انگریزی میں گفتگو کیوں نہیں کرتے؟ دیکھو کہاں جا رہا ہے؟ مولانا بھی تو یہ کہہ سکتے تھے کہ جب آپ اردو جانتے ہیں تو مجھ سے اردو میں گفتگو کیوں نہیں کرتے، مگر وہ نیچے اترنا نہیں چاہتا اس لئے مولانا سے کہہ رہا ہے کہ آپ براہ راست مجھ سے انگریزی میں گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ مولانا آزاد نے جواب دیا: جناب! اگر میں آپ سے انگریزی میں گفتگو کروں تو میری انگریزوں سے لڑائی کیا رہی؟ جب میں ان کی زبان بولنے لگا تو اب میری ان سے کوئی لڑائی نہیں رہی، یہی وہ دور تھا جب ہندوستان کے بڑے بڑے مفتیوں نے فتوی دیا تھا کہ انگریزی سیکھنا حرام ہے، انگریزی فوج میں ملازمت حرام ہے برطانیہ کی مصنوعات حرام ہیں، یہ سب فتوے اس زمانہ کے تھے اور کسی ضرورت اور مصلحت سے تھے، کیونکہ جنگ آزادی چل رہی تھی اگر اس زمانہ میں ہم ان کی مصنوعات پہن رہے ہوں، فوج میں بھی ملازمت کر رہے ہوں تو پھر ہماری انگریزوں کے ساتھ لڑائی کیا رہی؟

بہر حال مجھے اس واقعہ میں مولانا آزاد کا یہ جملہ سنانا تھا کہ اگر میں آپ سے انگریزی

میں گفتگو کروں تو میری انگریزوں سے لڑائی کیا رہی؟ اس واقعہ میں ٹھنڈے دل سے سوچو کہ وائسرائے اردو جاننے کے باوجود اردو کیوں نہیں بول رہا، مولانا انگریزی جاننے کے باوجود انگریزی کیوں نہیں بول رہے؟ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ والے واقعہ میں حضرت سلمانؓ فارسی جاننے کے باوجود فارسی کیوں نہیں بول رہے؟ ﴿إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِأُوْلِي الْأَلْبَابِ﴾ ان قصوں میں عقل رکھنے والوں کے لئے نصیحت ہے، اور سمجھنے والوں کے لئے سبق ہے، کوئی اگر نہ سمجھے تو میں کیا کروں۔

جو علاقے صحابہ نے فتح کئے وہ آج عرب ممالک ہیں

وہ علاقے جن کو صحابہ نے فتح کیا تھا وہ آج عرب ممالک ہیں، اور جو ملک صحابہ کے بعد فتح ہوئے وہ عرب ممالک نہیں بنے، یہ ہمارا ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، بخاری، سمرقند، تاشقند وغیرہ سارے علاقے صحابہ کے بعد فتح ہوئے اور عرب ممالک نہیں بن سکے کیونکہ صحابہ نے جو علاقے فتح کئے تھے وہاں ہر چیز میں عربی زبان داخل کی تھی، جب ہر چیز میں عربی زبان داخل کی تو لوگوں کو جھک مار کر عربی زبان سیکھنی پڑی، اور جب سارے لوگ عربی زبان سیکھنے پر مجبور ہوئے تو یہ علاقے عرب ممالک بن گئے، اور ہماری طرف کے علاقوں میں سندھ تک محمد بن قاسم آئے، آگے ان کی پیش رفت نہیں ہوئی ولید نے ان کو مروا دیا، بہت دنوں تک معاملہ یوں ہی رہا، پھر افغانستان کی طرف سے فاتحین آئے، وہ رنگون برما تک فتح کرتے چلے گئے، مگر فتح کرنے کے بعد انہوں نے زبان فارسی رکھی، وہ جب تک رہے فارسی خوب چلی، ہندو تک بہترین فارسی جانتے تھے، گلستان اور بوستان کی شرح ہندو کی بھی ہے، لیکن جب ان کی حکومتیں ختم ہوئیں تو فارسی سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی چنانچہ ان کی زبان بھی ان کی حکومت کے ساتھ گئی، اگر انہوں نے عربی شروع کی ہوتی تو یہ سب ممالک عرب ہوتے، اس فرق کو سمجھو کہ جو علاقے صحابہ نے فتح کئے وہ آج عرب ملک ہیں اور صحابہ کے بعد جو فتح ہوئے وہ آج عرب ملک نہیں ہیں، کیونکہ صحابہ نے ہر چیز عربی میں رکھی تھی، خطبے عربی میں، قرآن عربی میں، نماز عربی میں، درس عربی میں، ہر چیز عربی میں

رکھی تو لوگوں کو لامحالہ عربی سیکھنی پڑی، اور سارے علاقے عربی بن گئے، اور بعد میں لوگوں نے اپنی اپنی زبانیں آگے بڑھائیں اور عربی کو پیچھے کر دیا، نتیجہ میں ان کی زبانیں جب تک وہ رہے رہیں، وہ گئے تو ان کی زبان بھی گئی اور عربی پیچھے کی پیچھے رہ گئی۔ اس مسئلہ کو اور سمجھو۔

مقام نمود میں زبان کا ظہور ضروری ہے

ہر مذہب اور ہر حکومت کی ایک زبان ہوتی ہے، اور نمود کی جگہوں میں اسی کو سامنے لانا پڑتا ہے، اگر ایسا کریں گے تو وہ حکومت چلے گی اور وہ مذہب باقی رہے گا، اور اگر حکومت کی زبان نمود کی جگہوں میں نہ لائی گئی، مذہب کی زبان نمود کی جگہوں میں نہ لائی گئی تو نہ وہ حکومت باقی رہے گی اور نہ وہ مذہب، اس کی مثال لو! ہندوازم بہت پرانا مذہب ہے، کتنا پرانا؟ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کتنا پرانا ہے! کچھ محققین کا خیال ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے لڑکوں پر جو کتابیں نازل ہوئی تھیں انہی کتابوں کے یہ ماننے والے ہیں ان کے بعد کوئی نبی ان میں نہیں آیا، یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو، بہر حال اتنی بات صحیح ہے کہ یہ بہت پرانا مذہب ہے ان کی مذہبی زبان سنسکرت ہے، مگر ایک لمبے عرصے سے نمود کی جگہوں میں سنسکرت نہیں رہی چنانچہ دنیا سے سنسکرت مٹ گئی، آج کل ہندوستانی حکومت اس زبان کو زندہ کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے اس کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی ہیں مگر کہیں دو چار سادھو اس زبان کو جانتے ہوں تو جانتے ہوں ورنہ عام ہندو اس زبان کو نہیں جانتے، ایسا مقام نمود میں اس زبان کو نہ لانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ یہودی اور عیسائی ہیں ان کی تورات اور انجیل سریانی زبان میں نازل ہوئی تھیں لیکن آج پوری دنیا میں سریانی زبان کہیں نہیں، یہود و نصاریٰ بھی نہیں جانتے، پھر دوسری زبان آئی ہبرو یعنی عبرانی، یہ زبان باقی ہے اور ان کی تالمود وغیرہ عبرانی زبان میں ہیں، مگر ان کے زیادہ تر بشپ اور پادری عبرانی بھی نہیں جانتے، کیونکہ یہ زبان بھی نمود کی جگہوں میں نہیں آئی، چنانچہ زمانہ آگے بڑھا تو ان زبانوں کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں رہا، اور جب مذہب کی بنیادی زبان ختم ہو جائے تو مذہب اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہ سکتا، اسی وجہ سے ہندوازم اور یہودیت وعیسائیت آج اپنی اصلی

حالت پر باقی نہیں رہے۔

دوسری مثال: اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر حکومت کی ایک سرکاری زبان ہوتی ہے، اور ملک میں دیگر رائج زبانوں کو بھی حکومت قبول کرتی ہے، جیسے ہندوستان میں سرکاری زبان ہندی ہے اور اس کے علاوہ چودہ زبانیں ہیں جن کو حکومت نے مان رکھا ہے اور نوٹ پر وہ چودہ زبانیں لکھی جاتی ہیں مگر سرکاری زبان ایک ہی ہے اور وہ ہندی ہے، اور ہندوستان کا جو جنوبی علاقہ ہے، تمل ناڈو، مدراس، کیرالہ وغیرہ وہاں کوئی ہندی کا ایک لفظ نہیں جانتا، وہاں ان کی اپنی زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن اگر آپ وہاں جائیں اور ٹرین اسٹیشن پر پہنچ کر رکے تو آپ دیکھیں گے کہ بورڈ پر سب سے اوپر ہندی میں نام لکھا ہوگا پھر نیچے انگریزی اور مقامی زبانوں میں لکھا ہوگا، یہی ہے مقام نمود میں زبان کو ظاہر کرنا، اسی طرح سے کورٹ میں، دفتروں میں، ہر جگہ مقامی زبان سے اوپر آپ کو ہندی ملے گی، اگر سرکاری زبان ہندی اس طرح مسلط نہیں کی جائے گی تو پورا ہندوستان ایک حکومت کے ماتحت نہیں رہے گا، مقامی زبانوں کے حساب سے الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ جائے گا۔

یہ جو دو مثالیں میں نے دی ہیں ان کو سامنے رکھو اور غور کرو کہ اسلام کی مذہبی زبان کونسی ہے؟ عربی ہے! پس اس کو باقی رکھنے کے لئے نمود کی جگہوں میں اس کو لانا ضروری ہے، نمود کی جگہیں کیا ہیں؟ ہر ساتویں دن جمعہ کا خطبہ ہوتا ہے اور امام صاحب ڈٹ کر خطبہ دیتے ہیں، مگر سمجھ کوئی نہیں رہا، ہاں اتنا سب سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہماری زبان ہے، امام صاحب نماز میں عربی میں قراءت کر رہے ہیں، مسجد میں کوئی نہیں سمجھ رہا مگر سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہمارا قرآن ہے اور اسی زبان میں یہ نازل ہوا ہے، عیدین کے اجتماع سال میں دو دفعہ ہوتے ہیں جب خطیب کھڑا ہو کر عربی میں دندناتا ہے تو چاہے لوگ کچھ نہ سمجھیں مگر اتنا سب سمجھیں گے کہ یہ ہماری مذہبی زبان ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے: **نزل القرآن فی الحجاز**: قرآن حجاز میں اترا، **وقرئ فی مصر**: مصری جتنا شاندار قرآن پڑھتے ہیں اتنا شاندار دنیا میں کوئی نہیں پڑھتا، **وفُهِمَ فی الهند**: اور متحدہ ہندوستان میں سمجھا گیا، عرب ممالک کے لوگوں نے قرآن کو اتنا نہیں سمجھا جتنا ہندوستان والوں نے سمجھا کیونکہ یہاں

لوگوں نے عربی زبان پر محنت کی رات دن اس کے پیچھے لگے رہے تب جا کر وہ زبان کو سمجھنے والے بنے، آپ پوری دنیا کا سروے کریں آپ کو عرب ممالک میں قرآن وحدیث کے سمجھنے والے ایسے نہیں ملیں گے جیسے عجمی ممالک میں آپ کو مل جائیں گے، یہ برکت ہے اس بات کی کہ ہمارا عربی کے ساتھ ایک جذباتی تعلق ہے، یہ ہمارے مذہب کی زبان ہے اور ہم اس کو گلے لگائے ہوئے ہیں، اپنی زبان سیکھنے پر عرب وہ محنت نہیں کرتے جو ہم عربی سیکھنے پر کرتے ہیں، اور یہ جذباتی تعلق اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ جگہ جگہ اس کا نمود ہو۔

خلاصہ کلام

بات کا خلاصہ یہ ہے کہ جمعہ اور عیدین کے خطبے نمود کی جگہیں ہیں، اور جب یہ نمود کی جگہیں ہیں تو یہاں مذہب کی جو اصل زبان ہے وہ استعمال ہوگی تاکہ یہ زبان زندہ رہے اور مذہب اسلام اپنی اصلی تعلیمات پر باقی رہے، صحابہ نے اپنے سوسالہ دور میں کہیں ایک دفعہ بھی غیر عربی زبان میں خطبہ نہیں دیا جبکہ ان علاقوں میں نئے مسلمان ہونے والوں کو مقامی زبان میں نصیحت کرنے کی آج سے زیادہ ضرورت تھی، اور اس وقت سے لے کر آج تک ساری دنیا میں خطبے عربی میں ہی ہو رہے ہیں، کوئی کہیں یہ نہیں کہتا کہ عربی کے علاوہ مقامی زبان میں خطبہ دو، بس یہ امریکہ والے ہی انگریزی کی محبت میں بہکے چلے جا رہے ہیں، برطانیہ میں، کناڈا میں، یورپ کے دیگر ملکوں میں کہیں یہ مسئلہ نہیں، یہ مسئلہ صرف امریکہ میں ہے، میرے بھائیو! انگریزی کی محبت کی جگہ عربی کی محبت دل میں بڑھاؤ، اس سے ایمان بھی مضبوط ہوگا اور مذہب کی بنیادی زبان بھی زندہ رہے گی اور جب زبان زندہ رہے گی تو اسلام کی تعلیمات بھی اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں گی، ورنہ اگر زبان مر گئی تو اسلام کا بھی وہی حال ہو جائے گا جو آج ہندوازم اور یہودیت وعیسائیت کا ہو چکا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۶

مسجد میں باتیں نہ کرنا

اور

تکبیر شروع ہونے پر نماز کے لئے کھڑا ہونا

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾

بزرگو اور بھائیو! آج کوئی خاص تقریر نہیں کرنی بس دو ضروری باتیں عرض کرنی ہیں، ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اس ملک کی مسجدوں کا نظام صحیح نہیں، کمیونٹی سینٹر اور مسجدوں کا ایک ہی حال ہے، جب لوگ مسجدوں میں آتے ہیں تو باہر اور مسجد میں کوئی فرق نہیں ہوتا، جیسے کمیونٹی سینٹر میں پہنچ کر لوگ باتیں کرتے ہیں اسی طرح مسجدوں میں بھی باتیں کرتے ہیں، یہ غلط طریقہ ہے، اللہ پاک سورۃ الحج میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾: جو شخص اللہ کے دین کی امتیازی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے، تو یہ تعظیم کرنا اس کے دل میں پرہیزگاری کی وجہ سے ہوتا ہے، جس دل میں تقوی اور پرہیزگاری ہوتی ہے وہی شعائر اللہ (اللہ کی دین کی امتیازی نشانیوں) کی تعظیم کرتا ہے۔

شعائر اللہ کیا ہیں؟

ہر وہ چیز جس کو دیکھ کر فوراً سمجھ لیا جائے کہ یہ چیز فلاں مذہب سے تعلق رکھتی ہے تو وہ اس مذہب کا شعار ہے، جیسے چرچ پر منارہ اور صلیب دیکھ کر ہر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہ چرچ ہے، یہ عیسائیت کا شعار ہے۔ یہودیوں کا شعار چھ کونوں والا تارہ ہے، اس کو دیکھ کر آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ دوکان، یہ گھر، یہ عبادت خانہ یہودیوں کا ہے، یہ یہود کا شعار ہے۔ مندر کی ایک

خاص بناوٹ ہے، ہندو عورت مانگ میں سندور لگاتی ہے، مرد قشقہ لگاتا ہے اور ایک خاص انداز سے دھوتی پہنتا ہے، ان چیزوں کو دیکھ کر آپ فورا سمجھ جائیں گے کہ یہ ہندو ہے، یہ سب شعائر الهنود ہیں۔ اسی طریقہ پر اسلام کے بھی کچھ شعائر ہیں جن کو دیکھ کر ہر آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ مذہب اسلام سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، یہ: شعائر اللہ ہیں، اللہ کے دین کی امتیازی نشانیاں ہیں۔

شعائر اللہ کتنے ہیں؟

شعائر اللہ بہت ہیں، بڑے شعائر چار ہیں، قرآن، کعبہ، نبی اور نماز، کعبہ صرف اسلام کے پاس ہے کسی اور مذہب کے پاس کعبہ نہیں، قرآن مسلمانوں کی متبرک کتاب ہے، ہر آدمی جانتا ہے، نبی بھی شعائر اللہ میں سے ہے، کیونکہ آج دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی مذہب نہیں جو نبی کا صحیح تصور رکھتا ہو۔ برطانیہ میں ایک مرتبہ ہم یہودیوں کی عبادت دیکھنے کے لئے باقاعدہ وقت لے کر ان کے عبادت خانہ (سینیگوگ) میں گئے، ہم نے ان کی نماز دیکھی، نماز کے بعد ہم نے ان کے امام سے پوچھا: موسی علیہ السلام کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ اس نے جواب دیا: صرف معلّم! استاذ تو دنیا میں کروڑوں ہیں۔ ان کا اپنے نبی کے بارے میں نبی کا کوئی تصور نہیں، عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ کا بیٹا ہونے کا تصور ہے، وہ بھی نبی کا کوئی تصور نہیں رکھتے، ہندو اپنے بڑوں کے بارے میں اوتار کا تصور رکھتے ہیں نبی کا نہیں رکھتے، اوتار کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین شر وفساد سے بھر جاتی ہے تو اللہ تعالی انسان بن کر دنیا میں پیدا ہوتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ بڑے ہوتے ہیں اور بڑے ہو کر دنیا سے سب برائیاں ختم کرتے ہیں پھر مر جاتے ہیں اور مر کر اپنی جگہ چلے جاتے ہیں، تو ان کے یہاں بھی نبی کا کوئی تصور نہیں، نبی کا صحیح تصور صرف اسلام میں ہے۔

نبی کا صحیح تصور

وہ صحیح تصور کیا ہے؟ أَشْهَدُ أَن محمدا عبده ورسوله: میں اس بات کی گواہی دیتا

ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ دو چیزوں کو جمع کرنا نبی کا صحیح تصور ہے، اسلام حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبین ﷺ تک سب نبیوں کے بارے میں یہی تصور رکھتا ہے کہ یہ سب انسان تھے جیسے ہم انسان ہیں، ہمارے درمیان اور ان کے درمیان انسان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا، ہماری دو آنکھیں ہیں نبیوں کی بھی دو آنکھیں تھیں، ہمارے دو کان دو ہاتھ ایک منھ اور ایک ناک ہے نبیوں کے بھی یہی سب اعضاء تھے، ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، بازار جاتے ہیں، انبیاء بھی کھاتے پیتے اور بازار جاتے تھے، انسان ہونے کے ناتے ہم میں اور نبیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔

پھر فرق کیا تھا؟ ان کو ایک بہت بڑا عہدہ مل گیا تھا، وہ عہدہ: نبوت اور رسالت کا عہدہ ہے، یہ اتنا بڑا عہدہ ہے کہ انہیں کو ملا ہے، دوسرا چاہے جتنی بھی محنت کر لے اس کو یہ عہدہ نہیں مل سکتا، جیسے کسی ملک کا صدر، وزیر اعظم اور بادشاہ ہوتا ہے، ان میں اور عوام میں انسان ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا لیکن فرق ہوتا ہے کہ وہ ملک کا صدر ہے، وزیر اعظم ہے، بادشاہ ہے، یہ ان کا مرتبہ ہے اور یہ مرتبہ انہی کو حاصل ہے، دوسرے کسی کو حاصل نہیں۔

اسی طریقہ پر اسلام کا تصور تمام نبیوں کے بارے میں یہ ہے کہ وہ انسان تھے اور اللہ نے ان کو ایک بہت بڑا عہدہ دیا تھا، أشهد أن محمداً عبده ورسوله کا یہی مطلب ہے: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے بندے ہیں، وہ کوئی خدا نہیں، وہ کوئی خدا کے بیٹے نہیں، وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت نہیں، آدم علیہ السلام کی ساری اولاد جیسے انسان تھی وہ بھی انسان تھے، مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام رسولوں کے سردار ہیں، یہ بہت بڑا عہدہ اللہ نے ان کو دے رکھا تھا۔ سب نبیوں کے بارے میں اسلام کا یہی تصور ہے، اور یہی نبوت کا صحیح مفہوم ہے۔ اور یہ صحیح مفہوم صرف اسلام میں ہے، اس کے علاوہ اور کسی مذہب میں نبوت کا صحیح مفہوم نہیں، اس لئے نبی بھی شعائر اللہ میں سے ہے۔

اور چوتھی چیز ہے: نماز، دنیا کے تمام مذاہب اللہ کی بندگی کرتے ہیں بلکہ یہود و نصاری تو نماز پڑھتے ہیں، لیکن اللہ کی بندگی اور نماز پڑھنے کا جو طریقہ مسلمانوں کا ہے وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں نہیں، اگر آپ سڑک کے کنارہ پر، پلیٹ فارم پر، بس اسٹینڈ پر کسی آدمی کو

مصلی بچھا کر اللہ کی بندگی کرتے ہوئے دیکھیں تو آپ دیکھتے ہی فوراً سمجھ جائیں گے کہ یہ مسلمان ہے۔

الغرض اسلام کے بڑے شعائر چار ہیں: قرآن، کعبہ، نبی اور نماز۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے شعائر ہیں، قربانی کے جانور بھی شعائر ہیں، ہدی کے جانوروں کو بھی شعائر اللہ کہا گیا ہے، اسی طریقہ پر مسجدیں بھی شعائر اللہ ہیں کہ ان کو دیکھ کر ہر آدمی سمجھ جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے، بلکہ مسجد کے منارے جو ایک خاص انداز سے اٹھائے جاتے ہیں وہ بھی شعائر اللہ ہیں۔ ان کو دیکھ کر بھی آدمی مسجد کو پہچان لیتا ہے۔ اور شعائر اللہ کے بارے میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾: جو شخص اللہ کے دین کی امتیازی نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ تعظیم کرنا اس کے دل میں تقوی ہونے کی وجہ سے ہے۔

شعائر اللہ کی تعظیم کیا ہے؟

شعائر اللہ کی تعظیم کا کوئی ایک متعین طریقہ نہیں، ہر علامت کی تعظیم اس کے شایان شان کی جاتی ہے، پس قرآن کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، کعبہ کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، نبی کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، نماز کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، قربانی کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں، مسجدوں کی تعظیم کے طریقے الگ ہیں۔ غرض شعائر اللہ کی تعظیم کا کوئی ایک متعین طریقہ نہیں۔

کعبہ شریف کی تعظیم یہ ہے کہ اس کا طواف کرو، اس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو، اس کی طرف پیر نہ کرو، استنجے کے وقت اس کی طرف منہ کرو نہ پیٹھ۔

قرآن کی تعظیم یہ ہے کہ آپ بے وضو اس کو ہاتھ نہ لگائیں، بے وضو قرآن پڑھ تو سکتے ہیں لیکن ہاتھ نہیں لگا سکتے، ایسا کیوں ہے؟ جب بے وضو ہاتھ لگانا جائز نہیں تو پڑھنا بھی ناجائز ہونا چاہئے۔ جواب یہ ہے کہ ایسا ضرورت کی بنا پر ہے، مکتبوں اور مدرسوں میں صبح سے شام تک اساتذہ اور طلبہ قرآن پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، اگر یہ شرط لگادی جائے کہ پڑھنے

کے لئے بھی وضو ضروری ہے تو مکتبوں کا سارا نظام درہم برہم ہوجائے گا، صبح سے شام تک اساتذہ باوضو کیسے بیٹھیں گے؟ اسی طرح سے ہر مسلمان کو جب بھی موقعہ ملے تلاوت کرنی چاہئے، وضو کی شرط لگادیں گے تو ہر وقت تلاوت نہیں ہوسکے گی۔ اس لئے شریعت نے ضرورت کی وجہ سے اتنی گنجائش رکھی جنابت کی حالت میں قرآن پڑھنا تو حرام ہے، کیونکہ یہ حالت کبھی کبھی پیش آتی ہے، اور بے وضو ہونے کی حالت میں زبانی قرآن پڑھنے کی اجازت دیدی کہ یہ حالت بار بار پیش آتی ہے۔ الغرض قرآن کی تعظیم یہ ہے کہ آپ بے وضو اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔

قرآن ہاتھ سے گر جائے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نادانی میں قرآن ہاتھ سے گرجاتا ہے، لوگ پوچھتے ہیں: اس کا کفارہ کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی کفارہ نہیں، نادانی میں قرآن کا ہاتھ سے گرجانا کوئی گناہ نہیں اور کفارہ گناہ کا ہوتا ہے۔ گناہ کیوں نہیں؟ حدیث شریف میں ہے: **رُفع عن أمتي الخطأُ والنسیان وما استکرهوا علیه**: میری امت سے تین باتیں اٹھادی گئی ہیں، یعنی ان کا کوئی گناہ نہیں، ایک: چوک، دوسری: بھول، تیسری: زبردستی کرایا ہوا کام۔ تو ان تین کا کوئی گناہ نہیں چوک: جیسے شکاری نے خرگوش کو گولی ماری اور جس کو وہ خرگوش سمجھ رہا تھا وہ آدمی نکلا اور وہ گولی آدمی کو جالگی تو اس قتل کا کوئی گناہ نہیں، دیت تو آئے گی لیکن اس کو اس قتل کا کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اسی طریقہ سے بھول ہے، بھول کی وجہ سے کہیں تو عبادت بھی نہیں ٹوٹتی اور گناہ بھی نہیں ہوتا، اور کہیں عبادت تو ٹوٹ جاتی ہے مگر گناہ نہیں ہوتا، دوران نماز اگر کسی نے بھولے سے کسی شخص کے سلام کا جواب دیدیا تو نماز ٹوٹ جائے گی مگر گناہ نہیں ہوگا روزہ کی حالت میں بھولے سے کچھ کھا پی لیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹا اور گناہ بھی نہیں ہوا۔ بہر حال بھول میں کہیں عبادت ٹوٹ جاتی ہے اور کہیں نہیں ٹوٹتی اور گناہ دونوں صورتوں میں نہیں ہوتا۔

اور تیسری چیز ہے: زبردستی کوئی کام کروانا: جیسے مباح چیزوں میں اللہ کو سب سے زیادہ

ناپسند طلاق ہے، دوچار آدمیوں نے پکڑا اور جان سے مارنے کی دھمکی دے کر کسی سے طلاق دلوائی، اس نے جان بچانے کی لئے طلاق دیدی، تو اس طلاق میں کوئی گناہ نہیں، بے ضرورت آدمی طلاق دے تو اس کا گناہ ہوگا، اسی طرح حالت حیض میں اگر طلاق دی تو گناہ گار ہوگا، لیکن زبردستی کرنے میں گناہ نہیں ہوگا، البتہ طلاق پڑ جائے گی۔

غرض شریعت میں چوک کا، بھول کا اور زبردستی کوئی کام کروایا گیا ہو تو اس کا کوئی گناہ نہیں، جب یہ بات ہے تو ہاتھ سے جو قرآن کریم گرا ہے اس کی دو ہی شکلیں ہوسکتی ہیں، یا تو چوک گیا ہے یا بھول گیا ہے، کوئی مسلمان سلامتی ہوش وحواس کے ساتھ ایسا کام نہیں کرسکتا، بھول سے گرے گا یا چوک سے گرے گا، یہی دو شکلیں ہیں ان کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں، اور ان دونوں شکلوں میں کوئی گناہ نہیں، اور جب گناہ نہیں تو کفارہ بھی نہیں؟

اور اگر کسی نالائق نے جان بوجھ کر قرآن کو نیچے ڈالا تو یہ اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کا کوئی کفارہ توبہ کے علاوہ نہیں، جیسے یمین غموس میں کوئی کفارہ نہیں، گذرے ہوئے زمانہ کی کسی بات پر جھوٹی قسم کھانا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہوسکتا، اس لئے کوئی کفارہ نہیں ہے علاوہ توبہ کے، اسی طریقہ پر قرآن کو جان بوجھ کر پٹخنا بھی اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کے لئے کوئی کفارہ ممکن نہیں، توبہ کرے اور سچی پکی توبہ کرے تو ہی گناہ معاف ہوگا۔

بہرحال غلطی سے، نادانی سے کبھی قرآن گر جائے تو اس کا کوئی کفارہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی اپنے دل پر سے بوجھ ہٹانے کے لئے کچھ صدقہ وخیرات کرنا چاہے تو کرے، ضرور کرے، کیونکہ ایسا واقعہ پیش آنے کی صورت میں مؤمن کے دل پر ایک بوجھ پڑتا ہے اور صدقہ کرنے سے وہ بوجھ ہٹ جاتا ہے، باقی مسئلہ کی رو سے اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

خیر قرآن کی تعظیم یہ ہے کہ اس کو بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ نبی کی تعظیم یہ ہے کہ اس کا احترام دل میں ہو، اور جب بھی نبی کا نام لے تو صلوۃ بھیجے یا سلام بھیجے، موسیٰ نے کہا، یوں نہ کہو۔ یوں کہو: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا، ہر نبی کا احترام دل میں ہونا چاہئے اور یہ احترام جو دل میں ہے وہ زبان اور عمل سے ظاہر بھی ہونا چاہئے، ایسے ہی ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا جب نام آئے درود پڑھے، صلوۃ وسلام بھیجے، یہ نبی کی تعظیم میں داخل ہے۔

بعض لوگ اتنا جلدی درود پڑھتے ہیں کہ وہ غیر واضح ہوتا ہے، اس طرح درود شریف پڑھنے کا کیا فائدہ؟ مزے لے کر اور واضح درود شریف پڑھنا چاہئے، واضح صلوۃ وسلام بھیجنا اس بات کی علامت ہے کہ اس کے دل میں اس شخصیت کا احترام ہے۔

نماز کی تعظیم یہ ہے کہ جب آپ نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوں تو لکڑی بن جائیں، آج کل ہماری نمازیں ایسی ہوگئی ہیں کہ بس ان کا اللہ ہی مالک ہے، نیت باندھتے ہی سارے بدن میں کھجلی شروع ہوجاتی ہے، کبھی ادھر کھجائیں گے کبھی ادھر، پہلے کہیں کھجلی نہیں تھی، جہاں نیت باندھی کہ چاروں طرف کھجلی ہی کھجلی۔ نماز سے پہلے صحیح تھے، نیت باندھتے ہی جمائیاں شروع ہوگئیں، حدیث شریف میں ہے: **التثاؤب فی الصلوۃ من الشیطان:** نماز شروع کرنے کے بعد جو جمائیاں شروع ہوجاتی ہیں یہ شیطان کے اثر سے ہیں۔ نیت بندھی ہوئی ہوگی اور چاروں طرف دیکھیں گے، ہماری نمازوں کی یہ جو صورت حال ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے دل میں نماز کی تعظیم نہیں، بس ایک وظیفہ ہے جس کو ہم پورا کردیتے ہیں۔

نماز کی تعظیم یہ ہے کہ جب آپ کھڑے ہوں تو ایسے مستغرق ہوجائیں کہ آپ کو نہ اپنے بدن کا ہوش رہے، نہ چاروں طرف کا، پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہوکر نماز پڑھ رہے ہوں یہ نماز کی تعظیم ہے۔

قربانی اور ہدی کے جانور بھی شعائر اللہ ہیں، ان کی تعظیم یہ ہے کہ ان کی خدمت کرو، خوب کھلاؤ پلاؤ، نہلاؤ دھلاؤ۔ مسجدوں کی تعظیم یہ ہے کہ اپنے گھروں سے اچھا اللہ کا گھر بناؤ اور مسجد میں آتے ہی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھو، نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **إذا مررتم برياض الجنة فارتعوا:** جب تم جنت کی کیاریوں سے گذرو تو چرو، جیسے جانور ہری بھری کیاری پر سے گذرتے وقت منہ مارتا ہے تم بھی جنت کی کیاریوں پر منہ مارو، اور جنت کی کیاریاں مسجدیں ہیں، اور چرنا یہ ہے کہ مسجد میں آتے ہی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، مکروہ وقت ہو تو الگ بات ہے، وضو نہ ہو تو الگ بات ہے، لیکن اگر باوضو ہو اور مکروہ وقت بھی نہ ہو تو جب بھی مسجد میں داخل ہو دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے، یہ مسجد کا احترام ہے۔

مسجد میں باتیں کرنا نیکیوں کو کھا جاتا ہے

حدیث شریف میں ہے: إياكم وهيشات الأسواق: مارکیٹ میں جس طرح باتیں اور شور ہوتا ہے اس طرح باتیں اور شور کرنے سے مسجدوں میں بچو، کسی بڑے آدمی کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو سب خاموش بیٹھتے ہیں، یہ بڑے آدمی کا ادب ہے، مسجد کا بھی یہ ادب ہے کہ مسجد میں جاتے ہی باتیں بند ہوجانی چاہئیں کیونکہ وہ اللہ کے گھر ہیں۔

مگر میرے بھائیو! اس ملک کی صورت حال بہت بگڑی ہوئی ہے، اس ملک میں لوگ مسجدوں کو کمیونٹی سینٹر سمجھتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنے سے نیکیاں اس طرح خاکستر ہوجاتی ہیں جس طرح سوکھی لکڑی میں آگ لگنے سے خاکستر ہوجاتی ہے، نیکی ندارد گناہ لازم! اللہ جانے مسجد میں سے نیکیاں ملیں یا نہیں، گناہ کا گٹھر ضرور مل گیا۔

مسجدوں کو باتوں سے بچانے کا طریقہ

مسجدوں میں لوگ باتیں کیوں کرتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ دور دور سے کبھی کبھی نماز پڑھنے آتے ہیں، مستقل نمازی تو پانچ سات ہوتے ہیں، ایسے نمازی مسجد میں باتیں نہیں کرتے، جب دور دور سے کبھی کبھی نمازیں پڑھنے کے لئے آئیں گے تو ایک دوسرے سے ملاقات پر خیریت تو پوچھیں گے ہی، کچھ کاروبار کا حال بھی پوچھیں گے، کچھ ادھر ادھر کی باتیں بھی کریں گے، یہ وجہ ہے مسجدوں میں باتیں کرنے کی۔

آپ کہیں گے کہ یہ تو واقعی ایک ضرورت ہے، جب دور دراز سے کافی دنوں کے بعد اکٹھا ہوئے ہیں تو باتیں تو کریں گے ہی، باتوں کی لئے کچھ موقع تو ملنا چاہئے۔ صحیح بات ہے، موقع ملنا چاہئے، مگر اس کے لئے انتظام کرنا چاہئے۔ یہ رہا آپ کا برطانیہ، آپ کے ملک جتنا ترقی یافتہ، میں برطانیہ پچیس سال سے جارہا ہوں، پہلے وہاں بھی یہی صورت حال تھی، جب ہم نے ان کو سمجھایا تو انہوں نے آہستہ آہستہ اس پر قابو پالیا، کیسے پایا؟ مسجد کا ہال الگ کردیا اور مسجد کے ہال سے باہر پیسیج بنادیا، اگرچہ جمعہ کے دن اس پیسیج میں بھی نماز ہوگی مگر اس کو

با قاعدہ مسجد میں نہیں لیا، اب جس کو افطاری کرنی ہے پیسیج میں کرے، باتیں کرنی ہے پیسیج میں کرے، اور مسجد کے ہال میں قدم رکھتے ہی چپ ہوجائے، اب کوئی بات نہ کرے، یہ مسجدوں کو لوگوں کی باتوں سے بچانے کا ایک طریقہ ہے۔ ابھی مسجدوں کے تعلق سے یہاں اتنی ترقی نہیں ہوئی، ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ یہاں بھی یہ نظام بن جائے گا، فی الحال تو کرنا یہ ہے کہ یہ نظام بننے سے پہلے مسجد میں باتیں کرنے سے احتیاط برتو، باتیں کرنی ہوں تو باہر نکل کر جہاں وضوخانہ ہے وہاں جاکر کرو۔ ایک بات تو یہ عرض کرنی تھی۔

اور یہ طریقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنایا تھا، آپؓ نے مسجدِ نبوی کی مشرقی جانب میں ایک جگہ خاص کی تھی، جس کو بُطَیْحَاء کہا جاتا تھا، اور لوگوں کو حکم دیا تھا: من أراد أن يلغط، أو يرفع صوتا، أو يُنْشِد شعرا، فليخرج إليه (وفاء الوفاء ج۱ ص۳۵۳) یعنی جو شوروغل کرنا چاہے، یا زور سے بولنا چاہے، یا زور سے شعر پڑھنا چاہے، وہ مسجدِ نبوی سے اس جگہ میں جائے (اور یہ کام کرے)

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد سے باہر ایسی جگہ ہونی چاہئے، پھر لوگوں سے کہا جائے کہ مسجد میں دنیوی باتیں نہ کریں، پیسیج میں جاکر کریں تو لوگ مان جائیں گے، بلکہ یہاں کے لوگ تو سمجھدار ہیں، کہنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی

(دوسری بات)

اقامت کا غلط طریقہ

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ہمارے یہاں اقامت کا طریقہ غلط چلا ہوا ہے، جب نماز شروع ہونے کا وقت آئے گا تو سب سے پہلے امام صاحب مصلے پر آئیں گے، لوگ کھڑے ہوجائیں گے، جب صفیں سیدھی ہوجائیں گی تب تکبیر شروع ہوگی، یہ جو سلسلہ چلا ہوا ہے یہ غلط ہے۔ بریلویوں کے یہاں اس کا الٹا ہے، تکبیر کہنے والا کھڑا ہوکر تکبیر شروع کرے گا، باقی سب بیٹھے رہیں گے، جب وہ حی علی الصلوۃ کہے گا تب لوگ کھڑے ہونگے اور اب امام صاحب اٹھ کر مصلے پر آئیں گے۔ ان کے یہاں حی علی الصلوۃ سے پہلے کوئی کھڑا ہوجائے تو

اس کو بہت برا سمجھتے ہیں۔ بریلویوں کا یہ طریقہ بھی غلط ہے اور ہمارا طریقہ بھی غلط ہے۔

کھڑا کب ہونا چاہئے؟

عربی میں تکبیر کو اقامہ کہتے ہیں، اور اقامۃ کے معنی ہیں: کھڑا کرنا، میں نے آپ سے کہا: اٹھ بھئی! یہ کھڑا کرنا ہے، اب اٹھ بھئی کہنے کے بجائے اللہ کا ذکر رکھ دیا، وہ ذکر سنتے ہی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ ہمیں نماز کے لئے کھڑا کر رہا ہے، تو اقامہ کے معنی ہیں کھڑا کرنا، اب میرے بھائیو سوچو! جب تک اقامہ (کھڑا کرنا) نہیں پایا گیا لوگ کیوں کھڑے ہو گئے؟ کس نے ان کو کھڑا کیا؟ شریعت نے کھڑا کرنے کے لئے تکبیر رکھی ہے، یہ کھڑا کرنا (اقامہ) تو ابھی پایا نہیں گیا پھر آپ کیوں کھڑے ہو گئے؟ ہم تو غلط یوں ہیں۔ اور بریلوی غلط یوں ہیں کہ جب اقامہ (کھڑا کرنا) شروع ہو چکا تو اب کیوں بیٹھے ہو؟ تکبیر کا اقامہ نام ہی دلیل ہے کہ ہمارا طریقہ بھی غلط ہے اور بریلویوں کا بھی غلط ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو سب سے پہلے تکبیر کہنے والا کھڑا ہو اور تکبیر شروع کرے، اقامہ شروع ہوا تو اب لوگ کھڑے ہونا شروع ہوں گے، پھر جب اقامہ پورا ہو جائے تو امام صاحب صفوں کو دیکھیں گے، اور کسی کو کوئی ہدایت دینی ہو تو دیں گے اور جب صفیں سیدھی ہو جائیں تو نماز شروع کر دیں، صفیں درست کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے۔

صفیں درست کرنے کا صحیح وقت کب ہے؟

صفیں درست کرنے کا صحیح وقت تکبیر ختم ہو جانے کے بعد اور نماز شروع کرنے سے پہلے ہے، لیکن اس ملک میں ایک نیا اور عجیب وغریب طریقہ ہے، جب تکبیر شروع ہوتی ہے تو امام صاحب مصلے پر آ کر نمازیوں کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاتے ہیں، جب تک تکبیر ہوتی رہے گی امام صاحب نمازیوں کی طرف منہ کر کے کھڑے رہیں گے، تکبیر پوری ہونے کے بعد گھوم کر نماز شروع کریں گے۔ اللہ جانے امریکہ میں یہ طریقہ کہاں سے آیا، میں دنیا کے کئی ملکوں میں جا چکا ہوں، ہم نے یہ طریقہ یہاں کے علاوہ کہیں نہیں دیکھا۔

اور دیکھو میرے بھائیو! دین وہ ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں میں ہے، کیونکہ دین کا مدار

قرآن وحدیث پر ہے اور قرآن وحدیث ساری دنیا میں ایک ہی ہیں، لہٰذا ساری دنیا میں جو طریقہ چل رہا ہے وہی دین ہے، اور اگر کسی علاقہ میں ایک طریقہ ہے جس کو دوسرے علاقہ والے نہیں جانتے تو یہ طریقہ دین میں سے نہیں ہے بعد میں بڑھا ہے، اگر قرآن وحدیث میں یہ طریقہ ہوتا تو ساری دنیا میں ہوتا، میں پینتالیس سال سے حدیث پڑھا رہا ہوں، میں نے آج تک کسی حدیث میں یہ طریقہ نہیں دیکھا، حضور ﷺ تکبیر شروع ہونے کے بعد نماز شروع ہونے تک لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کھڑے رہتے ہوں، ایسا ہم نے کسی حدیث میں نہیں پڑھا۔

ننگے سر نماز پڑھنا سنت نہیں

اسی طرح ایک دوسرا مسئلہ ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا سنت ہے، مگر ہم نے آج تک کوئی حدیث نہیں پڑھی جس میں یہ ہو کہ نبی پاک ﷺ کے پاس ٹوپی یا عمامہ موجود تھا اور آپ نے ایک فرض نماز ننگے سر پڑھی، پوری زندگی میں ایک دفعہ بھی ایسا کیا ہو، ایسی کوئی حدیث ہم نے نہیں پڑھی، اور قیامت کی صبح تک مہلت ہے: لاؤ ایسی کوئی حدیث، چاہے ضعیف ہی کیوں نہ ہو۔ ان بھائیوں سے جب پوچھا جاتا ہے تو فوراً کہتے ہیں: ٹوپی کے بغیر کیا نماز نہیں ہوتی؟ ایک مرتبہ نہیں سو مرتبہ ہوتی ہے! اور ٹوپی کے بغیر ہی نہیں، کرتے کے بغیر بھی نماز ہوتی ہے، نماز میں مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنے تک ہی بدن ڈھکنا ضروری ہے، گھٹنے سے نیچے کا حصہ اور ناف سے اوپر کا حصہ اگر سارا کھلا ہو تو بھی نماز ہو جائے گی۔

غرض ننگے سر نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ یہ ہے کہ نماز کے وقت اللہ کا کیا حکم ہے؟ اللہ کا حکم ہے: ﴿يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾: اے آدم کی اولاد! جب تم نماز پڑھو، شاندار لباس پہن کر نماز پڑھو، اور اسلامی تہذیب میں ننگے سر ہونا شاندار لباس نہیں، یہ تو فیشن ہے، غیروں کا طریقہ ہے، اسلامی طریقہ نہیں ہے۔

غرض بعض چیزیں بغیر دلیل اور بغیر حدیث کے چلتی ہیں، امام صاحب کا لوگوں کی

طرف متوجہ ہوکر کھڑا ہونا بھی انہی چیزوں میں سے ہے جس کی کوئی دلیل اور جس کے بارے میں کوئی حدیث نہیں، مگر امریکہ میں یہ سنت بنا ہوا ہے۔

اقامت میں حضور ﷺ کا طریقہ

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اقامت میں ہمارا طریقہ بھی غلط ہے اور بریلویوں کا بھی، نبی پاک ﷺ کا طریقہ بخاری میں آیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: **إِذَا أُقِيْمَتِ الصلوة فلا تقوموا حتى تروني**: جب نماز کھڑی کی جائے یعنی تکبیر شروع ہو تو تم کھڑے مت ہوؤ، یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو۔ اذان کے وقت نبی پاک ﷺ اپنے کمرے میں ہوتے تھے، پھر جب وقت ہوتا تھا تو تکبیر شروع ہو جاتی تھی، حضور تکبیر سن کر گھر سے نکلتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ تکبیر شروع ہوگئی اور گھر میں آپ کی نیت بندھی ہوئی ہے، اس لئے نماز پوری کر کے حضور ﷺ آئیں گے، ایسی صورت میں صحابہ تکبیر پوری ہونے کے بعد کھڑے کھڑے حضورؐ کا انتظار کرتے تھے، اس لئے حضور ﷺ نے ان کو ہدایت دی کہ تکبیر شروع ہونے پر مت کھڑے ہوؤ، جب مجھے کمرے سے آتا ہوا دیکھو تب کھڑے ہوؤ۔ چنانچہ مسئلہ یہی ہے کہ مسجد میں تکبیر شروع ہوئی اور امام صاحب مسجد میں نہیں ہیں، وہ مسجد سے متصل اپنے کمرہ میں ہیں اور بالیقین ہیں، کس حالت میں ہیں یہ معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں تکبیر شروع ہونے پر بھی لوگ کھڑے نہیں ہونگے، جب امام صاحب کمرے سے نکلتے نظر آئیں گے تب لوگ کھڑے ہونگے۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ مصلے پر کھڑے ہوکر لوگوں کی طرف متوجہ ہوجاتے تب تکبیر شروع ہوتی ایسا نہیں تھا، آپ تو گھر میں ہوتے تھے اور تکبیر شروع ہوجاتی تھی۔

گھڑی دیکھ کر کھڑا نہیں ہونا چاہئے

یہ تکبیر شروع ہونے سے پہلے صف بندی کا رواج کیوں پڑا؟ اب نماز ٹن کی ہوتی ہے، گھڑی میں ٹن ہوا اور لوگ کھڑے ہوگئے، حالانکہ نماز کے سلسلہ میں امام کا اختیار ہے، جب

امام مناسب سمجھے گا موذن کو اشارہ کرے گا اور وہ کھڑے ہوکر تکبیر شروع کرے گا، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نماز کا وقت ہو جاتا ہے مگر اسی وقت بہت سارے آدمی آجاتے ہیں اور وضو کرنے لگتے ہیں، تو ایسی صورت میں امام نماز شروع کرنے میں دو منٹ تاخیر کرے گا تاکہ ان نئے آنے والوں کو بھی نماز مل جائے، ایسے ہنگامی حالات میں لوگوں کا لحاظ کرنا امام کی ذمہ داری ہے، بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی پاک ﷺ عشاء کی نماز معین وقت پر شروع نہیں کرتے تھے بلکہ، **إذا كثر الناس عجل وإذا قلوا أخر**: اگر لوگ زیادہ آجاتے تو آپ نماز جلدی پڑھادیتے، لوگ تھوڑے ہوتے تو آپ نماز میں تاخیر کرتے، بہر حال حالات پر نظر رکھنا امام کی ذمہ داری ہے، اور اس کا لحاظ کر کے جب امام اشارہ کرے تب تکبیر شروع ہوگی اور اس وقت لوگ کھڑے ہونگے، مگر اب تو لوگوں نے گھڑی کو دیکھ کر ٹن کی نماز کر دی ہے بیچارے امام کا کوئی اختیار نہیں رہا، یہ جو ہم نے امام کو اپنا نوکر بنالیا ہے، میرے بھائیو یہ ٹھیک نہیں، امام کو سردار بناؤ گے تو تمہاری نمازوں میں برکت ہوگی، امام کو نوکر سمجھو گے تو تمہاری نمازیں بغیر دانے کی مونگ پھلی ہونگی۔ آپ نے کہیں یہ سنا ہوگا کہ کسی عالم کے پیچھے نماز پڑھنا ایسا ہے جیسا کسی نبی کے پیچھے نماز پڑھنا، چونکہ دل میں نبی کا ایک احترام ہوتا ہے تو اس احترام کے بعد نبی کے پیچھے جو نماز پڑھی جائے گی اس میں خوبی پیدا ہوگی، اسی طرح عالم کا احترام اگر دل میں ہے تو اس کے پیچھے نماز پڑھنے میں خوبی پیدا ہوگی، اور اگر عالم کا کوئی احترام نہیں ہے تو پھر نماز میں کوئی خوبی پیدا نہیں ہوگی۔

یہ مسئلہ میں اس لئے سمجھا رہا ہوں کہ اقامت میں امام اپنے اختیار سے اور حالات کا لحاظ کر کے تکبیر شروع کرنے کا اشارہ کرے گا، گھڑی دیکھ کر لوگوں کو کھڑا ہونا نہیں چاہئے۔

آج کی تقریر میں بس یہ دو مسئلے عرض کرنے تھے، اللہ تعالی ان پر عمل کرنے کی ہم کو توفیق نصیب فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔ **وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين**۔

۷

دس دن میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟

بزرگو اور بھائیو! ایک سوال لوگ بار بار پوچھ رہے ہیں کہ دس دن میں قرآن ختم کرنا کیسا ہے؟ یہاں (کناڈا میں) میں بہت سالوں سے آرہا ہوں، پہلے یہ سلسلہ ٹورنٹو میں نہیں تھا، تین سال پہلے آیا تو ایک جگہ یا دو جگہ یہ سلسلہ قائم ہوا اور اب آیا تو دسیوں جگہ اس کو پایا، اور باقاعدہ اعلانات اور اشتہارات چھاپ کر مسجدوں کے دروازوں پر چپکائے گئے، ہماری مسجد میں بھی یہ اشتہار چپکایا گیا، الغرض یہ سلسلہ بڑھتا جارہا ہے اس لئے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھو۔

تین مقصد تین حکم

دس دن میں یا اس سے بھی کم دنوں میں جو قرآن ختم کیا جاتا ہے اس کے تین مقاصد ہوتے ہیں پس تینوں مقصدوں کے اعتبار سے احکام مختلف ہونگے۔

ایک مقصد: ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ قرآن سننا، اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ دو سنتیں علاحدہ علاحدہ ہیں، ایک: رمضان کے انتیس دن یا تیس دن بیس رکعت تراویح جماعت سے پڑھنا، چاہے **الم تر کیف** سے ہو، اور دوسری سنت ہے: پورے رمضان میں ایک قرآن سننا، اور ایک قرآن کم سے کم ہے، اگر کوئی دو سنے، تین سنے سبحان اللہ! جتنا گڑ ڈالوگے اتنا میٹھا ہوگا، پس دس دن میں قرآن سننے کی ایک نیت تو یہ ہوسکتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ قرآن سنیں، یہ بہت صحیح نیت ہے اور اس نیت سے قرآن ضرور سننا چاہئے، ایک شرط کے ساتھ اور وہ یہ ہے کہ قرآن صحیح پڑھا جائے، **یعلمون تعلمون** نہ پڑھا جائے، ایسے پڑھنے کا کوئی حاصل نہیں، حدیث میں ہے: **رب قارئ للقرآن و القرآن یلعنہ:** بعض قرآن پڑھنے والے ایسا قرآن پڑھتے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت بھیجتا ہے کہ تیرا ناس ہو کم بخت مجھے کیوں بگاڑ رہا ہے! ہمارے دیوبند میں تقریباً سو مسجدیں ہیں وہاں صرف چھتہ مسجد میں تین پاروں والا قرآن ہوتا ہے

جہاں حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہی رحمہ اللہ اعتکاف کیا کرتے تھے، اور سہارن پور: دیوبند سے بھی بڑا ہے وہاں تین پاروں والا قرآن کہیں نہیں ہوتا صرف حضرت شیخ زکریا رحمہ اللہ کی مسجد میں تین پاروں والا قرآن ہوتا ہے جہاں حضرت شیخ اعتکاف کیا کرتے تھے، دس دن میں ایک قرآن ختم ہوتا تھا، پھر اگلی رات سے دوسرا شروع ہوجاتا تھا اور جو دس دن سننے والے ہوتے تھے وہی اگلے عشرہ میں بھی سننے والے ہوتے تھے، کوئی نئے مصلی نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہاں مریدین ہوتے تھے جو دن رات اذکار میں لگے رہتے تھے ان کے لئے تین قرآن سننا مشکل نہیں تھا۔ تو یہ زیادہ سے زیادہ قرآن سننا ایک بہترین مقصد ہے اور اس مقصد کے پیش نظر اگر کوئی دس دن والا قرآن سنتا ہے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ ایسا اس کو ضرور کرنا چاہئے۔

دوسرا مقصد: یہ ہوتا ہے کہ دس دن میں قرآن پورا ہوجائے گا تو پھر چھٹی مل جائے گی پھر جی چاہے گا تراویح پڑھیں گے اور نہیں چاہے گا نہیں پڑھیں گے۔ یہ کوئی شرعی مقصد نہیں، میں نے کہا تھا کہ دو سنتیں الگ الگ ہیں، آپ نے ایک سنت تو پوری کرلی لیکن دوسری سنت چھوڑ دی، لہٰذا یہ کوئی اچھا مقصد نہیں۔

تیسرا مقصد: یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک قرآن دس دن میں سن لیں گے پھر جہاں چاہیں گے کسی نہ کسی مسجد میں پابندی سے تراویح پڑھیں گے ہماری ترتیب فوت نہیں ہوگی کیونکہ ہم ایک قرآن پہلے سن چکے ہیں، یہ مقصد دیکھنے میں تو خوبصورت ہے مگر بے کار مقصد ہے کیونکہ تراویح سبھی مسجدوں میں ایک ہی ترتیب سے ہوتی ہیں یا ہونی چاہئے۔ پس اگر آج یہاں پڑھو کل وہاں پڑھو تو کوئی فرق نہیں پڑتا سب جگہ ایک ہی ترتیب سے قرآن چلتا ہے، البتہ کبھی کبھی گڑبڑ ہوجاتی ہے۔

الغرض یہ مقصد خوبصورت ہے مگر کوئی اہم مقصد نہیں، پہلا مقصد ہی صحیح ہے کہ اگر آپ کو مہینہ میں تین یا اس سے زیادہ قرآن سننے ہیں تو شوق سے سنو، مگر میرے خیال سے اس مقصد سے سننے والا شاید ہی کوئی ملے، زیادہ تر وہ ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ بھئی ایک بار لگ جاؤ پھر چھٹی مل جائے گی اور یہ کوئی اچھا مقصد نہیں اور اس مقصد سے یہ دس دن والا قرآن دس سال گذرتے گذرتے پانچ دن پر آجائے گا پھر دس سال اور زندہ رہے تو یہ تین دن پر آجائیگا،

اس لئے میرے بھائیو! یہ جو سلسلہ چل رہا ہے میرا خیال ہے کہ یہ لوگوں کے احوال کے اعتبار سے ٹھیک نہیں۔

قیام اللیل (تہجد) جماعت کے ساتھ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

ایک دوسرا مسئلہ اور پوچھا گیا کہ قیام اللیل جماعت سے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا کہ اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں، کہنے لگے کہ فاؤنڈیشن (ٹورنٹو کی ایک بڑی مسجد) میں تو ہوتا ہے میں نے کہا کہ فاؤنڈیشن کوئی دلیل شرعی نہیں یہ تو حرمین میں بھی ہوتا ہے دلیل: قرآن وحدیث اور فقہ ہے، قرآن وحدیث تو چاروں ائمہ کا مشترک سرمایہ ہے اور فقہ چاروں اماموں کی الگ الگ ہے، ہمارے نزدیک قرآن، حدیث اور فقہ حنفی حجت اور دلیل ہیں، فاؤنڈیشن اور حرمین کوئی دلیل نہیں۔

حضورؐ نے رمضان میں دو یا تین راتیں جماعت سے تراویح پڑھائی تھی

پھر میں نے انہیں سمجھایا کہ نبی پاک ﷺ لوگوں کو رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے اضافی نفلیں پڑھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے، رات میں اٹھ کر تہجد کی نماز تو بارہ مہینہ پڑھنی ہے رمضان میں بھی پڑھنی ہے لیکن رمضان میں ایک اضافی نماز ہے جس کا نام: قیام رمضان ہے، حضور ﷺ اس کی ترغیب دیا کرتے تھے اس کے لئے کوئی جماعت نہیں کرتے تھے، فرمایا: **من قام رمضان إيمانا و احتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه**: جس نے رمضان کی راتوں میں سونے سے پہلے نفلیں پڑھیں ان نفلوں پر جو ثواب کا وعدہ ہے اس کا یقین کرتے ہوئے اور اس ثواب کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، اس طرح حضور ﷺ ترغیب دیا کرتے تھے اور صحابہ خوب نفلیں پڑھتے تھے جب تک اللہ تعالی ان کو توفیق دیتے تھے، اور یہ سب مسجد نبوی میں پڑھتے تھے، ایک رات نبی پاک ﷺ اپنے چٹائیوں والے اعتکاف کے مخصوص کمرے سے باہر نکلے کیونکہ یہ واقعہ رمضان کے آخری دنوں کا ہے اور حضور ﷺ آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے، اور اعتکاف کا کمرہ صرف حضورؐ کے لئے بنایا جاتا تھا، کسی اور صحابی کے لئے نہیں بنایا جاتا تھا،

سہارن پور میں جب ہم اعتکاف کرتے تھے تو مسجد میں پانچ سو اعتکاف کرنے والے ہوتے تھے اور مسجد میں صرف حضرت شیخ قدس سرہ کے لئے چار پانچ آدمیوں کی جگہ کے بقدر کمرہ بنتا تھا، کیونکہ حضرت کے پاس صبح سے شام تک مریدین آیا کرتے تھے، اپنے حالات سنایا کرتے تھے اور مشورے لیتے تھے، تو حضرت کے لئے ہی حجرہ بنتا تھا باقی کسی کے لئے نہیں بنتا تھا۔

الغرض حضور ﷺ اپنے کمرہ سے باہر نکلے اور مسجد میں جو صحابہ نماز پڑھ رہے تھے ان سے کہا: آؤ میں تمہیں نماز پڑھاؤں، حضورؐ نے کافی دیر تک نماز پڑھائی نماز کے بعد آپ کمرہ میں چلے گئے، صبح اس نماز کا چرچا ہوا تو اس امید پر کہ شاید اگلی رات بھی حضور ﷺ نماز پڑھائیں، کافی تعداد ان لوگوں کی مسجد میں رک گئی جو گھر میں نفلیں پڑھتے تھے، چنانچہ پچھلے دن جتنا وقت گذرا تھا اتنا وقت گذرنے کے بعد حضور ﷺ پھر تشریف لائے، آپؐ نے نماز پڑھائی اور آج کل سے بھی زیادہ وقت لیا، جب دو دن پڑھائی تو اب لوگوں کو ظن غالب ہو گیا کہ اب آپ ہر رات یہ نماز پڑھائیں گے چنانچہ اگلی رات مجمع اور بڑھ گیا، تیسری رات میں بھی آپؐ معینہ وقت پر نکلے، آپؐ نے نماز پڑھائی اور پہلے دو دنوں سے بھی زیادہ آج وقت لیا، جب تیسری رات بھی آپؐ نے نماز پڑھائی تو اب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آپؐ ہر رات یہ نماز پڑھائیں گے کیونکہ راتیں دو یا تین رہ گئی تھیں، پس چوتھی رات کو اتنے لوگ اکھٹا ہو گئے کہ مسجد میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، مقررہ وقت ہوا مگر آپ باہر تشریف نہیں لائے، لوگوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ شاید آپؐ کی آنکھ لگ گئی ہو زور سے تکبیر اور تسبیح پڑھی، کسی نے چٹائی پر کنکری ماری تا کہ آپ کی آنکھ کھل جائے، مگر حضور ﷺ سوئے نہیں تھے۔ بہر حال آج حضور ﷺ نہیں نکلے لوگ مایوس ہو کر منتشر ہو گئے، فجر کی نماز کے بعد حضورؐ نے تقریر کی کہ رات کا تمہارا عمل مجھ سے مخفی نہیں تھا، مگر میں نے تمہارا جو اشتیاق دیکھا تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر لازم نہ ہو جائے، اس لئے آئندہ میں یہ نماز نہیں پڑھاؤں گا، اپنے اپنے طور پر جیسے پہلے پڑھتے تھے پڑھتے رہو۔

اکثر احکام اللہ کی طرف سے خود آتے ہیں مگر بعض احکام اللہ کی طرف سے اس وقت آتے ہیں جب امت خواہش کرے اور نبی صاد کرے یا نبی خواہش کرے اور امت صاد کرے تو وہ حکم لازم ہو جاتا ہے، اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک پیچھے ہٹ جائے تو پھر وہ حکم

لازم نہیں ہوتا، یہ نماز اسی قبیل کی تھی کہ امت خواہش کر رہی تھی مگر نبیؐ پیچھے ہٹ گئے۔

اور جو میں نے حدیث بیان کی اس میں روایتیں مختلف ہیں بعض روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے دو راتیں نماز پڑھائی اور تیسری رات تشریف نہیں لائے اور کچھ روایتوں میں یہ ہے کہ آپؐ نے تین راتیں نماز پڑھائی اور چوتھی رات تشریف نہیں لائے۔

یہ حدیث جو میں نے آپ حضرات کے سامنے بیان کی اس میں غور کیجئے کہ حضورؐ نے یہ جو دو یا تین راتیں نماز پڑھائی تھی وہ کونسی نماز تھی؟ تراویح یا تہجد؟ غیر مقلدین کہتے ہیں: یہ حضور نے تہجد پڑھائی تھی اور چاروں ائمہ کے متبعین کہتے ہیں: یہ حضورؐ نے تراویح پڑھائی تھی اور اس سلسلہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ ماہ رمضان میں تنہا بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے[1] پس ظاہر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان دو یا تین راتوں میں یہی بیس رکعتیں پڑھائی ہونگی، غیر مقلدین کہتے ہیں: یہ روایت ضعیف ہے اس میں فلاں راوی ضعیف ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ضعیف ہے تو کیا آسمان ٹوٹ پڑا؟ اس کے مقابل کوئی صحیح روایت ہو تو لاؤ۔ وہ کہتے ہیں: حضرت عائشہ کی بخاری اور مسلم والی روایت ہے! ہم کہتے ہیں وہ تو تہجد کے بارے میں ہے، تراویح کے بارے میں بتاؤ کہ اس کے علاوہ کوئی روایت ہے؟ کوئی نہیں ہے۔

اور مسئلہ یہ ہے کہ صحیح اور ضعیف میں ٹکراؤ ہو تو صحیح لیں گے ضعیف نہیں لیں گے، لیکن اگر کسی مسئلہ میں صحیح روایت نہ ہو ضعیف حدیث ہی ہو تو وہ ضعیف حدیث لی جائے گی، چنانچہ یہاں بھی عبداللہ بن عباس کی روایت لی جائے گی پھر جب اس ضعیف حدیث کے مطابق ساری دنیا کے مسلمانوں کا تعامل شروع ہو گیا تو اس کا ضعف ختم ہو گیا، اب مسئلہ کا سارا مدار تعامل پر ہو جائیگا۔

بہر حال یہ اختلاف ہو گیا، چاروں ائمہ کے ماننے والے حضورؐ کی پڑھائی ہوئی نماز کو قیام رمضان (تراویح) سمجھتے ہیں اور غیر مقلدین اس کو قیام اللیل (تہجد) سمجھتے ہیں۔ تو فاؤنڈیشن

(۱) عن ابن عباس، قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم يصلي في شهر رمضان في غير جماعة عشرين ركعة والوتر تفرد به أبو شيبة إبراهيم بن عثمان العبسي الكوفي، وهو ضعيف (سنن بیہقی کبریٰ ۲:۴۹۶)

والوں یا حرمین والوں کا خیال اگر یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ نماز قیام اللیل پڑھائی تھی تو تم قیام اللیل جماعت سے پڑھو، تراویح جماعت سے کیوں پڑھتے ہو جب تمہارے خیال میں حضور ﷺ نے تراویح پڑھائی ہی نہیں تو اس کو کیوں پڑھتے ہو؟

اور چاروں ائمہ کے ماننے والوں کا خیال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ تراویح کی نماز پڑھائی تھی اس لئے وہ پورا مہینہ یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور حضور ﷺ نے پورا مہینہ اس لئے نہیں پڑھائی تھی کہ فرضیت کا اندیشہ تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ملت کی تنظیم کی اور اس کا باقاعدہ نظام بنایا اور خلفائے راشدین کے وہ طریقے جو ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں ان کو لینا ضروری ہے حضور ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے، اس لئے ہم پورا مہینہ تراویح جماعت سے پڑھتے ہیں اور قیام اللیل جماعت سے نہیں پڑھتے کیونکہ ہمارے خیال میں حضور ﷺ نے یہ نماز نہیں پڑھائی۔ پس ہم جو سمجھتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں اور وہ لوگ جو سمجھتے ہیں اس پر وہ خود عمل نہیں کرتے۔ بہر حال قیام اللیل خواہ رمضان میں ہو یا غیر رمضان میں حضور ﷺ کا جماعت سے پڑھنا ثابت نہیں، اس لئے ہماری فقہ میں یہ مسئلہ ہے کہ رمضان میں قیام اللیل جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے۔

یہاں اگر کوئی سوال کرے کہ حضرت مدنی قدس سرہ تہجد کی نماز جماعت سے پڑھتے تھے اور ان کے پیچھے بڑا مجمع ہوتا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حنفی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کی فقہ مدون ہے اس پر عمل کرنے والے ہم حنفی ہیں، اور احناف میں اکابر کے کچھ تفردات ہوتے ہیں، کچھ الگ رائیں ہوتی ہیں، یہ حضرت مدنی کا تفرد تھا،[1] اس کو حضرت کے ساتھ خاص رکھیں گے اور ہم اتباع کریں گے فقہ حنفی کا، جیسے علامہ ابن ہمام بہت بڑے حنفی عالم ہیں، ان

(۱) حضرت مدنی قدس سرہ کی رائے تھی کہ رمضان میں نوافل جماعت کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں، تداعی کے ساتھ بھی اور بغیر تداعی کے بھی۔ حضرتؒ ایک تحریر میں لکھتے ہیں: ''اس لئے تمام وہ نوافل جو رمضان کی راتوں میں پڑھی جائیں مراد ہونگی، خواہ تراویح میں خواہ تہجد میں، اوائل شب میں ہوں یا اواخر میں، سب میں جماعت کی اجازت ہوگی'' پھر آگے تحریر فرماتے ہیں: ''پس رمضان کے جملہ نوافل کی جماعت خواہ بالتداعی ہو یا بلا تداعی سب کی سب ماذون فیہ، بلکہ مستحب ہوگی'' (فتاوی شیخ الاسلام ص: ۴۴ و۴۵ مرتبہ مولانا مفتی سلمان صاحب منصور پوری)

کی چودہ مسئلوں میں امام ابوحنیفہؒ سے الگ رائے ہے، اوران کے شاگرد قاسم بن قطلو بغاؒ نے لکھا ہے کہ استاذ کے تفردات مفتی بہ نہیں ۔تو ہر بڑے عالم کی کچھ مسائل میں الگ رائے ہوتی ہے، اس کی ہم اتباع نہیں کریں گے، اتباع ہم فقہ حنفی کی کریں گے۔

جاننا چاہئے کہ فقہی اصطلاحات کے معانی کتب فقہ سے لینے چاہئیں، لغت سے اس کے معنی نہیں لینے چاہئیں جیسے دارالاسلام اور دارالحرب فقہ کی دو اصطلاحیں ہیں، دارالاسلام کے لغت میں معنی ہیں: وہ ملک جہاں تمام اسلامی قوانین جاری ہوں، ایسا ملک تو دنیا میں سعودیہ کے علاوہ کوئی نہیں، اور دارالحرب کے لغت میں معنی ہیں: لڑائی کا ملک، یعنی جہاں مسلمانوں کے ساتھ جنگ چل رہی ہے، تو انڈیا اور کناڈا میں مسلمانوں کے ساتھ کہاں جنگ چل رہی ہے؟ پس انڈیا اور کناڈا جیسے ملک دارالحرب کیسے ہونگے؟ چنانچہ لوگ اشکال کرتے ہیں کہ انڈیا اور کناڈا جیسے ملک دارالحرب کیسے ہوسکتے ہیں؟ یہاں کونسی مسلمانوں کے ساتھ جنگ چل رہی ہے، یہاں تو مذہبی اعتبار سے مکمل آزادی ہے، لوگوں نے یہ اشکال ان کے معنی لغت میں دیکھ کر کھڑا کیا ہے، یہ تو فقہ کی اصطلاحیں ہیں، لہٰذا فقہ کی کتابوں میں ان کے معنی دیکھ کر مفہوم طے کیا جائے اور فقہ میں دارالحرب اس ملک کو کہا جاتا ہے جہاں اقتدار اعلی کافروں کے ہاتھ میں ہو، اور جہاں اقتدار اعلی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو وہ دارالاسلام ہے، چاہے وہاں اسلامی قوانین جاری ہوں یا نہ ہوں، ایسے ہی تداعی کے معنی لغت میں دیکھ کر طے نہیں کئے جائیں گے یہ فقہ کا اصطلاحی لفظ ہے چنانچہ اس کے معنی بھی فقہ کی کتابوں میں دیکھ کر طے کئے جائیں گے اور فقہ میں تداعی کے معنی ہیں: کوئی بھی نفل نماز اگر اس میں ایک امام اور تین مقتدی ہوں تو تداعی ہے چاہے بلایا گیا ہو یا نہ بلایا گیا ہو۔

اسی لئے فتاوی شیخ الاسلام میں حضرت کے نواسے: مفتی محمد سلمان منصور پوری نے اس مسئلہ پر حاشیہ لکھا ہے کہ فقہ حنفی کی رو سے تداعی کے یہ معنی ہیں، اور حضرت نے جو کچھ لکھا ہے یہ حضرت کا تفرد ہے (۱) لہٰذا ہم حنفی ہونے کی حیثیت سے اس کی اتباع نہیں کریں گے۔

بہرحال یہ جو سوال تھا کہ قیام اللیل جماعت سے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ

(۱) مفتی سلمان صاحب کا حاشیہ یہ ہے: ’’یہ مسئلہ حضرتؒ کے تفردات میں سے ہے، جسے ←

ہے کہ اگر ایک امام اور دو مقتدی ہوں تو کوئی کراہیت نہیں، لیکن اگر ایک امام اور تین مقتدی ہوں تو پھر مکروہ ہے چاہے بلایا گیا ہو یا نہ بلایا گیا ہو، اور جو لوگ پڑھتے ہیں ان کو پڑھنے دو، دنیا میں اعمال میں اتحاد کہاں ہے؟ ہماری اسی مسجد میں آدھے آمین بالجہر کہتے ہیں اور آدھے بالسر۔ آدھے رفع یدین کرتے ہیں اور آدھے نہیں کرتے، نہ یہ ان سے لڑتے ہیں اور نہ وہ ان سے لڑتے ہیں، کوئی کھڑا ہوتا ہے تو پیروں کے درمیان چار چھ انگلیوں کا فاصلہ رکھتا ہے اور کوئی کھڑا ہوتا ہے تو پیروں کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رکھتا ہے، تو اعمال میں اتحاد کہاں ہے؟ اتحاد ایمان وعقائد میں ہونا چاہئے، پس اگر فلاں اور فلاں جگہ کے لوگ قیام اللیل جماعت سے پڑھتے ہیں تو پڑھنے دو، آپ اپنے طریقہ پر چلیں اور وہ اپنے طریقہ پر، ایک منہاج پر چلو یہ نہیں کہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر، یوں دین کی خیر نہیں رہے گی۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

تقریر کے بعد ایک سوال: دارالعلوم دیوبند کی مسجد رشید اور مسجد چھتہ میں تو تہجد کی جماعت ہوتی ہے، جبکہ دارالعلوم مسلک حنفی کا ترجمان ہے؟

جواب: یہ صاحبزدگان کا عمل ہے، دارالعلوم کا عمل نہیں۔ رمضان میں حضرت مدنی قدس سرہ کے صاحبزدگان ان دو مسجدوں میں اپنے مریدین کے ساتھ اعتکاف کرتے ہیں۔ اور حضرتؒ کے بعض خلفاء کی طرح یہ حضرات بھی جماعت کے ساتھ تہجد پڑھتے ہیں، پس یہ ان کا اپنا عمل ہے، دارالعلوم دیوبند سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ دارالعلوم کی مسجد قدیم میں یہ عمل نہیں ہوتا۔

→ حضرتؒ نے مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے براہ راست احادیث شریفہ سے مستنبط فرمایا ہے، لیکن احقر کو حضرت کے اس موقف کی تائید فقہ حنفی کے کسی جزئیہ سے نہیں ملی، بلکہ مبسوط سرخسی اور دیگر معتبر کتب احناف میں تین چار سے زیادہ مقتدی ہونے کی صورت میں نوافل کی جماعت کو مطلقاً مکروہ قرار دیا ہے (مبسوط سرخسی ۲:۱۴۴) بریں بنا مسئلہ زیر بحث میں فقہ حنفی کی رو سے حضرت گنگوہیؒ کا موقف ہی راجح اور مضبوط ہے‘‘ محمد سلمان۔

نوٹ: حضرت گنگوہیؒ نے فتاوی رشیدیہ میں جماعتِ تہجد کو مکروہ لکھا ہے ۱۲

﴿۸﴾

سعودیہ کے چاند کا مسئلہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ؟ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ، وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى، وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو: ابھی ہمارے قاری صاحب نے جو تلاوت کی ہے اس میں یہ آیت بھی پڑھی ہے اس آیت میں چاند کا مسئلہ ہے اور مغربی دنیا میں یہ مسئلہ جھگڑے کا باعث بنا ہوا ہے، پس کیوں نہ آج اسی آیت پاک کی تفسیر سمجھ لی جائے؟

شانِ نزول

آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی پاک ﷺ سے سوال کیا کہ سورج ہمیشہ ایک حال پر رہتا ہے مگر چاند ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا، ایسا کیوں ہے؟ مہینہ کی تین راتوں میں یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ میں تو ماہ کامل ہوتا ہے پھر گھٹنا شروع ہوتا ہے، اور گھٹتے گھٹتے برائے نام رہ جاتا ہے، پھر بالکل غائب ہو جاتا ہے، پھر کھجور کی ٹہنی کی طرح دوبارہ نمودار ہوتا ہے، جو مہینہ کی پہلی تاریخ کہلاتی ہے، پہلی تاریخ کے چاند کو عربی میں 'ہلال' کہتے ہیں، اردو میں بھی یہی لفظ مستعمل ہے، پھر چاند بڑھتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ماہ کامل بن جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ سورج کی طرح چاند ہمیشہ ایک حالت پر کیوں نہیں رہتا؟

اس سوال کا ایک پس منظر ہے، صحابہؓ نے حضور ﷺ سے یہ بات اس لئے پوچھی تھی کہ عرب کا ملک گرم ملک ہے، جیسے یہاں (یورپ وامریکہ میں) آٹھ مہینے سردی رہتی ہے عرب میں آٹھ مہینے گرمی رہتی ہے اور عرب میں پہاڑ بہت ہیں، وہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا،

مدینہ اور طائف میں تو تھوڑا بہت پیدا ہو جاتا ہے مگر ملک کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا، اس لئے عربوں کی معیشت کا مدار اسفار پر تھا، سال میں ایک مرتبہ شام جاتے تھے اور ایک مرتبہ یمن، اونٹوں پر سفر ہوتا تھا اور اونٹ پورے دن نہیں چل سکتے، زمین گرم ہو جاتی ہے، زیادہ سے زیادہ نو بجے تک چل سکتے ہیں، پھر سفر روک دینا پڑتا ہے، پھر شام کو عصر کے بعد جب سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں اور موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تب سفر شروع کرتے ہیں، دن میں سفر نہیں کر سکتے، اس لئے دن کی تلافی رات میں کرتے تھے اور چاند جیسا تیرہ چودہ اور پندرہ میں کامل ہوتا ہے اگر ایسا ہی پورا مہینہ رہے تو سفر پُر لطف ہو جائے، یہ پس منظر تھا جس کی وجہ سے سوال کیا تھا کہ جس طرح سورج ایک حال پر رہتا ہے چاند ایک حال پر کیوں نہیں رہتا؟ پس آیت پاک نازل ہوئی کہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں ہلالوں کے بارے میں؟ ہلال نہیں فرمایا بلکہ ہلالوں فرمایا، جمع لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ساری دنیا کا ہلال ایک نہیں، اگر ساری دنیا کا ہلال ایک ہوتا تو مفرد ہلال لایا جاتا، أهلة جمع لانے کی ضرورت نہیں تھی، بہر حال لوگ آپ ﷺ سے مہینہ کے شروع کے چاندوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ ان کو جواب دیں: مہینہ کے شروع کے چاند لوگوں کے لئے اوقات مقرر کرتے ہیں اور حج کے لئے وقت مقرر کرتے ہیں، یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حج کو الگ کیوں کیا؟ موا قیت للناس کافی تھا، حج کو الگ کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مہینہ کے نئے چاند ساری دنیا کے لئے الگ الگ تاریخیں مقرر کرتے ہیں۔

بعض احکام سورج سے متعلق ہیں اور بعض چاند سے

کیلنڈر دو طرح کے بنتے ہیں، ایک سورج کا اور ایک چاند کا، سورج کا کیلنڈر ہر آدمی نہیں بنا سکتا جو فلکیات کا ماہر ہے وہی بنا سکتا ہے، اور چاند کا کیلنڈر ہر شخص بنا سکتا ہے، چاند نظر آئے تو اگلا مہینہ شروع کر دو، ورنہ تیس دن مکمل کر لو، اس کے لئے کسی حساب کی ضرورت نہیں اور سورج کا کیلنڈر بنانے کے لئے حساب کا جاننا ضروری ہے۔

پھر شریعت نے کچھ احکام سورج سے متعلق کئے ہیں اور کچھ چاند سے، وہ احکام جن کو

سال میں دائر نہیں کرنا ان کو سورج سے متعلق کیا ہے، اور جن احکام کو سال میں دائر کرنا ہے ان کو چاند سے متعلق کیا ہے، جیسے رمضان شریف کو سال میں دائر کرنا ہے، اگر ہمیشہ رمضان گرمی میں آئے گا تو لوگ پریشان ہونگے اور ہمیشہ سردی میں آئے گا تو کچھ مشقت نہ ہوگی، پھر زمین کا کرہ گول ہے، شمال کی سردی گرمی کا اعتبار ہوگا یا جنوب کی؟ ایک جانب والا ہمیشہ مزہ میں رہے گا دوسری جانب والا پریشان! پس رمضان پورے سال میں گھومے اس لئے اس کو چاند سے متعلق کیا تاکہ کبھی اور کہیں رمضان سردیوں میں آئے اور کبھی اور کہیں گرمیوں میں، اور نمازیں سال بھر پڑھنی ہے، گرمی اور سردی کا اس پر اثر نہیں پڑتا اس لئے ان کو سورج سے متعلق کیا۔

پھر جو احکام سورج سے متعلق ہیں ان میں بھی حساب کا اعتبار نہیں، آنکھ سے دیکھو اور عمل کرو اور جو احکام چاند سے متعلق ہیں ان میں بھی حساب کا اعتبار نہیں آنکھ سے دیکھو اور عمل کرو کیونکہ نبی پاک ﷺ کی امت اتنی بڑی ہے کہ اگر درختوں کے پتے گنے جاسکتے ہیں تو حضور ﷺ کی امت گنی جاسکتی ہے، اگر ریت کے ذرے گنے جاسکتے ہیں تو حضور ﷺ کی امت گنی جاسکتی ہے، اگر آسمان کے تارے گنے جاسکتے ہیں تو حضور ﷺ کی امت گنی جاسکتی ہے، اور سب لوگ شہروں اور دیہاتوں میں نہیں رہتے، کچھ لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں، کچھ جنگلوں میں، پس اگر ان کو سورج اور چاند کا حساب سیکھنے کے لئے کہا جائے گا تو یہ بات امت کے لئے ناقابل عمل ہوگی، اس لئے حکم دیا کہ آنکھ سے دیکھو اور عمل کرو چاہے وہ حکم سورج سے تعلق رکھتا ہو یا چاند سے۔

ہندی مہینے یکساں کیوں ہوتے ہیں؟

ہندوؤں کا کیلنڈر بھی قمری ہے مگر وہ موسم فکس کرنے کے لئے ہر تین سال میں ایک مہینہ بڑھا دیتے ہیں، ہر تیسرے سال: سال کے تیرہ مہینے کر دیتے ہیں اور اس طرح ان کے قمری مہینے ایک سیزن میں آتے ہیں، جیٹھ ہمیشہ گرمیوں میں آتا ہے، اسلام سے پہلے عرب بھی مہینوں کے ساتھ یہی عمل کرتے تھے، وہ بھی ہر تیسرے سال کبیسہ کے نام سے

ایک مہینہ بڑھاتے تھے، چنانچہ رمضان کا جو رمضان نام پڑا ہے وہ اس وجہ سے پڑا ہے کہ رمضان کے معنی ہیں: وہ زمانہ جس میں پتھر نہایت گرم ہو جاتے ہیں، چونکہ رمضان ہمیشہ نہایت گرمی میں آتا تھا اس لئے اس مہینہ کو رمضان کہنے لگے، قرآن کی آیت ﴿إِنَّمَا النَّسِيْءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ﴾ میں اسی کا بیان ہے، اسلام نے اس سسٹم کو ختم کر دیا پس مہینے سال میں گھومنے لگے۔

نمازوں کے اوقات میں جنتری اور گھڑی کا اعتبار نہیں

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نمازوں کے اوقات کیلئے جنتریاں بنائی جاتی ہیں اور ان کے حساب سے اذانیں دی جاتی ہیں اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں، پس جب نمازوں میں حساب کا اعتبار کیا جاتا ہے تو رمضان کے چاند میں حساب کا اعتبار کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نمازوں کے اوقات میں جنتریوں کا اعتبار نہیں، مشرق میں دیکھو! پو پھٹے اور لال دھاری نمودار ہو تو صبح صادق ہوگئی، سحری بند کرو اور فجر کی نماز پڑھو، گھڑی میں چاہے کچھ بھی بجا ہو اس کا اعتبار نہیں، اسی طرح سورج نکلا اس کا اوپر کا کنارہ نمودار ہوا تو سورج نکل آیا اب فجر کی نماز کا وقت ختم ہوگیا، پھر جب سورج بلند ہوا اور ہر چیز کا سایہ گھٹتا ہوا درجہ صفر پر آگیا یعنی سورج سر پر آگیا تو ہر نماز ممنوع ہوگئی، پھر جب سورج ڈھلا اور سایہ مشرق کی طرف بڑھنا شروع ہوا تو زوال ہوگیا اب ظہر پڑھو، پھر اصلی سایہ چھوڑ کر جب ہر چیز کا سایہ اس کے مانند ہو جائے تو ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک ظہر کا وقت ختم ہوگیا اور امام اعظمؒ کے نزدیک ابھی ظہر کا وقت باقی ہے، ان کے نزدیک اصلی سایہ چھوڑ کر ہر چیز کا سایہ دوگنا ہو جائے تب ظہر کا وقت ختم ہوتا ہے، اور جب بھی ظہر کا وقت ختم ہو عصر کا وقت شروع ہو جائے گا، اور جب سورج کا اوپر کا کنارہ چھپ جائے تو مغرب کا وقت ہوگیا، پھر سورج ڈوبنے کے بعد جب تک مطلع پر روشنی رہے مغرب کا وقت ہے، اور جب بالکل اندھیرا چھا جائے تو عشاء کا وقت شروع ہوگیا صبح صادق تک عشاء پڑھ سکتے ہیں، غرض کسی حساب کی ضرورت نہیں اور کوئی گھڑی نہیں چاہئے، آنکھوں سے دیکھو اور پانچوں نمازیں پڑھو، نمازوں

میں جنتریوں کا حساب ضروری نہیں، جنتریاں لوگوں نے سہولت کے لئے سے بنائی ہیں، لیکن فرض کرو: جنتری کہتی ہے ابھی پانچ منٹ کے بعد سورج طلوع ہوگا اور ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ سورج نکل آیا، تو اعتبار دیکھنے کا ہوگا، جنتری اور گھڑی کا نہیں ہوگا، چاند کا بھی یہی معاملہ ہے، اعتبار آنکھ سے دیکھنے کا ہے، اگرچہ قمری کیلنڈر بھی بنتے ہیں، اور سال میں دس مہینے اس کے حساب سے چاند نظر آتا ہے، مگر سال میں دو ماہ اس کیلنڈر کے مطابق چاند نظر نہیں آتا، اس لئے اعتبار حساب کا نہیں، بلکہ آنکھ سے دیکھنے کا ہے۔

ترقی یافتہ دور میں حساب پر مدار رکھنے میں حرج کیا ہے؟

برطانیہ میں اور اس ملک (امریکہ) میں کچھ مسلمان جو ماہرین حساب ہیں کہتے کہ چاند کو آنکھ سے دیکھنے کا زمانہ چودہ سو سال پہلے تھا جبکہ اونٹوں اور پتھروں کا زمانہ تھا، اب ہم ترقی یافتہ ہیں، لکھنا پڑھنا جانتے ہیں، حساب کتاب جانتے ہیں، ہم حساب سے بتا سکتے ہیں کہ چاند کب نکلے گا اور کب ڈوبے گا؟ اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نیا چاند کب پیدا ہوگا اور کب آنکھ سے دیکھنے کے قابل ہوگا۔

میں ان بھائیوں سے پوچھتا ہوں: بتاؤ حساب کتاب جاننے والے کتنے مسلمان ہیں؟ پوری دنیا میں ایک فیصد بھی نہیں، پس شریعت احکام کا مدار ایسی چیز پر کیسے رکھے گی جس کے جاننے والے ایک فیصد بھی نہیں، چنانچہ حدیث میں نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **نحن أمة أمية لا نكتب ولا نحسب**: ہم ناخواندہ امت ہیں یعنی امت کی اکثریت ناخواندہ ہے، اور ناخواندہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اردو فارسی انگریزی نہیں جانتے، بلکہ ناخواندہ ہونے کا مطلب ہے: **لا نكتب ولا نحسب**: ہم لکھتے نہیں اور گنتے نہیں، چنانچہ آج بھی امت کی اکثریت حساب کتاب نہیں جانتی ایسی صورت میں شریعت اکثریت کا لحاظ کر کے احکام مقرر کرتی ہے کچھ خاص بندوں کا لحاظ کر کے احکام مقرر نہیں کرتی، پارلیمنٹ جو قوانین بناتی ہے ان میں بھی اکثریت کا لحاظ کرتی ہے بعض کا لحاظ نہیں کرتی۔

پس ماہرین حساب کا یہ کہنا کہ دنیا اب بہت ترقی یافتہ ہوگئی ہے، اب ہم حساب کے

ماہر ہوگئے ہیں ان کا یہ کہنا صحیح ہے، بے شک وہ ماہر ہوگئے ہیں، ہم ان کی مہارت کا انکار نہیں کرتے لیکن شریعت نے اکثریت کا لحاظ کر کے چاند کا مدار حساب پر نہیں رکھا، بلکہ آنکھوں کی رویت پر رکھا ہے۔

بہر حال کوئی ماہر ہے یا نہیں؟ اس قصہ کو چھوڑو، اگر ماہر ہے بھی تو احکام کا مدار حساب پر نہیں، سورج سے متعلق احکام کا بھی اور چاند سے متعلق احکام کا بھی، دونوں کا مدار آنکھ سے دیکھنے پر ہے کیونکہ امت کی اکثریت حساب کتاب نہیں جانتی اور شریعت احکام کے نازل کرنے میں اکثریت کا لحاظ کرتی ہے۔

آیت کریمہ پر ایک نظر پھر ڈالو، اللہ پاک فرماتے ہیں: آپؐ جواب دیں: چاند گھٹتا بڑھتا اس لئے ہے کہ لوگوں کے لئے اوقات مقرر کرے اور حج کے لئے وقت مقرر کرے، اس میں صاف اشارہ ہے کہ مدار آنکھ سے دیکھنے پر ہے اور آنکھ سے دیکھنے کے اعتبار سے مہینہ کا پہلا چاند پوری دنیا میں ایک نہیں ہوسکتا پس لامحالہ چاند کا مہینہ پوری دنیا میں الگ الگ شروع ہوگا، جہاں چاند نظر آئے گا وہاں مہینہ شروع ہوگا، صرف حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں ساری دنیا کے مسلمان اپنی تاریخیں چھوڑ کر مکہ کی قمری تاریخ کے اعتبار سے معین دن میں حج کریں گے۔

سعودیہ کا چاند

آج سے تقریبا چالیس سال پہلے جبکہ میں راندیر میں تھا، مکہ کے حکومتی ادارے رابطہ عالم اسلامی نے اجلاس بلایا، دنیا کے بڑے بڑے علماء اس کے رکن ہیں، ہندوستان سے اس وقت حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں صاحب ندوی رحمہ اللہ تھے، دونوں حضرات اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے، اس کانفرنس کے ایجنڈے میں توحید اہلہ کا مسئلہ بھی تھا، توحید کے معنی ہیں: ایک ہونا، اور اہلہ: ہلال کی جمع ہے، یعنی دنیا میں چاند کی الگ الگ تاریخیں شروع ہوتی ہیں، یہ نظام ختم کیا جائے اور پوری دنیا میں چاند کی تاریخیں ایک ساتھ شروع ہوں ایسا نظام بنایا جائے توحید

اھلہ کا مطلب یہی ہے، تمام ممبران نے حتی کہ سعودیہ کے ممبران نے بھی اس کو نامنظور کیا انھوں نے کہا: یہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے، قرآن کی تو یہی آیت ہے اور حدیث میں نبی پاک ﷺ نے فرمایا ہے: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته: جب چاند نظر آئے رمضان کے روزے شروع کرو اور چاند نظر آئے تو رمضان کے روزے ختم کرو، غرض تمام ممبران نے اس تجویز کو رد کردیا کہ پوری دنیا کا چاند ایک نہیں ہوسکتا۔

پوری دنیا کے لئے ایک چاند مقرر کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ چاند کو آنکھ سے دیکھنے کا مسئلہ ختم کردیا جائے اور قمر جدید یعنی نیومون کا اعتبار کرلیا جائے، اس صورت میں ساری دنیا کا چاند ایک ہوجائے گا۔

قمر جدید (نیا چاند) کیا ہے؟

سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے، چاند بھی اسی طرح مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے، یہ چاند کی روزمرہ کی چال ہے البتہ چاند کی ایک دوسری چال بھی ہے، وہ مغرب سے مشرق کی طرف بھی چلتا ہے، دو متضاد چالیں ایک ساتھ چلتا ہے اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ مشکل نہیں، جیسے ہم فٹ بال کو لات مارتے ہیں تو گیند سامنے کی طرف بھی جاتی ہے اور گول بھی گھومتی ہے، اسی طرح چاند چوبیس گھنٹے میں ایک راؤنڈ لیتا ہے، اور دوسری چال مغرب سے مشرق کی طرف چوبیس گھنٹوں میں ۲۳ ڈگری چلتا ہے اور انتیس دن میں ایک راؤنڈ پورا کرتا ہے۔ اور جیسے آدھی زمین روشن رہتی ہے اور آدھی پر اندھیرا چھایا رہتا ہے، یہاں رات ہے اور چین میں سورج نکلا ہوا ہے، یہی حال چاند کا بھی ہے، اس کا آدھا حصہ جو سورج کی طرف ہے وہ روشن ہوتا ہے اور دوسرا آدھا جو سورج کے مقابل نہیں وہ تاریک ہوتا ہے، پس آدھا روشن اور آدھا غیر روشن ہونے میں چاند اور زمین یکساں ہیں، اور جب ہم چاند کو زمین سے دیکھیں اور اس کا روشن حصہ نظر نہ آئے تو اس کا نام مُحاق ہے، پھر جب ہمارے دیکھنے کا زاویہ بدلتا ہے تو چاند کے روشن حصہ کا ایک کنارہ ہمیں نظر آتا ہے، یہ ہلال ہے، پھر جوں جوں زاویہ بدلتا رہتا ہے ہر دن کا چاند بڑا ہوتا رہتا ہے، پھر ایک وقت ایسا

آتا ہے کہ چاند زمین اور سورج کے بیچ میں آجاتا ہے، پس چاند کا آدھا روشن حصہ دوسری طرف ہوجاتا ہے اور ہماری طرف تاریک والا حصہ ہوجاتا ہے، یہ زمانہ محاق کہلاتا ہے، پھر جب چاند مشرق کی طرف ہٹتا ہے اور سورج کے تقابل سے نکل جاتا ہے تو قمر جدید کہلاتا ہے، لیکن ابھی اس کا زاویہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ زمین سے اس کے دیکھنے کا امکان نہیں ہوتا، جب چاند سورج سے کم از کم سولہ ڈگری پیچھے ہوجائے تب زمین سے دیکھنے کے قابل ہوتا ہے اور کھجور کی ٹہنی کی طرح نظر آتا ہے۔

غرض قمر جدید کا اعتبار کرلیں تو پوری دنیا کی تاریخ ایک ہوجائے گی، توحید اہلہ کی یہی صورت ہے، یہ تجویز رابطہ کے اجلاس میں پیش ہوئی مگر دنیا کے تمام علماء نے اس کو نامنظور کردیا، کانفرنس سے جب وہ دونوں حضرات لوٹے تو حضرت مولانا محمد منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ تبلیغی دورے پر سورت تشریف لائے، میں چونکہ ان کے رسالہ الفرقان میں لکھتا تھا اس لئے میرا ان سے تعارف تھا، حضرت نے ساری تفصیل مجھے سنائی اور فرمایا سعودیہ نے ایک خطرناک اسکیم شروع کی ہے اور اچانک یہ مسئلہ کھڑا کیا ہے تاکہ بے خبری میں اس کو پاس کرالیا جائے، علماء نے اگرچہ اس کو بالکل نامنظور کردیا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ فتنہ رکے گا نہیں، اس سے پہلے کہ یہ بہت بڑا فتنہ بن جائے اس پر مضامین لکھنے چاہئیں، چنانچہ میں نے اسی زمانہ میں اس مسئلہ پر ایک مضمون لکھا جو الفرقان میں دو قسطوں میں شائع ہوا[(۱)]
اس کے بعد کیا ہوا؟ سعودیہ خاموش ہوگیا، اس نے آگے مسئلہ نہیں چھیڑا مگر اس وقت سے اس کو ساری دنیا سے پہلے چاند نظر آتا ہے اور باقاعدہ اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں قاضی کے پاس دو گواہوں نے گواہی دی، اس کو دو ہی گواہ ملتے ہیں، جبکہ سعودیہ کا مطلع عام طور پر صاف ہوتا ہے مگر کبھی رویت عامہ نہیں ہوتی۔

سعودیہ کا انوکھا چاند

اس سال (۲۰۰۹) میں تو عجیب تماشہ ہوا، مدینہ منورہ میں مولانا...... ہیں جو حضرت مولانا

(۱) یہ مضمون اس تقریر کے بعد ہے ۱۲

......صاحب رحمہ اللہ کے خلیفہ ہیں اور ایک مولانا...... ہیں، ان کا لندن میں ایک صاحب کے پاس فون آیا کہ ہم نے فجر کے بعد سورج نکلنے سے پہلے اپنی آنکھوں سے چاند دیکھا اور شام کو سعودیہ نے رمضان کے چاند کا اعلان کر دیا، یہ اسی سال کا قصہ ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۷۴ء سے چل رہا ہے جس کا پس منظر میں نے آپ حضرات کو سنایا، اُس وقت سعودیہ نے جو سوچا تھا اسی کے مطابق کرتا ہے، مگر چونکہ مسلمان اس کو مانیں گے نہیں اس لئے رویت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔

کیا سعودیہ والے مسلمان نہیں؟

کچھ لوگ کہتے ہیں: کیا سعودیہ والے مسلمان نہیں؟ کیا وہ جھوٹ بولتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرق میں جب چاند نظر آئے گا تو مغرب میں ضرور نظر آئے گا، کیونکہ مغرب میں چاند کا سورج سے فاصلہ بڑھ جائے گا، مگر آپ دیکھتے ہیں کہ سعودیہ چاند دیکھنے کا اعلان کرتا ہے، پھر ڈھائی گھنٹے بعد براعظم افریقہ میں سورج غروب ہوتا ہے، مگر پورے براعظم افریقہ میں یہ چاند کسی مسلمان کو نظر نہیں آتا، سعودیہ والے مسلمان ہیں تو کیا افریقہ والے مسلمان نہیں؟ اس کے بعد براعظم امریکہ میں سورج غروب ہوتا ہے، پورے براعظم امریکہ میں کسی مسلمان کو یہ چاند نظر نہیں آتا مگر سعودیہ میں دو آدمیوں کو نظر آجاتا ہے بلکہ بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ پورے راؤنڈ میں کہیں چاند نظر نہیں آتا، اس سال جس چاند کے دیکھنے کا سعودیہ نے اعلان کیا ہے وہ چاند پورے افریقہ میں کسی کو نظر نہیں آیا، پورے امریکہ میں کسی کو نظر نہیں آیا، چائنا میں نظر نہیں آیا، ملیشیا میں نظر نہیں آیا، انڈیا میں نظر نہیں آیا، ہاں مغربی انڈیا میں نظر آیا، گجرات کی جو پٹی ہے وہاں چاند نظر آیا اور وہاں سے جو نظر آنا شروع ہوا تو پورے راؤنڈ میں سب جگہ نظر آیا، مگر سعودیہ کا دیکھا ہوا چاند پورے راؤنڈ میں گجرات تک کہیں نظر نہیں آیا پس سعودیہ والے مسلمان ہیں تو کیا دنیا کے سارے مسلمان آنکھ بند کر کے چاند دیکھتے ہیں؟ اگر سعودیہ صاف کہہ دے کہ ہم قمر جدید پر اعلان کرتے ہیں تو کوئی جھگڑا نہیں، جس کو ماننا ہوگا مانے گا اور جس کو نہیں ماننا ہوگا نہیں مانے گا۔

مشکوک بات چھوڑو اور یقینی بات اختیار کرو

اور امر مشکوک کے بارے میں شریعت کا حکم وہ ہے جس کو نبی پاک ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إلى ما لا يريبك فإنَّ الصدق طُمَأْنِيْنَةٌ، وَالْكَذِبَ رِيْبَةٌ: کھٹک والی بات چھوڑو اور بے کھٹک بات اختیار کرو، سچ سے اطمینان ہوتا ہے اور جھوٹ سے دل بے چین ہوتا ہے، مثال کے طور پر آپ پولیس کے ہاتھوں میں پھنس جائیں اور آپ جھوٹ بول کر اپنا الو سیدھا کر لیں تو کر لیں، لیکن دل آپ کا بے چین رہے گا اور اگر آپ اس معاملہ میں سچ بولیں اور چار پیسے کا نقصان برداشت کر لیں تو اگرچہ نقصان ہوگا مگر دل آپ کا مطمئن رہے گا، پس سعودیہ کو ہم جھوٹا نہیں کہتے لیکن وہ مشکوک تو ضرور ہے اور شریعت کا حکم مشکوک کے بارے میں میں نے حدیث کے حوالہ سے بتایا کہ مشکوک کو یقینی بنالو، یقینی بات کیا ہے؟ حدیثوں میں حکم آیا ہے کہ ہر جگہ کی اور ہر ملک کی رویت پر رمضان شروع کیا جائے اور رویت ہی پر ختم کیا جائے، ہاں اگر کوئی ملک ایسا ہو کہ وہاں سال کا بیشتر حصہ مطلع ابر آلود رہتا ہو، چاند نظر نہ آتا ہو تو وہ نزدیک والے ملک کی رویت کا اعتبار کرے، اور اگر کبھی مطلع ابر آلود رہتا ہو تو وہ نزدیکی ملک کا اعتبار نہیں کرے گا، بلکہ وہ اپنے چاند کا اعتبار کرے گا، چاند نظر آیا تو ٹھیک ہے، نہیں نظر آیا تو مہینہ تیس کا شمار کریں گے، اس سال گجرات میں چاند دیکھا گیا اور انتیس کے اعتبار سے عید ہوئی لیکن پورے ہندوستان نے وہ رویت نہیں لی کیونکہ گجرات مغرب میں ہے اور مغرب کا چاند مشرق میں نظر نہ آئے ایسا ہو سکتا ہے لیکن مشرق کا چاند مغرب میں نظر نہ آئے یہ ممکن نہیں، یہ عجوبہ تو چالیس سال سے چل رہا ہے کہ سعودیہ میں چاند نظر آتا ہے اور افریقہ اور امریکہ میں نظر نہیں آتا، اگر سعودیہ کی رویت حقیقی ہوتی تو دنیا میں کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا، یہ آیت پاک کے شروع حصہ کی وضاحت ہوئی، اس کے بعد جو ٹکڑا ہے اس کی بھی وضاحت کر دوں تا کہ بات پوری ہو جائے۔

اسلام سے پہلے جب عرب حج کا احرام باندھتے تھے تو دروازہ سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے اور گھر میں آنا ضروری ہے، پس وہ پچھلے دروازے سے گھر میں آتے تھے اور وہیں سے نکلتے بھی تھے، جیسے یہود کے یہاں سنیچر کو کوئی کام نہیں کر سکتے، لائٹ اگر کھلی ہے اور سنیچر

شروع ہوگیا تو اب اس کو بند نہیں کر سکتے، بند ہے اور سنیچر شروع ہوگیا تو اب اس کو کھول نہیں سکتے، لیکن کرتے سب کام ہیں، کرتے کیا ہیں؟ سڑک سے کسی مسلمان کو پکڑ لاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: ذرا بٹن آن کردو، یہ کیا دین پر عمل ہوا؟ یہ تو اللہ کو دھوکہ دینا ہوا، ایسا ہی حیلہ انہوں نے پرانے زمانہ میں مچھلیوں کے تعلق سے کیا تھا، بہرحال جیسا یہ یہودی کرتے ہیں ایسا ہی عرب بھی کرتے تھے کہ حج کا احرام باندھنے کے بعد سامنے کے دروازے سے گھر میں نہیں آتے تھے، پیچھے سیڑھی لگا کر گھر میں آتے تھے، قرآن نے کہا: ﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ یہ کونسا نیکی کا کام ہے کہ تم گھروں میں پچھواڑے سے آؤ ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ بلکہ نیکی کا کام یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر عمل کرو اس کے حکم کی خلاف ورزی مت کرو۔

اللہ سے ڈرنے کا مطلب

اور اللہ سے ڈرنا ایسا ڈرنا نہیں جیسے سانپ سے، شیر سے اور دشمن سے ڈرتے ہیں، اللہ تو وہ ذات ہے جس سے محبت کرنی ہے، بلکہ اللہ سے ڈرنے مطلب یہ ہے کہ جیسے اطاعت شعار بیٹا باپ سے ڈرتا ہے، مخلص طالب علم استاذ سے ڈرتا ہے، عقیدت مند مرید پیر سے ڈرتا ہے، بیٹا سوچتا ہے کہ مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے کہ ابا ناراض ہوجائیں، جنت تو ماں باپ کے قدموں کے نیچے ہے اور وہی ناراض ہوگئے تو میرا کیا ہوگا؟ طالب علم پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے سوچتا ہے کہ میں کوئی ایسا کام نہ کروں کہ استاذ ناراض ہوجائیں، اگر وہ ناراض ہوگئے تو مجھے چار لفظ کہاں سے آئیں گے؟ عقیدت مند مرید سوچتا ہے کہ مجھے کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ پیر ناراض ہوجائے، اگر پیر ناراض ہوگیا تو میرا اللہ سے تعلق کون جوڑے گا؟ تو جیسے یہ تینوں حضرات اپنے بڑوں کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرتے ہیں، ان کی ناراضگی سے ڈرتے ہیں ایسے ہی اللہ سے ڈرنا ہے کہ مومن بندے کو کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ جس سے اللہ ناراض ہوجائیں، قرآن وحدیث میں جہاں جہاں آتا ہے کہ اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو، اس کا یہی مطلب ہے۔

غرض قرآن نے مشرکین سے کہا: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى﴾ نیکی کا کام یہ ہے کہ تم اللہ

کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرو، اگر اللہ نے یہ حکم دیا ہو کہ احرام باندھنے کے بعد گھر میں مت جاؤ تو مت جاؤ، یہ کیا بات ہوئی کہ دروازے سے نہیں گئے، پیچھے سے گھس گئے ﴿وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، یعنی شریعت کا یہ حکم نہیں ہے کہ احرام باندھنے کے بعد گھر میں نہیں آسکتے، یہ تو تم نے خود گھڑ لیا ہے، ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اور اللہ سے ڈرو، یعنی اللہ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی مت کرو، اللہ نے کہا ہے: احرام میں ٹوپی مت پہنو، مت پہنو، اللہ نے کہا ہے: احرام میں پگڑی مت باندھو، مت باندھو اللہ نے جو احکام دیئے ہیں ان کا پالن کرو اپنی طرف سے کچھ مت بڑھاؤ، ﴿لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تاکہ تم کامیاب ہوؤ، مومن کی کامیابی اللہ کے احکام کی اطاعت میں ہے اپنی طرف سے احکام تجویز کرنے میں نہیں ہے۔

ربط مضامین

آیت میں مذکور دونوں مضمون میں نے آپ حضرات کو سمجھا دیئے، میرے بھائیو! آپ اس پر غور کریں کہ ان دونوں مضمونوں میں جوڑ کیا ہے؟ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا تو بھان متی نے نہیں جوڑا؟ نہیں ایسا نہیں ہے، پہلا مضمون یہ ہے کہ مہینہ کے نئے چاند تمام لوگوں کے لئے الگ الگ اوقات مقرر کریں گے اور حج کے لئے ایک وقت مقرر کریں گے، اور دوسرا مضمون یہ ہے کہ اللہ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی خلاف ورزی مت کرو، نہ اپنی طرف سے کسی حکم کا اضافہ کرو، یہی بر وتقویٰ ہے، کامیابی کا راز اسی میں ہے، اپنی طرف سے نئے نئے شوشے چھوڑنا کہ اب تو ہم بڑے ماہر ہوگئے ہیں، حساب کتاب جاننے لگے ہیں، اب آنکھ سے چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں، اب ہم ہیلی کاپٹر میں اڑ کر جائیں گے اور اوپر جا کر چاند دیکھیں گے، دوربینوں سے چاند دیکھیں گے، یہ کریں گے وہ کریں گے، ارے بھائی یہ سب باتیں چھوڑو اور جو اللہ کا حکم ہے اس پر عمل کرو، کامیابی اسی میں ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۸

توحید اھلہ کی تجویز سے متعلق سوال کا جواب

(از جناب مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم اشرفیہ راندیر)

محرم کے الفرقان میں رمضان وعید وغیرہ سے متعلق بعض ممالک اسلامیہ کے کچھ علماء کی اس رائے اور تجویز کا ذکر کیا تھا کہ کسی ایک ملک میں رویت ہلال ثابت ہوجانے پر دنیا کے تمام ملکوں کے لئے اسی رویت کو تسلیم کرکے پورے عالم اسلامی میں ایک ہی دن رمضان شروع اور ختم ہو اور ایک ہی دن عید اور بقرعید منائی جائے ''توحید اہلہ'' ان حضرات کی اسی تجویز کا عنوان ہے، اوران کے اس نقطۂ نظر کی بڑی دلیل اکثر ائمہ مجتہدین کا یہ نظریہ ہے کہ رویت ہلال میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں۔

اس سلسلہ میں الفرقان میں مندرجہ ذیل سوالات کیے گئے تھے:

(۱) اس بارہ میں ہمیں براہ راست کتاب وسنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے؟

(۲) جن ائمہ نے اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کیا ہے اُن کا مقصد اس انکار سے کیا ہے؟ اوراس مسئلہ میں اختلاف حقیقی ہے یا صرف لفظی اور تعبیری؟

(۳) کیا حنفیہ کے مشہور مذہب عدم اعتبار اختلاف مطالع کی بنا پر ہندوستان وپاکستان کے احناف کے لئے اس تجویز کو قبول کرنے کی گنجائش ہے؟

گذشتہ اشاعت میں اس سوال کا ایک جواب شائع ہوچکا ہے، دوسرا جواب مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری استاذ دارالعلوم اشرفیہ راندیر ضلع سورت کے قلم سے ہے۔ اس اشاعت میں نذر ناظرین کیا جارہا ہے۔ جوابات کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ ابھی جاری رہے گا۔
(نعمانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلے سوال کا جواب

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ میں ہمیں 'تعدد اھلہ' کے لئے واضح حکم ملتا ہے، اس لئے 'توحید اھلہ' کا نظریہ قرآن وحدیث کے خلاف جائے گا، کتاب اللہ کی دو آیتیں مسئلہ ہلال سے بحث کرتی ہیں، ایک مسئلہ باب میں عبارت النص ہے اور دوسری کے 'اشارہ' سے مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔

پہلی آیت: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ، قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (البقرہ ۱۸۹) مہینہ کے پہلے روز کے چاندوں کے سلسلہ میں لوگ آپ سے پوچھتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے اوقات (متعین کرنے والے) ہیں۔

تشریح: آیت کی تشریح پڑھنے سے پہلے ایک حدیث بھی ملاحظہ فرمالیں کیونکہ حدیث قرآن کا 'بیان' ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إن الله جعل هذه الأهلة مواقيت فإذا رأيتموه فصوموا وإذا رأيتموه فأفطروا، فإن غم عليكم فعدوا ثلاثين** (کنز العمال ج۴ ص۳۰۲، روایت ابن عمر حدیث ۶۰۸۴) اللہ پاک نے پہلی رات کے چاندوں کو اوقات مقرر کرنے والا بنایا ہے، لہٰذا جب اس کو دیکھو تو روزے رکھنا شروع کرو اور روزوں کا اختتام بھی اسے دیکھ کر ہی کرو اور اگر پہلی رات کا چاند تم سے چھپالیا جائے تو پھر (شعبان یا رمضان کے) تیس دن شمار کرو (اور شمار پورا ہونے پر رمضان کی ابتدا کرو یا روزوں کو ختم کرو)

اس حدیث میں چاند دیکھ کر روزہ رکھنے اور چاند دیکھ کر رمضان پورا کرنے کا حکم آیتِ پاک ہی سے مستنبط کیا گیا ہے یعنی حضور پاک ﷺ نے صوم کا مدار ''رویت'' پر رکھا ہے اور

وہ حکم اسی آیت سے مستنبط اور مستفاد ہے، لہٰذا مندرجہ ذیل حدیث بھی جو مختصر ہے اسی آیت کی تفسیر ہوگی۔

إذا رأيتم الهلال فصوموا وإذا رأيتم فأفطروا، وإن غم عليكم فعدوا ثلاثين يوما (رواہ جابر وابو ہریرہ وابن عباس وحذیفہ، وطلق بن علی رضی اللہ عنہم) جب ہلال دیکھ لوتو روزے شروع کرو اور جب اسے دیکھ لوتو روزے ختم کرو اور اگر وہ تم سے چھپ جائے تو پھر تیس دن شمار کرلو۔

بہرحال ان احادیث کے پیشِ نظر تمام علماء نے آیت کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہر مہینے کی پہلی رات کو نمودار ہونے والے چاند (اھلہ) لوگوں کے لئے تعیین اوقات کا ذریعہ ہیں یعنی ان کے ذریعہ مہینوں کا نظام بنتا ہے جس کے مطابق معاملات وکاروبار بھی چلتے ہیں اور تمام عبادات ادا کی جاتی ہیں علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے ربط ماقبل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ احکام صیام کے بعد یہ آیت اس لئے بیان ہوئی ہے کہ روزوں کا مدار رویت ہلال پر ہے (دیکھئے روح المعانی)

خلاصہ یہ ہے کہ حج کے علاوہ تمام عبادات ومعاملات میں ''تعدد اھلہ'' ہی اصل ہے۔ چاند ان کے لئے ایک وقت نہیں مقرر کرے گا بلکہ ان کے مطالع کے اختلاف سے علاحدہ علاحدہ اوقات مقرر کرے گا۔ صرف حج میں ''توحید اھلہ'' (اگر یہ تعبیر مناسب اور صحیح ہو) ہوگا اور حج کے لئے مکہ شریف کا ہلال معتبر ہوگا اور اسی کے لحاظ سے حج کا وقت مقرر ہوگا اور دنیا کے تمام خطوں کے لوگوں کو اس کی اتباع لازم ہوگی۔

دوسری آیت: ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرہ ۱۰۵) سو جو کوئی تم میں سے مہینہ (رمضان) کو دیکھے وہ اس کا روزہ رکھے۔

تشریح: شھد کا مصدر الشھادۃ ہے اور اس کے معنی ہیں: **الإخبار بصحة الشيئ عن مشاهدة وعيان، مشتقة من المشاهدة التي تنبئ عن المعاينة** (عنایہ شرح ہدایہ فی اول کتاب الشہادۃ) اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کے مفہوم میں رویت (دیکھنا) ملحوظ ہے اور مہینہ کا دیکھنا موقوف ہے چاند کے دیکھنے پر، اور چاند کا دیکھنا موقوف ہے اس کے افق پر

موجود ہونے پر۔

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ''توحید اھلہ'' کی صورت میں سارے عالم اسلامی میں ''ہلال'' کا علم تو حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ تو **من علم منكم الشهر** ہوا۔ حالانکہ قرآن پاک نے ﴿مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ فرمایا ہے، لہٰذا صرف علم کافی نہ ہوگا بلکہ اس سے مزید کسی چیز کی ضرورت ہوگی۔ اب اگر ہمارے مطلع پر چاند ہے ہی نہیں تو پھر اس کے دیکھنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے، لہٰذا اس آیت پر اسی وقت عمل ہوسکتا ہے جبکہ ہمارے مطلع پر چاند موجود ہو۔ بلکہ صرف وجود بھی کافی نہیں اس کا دیکھنا بھی شرط ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ: **صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فإن حالت دونه غياية فأكملوا ثلاثين** (کنز العمال) چاند دیکھ کر روزہ شروع کرو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو، لیکن اگر ہلال کے وَرے بادل آجائے (اور وہ نہ دیکھا جاسکے) تو پھر تیس دن کو شمار کرلو۔

بہرحال آیت عبارۃ النص (**ما سيق لأجله الكلام**) نہیں ہے بلکہ لفظ شھد کے اشارہ سے مسئلہ مفہوم ہوتا ہے۔ عبارۃ النص میں تو مسئلہ یہ بیان ہورہا ہے کہ جو ماہ رمضان میں موجود ہو اسے ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے اور فدیہ کی اجازت جو اوپر مذکور ہوئی منسوخ وموقوف کی گئی ہے (بیان القرآن، تھانویؒ) البتہ پہلی آیت عبارۃ النص ہے جیسا کہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: **وكفى به قدوة**۔

جواب (۲):

اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کو بیان کرنے والے فقہاء کرام تین ادوار میں تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ متقدمین، زمانۂ وسطی کے فقہاء اور متاخرین۔ تینوں زمانوں میں مسئلہ کی نوعیت علاحدہ علاحدہ رہی ہے، ذیل میں اجمالاً اس کو بیان کیا جاتا ہے۔

(الف) متقدمین کے یہاں اس میں اختلاف حقیقی ہے صرف لفظی اور تعبیری اختلاف نہیں ہے، لیکن پہلے یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ ان کے نزدیک مسئلہ کی نوعیت کیا تھی؟

مطالع جمع ہے مطلع کی جس کے معنی ہیں ''طلوع کی جگہ'' لیکن ''اختلاف مطالع'' کی بحث میں اس لفظ کے معنی میں وسعت کردی گئی ہے، یہاں ''طلوع کی جگہ اور غروب کی جگہ'' ترجمہ ہوگا۔ اور یہ فقہاء کی اپنی اصطلاح ہے، لغت کا اس کے بالکل موافق ہونا ضروری نہیں۔

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سورج کے طلوع وغروب کے نقاط اسی طرح چاند کے طلوع کا افقی نقطہ ہر مقام کے لئے علاحدہ علاحدہ ہوتا ہے، کوئی بھی دو مقام متحد المطلع نہیں ہوتے جو مقامات قریب ہوتے ہیں (مثلاً میل دو میل کے فاصلے والے مقامات) وہاں اس اختلاف کا فرق عام طور پر محسوس نہیں کیا جاسکتا۔

فقہاء کرام نے پانچوں نمازوں کے اوقات اور یومیہ سحر وافطار میں اختلاف مطالع کا اعتبار کیا ہے بلکہ اس پر امت کا اجماع ہے، مثلاً ایک جگہ آفتاب غروب ہوگیا تو وہاں مغرب شروع کی جاسکتی ہے اور اس سے مغربی مقام میں جہاں غروب میں ابھی ایک منٹ باقی ہے، مغرب کی نماز شروع کرنا جائز نہیں ہے۔ وقس علی ہذا۔

اب سوال سامنے آتا ہے کہ طلوع ہلال کا مشاہدہ یہ ہے کہ اس میں معمولی بُعد مسافت سے اختلاف مطالع نہیں ہوتا۔ پھر رسول مقبول ﷺ کا دیہات کے اعرابی کی رویت کو تسلیم کرنا بھی مروی ہے [۱] نیز یہاں مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنا باعثِ حرج بھی ہے اور فلکیات کا سہارا بھی لینا پڑے گا جسے شریعت میں پسند نہیں کیا [۲] یہ تمام امور ملحوظ رکھتے ہوئے جمہور کی رائے یہ ہوئی کہ ''طلوع ہلال'' کے مسئلہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار نہ کیا جائے مثلاً ایک مقام پر رویت ہوئی تو اس مقام سے جانب مغرب جو مقامات ہوں گے وہاں رویت یقینی امر ہے، لیکن مذکورہ مقام سے جو مقامات جانب مشرق واقع ہوں وہاں رویت اور عدم رویت کے دونوں احتمال ہیں، لیکن جمہور نے مندرجۂ بالا وجوہ سے اس احتمال کو نظر انداز کردیا۔ جمہور نے مسئلہ کی تعبیر اس طرح کی ہے: **لا اعتبار لاختلاف المطالع فیلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب** (درمختار) لیکن حضرات شوافع نے دقیقہ سنجی سے کام لیا

(۱) رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی، وابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ ۱:۱۷۴ (۲) **قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: إنا أمة أمية لانكتب ولا نحسب إلخ** (حوالہ مذکورہ)

اور فقہ کی مشہور اصل کہ ''شک سے کوئی بات ثابت نہیں ہوسکتی اور نہ ثابت حکم ختم ہوسکتا ہے'' پیش نظر رکھ کر اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا اور مذکورہ مقام کے مشرقی مقامات کے لئے اس رویت کو حجت نہیں مانا کیوں کہ احتمال سے نہ رمضان ثابت ہوسکتا ہے نہ ختم ہوسکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ نہ تو دلائل کے اعتبار سے اس قول کو قوت مل سکتی تھی نہ ہی عملی آسانی سے اس کی تائید ہوسکتی تھی، اس لئے بعض شوافع نے بھی مجبور ہوکر جمہور کی ہمنوائی اختیار فرمائی۔

یہاں یہ بات بالکل فراموش نہ ہونی چاہئے کہ مشرق ومغرب دو اضافی لفظ ہیں کوئی بھی دو بستیاں ایک دوسرے کے لئے مشرقی اور مغربی مقامات کہلائیں گی بعد میں ان لفظوں کے معنی میں جو وسعت ہوئی ہے وہ متقدمین کی عبارتوں میں ہرگز مراد نہیں لی جاسکتی۔

(ب) ازمنۂ وسطی میں آکر یہ مسئلہ فقہاء کرام کے اذہان کی آماجگاہ بن گیا اور فقہاء کرام تین طرح کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

وہ حضرات جنھوں نے مسئلہ کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کردیا اور مشرق ومغرب (جو اضافی لفظ تھے) کا مفہوم بھی ان کے زمانہ میں بدل گیا، کیونکہ اب مغرب سے اندلس اور مشرق سے ایشا مراد لیا جانے لگا اور اس وسیع مفہوم پر ''ظاہر روایت'' کے الفاظ **(فیلزم أهل المشرق برؤية أهل المغرب)** ان کو فٹ نظر نہ آئے تو وہ مجبور ہوئے اور ظاہر روایت کے حقیقی مفہوم کو وہ اچھی طرح سمجھ کر مسئلہ کی دوسری تعبیر کرنے لگے اور انھوں نے بلدان نائیہ اور قریبہ کی اصطلاح وضع کی اور ظاہر روایت کو انھوں نے بلدان قریبہ پر محمول کیا اور اس میں اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کیا اور بلدان نائیہ میں مطالع کے اختلاف کے اعتبار کرنے پر قرآن وحدیث کی روشنی میں وہ مجبور ہوگئے۔

متقدمین میں اور فقہاء کرام کے اس طبقہ میں اختلاف صرف لفظی ہے جیسا کہ بیان ہوچکا۔ دوسرے وہ فقہاء ہیں جنھوں نے یا تو اس لئے کہ مشرق ومغرب کے مفہوم کو اتنی وسعت نہیں دی تھی یا کچھ اور وجوہ ہوں گے بہر حال وہ اسی راہ پر جمے رہے جو انھوں نے متقدمین کے کلام سے متعین کی تھی، چنانچہ وہ بلدان شاسعہ اور قریبہ کا فرق کئے بغیر اختلاف مطالع کے اعتبار کا انکار کرتے رہے۔

اور کچھ حضرات وہ بھی ہیں جن کے ذہن میں مشرق و مغرب کا بدلا ہوا مفہوم ہے اور اس سلسلہ میں ظاہر روایت کا اعتبار کرنے سے جو الجھنیں رونما ہوتی ہیں اور قرآن وحدیث کے خلاف ظاہر روایت چلی جاتی ہے وہ اس سے بے خبر نہیں، نیز بعض حضرات نے جو بلدان نائیہ اور قریبہ کی تقسیم کر کے ظاہر روایت کا مصداق بلدان قریبہ کو بنایا ہے اس سے بھی وہ مطمئن نہیں یا یہ کہ قدیم مسلک کے خلاف صاف صاف واضح اور غیر مبہم انداز میں اعلان کرنے کے لئے وہ تیار نہیں، اس لئے یہ حضرات کچھ مبہم سی گول گول باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً درمختار کی مذکورہ عبارت پیش نظر ہوتے ہوئے بھی علامہ شامی رحمہ اللہ نے حاشیہ **رد المحتار** میں عدم اعتبار اختلاف کی مثال دوسری دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”اگر مشرق میں جمعہ کی رات کو چاند دیکھا گیا اور مغرب میں سنیچر کی رات کو چاند دیکھا گیا تو کیا اہل مغرب پر اہل مشرق کی رویت کا اعتبار جو ایک دن مقدم ہے ضروری ہوگا؟ —— بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اختلاف کا اعتبار ہوگا اور ہر مقام کے لوگوں کے لئے ان کی اپنی رویت ہی حجت ہوگی، یہ زیلعی، صاحب فیض اور بعض شوافع کا مختار ہے، لیکن ظاہر روایت یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہ ہوگا بلکہ جس کی رویت سابق ہے اسی کا اعتبار ہے۔ مالکیہ حنابلہ اور ہمارا یہی مختار ہے“

(ردالمحتار الی الدار المختار جلد ثانی بحث اختلاف مطالع)

حالانکہ علامہ نے جو مثال فرض کی ہے اس میں تو کسی کا اختلاف نہیں، کیونکہ جب چاند سورج سے بوقت غروب ایک خاص مقدار سے منفصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی رویت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے بعد والے مغربی ممالک میں چاند لامحالہ موجود ہوگا کیونکہ چاند کا انفصال بڑھتا ہی جائے گا —— اور جب اُفق پر چاند کا وجود قطعی طور پر ہے تو اب اہل مشرق کی خبر ان کو لامحالہ ماننا ہوگی۔

اختلاف اس کے برعکس صورت میں ہے جو درمختار کی عبارت میں مذکور ہے، لیکن علامہ نے اس مثال کو چھیڑا ہی نہیں —— معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مثال اُلٹ کر مسئلہ کو بالکل ہلکا کر دینا چاہتے ہیں یا ظاہر روایت ان کے خیال میں جو الجھن پیدا کر رہی ہے وہ اس کا صالح

محمل تیار فرما رہے ہیں۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہو چکا ہوگا کہ اس دور کی ان تینوں جماعتوں میں اختلاف حقیقی ہے، لیکن پہلی جماعت اور ظاہر روایت کے درمیان اختلاف صرف لفظی ہے۔

(ج) تیسرا دور متاخرین فقہاء کا ہے۔ اس دور میں مشرق و مغرب کے ایک نئے معنی وضع کر لیے گئے ہیں اور آج کے ہر فقیہ کے ذہن میں مشرق و مغرب کے تقریباً وہی معنی ہیں جو آج کا جغرافیہ نویس لکھتا ہے۔

بہر حال متاخرین فقہاء کے یہاں بھی وہ تین جماعتیں موجود ہیں جو دوسرے دور میں تھیں، کوئی آج کے جغرافیہ کی اصطلاح ذہن میں رکھ کر ظاہر روایت کو مستدل بنا کر بانگ دہل کہتا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں اور مغرب یعنی امریکہ اور بلاد افریقہ کی رویت جب اہل مشرق یعنی ہندوچین میں طریق موجب سے پہنچ جائے تو اس کا اعتبار ضروری ہے، لیکن یہ مفتی زمانہ خوب جانتا ہے کہ اگر ایسا عمل ہونے لگا تو قرآن وحدیث کی صریح خلاف ورزی ہوگی اس لئے وہ بضد ہے کہ فتویٰ تو اس کا وہی رہے، لیکن عملاً وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے اس لئے اس نے سہارا لیا ”طریق موجب“ کا۔ اور وہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون وغیرہ جدید ذرائع خبر رسانی سے علم حاصل ہونے کا قطعاً انکار کر دیتا ہے۔ دنیا کے دیگر تمام معاملات میں اس کو ان ذرائع سے علم حاصل ہو سکتا ہے، لیکن نہیں حاصل ہو سکتا تو صرف اس مسئلہ میں نہیں حاصل ہو سکتا **فیا للعجب**! لیکن اب تو ہوائی جہاز اور راکٹ تیار ہو گئے ہیں اور خود چاند دیکھنے والا رات بھر میں سب جگہ سفر کر کے اطلاع کر سکتا ہے اور شہادت دے سکتا ہے ممکن ہے اب یہ کہا جانے لگے کہ طریق موجب یہ ہے کہ چاند دیکھنے والا پیدل چل کر گواہی دے۔

دوسری جماعت متاخرین فقہاء کی ہے جو بلدان شاسعہ میں اختلاف کا اعتبار کرتی ہے اور قریبہ میں نہیں کرتی اور ظاہر روایت کا محمل وہ اسی کو قرار دیتی ہے اور بلدان نائیہ کا مسئلہ ایک بالکل جدید مسئلہ قرار دیتی ہے، اور اس کا حکم قرآن وحدیث سے اخذ کرتی ہے۔

اسی طرح مذبذبین کی ایک جماعت بھی آج موجود ہے وہ حیران ہے کہ کیا کرے۔ ظاہر روایت جو اس کے خیال میں عام ہے چھوڑ دے یا پھر توحید اھلہ کی صدا بلند کرے،

حالانکہ قرآن پاک کی نصوص، احادیث اور صحابہ کا عمل (میری مراد حضرت کریب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے جس میں انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شب جمعہ کی رویت کی اطلاع حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو دی تھی لیکن انھوں نے اپنی سنیچر والی رویت ہی کا اعتبار کیا تھا اور فرمایا تھا: **ھٰکذا أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم**) بلدان نائیہ میں مطالع کے اختلاف کا اعتبار کرنے کے بارے میں نص قطعی ہیں۔

اب رہ جاتا ہے سوال ممالک شاسعہ اور قریبہ کی تعیین کا تو اس مسئلہ میں احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ حساب وتجربہ سے جن دو جگہوں میں تاریخیں نہیں بدلتی وہ تمام ممالک قریبہ ہیں اور جہاں کی تاریخیں ہمیشہ الگ رہتی ہیں یا گاہے گاہے بدل بھی جاتی ہیں وہ ممالک بعیدہ اور شاسعہ ہیں۔

بہر حال یہ ہے اختلاف مطالع کے اعتبار کرنے نہ کرنے کے سلسلہ کی تفصیل —— سال بھر ہوا حضرت مولانا محمد میاں صاحب مدظلہ شیخ الحدیث مدرسہ امینیہ دہلی کا ایک سوال آیا تھا اس میں ضمنی سوال یہ بھی تھا اس کے جواب میں میں نے عرض کیا تھا کہ:

”متقدمین فقہاء احناف نے جو فرمایا تھا: **لا اعتبار لاختلاف المطالع**: اس ہیچ میرز کے خیال میں فقہاء متاخرین نے مراد متکلم سے زیادہ عموم پیدا کر دیا ہے“

وہ تفصیل کا محل نہیں تھا اس لئے بات مجمل کہی گئی تھی آج اللہ کے فضل سے اس کی تفصیل ہوگئی، کہاں دورِ اول کے مشرق ومغرب کا سیدھا سادہ مفہوم اور کہاں آج کے جغرافیہ کی وضع کردہ اصطلاح؟ متقدمین کی اصطلاح کو اس قدر وسعت دینا کیسے جائز ہے؟

جواب (۳): ہندو پاک کے حنفیہ کے لئے ہی نہیں بلکہ کسی بھی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ مصر، ترکی کے دیکھے ہوئے چاند کی خبر پر عمل کرے خواہ کیسے ہی قوی ترین ذرائع سے وہ خبر کیوں نہ پہنچ جائے۔ **اللّٰھم اھدنا فیمن ھدیت، وصل وسلّم علی سید المرسلین وعلی آله وأصحابه أجمعین۔**

۹

اصلاح معاشرہ کے لئے ضروری احکام

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿**قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ، وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ، ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ، وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ، وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِىْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِىْ أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَاءِ هِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ أُوْلِى الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ، وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ، وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ**﴾ (النور: ۲۹و۳۰)

بزرگو اور بھائیو! آج نماز میں سورۃ النور پڑھی گئی ہے، اس سورت میں اصلاح معاشرہ کے احکام ہیں، معاشرہ میں خرابیاں کیسے پیدا ہوتی ہیں؟ اور معاشرہ کی اصلاح کیسے ہوگی؟ اور وہ کیا احکام ہیں جن کی پیروی کرنے سے معاشرہ سنور جائے گا؟ اس سورت میں یہی احکام ہیں۔

زنا بڑا بھاری گناہ ہے

ان احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنی نگاہ کی حفاظت کرے، اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ دونوں کی شرمگاہیں محفوظ رہیں گی، شرمگاہ کو محفوظ نہ رکھنے ہی سے زنا کا صدور ہوتا ہے اور زنا کی سزا بڑی سخت ہے جو سورت کے شروع میں بیان ہو چکی ہے اور زنا ان تین گناہوں میں سے ایک ہے جو بڑے بھاری گناہ ہیں، ایک: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، دوسرا: کسی کو ناحق قتل کرنا، تیسرا: زنا کرنا۔ آج ہی عباد الرحمٰن کے گیارہ اوصاف پڑھے گئے ہیں، کچھ مثبت ہیں کچھ منفی۔ منفی اوصاف یہ ہیں: ﴿**وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ**

﴿إِلٰهًا آخَرَ﴾: اللہ کے خاص بندے اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے، یعنی شرک سے بالکل پاک ہیں ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾: اور وہ شخص جس کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے۔ مگر حق کی وجہ سے۔

چند حقوق جن کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے

کچھ قتل ایسے ہیں جن کے کرنے کو اللہ نے حلال کیا ہے، جیسے جہاد ہو تو اس میں دشمن کو قتل کرنا جائز ہے، بلکہ اس کا بڑا ثواب ہے، یا کسی نے جان بوجھ کر کسی کو قتل کیا تو قصاص میں قاتل کو قتل کرنا جائز ہے، یا شادی شدہ آدمی زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا۔ یہ قتل کرنا بھی جائز ہے، اسی طرح مرتد کو قتل کرنا بھی ضروری ہے، مذہب اسلام میں داخل ہونے میں تو کوئی زبردستی نہیں، لا إكراه فى الدين لیکن مذہب اسلام سے نکلنے پر سخت پابندی ہے، کیونکہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا، ساری دنیا میں وہ اسلام کو بدنام کرے گا، پس جب کوئی مرتد ہو جائے تو پہلے اس کے اشکالات رفع کرنے کی پوری کوشش کی جائے، پھر تین دن کی مہلت دی جائے، پھر بھی اگر وہ اسلام کی طرف واپس نہ لوٹے اور مرتد مرد ہے تو اسلامی حکومت اسے قتل کردے، اور عورت ہے تو اس کو نظر بند کردے، قتل نہ کرے، کیونکہ عورت گھر میں پوری زندگی گذار سکتی ہے، اس لئے اس کو نظر بند کر دیا جائے اور مرد کو جیل میں نہیں رکھ سکتے، اسلامی قانون میں جیل کی کوئی سزا نہیں، اس لئے لامحالہ وہ باہر گھومے گا اور فتنہ پھیلائے گا اس لئے اس کو قتل کر دیا جائے۔

یہ چند حقوق ہیں جن کی وجہ سے قتل کیا جاتا ہے، باقی جس نفس کو اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل کرنا جائز نہیں، جیسے عام مسلمان یا اسلامی حکومت کا کوئی بھی شہری خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو، اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔

اور تیسرا گناہ ہے: ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ﴾: وہ زنا نہیں کرتے ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا﴾: اور جو یہ تین کام کرے گا وہ گناہ سے ملاقات کرے گا یعنی گنہ گار ہوگا ﴿يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے دن اس کی سزا دو چند کر دی جائے گی ﴿وَيَخْلُدْ فِيْهِ مُهَانًا﴾ اور وہ اس سزا میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔

نگاہ نیچی رکھنا زنا سے بچاتا ہے

جب زنا کا گناہ اتنا سخت ہے تو اس سے بچنے کا سامان بھی کرنا پڑے گا، دریا میں اترو اور چاہو کہ کپڑے نہ بھیگیں یہ کیسے ممکن ہے؟ ننگے معاشرہ میں گھومو، نظریں لڑاتے پھرو اور چاہو کہ زنا نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ اس لئے زنا سے بچنے کے لئے کچھ اسباب بھی اختیار کرنے پڑیں گے تاکہ زنا کا گناہ وجود میں نہ آئے۔

وہ سبب یہ ہے کہ سب مرد وزن نظریں نیچی رکھیں، ایک دوسرے پر نظر نہ ڈالیں، زنا کے گناہ سے بچ جائیں گے۔ نظر بازی اس گناہ کا پہلا زینہ ہے، نگاہوں کے لڑنے کے بعد گناہ میں کوئی آڑ باقی نہیں رہتی، اب کسی بھی وقت گناہ صادر ہو سکتا ہے۔

نظر دو طرح کی ہوتی ہے

مرد اور عورتیں دو طرح کی نظر ڈالتے ہیں، ایک: اوپن (کھلی ہوئی) جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ اس عورت کو دیکھ رہا ہے، دوسری: ہیڈن (چھپی ہوئی) دیکھنے میں پتہ نہیں چلتا کہ دیکھ رہا ہے مگر دیکھ رہا ہے، اس کو نظر کی چوری کہتے ہیں، اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِيْ الصُّدُوْرُ﴾: نگاہیں جو چوری کرتی ہیں اللہ اسے بھی جانتے ہیں اور دلوں میں جو باتیں چھپی ہوئی ہیں ان کو بھی جانتے ہیں۔ بہر حال مرد چونکہ برقعہ نہیں اوڑھتے اس لئے وہ عورتوں کو دو طرح سے دیکھتے ہیں اور عورتوں نے برقعہ ہی ایسا بنا رکھا ہے کہ اس میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں، وہ سمجھتی ہیں کہ انھوں نے کپڑا اوپر نیچے باندھ لیا ہے اس لئے اب نگاہیں آزاد ہیں جس کو چاہیں دیکھیں حالانکہ پردے کا مقصد ہی نگاہوں کی حفاظت ہے۔ عورتیں برقعہ اوڑھ کر سمجھتی ہیں کہ ہم حجاب میں ہیں، اری! حجاب میں کہاں ہو؟ ساری دنیا کو تو دیکھ رہی ہو۔ اسی لئے قرآن میں دونوں کو یکساں حکم دیا: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ﴾ آپ مؤمنین سے کہیں: اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ ﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾ اور مسلمان عورتوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور

اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ان دونوں حکموں میں (نظر نیچی رکھنے میں اور شرمگاہ محفوظ رہنے میں) جوڑ یہ ہے کہ شرمگاہ کا گناہ نگاہ کی حفاظت نہ کرنے سے وجود میں آتا ہے، پس جب شرمگاہ کی حفاظت ضروری ہے تو اس کا سبب 'نگاہ نیچی رکھنا' بھی ضروری ہے، لہٰذا شروع سے اگر تم چلوگے تو گناہ سے بچ سکوگے ورنہ نہیں ﴿ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ﴾ یہ بات مردوں کے لئے زیادہ ستھری ہے، مرد اگر ستھرے رہنا چاہتے ہیں، شرمگاہ کے گناہ سے بچے رہنا چاہتے ہیں تو اس کا راستہ یہی ہے کہ اپنی نگاہ نیچی رکھیں ان کی شرمگاہیں خود بخود محفوظ رہیں گی ﴿إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ﴾: بیشک اللہ تعالیٰ باخبر ہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اوپن نظر اور ہیڈن نظر دونوں سے واقف ہیں۔ پھر ٹھیک یہی حکم عورتوں کو دیا: اور آپ مؤمن عورتوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔وہی مضمون جو مردوں کے لئے تھا وہی عورتوں کے لئے بھی ہے، لیکن مردوں کے لئے تو اتنی بات کافی تھی کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، عورتوں کے لئے اتنی بات کافی نہیں، ان کے لئے کچھ دوسرے احکام بھی ہیں اور یہ احکام اگلی آیت میں ہیں اور یہی احکام مجھے بیان کرنے ہیں۔

مرد اور عورت کا ستر ایک ہے

ستر: مرد اور عورت کا ایک ہے، ناف سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک ستر ہے، یعنی چھپانے کا بدن ہے، اس کو بے ضرورت کسی کے سامنے کھولنا جائز نہیں، ایک عورت دوسری عورت کے سامنے جسم کا یہ حصہ بے ضرورت نہیں کھول سکتی، مجبوری کی بات الگ ہے، جیسے بچہ کی ولادت ہے یا کوئی آپریشن کرانا ہے تو وہ الگ مسئلہ ہے لیکن بے ضرورت نہیں کھول سکتی۔مرد وعورت دونوں کا یہی ستر ہے۔

عورت کے لئے حجاب ہے اور وہ تین مرحلوں میں ہے

پھر مرد کے لئے کوئی حجاب نہیں، لیکن عورت کے لئے ستر کے علاوہ حجاب بھی ہے اور وہ حجاب تین مرحلوں میں ہے:

پہلا حجاب

اللہ سے بندی کا حجاب ہے، جب عورت نماز کے لئے کھڑی ہو تو چہرہ: جتنا وضو میں دھونا فرض ہے اور دونوں ہاتھ پہنچوں تک اور دونوں پیر ٹخنوں سے نیچے تک کھلے رہ سکتے ہیں۔یہ تین اعضاء نماز کے حجاب میں داخل نہیں، لیکن اگر کوئی عورت ہاتھ میں دستانے اور پیر میں موزے پہن کر نماز پڑھے تو اچھی بات ہے، ضروری نہیں، کیونکہ یہ نماز کے حجاب میں داخل نہیں، البتہ ٹخنے چھپانے ضروری ہیں اگر وہ کھلے رہیں گے تو عورت کی نماز نہیں ہوگی، ایسے ہی کان چھپانے بھی ضروری ہیں اگر ان کو کھلے رکھ کر نماز پڑھے گی تو نماز نہیں ہوگی۔صرف تین اعضاء ہی کھلے رہ سکتے ہیں باقی بدن چھپا کر نماز پڑھنا ضروری ہے۔یہ بندی کا اللہ سے حجاب ہے۔

دوسرا حجاب

محارم کا حجاب ہے، یعنی ان لوگوں کے ساتھ ہے جن سے نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہے، ان کے سامنے پیٹ اور اس کے مقابل کی پیٹھ نہیں کھول سکتی، اس کے علاوہ باقی بدن کھول سکتی ہے، سینہ، سینے کے مقابل کی پیٹھ، سینہ سے اوپر کا حصہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پنڈلیاں یہ سب اعضاء محارم کے سامنے عورت کھول سکتی ہے لیکن کھول سکنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کھول کر رہے۔

پنڈلی، سر اور گردن وغیرہ میں تو آپ کو کوئی اشکال نہیں ہوگا لیکن سینہ اور اس کے مقابل کی پیٹھ حجاب میں نہ ہونے پر آپ کو اشکال ہوسکتا ہے، پس جاننا چاہئے کہ یہ ایک معاشرتی ضرورت ہے، عورت گھر میں چھاتی کھول کر بچہ کو دودھ پلاتی ہے اور اسی گھر میں باپ، خسر اور بھائی ہیں، پس اگر سینہ کو حجاب میں لیا جائے گا تو عورت بچہ کو دودھ کیسے پلائے گی؟ اس ضرورت سے سینہ کو محارم کے حجاب سے باہر رکھا گیا ہے، اور جب سینہ کا حصہ باہر رکھا گیا تو اس کے مقابل کی پیٹھ کو بھی باہر رکھا گیا۔اور پیٹ کھولنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے پیٹ کو اور اس کے مقابل کی پیٹھ کو حجاب میں لیا۔غرض یہ ایک معاشرتی ضرورت ہے اگر اس پر پابندی لگائی جائے گی تو کام نہیں چلے گا۔

تیسرا حجاب

اجنبیوں کا حجاب ہے اور وہ پورے بدن کا حجاب ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں، ہاتھ، پاؤں، چہرہ سب کا حجاب ہے بلکہ آواز کا بھی حجاب ہے، عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی آواز اجنبیوں کو نہ سنائے، ٹیلی فون پر بھی نہ سنائے، کوئی دروازے پر دستک دے تو بھی نہ سنائے، ہاں مجبوری ہو تو ٹھیک ہے، فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور گھر میں کوئی مرد نہیں، تو عورت فون اٹھا کر جواب دے سکتی ہے، مگر سریلی آواز میں جواب نہ دے کراری آواز میں جواب دے یہ حکم قرآن میں ہے: ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ کراری آواز میں جواب دے کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں۔ عورت کا یہ پوچھنا کہ تم کون ہو؟ تمہارا نسب نامہ کیا ہے؟ تم کہاں سے بول رہے ہو؟ یہ سب غلط ہے، عورتوں کو اس سے کیا لینا ہے، بس اتنا کہہ دے کہ صاحب خانہ گھر میں نہیں، اور اگر گھر میں کوئی مرد ہے یا سمجھ دار بچہ ہے تو وہ فون اٹھا کر جواب دے، عورتیں فون نہ اٹھائیں۔ مگر آج کل ایسی مصیبت آئی ہوئی ہے کہ کسی کے گھر فون کرو پہلے عورت فون اٹھاتی ہے، وہ دنیا بھر کی تفصیل پوچھتی ہے، پھر شوہر کو دیتی ہے، وہ بھی وہیں بیٹھا ہے۔ یہ اسلامی معاشرہ کے خلاف ہے، عورتوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہئے۔

حجاب کے اس تیسرے مرحلے کا ذکر سورۃ الاحزاب میں ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ﴾: اے پیغمبر! آپ اپنی بیویوں سے، بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنے چہرے پر اپنی چادریں کھینچ لیں، یعنی جب کسی ضرورت سے گھر سے نکلیں تو اوڑھنا چہرے پر کھینچ لیں، یہ چہرے کا حجاب ہے اور جب چادریں اپنے چہرے پر کھینچ لیں گی تو ہاتھ تو چھپے ہوئے ہونگے ہی، اگر چھپے ہوئے نہ ہوں تو کوئی خاص حکم ان کے بارے میں نہیں دیا۔ اسی طرح پیروں کے بارے میں بھی کوئی خاص حکم نہیں دیا، صرف چہرے کے بارے میں حکم دیا کہ عورتیں چہرے پر چادر کھینچ کر گھر سے نکلیں، کیونکہ چہرہ مجمع المحاسن ہے سارے جسم کی بیوٹی (خوبصورتی) چہرے میں اکٹھا ہوتی ہے، اور وہ پانچ حواس خمسہ جن سے علم حاصل کیا جاتا ہے جو انسان کا کمال ہیں، وہ سب چہرے میں جمع ہیں، اس لئے سارے جسم کی خوبصورتی چہرے میں آجاتی ہے، اس

لئے خاص طور پر اسی کے حجاب کا حکم دیا اور ہاتھوں اور پیروں کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔

اور یہاں سورۃ النور میں جو لمبی آیت ہے وہ حجاب سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا تعلق اصلاح معاشرہ سے ہے یعنی عورتوں کو اپنے محارم اور محارم جیسوں کے سامنے کس طرح رہنا چاہئے؟ کونسا جسم کھولنا جائز ہے اور کونسا ناجائز۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾: اور ظاہر نہ کریں عورتیں اپنی زینت۔ زینت سے مراد زیور بھی ہے اور زیور کا محل بھی ﴿اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾ مگر وہ اعضاء جو عام طور پر کھلے رہتے ہیں جن کو ہر وقت چھپائے رکھنا دشوار ہے، ان کو مستثنیٰ کیا۔ وہ اعضاء کونسے ہیں؟ چہرہ، ہتھیلیاں اور دونوں پیر۔ پیروں کا روایت میں ذکر نہیں، چہرے اور ہتھیلیوں کا ذکر ہے مگر فقہاء نے ہتھیلیوں کے حکم میں پیروں کو بھی لیا ہے۔ گھر میں ہر وقت ان تین اعضاء کو چھپائے رکھنا بہت مشکل ہے، اس لئے ان کا استثناء کیا کہ ان کو کھول سکتے ہیں، اور ان سے زائد بدن بھی اگرچہ کھولنا جائز ہے جیسا کہ محارم کے حجاب کے بیان میں آیا ہے، مگر معاشرہ کی درستگی کا تقاضا یہ ہے کہ بدن کا اور حصہ کھلا نہ رہے۔

بلکہ جسم کے وہ حصے جو کپڑے کے اوپر سے جھلکتے ہیں جیسے عورت جوان ہو تو چھاتی جھلکے گی، اس کے بارے میں مستقل حکم دیا کہ اوڑھی سینہ پر ڈالے رہیں تا کہ سینہ کا ابھار محسوس نہ ہو: ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ﴾: اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رکھیں معلوم ہوا کہ کچھ اعضاء وہ ہیں جو کپڑے کے اوپر سے بھی محسوس نہیں ہونے چاہئیں، اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ پتلون میں آدمی آدھا ننگا ہوتا ہے، دیکھو عورت نے کرتہ پہن رکھا ہے، مگر چھاتی کے ابھار پر قرآن نے دوپٹہ ڈلوایا تا کہ وہ ابھار ظاہر نہ ہو، معلوم ہوا کہ صرف کپڑا پہن لینا کافی نہیں، کپڑا ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں جسم کے پچھلے حصہ کا ابھار محسوس نہ ہو۔

قرآن کے دو خاص اسلوب

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ قرآنِ کریم کا ایک خاص اسلوب ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر قرآنِ کریم کو ایک سوال کے بارے میں دو باتیں بتانی ہوتی ہیں تو وہ ایک ساتھ نہیں بتاتا بلکہ

سوال مکرر لاتا ہے، اسی طرح ایک مستثنیٰ منہ سے دو استثناء کرنے ہوتے ہیں تو دونوں استثناء ایک ساتھ نہیں کرتا، بلکہ مستثنیٰ منہ دوبارہ لاکر دوسرا استثناء کرتا ہے، جیسے سورۂ عنکبوت میں ہے: ﴿يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾: لوگ آپ سے عذاب جلدی طلب کرتے ہیں، قرآن نے اس کا جواب دیا۔ پھر اگلی آیت میں فرمایا: ﴿وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾ پھر دوسرا جواب دیا۔ یہ کوئی الگ الگ سوال نہیں تھے، ایک ہی سوال تھا، مگر اس کے بارے میں دو باتیں بتلانی تھیں اس لئے پہلے سوال لاکر پہلی بات بتائی پھر وہی سوال دوبارہ لاکر دوسری بات بتائی، یہ قرآنِ کریم کا خاص انداز بیان ہے، ایسا ہی یہاں کیا ہے چونکہ دو استثناء ایک ساتھ کرنے سے کلام پیچیدہ ہوجاتا ہے اور فصاحت سے خارج ہوجاتا ہے اس لئے ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ﴾ کہہ کر ﴿إِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾ کا پہلا استثناء کیا، پھر دوسرا استثناء کرنے کے لئے مستثنیٰ منہ کو دوبارہ لائے، فرمایا: ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ﴾ پھر دوسرا استثناء شروع کیا: فرمایا: ﴿إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ﴾ الآیۃ یعنی پہلے جو حکم دیا تھا کہ عورتیں چہرہ، ہتھیلیاں اور پیروں کے علاوہ اپنی زینت ظاہر نہ کریں تو کس کے سامنے ظاہر نہ کریں؟ شوہر کے سامنے، باپ کے سامنے، خسر کے سامنے، عورت کے اپنے بیٹوں (پہلے شوہر سے) کے سامنے، اپنے شوہر کے بیٹوں (دوسری بیوی سے) کے سامنے، بھائیوں کے سامنے، بھتیجوں کے سامنے، بھانجوں کے سامنے ہی اپنی زینت ظاہر کریں یعنی صرف ہاتھ پاؤں اور چہرہ کھلا رکھیں۔

پھر چند اور لوگوں کو محارم کے ساتھ ملایا، فرمایا: ﴿أَوْ نِسَائِهِنَّ﴾: یا اپنی عورتوں کے سامنے، یعنی مسلمان عورتوں کے سامنے چہرہ وغیرہ کھول سکتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں یہ مسئلہ دو جگہ آیا ہے۔ غیر مسلم عورت اجنبی مردوں کے حکم میں ہے، اس سے پردہ واجب ہے۔ مگر ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جن احکام میں مسلمان غفلت برتتے ہیں ان میں سے ایک غیر مسلم عورتوں سے پردہ کرنے کا مسئلہ ہے، اور ایک استیذان کا مسئلہ ہے جب دوسرے کے گھر جائیں تو اجازت کے بغیر گھر میں نہ گھسیں، لوگ اس میں بھی غفلت برتتے ہیں، خاص طور پر عورتیں تو اجازت لیتی ہی نہیں۔ بہرحال مسلمان عورتیں بھی مستثنیٰ ہیں، ان کے سامنے عورتیں زینت ظاہر کرسکتی ہیں۔

دوم: ﴿أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ﴾: یا غلام باندیوں کے سامنے زینت ظاہر کرسکتی ہیں اگرچہ باندی غیر مسلم ہو۔ پرانے زمانے میں غلام باندی ہوتے تھے، مالکہ اپنے غلام باندی کے سامنے زینت کی جگہیں جو مستثنیٰ ہیں ظاہر کرسکتی ہے یا نہیں؟ فرمایا کہ چہرہ وغیرہ ظاہر کرسکتی ہیں، کیونکہ مالکہ کو ان سے ہر وقت کام لینا ہوتا ہے، اس لئے حرج کی وجہ سے ان کا بھی استثناء کیا۔

سوم: ﴿أَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ أُوْلِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾: یا طفیلی آدمی جو کسی گھر والوں کے ساتھ رہتا ہے، کھانا پینا ان کے ساتھ ہے اور اس میں مردانی خواہش نہیں ہے، تو اس کو بھی مستثنیٰ کیا اور محارم کے ساتھ لاحق کیا۔

چہارم: ﴿أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرَاتِ النِّسَاءِ﴾: یا وہ بچے جن کو ابھی عورتوں کے راز معلوم نہیں، یعنی زنانہ باتیں وہ ابھی نہیں سمجھتے ان کو بھی محارم کے ساتھ لاحق کیا۔ رہی یہ بات کہ بچہ کتنی عمر تک زنانہ باتوں کو نہیں سمجھتا؟ یہ زمانے اور ملکوں کے حساب سے مختلف ہوتا ہے، آج کل ٹی وی کا منحوس دور آگیا ہے، اس میں تو بچہ سات سال ہی میں سب کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

پھر ایک حکم تو پہلے دیا تھا کہ عورتیں اپنے سینے پر دوپٹے ڈالے رہیں تاکہ سینہ کا ابھار محسوس نہ ہو، اب ایک دوسرا حکم اسی قبیل کا دیتے ہیں: ﴿وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ﴾: چلتے وقت پاؤں زمین پر زور سے نہ پٹخیں تاکہ کپڑے میں چھپا ہوا زیور نہ بجے اور گھر کے لوگوں کو پتا نہ چل جائے کہ کپڑے کے اندر یہ زیور ہے، کہاں تک احتیاط کے احکام ہیں؟ یہ سب وہ احکام ہیں جن کا پاس ولحاظ کرنے سے معاشرہ پاکیزہ رہتا ہے۔ لیکن انسان بہرحال انسان ہے، کوتاہی مردوں سے بھی ہوسکتی ہے اور عورتوں سے بھی، اس لئے آخر میں فرمایا: ﴿وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾: اے مؤمنو! تم سب مرد وزن اللہ کے سامنے توبہ کرو، تاکہ تم کامیاب ہوؤ۔ یہ میں نے آیت کا ترجمہ کیا ہے، زیادہ تفصیل نہیں کی، اور دھیان میں رکھنے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ آیت حجاب کی آیت نہیں ہے، وہ تو سورۂ احزاب میں ہے، یہ آیت تو معاشرہ میں عورتوں کو اپنے محارم وغیرہ کے سامنے کس طرح رہنا چاہئے اس کو بیان کرتی ہے، اجنبیوں کے ساتھ حجاب

کے مسائل اس آیت میں نہیں ہیں۔ بعض بڑے لوگوں کو دھوکہ اس سے ہوا ہے کہ انھوں نے دونوں استثناؤں کو الگ الگ کر دیا، حالانکہ آیت میں ایک مستثنیٰ منہ سے دو استثناء ہیں اور دونوں استثناء ایک ہی مسئلہ سے متعلق ہیں۔ و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

سوال (۱): چچا اور ماموؤں کا ذکر آیت میں کیوں نہیں؟ وہ بھی تو محرم ہیں۔

جواب: بے شک وہ بھی محرم ہیں، مگر معاشرہ میں ہر وقت ان کے ساتھ رہنا نہیں ہوتا۔ اور آیت میں ذکر ان لوگوں کا ہے جن کے ساتھ عورتوں کو ہر وقت رہنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان عورتوں، عورتوں سے مطلب نہ رکھنے والے طفیلیوں، غلاموں اور نابالغ بچوں کا تذکرہ کیا اور چچا ماموں کا تذکرہ نہیں کیا۔

سوال (۲): اس زمرہ میں شوہر کا تذکرہ کیوں کیا، اس سے تو کوئی پردہ نہیں؟

جواب: عورت کو شوہر کے سامنے بھی سلیقہ سے رہنا چاہئے، خاص وقت کی بات الگ ہے، علاوہ ازیں: شوہر کو اس زمرہ میں اس لئے لیا گیا ہے کہ آیت میں مذکور تخفیف اس عورت کے لئے ہے جو شوہر والی ہے اور شوہر گھر پر موجود ہے، سفر میں گیا ہوا نہیں ہے۔ کنواری لڑکی اور بیوہ عورت کے لئے اجنبیوں کے سامنے چہرہ وغیرہ کھولے رکھنے کی گنجائش نہیں، اسی طرح جس عورت کا شوہر لمبے سفر میں گیا ہوا ہے اس کے ساتھ اجنبیوں کو تنہائی میں جمع ہونے کی بھی اجازت نہیں، حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔

سوال (۳): ہمارے معاشرہ میں جیٹھ، دیور بھی ساتھ رہتے ہیں، کیا ان کے ساتھ بھاوج کے لئے رہن سہن میں کچھ تخفیف ہے؟

جواب: ممکن ہے، مگر تین شرطوں کے ساتھ: **ایک**: شوہر گھر پر موجود ہو، لمبے سفر میں گیا ہوا نہ ہو، **دوم**: جیٹھ، دیور گھر میں اطلاع کر کے آئیں، ایسے ہی گھس نہ آئیں۔ **سوم**: تنہائی میں بھاوج کے ساتھ جمع ہو کر بے تکلف باتیں نہ کریں۔ حدیث میں ہے: ''عورتوں کے پاس تنہائی میں جانے سے بچو!'' ایک انصاری نے پوچھا: جیٹھ، دیور کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جیٹھ دیور تو موت ہیں!'' یعنی بڑا فتنہ ہیں۔ کیونکہ جیٹھ دیور کی بھاوج سے بے تکلفی ہوتی ہے، اس لئے فتنہ پیش آنے میں دیر نہیں لگتی۔

۱۰

تین کام جو کامیابی کی کنجی ہیں

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ۝ إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُوْلٰى ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾

بزرگو اور بھائیو! اللہ تعالیٰ کا ہم پر بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا، اگر اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی نہ کرتے، انبیاء و رسل کو مبعوث نہ فرماتے، وحی نازل نہ کرتے، تو ہم اپنی عقل سے سیدھا راستہ نہیں پا سکتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل دی ہے، علم حاصل کرنے کے وسائل دیئے ہیں، آنکھیں، ناک، کان، سوچنے سمجھنے اور ادراک کرنے کی قوت دی ہے، مگر اُن سے انہی چیزوں کا علم حاصل ہو سکتا ہے جو ان کے دائرہ میں آتی ہیں، اور جو چیزیں پس پردہ ہیں ان کو دریافت کرنے کے لئے انسانی عقل کافی نہیں، انسان اپنی عقل و فہم سے ان کو بوجھ نہیں سکتا، جبکہ ان حقیقتوں کو جاننا اور سمجھنا ضروری تھا۔

معرفتِ الٰہی کے لئے وحی کی ضرورت

اللہ عز و جل ہمارے خالق و مالک اور پالنہار ہیں وہ ہماری اس محسوس دنیا سے ماوراء ہیں۔ ان کی معرفت ان کی صفات کی معرفت کے لئے انسانی عقل کافی نہیں۔ انسان اپنی عقل سے نہ اللہ کی ذات کی معرفت حاصل کر سکتا ہے، نہ ان کی صفات کی، کیونکہ یہ چیزیں انسانی عقل کے دائرہ میں نہیں آتیں، اس کے لئے انبیاء و رسل اور وحی کی ضرورت ہے، انبیاء ہی انسان کو اس حقیقت سے واقف کر سکتے ہیں، بلکہ جنت و جہنم جو انسان کا آخری ٹھکانہ ہیں ان کو بھی انسان بذاتِ خود نہیں جان سکتا، جنت و جہنم کی حقیقت جاننے کے لئے اور جہنم سے

بچنے اور جنت پانے کے لئے بھی انسان خدائی رہنمائی کا محتاج ہے، چنانچہ اللہ عزوجل نے نبیوں کے ذریعہ انسان کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی، اور ذات وصفات کی معرفت اور جنت وجہنم اور ہماری اس دنیا سے ماوراء جو حقیقتیں ہیں وہ سمجھائیں، اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اللہ کے سب سے بڑے اور سب سے افضل رسول اور انبیاء ورسل کے سلسلہ کی آخری کڑی محبوب رب العالمین، سید الاولین والآخرین جناب محمد ﷺ کو اللہ نے مبعوث فرمایا، اور اپنی آخری کتاب قرآن مجید نازل فرمائی، اور قرآن کے ذریعہ تمام انسانوں کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی یہ اللہ کا ہم پر بڑا احسان اور انعام ہے۔

قیامت کے دن ہر شخص کو قرآن کی قدر وقیمت معلوم ہوگی

آج انسان کو کتابِ ہدایت قرآنِ مجید کی کوئی قدر نہیں، مسلمانوں کو الحمد للہ تھوڑی بہت قدر ہے، لیکن تمام انسانوں کو اس کی کوئی قدر نہیں کہ نبوت انسانیت کے لئے کتنی بڑی رحمت ہے، اور اللہ کی نازل کردہ کتابیں اور قرآنِ مجید کتنی بڑی نعمت ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ ہر انسان اس کی عظمت کا اعتراف کرے گا، اللہ نے ہمیں آنکھیں دی ہیں، ہم اس کی کیا قدر کرتے ہیں؟ کون اس نعمت کو یاد کرتا ہے؟ اور شکر بجالاتا ہے؟ لیکن اللہ نہ کرے اگر کسی کی آنکھیں نہ رہیں تو اس وقت آنکھوں کی قدر معلوم ہوگی، اگر اس کے پاس کل کائنات ہو تو وہ ایک آنکھ پانے کے لئے اس کو خرچ کردے، مگر آج نعمت حاصل ہے تو کوئی قدر نہیں۔ اسی طرح اللہ نے جو کتابیں نازل فرمائی ہیں، اور جو انبیاء مبعوث کئے ہیں اور ان کے ذریعہ صراط مستقیم کی راہنمائی کی ہے، لوگوں کو اس کی بالکل قدر معلوم نہیں۔ اور ہمیں اللہ کے فضل سے اس کی تھوڑی بہت قدر معلوم ہے، مگر پوری قدر ہمیں بھی معلوم نہیں۔ لیکن جب یہ دنیا ختم ہوگی، اور قیامت قائم ہوگی، اور جزاء وسزا کے فیصلے ہونگے، اور جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں جائیں گے تب جنتیوں کو بھی اور جہنمیوں کو بھی اس نعمت کی قدر معلوم ہوگی۔

جہنمیوں کا افسوس کرنا اور قرآن کی قدر کا اعتراف کرنا

سورۃ الفرقان میں اللہ عزوجل نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ قیامت کے دن کافر

پچھتائیں گے اور افسوس کریں گے اور کہیں گے: ﴿یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا﴾: کاش ایسا ہوتا کہ میں نے رسول کا اتباع کیا ہوتا، جہنمی یہ اعتراف کریں گے کہ اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہمیں پہنچی تھی، مگر ہم نے اس نعمت کی قدر نہیں کی، اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، اس لئے ہمیں آج یہ برادن دیکھنا پڑا۔ اگر میں نے اس نعمت کی قدر کی ہوتی اور اس نعمت سے فائدہ اٹھایا ہوتا، اور رسول کا راستہ اختیار کیا ہوتا تو یہ برادن آج مجھے دیکھنا نہ پڑتا۔

جنتیوں کا اعتراف کرنا اور اللہ کی تعریف کرنا

اور مؤمنین کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے، جب سب مسلمان جنت میں پہنچ جائیں گے تو جنت میں مجلسیں ہونگی، اور ان مجلسوں میں ہر قسم کی باتیں ہونگی، وہ باہم ایک دوسرے سے کہیں گے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ، لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾: جنتی سب ایک زبان ہو کر کہیں گے: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں اس جنت کا راستہ دکھایا، اگر اللہ ہمیں جنت کا راستہ نہ دکھاتے تو ہم اپنی سمجھ سے جنت کا راستہ نہیں پاسکتے تھے، بخدا! واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پروردگار کے رسول جو دین ہمارے پاس لے کر آئے تھے وہ برحق دین تھا، یعنی جنت میں پہنچنے کے بعد تمام جنتی اقرار کریں گے کہ ہم جو جنت میں آئے ہیں، اللہ کی راہنمائی سے آئے ہیں۔ نبیوں کی تشریف آوری کی وجہ سے آئے ہیں، اللہ کی وحی اور دینِ شریعت کی برکت سے آئے ہیں، ورنہ ہم اپنی عقل وفراست سے جنت تک نہیں پہنچ سکتے تھے، اور کافر انگلیاں کاٹیں گے، افسوس کریں گے، پچھتائیں گے اور کہیں گے: کاش میں نے دنیا میں رسول کا راستہ اپنایا ہوتا، ان کے طریقہ کو اختیار کیا ہوتا تو آج مجھے یہ برادن دیکھنا نہ پڑتا، غرض آخرت میں جنتیوں کو بھی انبیاء ورسل اور نبوت وہدایت کی قدر معلوم ہوگی اور جہنمیوں کو بھی۔

رسولوں کی بعثت اللہ کا خاص انعام ہے

میرے بھائیو! اللہ کا یہ ہم پر بہت بڑا انعام اور احسان ہے کہ انھوں نے ہمیں سیدھا

راستہ دکھانے کے لئے انبیاء مبعوث فرمائے اور انسانوں میں سے مبعوث فرمائے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾: بخدا! واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے مؤمنین پر احسان کیا، انہی میں سے اپنا بہت بڑا رسول بھیج کر، یعنی انسان رسول بھیج کر، انسان رسول بھیجنا بذاتِ خود بڑا انعام ہے، اس لئے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہاتھی کو، طوطے کو، جنات اور فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتے تو ہم کیا فائدہ اٹھاتے؟ ہاتھی چنگھاڑتا، ہم کیا سمجھتے؟ طوطا بولتا ہمارے پلّے کیا پڑتا؟ شیر دھاڑتا تو ہمارا استنجاء خطا ہوجاتا، جنات اور فرشتے ہمیں نظر نہیں آتے پھر ہم ان سے کیا فائدہ اٹھاتے؟ پھر جنات اور فرشتوں کی ضرورتیں الگ ہیں، اور ہماری ضرورتیں الگ، وہ اپنے اعتبار سے شریعت سازی کرتے اور ہم اپنے اعتبار سے چاہتے، اللہ کا کرم دیکھئے کہ انسانوں کے پاس انسان ہی رسول بھیجا، ہمارے اور رسول کے جذبات ایک ہیں، ضرورتیں ایک ہیں، چاہتیں ایک ہیں، مجبوریاں ایک ہیں، اعذار ایک ہیں، وہ ہماری ضرورتوں کو اور مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اور شریعت سازی میں اس کا خیال رکھتے ہیں، اس لئے انسان رسول کی بعثت بذاتِ خود ایک بہت بڑا کرم ہے۔ پس یہ تین احسان ایک ساتھ ہیں: ایک: رسول بھیجنا۔ دوسرا: انسان رسول بھیجنا۔ تیسرا: سب سے بڑا رسول یعنی سید الاولین والآخرین، خاتم النّبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھیجنا اور ہمیں ان کی امت ہونے کی سعادت بخشنا، یہ وہ عظیم احسان ہے جس کی ہر نبی نے تمنا کی ہے۔ تمام انبیاء آرزوئیں کرتے رہے ہیں کہ ہمیں نبوت ملنے کے بجائے نبی آخر الزماں ﷺ کا امتی بنایا جاتا تو کیا اچھا ہوتا، اور ہمیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سے بغیر کسی استحقاق کے اپنے محبوب کا امتی ہونے کا شرف بخشا، یہ سب سے بڑا احسان ہے۔

نبی ﷺ کے تین کام

۱- نبی ﷺ کا پہلا کام یہ ہے کہ اللہ کی آیتیں یعنی قرآنِ کریم لوگوں کو پڑھ کر سنائیں، آپ ؐحضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآنِ کریم لیتے تھے، پھر لوگوں کو پہنچاتے تھے۔

۲- آپ ؐلوگوں کو ستھرا کرتے تھے، جیسے میلا کپڑا اور میلا برتن دھوکر اور مانجھ کر صاف کیا جاتا ہے، اسی طرح آپ ؐانسانوں کو ستھرا کرتے تھے۔ آپ ؐانسانوں کے ظاہر کو ستھرا نہیں کرتے تھے، ظاہر تو انسان خود صاف کرتا ہے، چہرے پر دھبہ لگتا ہے تو آئینہ کے سامنے کھڑے ہوکر چہرہ صاف کرتا ہے، کپڑے میلے ہوجاتے ہیں تو ان کو دھوکر صاف کرتا ہے، کیونکہ انسان کو ان کا میلا ہونا معلوم ہوجاتا ہے، مگر باطن کا میل نہ صرف یہ کہ انسان خود اس کو صاف نہیں کرسکتا، بلکہ اس کو باطن کے میل کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ اور یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آدمی جتنا اندر سے میلا ہوتا ہے اتنا ہی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں ہی سب سے زیادہ صاف وشفاف ہوں، مگر جو اللہ کے نیک بندے ہیں وہ ہمیشہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں، اپنے باطن کا جائزہ لیتے ہیں، اور اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھتے ہیں، پس اللہ کے نیک بندوں کو تو اپنے اندر کمزوریاں نظر آتی ہیں، مگر جن کا باطن گناہوں سے میلا ہوتا ہے وہ نہ اپنا محاسبہ کرتے ہیں اور نہ ان کو اپنی خامیاں نظر آتی ہیں، بلکہ وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ پاک صاف تصور کرتے ہیں۔

انبیاء اور علماء لوگوں کو اخلاق حمیدہ سے آراستہ کرتے ہیں

جب انسان اپنی خامیوں کا ادراک نہیں کرسکتا، اس کو اندر کی خرابیوں کا پتہ نہیں چلتا، تو ضروری ہے کہ کوئی ایسی شخصیت ہو جو انسانوں کو اس کے عیوب سے مطلع کرے اور باطنی خرابیوں سے اور اخلاق رذیلہ سے اس کو پاک کرے اور اخلاق حمیدہ سے آراستہ کرے، یہ کام انبیاء کرام کا ہے، اور ان کے بعد علماء اور صوفیاء کا ہے، وہ بھی لوگوں کو رذائل سے پاک کرتے ہیں اور اچھے اخلاق سے آراستہ کرتے ہیں، یہی لوگوں کو ستھرا کرنا ہے ﴿يُزَكِّيْهِمْ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے: بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ: میری بعثت کا ایک مقصد یہ ہے کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کروں، لوگوں میں اچھے اخلاق پیدا کروں، اور اچھے اخلاق پیدا کرنے کے لئے پہلے برے اخلاق نکالنے ہونگے، جس آدمی میں خودغرضی ہے وہ سخی بن

جائے ممکن نہیں، پہلے اندر سے خودغرضی نکالنی پڑے گی، تب فیاضی اور سخاوت کی صفت پیدا ہوگی۔ غرض انبیاء اور ان کے بعد علماء اور صوفیاء کا یہ مشن ہے کہ لوگوں کے اندر جو پوشیدہ عیوب اور برے اخلاق ہیں ان سے ان کو پاک کریں، ان کے باطن کو مجلّی کریں، پھر اخلاق حسنہ اور صفاتِ محمودہ سے ان کو مزین کریں۔

انسان کی کمزوریاں انسان ہی سمجھ سکتا ہے

اور لوگوں کو اخلاقِ رذیلہ سے انسان رسول ہی پاک کرسکتا ہے، کیونکہ وہی انسان کی کمزوریوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے، اگر فرشتہ رسول بن کر آتا، جنّ رسول بن کر آتا، چرند و پرند رسول بنکر آتے تو وہ لوگوں کو ستھرا نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ وہ انسانوں کی خامیوں کو سمجھ نہیں سکتے، پھر ستھرا کیسے کریں گے؟ جیسے میں ہندوستان کا ہوں اور ہندوستان میں بھی گجرات کا ہوں، پس گجرات کے لوگوں کی کمزوریوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ مگر امریکہ کا شخص گجرات کے لوگوں کی کمزوریاں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا اور میں امریکہ کے لوگوں کی کمزوریاں پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، کچھ سمجھ سکتا ہوں، مگر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ یہاں کے لوگوں کی کمزوریاں اور خوبیاں یہاں کا آدمی ہی سمجھ سکتا ہے، جو یہاں رہا ہے، اور یہاں کی سوسائٹی میں پلا بڑھا ہے وہی اچھی طرح ان کو سمجھ سکتا ہے۔

ہر قوم میں نبی اسی قوم کا بھیجا گیا

اس لئے اللہ نے ہر قوم میں اسی قوم کا نبی بھیجا، ایک قوم کا نبی دوسری قوم میں نہیں بھیجا، صرف حضرت لوط علیہ السلام غیر قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے، ان کے علاوہ ایک قوم کا نبی دوسری قوم کی طرف نہیں بھیجا گیا، جس قوم کی طرف اللہ کو نبی بھیجنا منظور ہوتا ہے اسی قوم میں سے کسی شخصیت کو منتخب فرماتے ہیں، کیونکہ قوم کی خوبیاں، خرابیاں اور ان کی نفسیات کا ادراک قوم کا فرد ہی اچھی طرح کرسکتا ہے۔ اور زبان کا معاملہ بھی اہم معاملہ ہے، یہاں امریکہ میں بہت سے بھائی ہیں، میں اپنی بات ان کو نہیں سمجھا سکتا، کیونکہ وہ انگریزی بولتے ہیں اور میں انگریزی نہیں جانتا، اس لئے اللہ نے ہمیشہ ہر قوم میں اسی زبان کا پیغمبر بھیجا، کسی قوم کے

پاس ایسا رسول کبھی نہیں بھیجا جو قوم کی زبان نہ جانتا ہو، سورۂ ابراہیم کے پہلے رکوع میں یہ آیتِ کریمہ ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾: اللہ نے ہمیشہ لوگوں کے پاس ان کی زبان جاننے والا رسول بھیجا ہے تاکہ جو وحی آئے وہ قوم کو ان کی زبان میں سمجھائے۔

وحی سمجھانا انبیاء کا کام ہے

۳- انبیاء کا تیسرا کام وحی سمجھانا ہے، جو وحی نازل ہوئی ہے اس کو پڑھ کر سنانا الگ کام ہے، پھر اس کی تبیین وتشریح کرنا دوسرا کام ہے، علاوہ ازیں نبی اپنی امت کو حکمت کی باتیں بھی سکھاتا ہے، حکمت ودانشمندی کی یہ باتیں احادیث شریفہ کہلاتی ہیں۔

قرآنِ کریم مال ودولت سے بہتر ہے

اللہ نے انبیاء بھیج کر جو انسانوں کی اصلاح فرمائی ہے اور ان کو راہ راست دکھائی ہے، یہ اللہ کا انسانوں پر بہت بڑا کرم ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾: آپ کہہ دیجئے! یہ قرآن اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے، یہ اللہ کا بھیجا ہوا دین ہے، اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اس انعام پر خوشیاں مناؤ ﴿هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ وہ قرآن وہ دین وشریعت اس مال سے بہتر ہے جس کو تم اکٹھا کرتے ہو، جس دنیا پر تم شاداں فرحاں ہو، اس سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے، اس پر خوشیاں مناؤ۔

تین باتیں جو کامیابی کی کنجی ہیں

میں نے جو آیاتِ کریمہ تلاوت کی ہیں، ان میں ایک قیمتی مضمون ہے، وہ مضمون گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کتابوں میں بھی تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتابوں میں بھی تھا، یہ مضمون کی اہمیت بیان کی کہ وہ اتنا قیمتی مضمون ہے کہ گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں بھی نازل کیا گیا تھا، وہ کیا مضمون ہے؟ فرمایا: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾: وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو سنوار لیا یعنی کفر وشرک سے کنارہ کشی اختیار کرلی ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى﴾ اور اللہ کا نام لیا پس اس نے نماز پڑھی، جس آدمی

میں یہ تین باتیں جمع ہوں اس کے لئے کامیابی یقینی ہے۔

ایک: شرک وکفر سے علاحدہ ہوجائے، اور ظاہری اور باطنی، حسّی اور معنوی نجاستوں سے پاک ہوجائے، اور قلب وقالب کو عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ فاضلہ سے آراستہ کردے۔

اور دوسری چیز جس پر کامیابی کا مدار ہے یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کو یاد رکھے، اور ہر حال میں اللہ کو یاد رکھنے کا فارمولہ یہ ہے کہ بندہ جو بھی کام کرے اس میں جائز ناجائز کا خیال رکھے، ہر ناجائز کو چھوڑ دے اور جائز کو اپنائے، کاروبار میں یہی اللہ کو ہر وقت یاد رکھنا ہے، اور گھریلو زندگی میں ہمیشہ یاد رکھنا یہ ہے کہ والدین کے ساتھ جو معاملات کرے، بھائی بہنوں کے ساتھ، بیوی بچوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ اور اعزہ واقارب کے ساتھ جو معاملات کرے شریعت کے مطابق کرے، کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی نہ کرے، اور اللہ کے حکم کے مطابق ہر ایک کا حق ادا کرے، یہ فیملی لائف میں ہر وقت اللہ کو یاد رکھنا ہے، اسی طرح کھانے پینے میں حلال وحرام کا خیال رکھے، مشتبہ چیزوں سے بچے، اللہ کے نام سے کھانا شروع کرے، دائیں ہاتھ سے کھائے، دسترخوان پر لقمہ گرجائے اور دسترخوان صاف ہو تو اس کو اٹھا کر کھالے، کھانا ضائع نہ کرے، یہ کھانے پینے میں اللہ کو یاد رکھنا ہے۔ غرض ہمیشہ اللہ کا استحضار رکھے اور اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذارے، یہی کامیابی کی کنجی ہے۔

اور تیسری چیز یہ ہے کہ نمازیں پڑھے، یہ ہمیشہ اللہ کو یاد رکھنے کی ایک شکل ہے، اور یہ تین کام کامیابی کی ضمانت ہیں۔

نماز اللہ کو یاد رکھنے کا ذریعہ ہے

میرے بھائیو! جو نماز کا جتنا زیادہ اہتمام کرتا ہے وہ اللہ کو اتنا ہی زیادہ یاد رکھتا ہے، یہ نماز اللہ کو یاد رکھنے کا ذریعہ ہے، اور اللہ کو جو یاد رکھے گا وہی نماز پڑھے گا، اور نماز کا اہتمام کرے گا، اور جو اللہ کو بھول گیا وہ نماز نہیں پڑھے گا۔

اور نماز کے دو فائدے ہیں، اکیسویں پارہ کی پہلی آیت ہے: ﴿اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ﴾: جو کتاب ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے اس کی تلاوت کرو

اور نماز کا اہتمام کرو، یعنی پابندی کے ساتھ صحیح طریقہ پر نماز پڑھو، اس لئے کہ نماز کے دو فائدے ہیں:

ایک: نماز بے حیائی کے کاموں سے اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے، بعض بھائی یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم نے ایسے نمازی دیکھے ہیں جو نماز بھی پڑھتے ہیں اور بے حیائی کے کام اور ناجائز کام بھی کرتے ہیں، پس نماز نے ان کو برائیوں سے کہاں روکا؟

یہ سوال ایک معمولی بات نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز روکتی ہے، نماز روک دیتی ہے یہ نہیں فرمایا، اور روک دینے کا مطلب یہ ہے برائیاں صادر نہیں ہونے دیتی، اللہ نے یہ نہیں فرمایا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ نماز بے حیائی کے کاموں سے اور ناجائز کاموں سے روکتی ہے، جیسے باپ بیٹے کو برائیوں سے روکتا ہے مگر بیٹا نہیں مانتا، برائیاں کرتا ہے، پس یہ نہیں کہہ سکتے کہ باپ نے نہیں روکا، باپ نے تو روکا مگر وہ نہیں سنتا، اسی طرح نماز برائیوں سے روکتی ہے مگر نمازی نہیں سنتا، برائیاں کرتا ہے۔ غرض یہ اعتراض 'روکنے' اور 'روک دینے' میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

اور یہ بات اس طرح بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ آپ دو 'دل' لیں: ایک: نمازی بندے کا، دوسرا: بے نمازی کا، جو ایک ہی گناہ میں مبتلا ہوں، اور ان کو کسی لیبارٹی میں بھیجیں، اور تجزیہ کرائیں، اور ایسی لیبارٹی نہ ملے تو اپنے ذہن میں تجزیہ کریں، نمازی بندے کا دل روتا ہوگا جب وہ گناہ کرتا ہوگا، اور بے نمازی کو اس گناہ کے کرنے میں کوئی پشیمانی نہیں ہوگی، یہ نماز کے روکنے کا اثر ہے جو پشیمانی کی شکل میں دل میں موجود ہوتا ہے۔

اور نماز کا دوسرا فائدہ: اللہ کی یاد ہے، یہ پہلے فائدے سے بھی بڑا فائدہ ہے، یعنی بے حیائی اور ناجائز کاموں سے روکنے سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ نماز اللہ کو یاد رکھنے کا ذریعہ ہے، آدمی جتنی دیر نماز پڑھتا ہے اتنی دیر تو اللہ کو یاد کرتا ہی ہے، اس سے پہلے بھی اور بعد میں بھی یاد کرتا ہے، پہلے ہی سے خیال رکھتا ہے کہ باجماعت نماز پڑھنی ہے، پھر جب نماز پڑھ کر فارغ ہوجاتا ہے اور کاروبار میں مشغول ہوتا ہے تو بھی یہی خیال رہتا ہے کہ اگلی نماز بھی باجماعت پڑھنی ہے، سوتا بھی ہے تو نماز نہ چھوٹ جائے اس لئے الارم لگا کر یا کسی سے کہہ کر سوتا ہے،

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی اس کا یہ فائدہ بھی بتایا ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ آپ نمازوں کا اہتمام کریں مجھے یاد رکھنے کے لئے۔ غرض ان دونوں آیتوں سے صاف مفہوم ہوتا ہے کہ جو جتنا نماز کا اہتمام کرے گا وہ اتنا ہی اللہ کو یاد کرے گا۔ علاوہ ازیں: زندگی کی ہر لائن میں جائز ناجائز کا خیال رکھے گا یہ بھی اللہ ہی کی یاد کی وجہ سے ہے اور یہی کامیابی کی کنجی ہے اس لئے اپنے آپ کو ستھرا بھی کرنا ہے اور نمازوں کا اہتمام بھی کرنا ہے، تاکہ اللہ ہر وقت یاد رہیں، دنیا و آخرت کی کامیابی کا مدار اسی پر ہے۔

دنیا کے لئے محنت حرماں نصیبی ہے

مضمون پورا ہوا، اس کے بعد اس سے لگتا ایک دوسرا مضمون ہے: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾: مگر انسان دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، حالانکہ اصل محنت آخرت کی زندگی کے لئے کرنی ہے، اصل فکر آخرت کو سنوارنے کی کرنی ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی تو معمولی ہے، آنکھ جھپکتے پوری ہو جائے گی اور آخرت کی زندگی ہمیشہ رہنے والی ہے، وہ ختم ہونے والی نہیں، مگر انسان دنیا کی ذراسی زندگی کو سنوارنے کے لئے رات دن تگ و دو کرتا ہے اور آخرت کی پرواہ نہیں کرتا ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ مگر تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دنیا کے لئے بلاشبہ محنت کرنی ہے مگر بقدر ضرورت کرنی ہے، اصل تیاری آخرت کی کرنی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: کن في الدنيا كأنك غريب أو عابر سبيل: دنیا میں پردیسی یا مسافر کی طرح رہو۔ جس طرح غریب الوطن کے پاس معمولی سامان ہوتا ہے اور مسافر بس میں جگہ مل جائے تو بیٹھ جاتا ہے ورنہ کھڑے کھڑے سفر پورا کر لیتا ہے۔ اسی طرح دنیا بھی گذار دینی ہے۔ اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں اور اس دولت جاوداں سے نوازیں، دنیا میں ٹھاٹھ ضرور کرو، مگر ٹھاٹھ کے لئے غلط راہیں نہ اپناؤ۔ نہ اللہ کو بھولو، اللہ تعالیٰ ہمیں اس حقیقت کو سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۱۱

پانچ باتیں اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ، وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ، وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ، وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا، وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ، إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ سورۂ لقمان کی آخری آیت ہے اس میں ایک مضمون آیا ہے کہ اللہ ہی اس چیز کو جانتے ہیں جو بچہ دانیوں میں ہے۔ لوگ اس پر سوال کرتے ہیں کہ اب تو ایسی مشینیں ایجاد ہو گئیں ہیں جن کے ذریعہ ڈاکٹر پہلے ہی بتا دیتے ہیں کہ پیٹ میں بچہ ہے یا بچی؟ بلکہ یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ بچہ تندرست ہے یا معذور؟ جبکہ آیت میں یہ ہے کہ اللہ اس چیز کو جانتے ہیں جو بچہ دانیوں میں ہے۔ اس لئے آج کی مجلس میں میں چاہتا ہوں کہ اس آیت کی کچھ وضاحت آپ کے سامنے پیش کروں۔

اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾: بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس قیامت کا علم ہے۔ جیسے اردو زبان میں 'ہی' وغیرہ لگانے سے حصر ہوتا ہے اسی طرح عربی زبان میں بھی حصر کرنے کے کچھ طریقے ہیں، ان طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ تاکید کے لئے إن لاتے ہیں، پھر إن کے اسم وخبر لاتے ہیں، پس آیت یوں ہونی چاہئے تھی إن عندَ الله علمَ الساعة، مگر جملہ کی ساخت بدل دی اب ترجمہ یوں ہوگا: بیشک اللہ ان ہی کے پاس قیامت کا علم ہے، پس یہ آیت میں حصر ہو گیا جبکہ آپ جانتے ہیں کہ قیامت کا تھوڑا بہت علم سبھی کو ہے، سورۂ طٰہٰ میں یہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى﴾: بیشک قیامت آنے والی ہے، قریب تھا میں کہ اس کو چھپالوں تاکہ ہر نفس کو اس کام کا بدلہ دیا جائے

جواس نے کیا ہے، یعنی قیامت اس لئے آنی ہے کہ آدمی جو بھی کام اس دنیا میں کرتا ہے اس کا بدلہ دیا جائے، اور درمیان میں فرمایا: ﴿أَكَادُ أُخْفِيهَا﴾: قریب تھا میں کہ قیامت کو چھپالوں، یعنی صحیح امتحان تو اس وقت ہوگا جب یہ بھی نہ بتایا جائے کہ امتحان لیا جائے گا اور بغیر بتائے اچانک امتحان لے لیا جائے اس وقت پتہ چلے گا کہ کس طالب علم نے پڑھنے میں محنت کی ہے اور کس نے نہیں کی، اور اگر پہلے سے معلوم ہوجائے کہ سال میں دو یا تین امتحان ہونگے، اور فلاں فلاں تاریخوں میں ہونگے پھر امتحان سے ایک مہینہ پہلے اعلان کردیا جائے کہ فلاں تاریخ سے امتحان شروع ہوگا، یہ کیا امتحان ہوا؟ طالب علم دو مہینے سوتا رہے گا اور امتحان سے ایک مہینہ پہلے دن رات محنت کرکے پاس ہوجائے گا۔ اور اگر یہی پتہ نہ ہو کہ امتحان ہوگا، پھر اچانک امتحان لیا جائے تو صحیح جانچ ہوتی ہے کہ طالب علم پڑھتا ہے یا نہیں۔

پرانے زمانہ کا قصہ ہے: ٹونک سے ایک طالب علم: برکات احمد ٹونکی منطق پڑھنے کے لئے خیر آباد مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس گیا، مولانا عبدالحق خیر آبادی منطق کے بڑے ماہر تھے، استاذ نے کہا: میں پڑھانے کو تیار ہوں، مگر جب چاہوں گا امتحان لوں گا، طالب علم نے کہا: ٹھیک ہے، سبق شروع ہوا، ایک ہفتہ پڑھایا، آٹھویں دن جب پڑھنے گیا تو کہا آج امتحان ہوگا، طالب علم کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ آٹھویں دن امتحان ہوگا اس لئے اس نے کتاب یاد نہیں کی تھی چنانچہ امتحان ہوا اور سات دن کا سبق یاد نہ نکلا، تو حضرت نے یہ کہتے ہوئے نکال دیا کہ اگر میں تجھے عمر نوح بھی پڑھاؤں گا، پھر بھی تجھے علم نہیں آئے گا، طالب علم وہاں سے کلیر گیا اور حضرت صابر کلیری رحمہ اللہ کے مزار سے لگی ہوئی مسجد میں چالیس دن کا اعتکاف کیا اور چالیس دن تک اللہ سے دعائیں کرتا رہا کہ استاذ راضی ہوجائیں اور دوبارہ پڑھانا منظور کرلیں۔

مزار سے متصل مسجد

کسی مزار سے متصل اگر کوئی مسجد ہو تو اس مسجد کا مزار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اگر مسجد کے پاس کسی نیک آدمی کی قبر ہو تو اس کا فیض پہنچے گا، جیسے مسجد نبوی میں نبی پاک ﷺ

کی قبر ہے تو اس کا فیض لوگوں کو پہنچے گا، آج کچھ سرپھرے لوگ ہیں جو اس کے قائل نہیں، وہ مسجد نبوی میں کھڑے ہوکر گنبد خضری کی طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں: هٰذا هو الصنم الأكبر: یہ سب سے بڑا بت ہے! ایسے بھی سرپھرے انسان ہیں، بہر حال جہاں بھی نیک آدمی ہوگا، زندہ ہو تو اس کا فیض حاضرین کو پہنچے گا، قبر میں چلا گیا تو بھی فیض پہنچے گا۔

دو مسئلے الگ الگ ہیں قبر والے سے مانگنا جائز نہیں، جیسے اگر وہ زندہ ہوتا تو اس سے اولاد مانگنا جائز نہیں تھا ایسے ہی مرنے کے بعد بھی اس سے مانگنا جائز نہیں، لیکن جیسے ایک زندہ بزرگ ہو اور کسی بستی میں رہتا ہو تو اس بستی والوں کو اس کا فیض پہنچے گا، ایسے ہی اگر کسی نیک بندے کی قبر کے پاس مسجد ہے تو اس مسجد والوں کو فیض پہنچے گا، اس کا ذکر قرآن میں ہے، اصحاب کہف کے واقعہ میں جب مسلمانوں نے غار کے منہ پر دیوار چن کر اس کو اصحاب کہف کی اجتماعی قبر بنا دیا تو پھر ان کے درمیان آپس میں اس بات کو لے کر اختلاف ہوا کہ باہر کیا بنایا جائے؟ کسی نے کہا: غار کے باہر لاٹ بناؤ، اللہ نے اس کا رد کیا: ﴿رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ﴾ ان کا پروردگار ان کو خوب جانتا ہے۔ یادگار اور لاٹ بنانے کا کیا فائدہ، اور جو اقتدار میں تھے انہوں نے کہا: ہم یہاں مسجد بنائیں گے تاکہ لوگ یہاں آئیں اور عبادت کریں اور ان سات بزرگوں کا فیض ان کو پہنچے اللہ نے اس رائے کا رد نہیں کیا معلوم ہوا کہ قبر کے ساتھ مسجد بنائی جاسکتی ہے اور وہاں اعمال صالحہ کرنے والوں کو قبر کا فیض پہنچے گا اور مسجد میں جو اعمال صالحہ ہونگے اس کا فیض قبر والے کو بھی پہنچے گا۔

مسجد میں یا مسجد کے احاطہ میں قبر بنانا

مسجد میں یا مسجد کے احاطہ میں کسی نیک آدمی کو دفن کرنا جائز نہیں۔ حدیث شریف میں ہے: لَاتَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا: اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ، اور جب اپنے گھر میں دفن کرنے کی ممانعت ہے تو اللہ کے گھر میں دفن کرنے کی کہاں سے اجازت ہوگی؟ کتنا ہی بڑا بزرگ ہو اس کی قبر گورغریباں میں بنے گی، نہ گھر میں، نہ مسجد میں اور نہ مسجد سے ملحق گارڈن میں، مگر آج کل یہ بدعت چل پڑی ہے، کراچی کے مدرسہ بنوریہ میں حضرت مولانا یوسف

صاحب بنوری قدس سرہ کی قبر مسجد کے ساتھ بنائی گئی ہے ،کلکتہ میں حضرت مولانا طاہر صاحب کی قبر مسجد کے ساتھ بنائی گئی ہے، مرکز نظام الدین میں تین بزرگوں کی قبریں مسجد کے ساتھ بنائی گئی ہیں جبکہ پانچ سو گز کے فاصلہ پر گورغریباں ہے اور مرکز کے تمام بزرگ وہیں دفن ہیں، گنگوہ میں بھی مسجد کے ساتھ قبر بنی ہے، سونگڑہ (اڑیسہ) میں مولانا اسماعیل صاحب کی قبر مسجد کے ساتھ بنی ہے، اور نہ معلوم کتنی جگہیں ہیں جہاں اس طرح کی تدفین عمل میں آئی ہے، یہ سب غلط ہے، کوئی بھی بزرگ ہو قبر گورغریباں میں بنے گی مسجد کے ساتھ یا مسجد کے احاطہ میں قبر نہیں بننی چاہئے۔

اور اگر کہیں پہلے سے قبر ہے اور اس کے قریب مسجد بنائی گئی اور اس مسجد میں قبر کی زیارت کے لئے آنے والے ٹھہرتے ہیں اور اعمال صالحہ کرتے ہیں تو یہ درست ہے اور اس کی دلیل اصحاب کہف کا واقعہ ہے، قبر پہلے ہے اور مسجد بعد میں بنائی گئی ہے، دیوبند میں بھی جہاں حاجی عابد حسین صاحب کی قبر ہے اس سے دوسو گز کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے جہاں زیارت کے لئے آنے والے ٹھہرتے ہیں اور نماز وغیرہ پڑھتے ہیں۔

یادگاریں بنانے کا جذبہ

یادگاریں دو طرح کی ہوتی ہیں: ایک اشوک کی لاٹ کے مانند یادگار، یہ بیکار یادگار ہے اس کا کوئی فائدہ نہیں، اور ایک یادگار ایسی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں مثلاً بیادگار فلاں مسجد بنادی یا کنواں بنادیا یا سرائے بنادی، کوئی ایسی چیز بنائی جس سے مخلوق کو فیض پہنچے تو ایسی یادگار بنانا نہ صرف جائز ہے بلکہ ایسی یادگار بنانی چاہئے اور اصحاب کہف کا یہ واقعہ اس کی دلیل ہے اور لاٹ جیسی یادگاریں بنانا بیکار ہے، کیونکہ اس طرح کی یادگار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس گذرے ہوئے شخص کو لوگ یاد رکھیں قرآن نے کہا: ﴿رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ﴾: غار والوں کا پروردگار ان کو خوب جانتا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ اشوک کو یا اس کے مانند لوگوں کو جاننے کے لئے یادگار کی ضرورت نہیں اور لوگوں کے جاننے نہ جاننے سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ جذبہ کہ میں ایسا کام کر جاؤں کہ لوگ مجھے جانیں یہ بیکار جذبہ ہے، لوگ جانے تو کیا اور نہ جانے

تو کیا، اللہ کا جاننا اصل ہے اور اللہ ہر چیز جانتے ہیں کہ بندہ برا تھا یا اچھا، جنتی تھا یا جہنمی؟ اللہ کو سب معلوم ہے، اگر کسی کو یادگار بنانی ہے تو بنائے مگر ایسی چیز بنائے کہ جس کا لوگوں کو فیض پہنچے اور بنانے والے کو ثواب پہنچے، ایسی یادگار ہوگی تو لوگ یاد بھی رکھیں گے اور ثواب بھی ملتا رہے گا، ایک اعلیٰ درجہ کی حدیث ہے: **من بنى لله مسجداً بنى الله له بيتاً فى الجنة**: جو اللہ کے لئے مسجد بناتا ہے اللہ اس کے لئے جنت میں حویلی بناتے ہیں، اس میں یہ ہے: **من بنى لله**: جو اللہ کے لئے یعنی اس کی خوشنودی کے لئے مسجد بناتا ہے، بخاری کی شرح عمدة القاری میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی نے مسجد بنائی اور اس پر بانی کی حیثیت سے اپنا نام لکھا تو **كان بعيداً عن الإخلاص** اخلاص باقی نہیں رہا، یہ تو ناموری کے لئے مسجد بنائی، ہاں دوسرے بندے بانی کی ادنی خواہش کے بغیر لکھیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

الغرض نیک لوگوں کی قبر پر مسجد بنانے کا مسئلہ قرآن کریم میں ہے سلفی اس کو بالکل نہیں مانتے، خود روضہ اقدس کا فیض مسجد نبوی میں نہیں مانتے، یہ سر پھرے ہیں ان کی باتیں سننے کی ضرورت نہیں۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ مولانا برکات احمد ٹونکی نے کلیر کی مسجد میں چالیس دن کا اعتکاف کیا اور اللہ سے دعا کی کہ استاذ کسی طرح راضی ہوجائیں اور دوبارہ پڑھانا منظور کرلیں، پھر ٹونک گئے، وہ خود بھی بڑے خاندان کے تھے مگر پھر بھی ٹونک کے نواب سے سفارش کے لئے کہا، ٹونک کے نواب کے مولانا عبد الحق صاحب سے تعلقات نہیں تھے اس لئے انہوں نے رامپور کے نواب کے نام جن کے حضرت سے تعلقات تھے سفارش لکھی اور رامپور کے نواب نے حضرت مولانا عبد الحق صاحب سے سفارش کی کہ اس لڑکے کو آپ دوبارہ پڑھانا منظور فرمالیں، حضرت نے فرمایا: ٹھیک ہے بھیج دو، پڑھاؤں گا مگر جب چاہوں گا امتحان لوں گا، اس کے بعد اس طالب علم کا یہ حال تھا کہ روزانہ سونے سے پہلے پچھلا تمام پڑھا ہوا یاد کر کے سوتا تھا، کیونکہ ممکن ہے کل پڑھنے جاؤں اور استاذ امتحان لے لیں، مگر پھر حضرت نے کبھی امتحان نہیں لیا کیونکہ استاذ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ طالب علم پچھلا یاد کر کے آتا ہے، اسی طرح قیامت بھی ایک امتحان کا دن ہے، اگر پہلے سے امتحان کی ساری تفصیل بتادی جائے تو پھر

امتحان کیا رہا اس لئے اللہ نے فرمایا: ﴿أَكَادُ أُخْفِيهَا﴾: چاہئے تو یہ تھا کہ میں قیامت کی کسی کو بھنک نہ پڑنے دیتا مگر اللہ کا کرم اور احسان ہے تھوڑا بہت انہوں نے بتادیا، لیکن بالکل صحیح وقت اللہ نے کسی کو نہیں بتایا۔ اس آیت کے پہلے جملے میں تاکیدات ہیں کہ قیامت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اور جو کچھ باتیں ہم جانتے ہیں اس سے قرآن کریم کے حصر پر کوئی فرق نہیں پڑتا، پھر آگے چار مضمون ہیں: (۱) اللہ تعالی بچہ دانیوں میں جو کچھ ہے اسے جانتے ہیں، آیت میں مَا ہے مَن نہیں اور ما غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے، اور ڈاکٹر اس وقت بتاتے ہیں جب وہ مَن بن جاتا ہے (۲) اور اللہ تعالی بارش برساتے ہیں (۳) کوئی شخص نہیں جانتا کہ آئندہ کل کیا کرے گا، آدمی پلان بناتا ہے مگر کل اس پر وہ واقعی عمل پیرا ہوجائے گا یہ آدمی کو معلوم نہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور ارشاد ہے: عرفت ربّی بفسخ العزائم: میں جو پختہ ارادہ کرتا ہوں پھر وہ پورا نہیں ہوتا تو اس سے میں سمجھتا ہوں کہ میرے ارادے کے اوپر کوئی پروردگار ہے جس کے ارادہ کے مطابق کام ہوتا ہے (۴) اور کوئی شخص یہ بات نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں آئے گی۔

حصر کرنے کا ایک طریقہ

پہلے جملے میں تو حصر کے کلمات ہیں بعد کے ان چاروں جملوں میں حصر کا کوئی لفظ نہیں، عام جملے ہیں، مگر نبی پاک ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ یہ پانچوں باتیں اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب قیامت کے بارے میں پوچھا تھا تو آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں اس لئے پوچھ رہے ہو مجھے بھی معلوم نہیں اس لئے کیا بتاؤں، پھر فرمایا: فی خمس لایعلمهن إلا الله: قیامت کی بات ان پانچ باتوں میں سے ایک ہے جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باقی چار باتوں میں اگرچہ حصر پر دلالت کرنے والا کوئی لفظ نہیں مگر حصر ہے، کیسے حصر ہے؟ جیسے ایک انجن دلی جارہا ہے اس کے پیچھے چار ڈبے جوڑ دئے جائیں جن میں نہ کوئلہ ہے نہ ڈیزل، جب انجن دلی پہنچے گا تو یہ ڈبے بھی دلی پہنچیں گے، پہلا جملہ جو کہ انجن ہے اس میں حصر ہے تو اس کے

ساتھ جو چار ڈبے جوڑے گئے ہیں ان میں بھی حصر ہوگیا، اور یہ مقام حضور ہی کا ہے، حضور قرآن کی یہ تفسیر کرسکتے ہیں، امت میں سے کسی کے بس میں یہ بات نہیں۔

اس حدیث کو جب آیت کے ساتھ ملایا جائے تو سوال پیدا ہوگا کہ بچہ دانیوں میں جو ہے اس کو صرف اللہ ہی نہیں جانتے حالانکہ ڈاکٹر بھی جانتے ہیں پس سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر ہر جملہ میں ایسا لفظ ہونا ضروری نہیں جو حصر پر دلالت کرے، پہلا جملہ جو انجن بن کر چل رہا ہے اس میں حصر ہے اور باقی جملے اس پر عطف ہو رہے ہیں پس یہ حصر سب میں چلا جائے گا اور یہ تفسیر ماوشما نہیں کرسکتے اللہ کا رسول ہی کرسکتا ہے۔

حصر کرنے کا ایک اور طریقہ

ایسا ہی حصر کرنے کا ایک اور طریقہ ہے جو ان غیر مقلدوں کے سمجھ میں نہیں آتا، وہ طریقہ یہ ہے کہ کسی چیز میں حصر کا لفظ تو نہ ہو، مگر حصر کا فلیور (خوشبو) ہو جیسے مینگو فروٹی میں آم کا رس نہیں ہوتا، اس کا فلیور ہوتا ہے، ایسے ہی بعض جملے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں حصر کے الفاظ تو نہیں ہوتے مگر حصر کا فلیور ہوتا ہے، اس فلیور کو بھی اللہ کا رسول ہی پہچان سکتا ہے مجتہدین نہیں پہچان سکتے، سورہ نساء کے بالکل شروع میں یہ مضمون ہے کہ لوگ جنگوں میں مارے جاتے تھے، ان کے چھوٹے چھوٹے بچے دوست یا کوئی رشتہ دار پالتا تھا، ان بچوں کے باپ کی جو جائیداد ہوتی تھی وہ بھی اس پرورش کرنے والے کے قبضہ میں ہوتی تھی، پھر جب یتیم بچی بڑی ہوگئی اب اگر اس کا نکاح کسی اور سے کردیں گے تو اس کی جائیداد بھی اس کو دینی پڑے گی، جائیداد دینے کو جی نہیں چاہتا، پس کرتے یہ تھے کہ اس یتیم بچی سے شادی کرلیتے تھے اور شادی کے بعد نہ تو ڈھنگ سے مہر دیتے تھے، نہ ہی بیوی والے حقوق پوری طرح ادا کرتے تھے، اس شادی کا مقصد صرف اس یتیم بچی کی جائیداد پر قبضہ رکھنا ہوتا تھا چنانچہ اس سلسلے میں قرآن نے احکام نازل کئے اور فرمایا: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى﴾: اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم یتیم لڑکی کے ساتھ نکاح کرکے انصاف نہیں کرسکو گے ﴿فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ تو تم ان یتیم لڑکیوں سے نکاح مت کرو، ان کا نکاح دوسری

جگہ کرو، اور تمہیں واقعی دوسری بیوی کی ضرورت ہو تو جو عورتیں تمہیں اچھی لگیں ان سے نکاح کرو، دو دو سے کرو، تین تین سے کرو، چار چار سے کرو، چار پر آ کر اللہ پاک رک گئے اور قاعدہ ہے کہ معرض بیان میں آدمی رک جائے تو حصر ہو جاتا ہے، جیسے کسی نے پوچھا کہ آپ انڈیا سے کتابیں لائے ہیں؟ جی ہاں لایا ہوں! اس نے پوچھا: میں ان میں سے لے سکتا ہوں؟ ہاں لے سکتے ہو، ایک لو دو لو تین لو، پس وہ تین ہی لے سکتا ہے چوتھی نہیں لے سکتا کیونکہ میں اجازت دیتا ہوا تین پر رک گیا تو اس میں خود بخود حصر آ گیا اب وہ تین ہی لے سکتا ہے چوتھی نہیں لے سکتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ اجازت دیتے ہوئے چار پر رک گئے، معلوم ہوا کہ بس چار تک ہی نکاح ہو سکتے ہیں اس سے آگے نہیں ہو سکتے، اس سے زائد اگر نکاح جائز ہوتے تو اللہ تعالیٰ نہ رکتے کیونکہ یہ معرض بیان ہے، یہ ہے حصر کا فلیور اور اس فلیور کو بھی اللہ کے رسول سمجھیں گے ماوشما کے بس کی یہ بات نہیں، چنانچہ حضرت غیلان ثقفی جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس بیویاں تھیں حضور ﷺ نے کہا: چار رکھو چھ الگ کرو یہ حضورؐ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اسی آیت سے کیا ہے، ایک دوسرے صحابی مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں، حضور نے ان سے کہا چار رکھو چار الگ کرو، یہ دو واقعے ہیں، غیر مقلدین ان کو ضعیف بتاتے ہیں، مگر ان حدیثوں سے مسئلہ نہیں ثابت کرنا ان حدیثوں سے آیت پاک کی تفسیر کرنی ہے اور آیت پاک کی تفسیر ضعیف حدیث سے بھی ہو سکتی ہے، بہر حال یہ جو دو حدیثیں ہیں جن میں آپ نے چار سے زائد بیویوں کو الگ کرایا ہے ان سے معلوم ہوا کہ آیت پاک میں اگرچہ حصر کا کوئی لفظ نہیں مگر اس کا فلیور ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ معرض بیان میں اجازت دیتے ہوئے چار پر رک گئے ہیں معلوم ہوا کہ اجازت یہیں تک ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے، ائمہ اربعہ کا اس میں کوئی اختلاف نہیں اور غیر مقلدین اگر اختلاف کرتے ہیں تو کرتے رہیں کیونکہ گمراہ فرقوں کے اختلاف سے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اگر گمراہ فرقوں کا اختلاف بھی اجماع کو متاثر کرے گا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اجماعی نہیں رہے گی کیونکہ شیعہ اس میں اختلاف کرتے ہیں، مگر شیعوں کے نہ ماننے سے صحابہ کے اجماع میں کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح اس مسئلہ میں غیر مقلدین کے

اختلاف سے ائمہ اربعہ کے اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ انجن میں حصر ہے تو اس کے ساتھ لگے ہوئے ڈبوں میں بھی حصر ہوگا، لہٰذا آیت میں بعد کے چار جملوں میں بھی حصر ہے، اسی طرح کسی جملہ میں کوئی کلمہ حصر نہ ہو مگر حصر کا فلیور ہو تو وہاں بھی حصر ہو جاتا ہے، یہ اتنی باریک باتیں ہیں کہ مجتہد ان کو سمجھ نہیں سکتا یہ وہی سمجھ سکتا ہے جس پر کلام نازل ہوا ہے۔

علم کی تین قسمیں: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین

پس کسی بھی معاملہ کا تھوڑا سا حصہ جان لینا جان لینا نہیں، معاملہ سارا جاننا ہی جاننا ہے ورنہ جاننا نہیں، اسی لئے علم کی تین قسمیں کی گئی ہیں علم الیقین: یقینی طور پر جاننا، معاملہ میں ذرا شک نہ رہے جیسے ہم یہ بات جانتے ہیں کہ لا إلٰه إلا الله صرف اللہ ہی معبود ہیں ان کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، یہ بات ہم ایسی جانتے ہیں کہ اس میں شک وشبہ کا کوئی گذر نہیں، یہ علم الیقین آدمی کو جب حاصل ہوتا ہے تب وہ ایمان والا ہوتا ہے، اس سے پہلے ایمان نہیں، اور صرف اتنے سے ایمان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا، یہ آدھا مضمون ہے اس کے ساتھ دوسرا جز لگا ہوا ہے محمد رسول اللہ یعنی جس پیغمبر کا زمانہ چل رہا ہے اس پیغمبر پر ایمان لانا اور اس سے پہلے کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا، یہ دوسرا مضمون حاصل ہو تو ایمان ملتا ہے اس کے بغیر نہیں، اور یہ جو میں نے کہا کہ پہلے کے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا یہ ہمارے اعتبار سے ہے ہم سے پہلے ایسا نہیں تھا ہم سے پہلے یہ تھا کہ جس نبی کا زمانہ چل رہا ہے اس پر ایمان لانا، اس سے پہلے کے تمام نبیوں پر ایمان لانا اور اس کے بعد آنے والے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری تھا، مگر اب ہمارے آقا کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں اس لئے صرف حضور ﷺ پر اور ان سے پہلے والے تمام نبیوں پر ایمان لانا واجب ہے سورہ بقرہ میں ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ متقی وہ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی اور ان کتابوں پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ سے پہلے اتاری گئیں، آپ کے بعد؟ آپ کے بعد کوئی نہیں اس لئے اس

کاذکر نہیں کیا۔

پھر ایسے شواہد، دلائل اور بینات انسان کے سامنے آتے ہیں کہ اس کی وجہ سے یقین بالائے یقین ہوجاتا ہے، یہ حق الیقین کہلاتا ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی ﴿رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ اے میرے پروردگا! مجھے دکھلایئے کہ آپ قیامت کے دن مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟ اللہ نے پوچھا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ؟﴾ کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ ﴿قَالَ بَلٰى!﴾ کہا: کیوں نہیں! پکا یقین ہے یہ علم الیقین ہے ﴿وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ مگر میں اپنی آنکھ سے اس لئے دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان حاصل ہوجائے یہی حق الیقین ہے۔ چنانچہ اللہ نے ان کو منظر دکھلایا اور حضرت کو منظر دیکھ کر حق الیقین حاصل ہوگیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ میں تو یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ علم الیقین ہے اور یہ حق الیقین ہے مگر ہم اپنی زندگی میں الگ الگ کرکے یہ نہیں سمجھا سکتے کہ یہاں تک علم الیقین ہے، پھر یہ واقعات پیش آئے اور وہ ان حالات سے گذرا تو اس کا ایمان پکا ہوگیا اور اس کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہوگیا مثال دے کر اس کو نہیں سمجھا سکتے۔

اور اگر چاہو کہ مثال ضرور دی جائے تو یہ مثال سنو ایک حدیث شریف ہے نبی پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص حج کرسکتا ہے یعنی بدن درست ہے ہاتھ میں خرچہ ہے راستہ میں کوئی خطرہ نہیں، پھر بھی اس نے حج نہیں کیا فلا علیه أن يموت يهوديا أو نصرانيا اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا عیسائی ہوکر مرے اب میں الفاظ بدلتا ہوں تاکہ بات سمجھ میں آئے آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس گنجائش ہے حج کرسکتا ہے پھر بھی حج نہیں کرتا تو اسے مسلمان رہنے کی کیا ضرورت ہے یہودی کیوں نہیں ہوجاتا عیسائی کیوں نہیں ہوجاتا۔ علماء نے اس سے ایک مسئلہ نکالا ہے کہ انسان ہمیشہ معرض ارتداد میں رہتا ہے، ایمان سے ہٹ کر بے ایمان ہوسکتا ہے لیکن جس بندے نے حج کرلیا اور اس کو حج مبرور نصیب ہوگیا تو ان شاء اللہ اس کے ایمان پر مہر لگ گئی اب یہ مرتد نہیں ہوگا۔ اور اگر گنجائش ہے پھر بھی حج نہیں کرتا تو کسی بھی وقت ایسی صورت پیش آسکتی ہے کہ ہندو ہوجائے یا یہودی ہوجائے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ میں نے مثال دی ہے کہ یہاں تک اس کا ایمان علم الیقین تھا

حج کرنے کے بعد حق الیقین ہوگیا کہ اب وہ اسی پر جان دے گا۔

پھر ایک تیسرا مرحلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت کو جس کو وہ پہلے جانتا تھا، یقین بالائے یقین ہوچکا تھا اس حقیقت کا آدمی مشاہدہ کرلے یہ آخری درجہ ہے اس سے آگے کوئی درجہ نہیں، یہ عین الیقین ہے۔ یہ درجہ کب آتا ہے؟ یہ درجہ موت کے بعد آتا ہے اس سے پہلے یہ مرحلہ نہیں آتا سورۃ الحجر کی آخری آیت ہے: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ﴾: اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو تا آنکہ تمہیں یقین آجائے حدیث شریف میں یقین کی تفسیر موت سے آئی ہے۔ یہ دنیا ایمان بالغیب ہے پس جب یہ دنیا ایمان بالغیب ہے تو یہاں عین الیقین کا درجہ کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟

غیب کسے کہتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے علم حاصل کرنے کے لئے پانچ حواس دئے ہیں: وہ حواس یہ ہیں: آنکھ، کان ناک چکھنا اور پورے جسم میں ٹٹولنے کی طاقت ہے اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محسوسات کہلاتا ہے اور وہ حقیقتیں جو ان حواس کے دائرے میں نہیں آتیں ان کو ڈائرکٹ عقل سے سمجھنا ہے یہی غیب ہے ہم اللہ پر جنت پر جہنم پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے یہ سب غیب ہیں پس جب یہ سب غیب ہیں تو ہم ان میں عین الیقین کا درجہ کیسے حاصل کرسکتے ہیں۔

دوسرا مضمون میں نے کل یہ بتایا تھا کہ کسی غیب کا اگر اگاڑا پچھاڑا تھوڑا سا علم حاصل ہوجائے تو اس کو غیب کا جاننا نہیں کہتے۔

دوسرا ٹکڑا ہے: ﴿وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ﴾: بارش اللہ ہی برساتے ہیں بیشک! اللہ کے علاوہ کون ہے جو بارش برسائے؟ اس میں تو کوئی اشکال نہیں، کوئی اگر کہے کہ اب تو محکمہ موسمیات والے پہلے سے بتادیتے ہیں کہ بارش اتنے دنوں کے بعد آئے گی اور اتنی آئے گی یہاں آئے گی اور یہاں نہیں آئے گی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ مسئلہ نہیں ہے، آیت میں تو یہ بات ہے کہ اللہ ہی بارش برساتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے پھر محکمہ

موسمیات والے کب بتاتے ہیں؟ جب سمندر سے مانسون اٹھتا ہے اس کے بعد ہی وہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں اس سے پہلے وہ بھی نہیں بتا سکتے اور بعض دفعہ ان کی ساری پیشین گوئیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

پھر فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾: جانتے ہیں اللہ اس چیز کو جو بچہ دانیوں میں ہے، عربی میں دو لفظ ہیں: من اور ما، من ذوی العقول کے لئے ہے یعنی جو سمجھ کا اعلی معیار رکھتے ہیں جیسے انسان، جنات اور فرشتے اس کے لئے من آتا ہے اور اردو میں ہم اس کا ترجمہ 'لوگ' کرتے ہیں ﴿وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ﴾ اور اللہ کی ملک ہیں وہ لوگ جو آسمانوں میں ہیں اور وہ لوگ جو زمین میں ہیں۔ لوگ میں جنات اور فرشتے بھی آتے ہیں اگرچہ آدمی میں یہ دونوں نہیں آتے آدمی میں صرف مرد و عورت آتے ہیں۔ اور وہ چیزیں جن میں عقل وفہم کا اعلی معیار نہیں وہ غیر ذوی العقول کہلاتے ہیں ان کے لئے ما استعمال ہوتا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ 'چیز' کرتے ہیں قرآن میں جگہ جگہ ہے ﴿لَهُ مَافِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ اللہ ہی کی ملک ہیں وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ چیزیں جو زمین میں ہیں بہر حال من اور ما میں یہ فرق ہے۔

اس کے بعد یہ سمجھو کہ من بھی عام ہے اور ما بھی عام ہے یعنی من بول کر ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں مراد لیتے ہیں اور ما بول کر بھی دونوں مراد لیتے ہیں مگر لفظ کے اصل معنی اصل رہتے ہیں اور دوسرے معنی اس کے تابع ہوتے ہیں، من دراصل ذوی العقول کے لئے ہے اور غیر ذوی العقول اس کے تابع ہونگے۔

اور جہاں ما بولیں گے وہاں غیر ذوی العقول اصل ہونگے اور ذوی العقول اس کے تابع ہونگے اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جب تک عورت اور مرد کے مادے بچہ دانی میں نہیں پہنچتے تب تک کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور جب وہ بچہ دانی میں پہنچ گئے اور علوق ہو گیا تو اب یہ ما ہے۔ اس کے بعد سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ یہ اندر ٹھہرے گا اور کچھ بنے گا یا گر جائے گا؟ اس کو اللہ ہی جانتے ہیں کوئی سائنس اس کو نہیں بتا سکتی، اور پھر اسقاط حمل کس مرحلہ میں ہوگا اس کو بھی اللہ کی علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ مادے چالیس دن میں علقہ بنتے ہیں یعنی کلیجی

اور تلی کی طرح جما ہوا خون بنتے ہیں پھر علقہ گوشت کی بوٹی بنتا ہے۔ پھر گوشت میں سفید دھاگے بنتے ہیں اور یہی آگے چل کر ہڈی بنتے ہیں اور باقی گوشت ہڈیوں پر چڑھ جاتا ہے اب یہ مادہ ان مرحلوں تک پہنچے گا یا نہیں؟ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں ما میں داخل ہیں۔ پھر جب جسم تیار ہو گیا تو قرآن کریم کہتا ہے: ﴿ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ﴾: پھر ہم اسے ایک نئی مخلوق بنا دیتے ہیں۔ فرشتہ کو حکم ہوتا ہے چنانچہ وہ عالم ارواح سے روح لاکر اس میں ڈالتا ہے اور وہ ڈھانچہ انسان بن جاتا ہے۔ بہر حال جب ڈھانچہ میں روح پڑتی ہے تو وہ وجود بنتا ہے اور من کے مرحلہ میں داخل ہوتا ہے اور آگے بھی بہت مراحل ہیں، اگلا مرحلہ یہ ہے کہ جب فرشتہ اللہ کے حکم سے روح لاکر ڈالتا ہے تو اللہ تعالی اس کو چار باتوں کا حکم دیتے ہیں اور وہ فرشتہ چار باتوں کو لکھتا ہے پہلی بات: ما أجله؟ اس کی زندگی کتنی ہوگی؟ ما رزقه: اس کی روزی کتنی ہے؟ ساری تفصیل لکھ دی جاتی ہے۔ ما عمله؟ مرنے تک وہ کیا عمل کرے گا؟ یہ ساری تفصیل بھی لکھ دی جاتی ہے۔ اور آخری چیز ہے کہ کیا وہ نیک بختوں میں سے ہے یا بد بختوں میں سے؟ یہ بھی لکھ دیا جاتا ہے اور یہ چاروں باتیں اللہ فرشتے کو بتاتے ہیں اور وہ لکھتا ہے۔ یہ سارے مرحلے ما کے ہیں۔ قرآن نے کہا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾: وہ چیز جو بچہ دانیوں میں ہے اسے اللہ ہی جانتے ہیں یعنی پیدائش کے یہ مراحل شروع سے لے کر آخر تک اللہ ہی جانتے ہیں پس اگر درمیان میں ایکسرے مشین نے لڑکا یا لڑکی ہونا بتا دیا، تندرست ہے یا بیمار ہے بتا دیا تو یہ ذرا سا حصہ معلوم ہوا اور یہ تو من کا مرحلہ ہے جب تک یہ من نہ بنے گا کوئی مشین کچھ نہیں بتا سکتی جب تک وہ ما کے مرحلہ میں ہے کوئی مشین اور کوئی ڈاکٹر کچھ نہیں بتا سکتا کہ وہ لڑکا ہوگا یا لڑکی تندرست ہوگا یا بیمار؟ اور من کے مرحلہ کے بعد جو چار مرحلے آتے ہیں جن کو اللہ کے حکم سے فرشتہ لکھتا ہے یہ چاروں بھی ما کے مرحلے ہیں اور ان کو بھی دنیا کی کوئی طاقت نہیں بتا سکتی بہر حال سمجھنے کی بات یہ ہے کہ شروع میں بھی ما کا مرحلہ ہے اور آخر میں بھی ما کا مرحلہ ہے بیچ میں ذرا سا من کا مرحلہ آیا ہے اس کو اگر ڈاکٹر نے جان لیا تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے؟

اس کے بعد اگلا جملہ ہے: ﴿وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾: کوئی نہیں جانتا

کہ آئندہ کل وہ کیا کرے گا حالانکہ ہم سب پروگرام بناتے ہیں اور ہم جو پروگرام بناتے ہیں ننانوے فیصد اس کے حساب سے کام بھی کرتے ہیں جبکہ اللہ فرماتے ہیں آئندہ کل آدمی کیا کام کرے گا اس کو کوئی نہیں جانتا اسی لئے میں نے بتایا تھا مکمل جاننا ہی جاننا ہے کچھ باتوں کا جان لینا جاننا نہیں، یوں تو قیامت کے بارے میں بھی ہم بہت سی باتیں جانتے ہیں مگر وہ قیامت کا جاننا نہیں، یہاں بھی جو آدمی پروگرام بناتا ہے اگر یہ پروگرام بالیقین پورا ہو، کبھی تخلف نہ ہو تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان بھی اپنے آئندہ کل کا پروگرام جانتا ہے حالانکہ ہمارے بنائے ہوئے پروگرام بعض مرتبہ فیل ہو جاتے ہیں اور ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے اور اس جملہ پر کوئی اعتراض بھی نہیں کرتا۔

آخری جملہ ہے: ﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِأَیِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾: کوئی نفس نہیں جانتا کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا عام طور سے لوگ جہاں پیدا ہوتے ہیں وہیں مرتے ہیں لیکن یہ جاننا نہیں بالیقین سو فیصد آدمی جانے کہ وہ فلاں جگہ مرے گا اور یہ فلاں جگہ مرے گا تو اس کو جاننا کہا جا سکتا ہے لیکن انسان اس طور سے نہیں جانتا۔ یہ پانچوں باتیں اللہ ہی جانتے ہیں ﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾ وہ خوب جاننے والے ہیں اور ہر معاملہ سے باخبر ہیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

۱۲

آگ والے اور باغ والے برابر نہیں

خطبہ مسنونہ کے بعد ﴿لَایَسْتَوِیْ أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ، أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ ○ لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَأَیْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ، وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ دو آیتیں ہیں جن کی قاری صاحب نے تلاوت فرمائی ہے، ان آیتوں میں نہایت اہم مضمون ہے، آج مختصر طور پر اس کو سمجھ لیا جائے۔

دنیا میں اچھے برے رلے ملے ہیں

﴿لَایَسْتَوِیْ أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ﴾: آگ والے اور باغ والے برابر نہیں، کچھ لوگ اس زندگی کے ختم پر باغ میں پہنچیں گے اور کچھ آگ میں، باغ میں پہنچنے والے اور آگ میں پہنچنے والے اس دنیا میں تو برابر ہیں، اس دنیا میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، جو باغ والے ہیں وہ مالدار بھی ہیں اور نان شبینہ کے محتاج بھی، تندرست بھی ہیں اور بیماریوں کے شکار بھی، عزت والے بھی اور ذلت سے دوچار بھی، بالکل یہی حال آگ والوں کا ہے، لیکن آگے ایک زندگی آرہی ہے جہاں دانہ اور بھس الگ الگ کر دیئے جائیں گے۔

کھیت میں جب گیہوں بوتے ہیں تو پہلے اس کا پودا نکلتا ہے پھر اس پر بالی آتی ہے پھر وہ پکتا ہے، پکنے تک گھاس، تنکا، بھوسا، دانہ سب ایک ساتھ ہوتے ہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو سب کچھ نظر آتا ہے، نظر نہیں آتا تو دانہ نظر نہیں آتا، جو مقصود ہے، کاشتکار اسی دانہ کے لئے کھیت بوتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ کھیت پک جاتا ہے، پھر کٹتا ہے، کھلیان میں جمع کیا جاتا ہے، گاہا جاتا ہے، برسایا جاتا ہے، برسانے کے بعد گیہوں نیچے گرتا ہے اور بھس دور جا پڑتا ہے، پھر دانہ اور بھس دونوں کو گھر لے جایا جاتا ہے، دانہ کوٹھی میں رکھا جاتا ہے، اور بھس

باڑے میں ڈالا جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا میں آگ والے اور باغ والے الگ الگ نہیں ہیں، یہاں سب ایک جیسے دکھتے ہیں بلکہ بعض مرتبہ ایسا دکھتا ہے کہ دنیا انہی کافروں کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے غلبے کی مثال دی ہے: جب بارش ہوتی ہے تو بستی اور جنگل کا پانی نالے میں چلتا ہے اور خس وخاشاک پانی پر ایسے چھائے رہتے ہیں کہ پانی نیچے ہوتا ہے اور کوڑا کرکٹ اوپر، لیکن تالاب میں پہنچنے کے بعد: ﴿أَمَّا الذَّهَبُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً﴾: کوڑے کرکٹ کو ہوائیں کنارے پر پھینک دیتی ہیں اور صاف وشفاف پانی تالاب میں رہ جاتا ہے، اسی طرح اس دنیا کی زندگی میں ایسا نظر آتا ہے کہ باطل سر چڑھا ہوا ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ دنیا کی کھیتی کٹ جائے گی، دانہ بھس الگ الگ کردیا جائے گا، پھر خلاصۂ کائنات جنت میں جائے گا اور کوڑا جہنم میں جلنے کے لئے ڈال دیا جائے گا۔

اگلی زندگی کے نمونے

قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں یہ مضمون بار بار سمجھایا گیا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں، دنیا کی کھیتی ایک دن کٹنے والی ہے اور اس کی مثال ہر شخص کی موت ہے، کوئی ہے ایسا جسے نہیں مرنا؟ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مرتے چلے جارہے ہیں، ہمیں خود اپنے بارے میں موت کا یقین ہے اور جیسے ایک شخص کی موت ہے ایسی ہی ساری دنیا کی موت، پوری دنیا کی موت کا نمونہ فرد کی موت ہے، جو حکم جزئی کا ہوتا ہے وہی کلی کا ہوتا ہے پس جب ہر فرد کو مرنا ہے تو تمام افراد یعنی دنیا کو بھی مرنا ہے، اور ہر فرد کی موت کا نمونہ ہے نیند، نیند موت کی بہن ہے حدیث شریف میں ہے: النوم أخو الموت: چوبیس گھنٹے میں انسان کم از کم ایک مرتبہ ضرور مرتا ہے، پھر بھی ہمیں موت کا یقین جیسا چاہئے نہیں ہے، ہم دوسروں کو مرتا دیکھتے ہیں پھر بھی ہمیں دنیا کے مرنے کا یقین جیسا چاہئے نہیں ہوتا۔

غرض اللہ نے ہر چیز کو سمجھنے کے لئے اس دنیا میں نمونے رکھے ہیں، اگلی زندگی میں پیش آنے والی باتوں میں کوئی بات ایسی نہیں جس کا نمونہ اس دنیا میں نہ ہو اور یہ نمونے اس لئے رکھے ہیں کہ انسان آگے آنے والی زندگی کو سمجھے۔

اسی طرح کسی مصلحت سے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں خیر وشر رلے ملے رکھے ہیں مگر

ایک وقت آئے گا کہ خیر الگ ہوجائے گی اور شر الگ، جیسے کھیت میں گھاس دانہ تنکا بھوسا سب رلا ملا رہتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے کہ دانہ الگ کرلیا جاتا ہے اور بھس الگ، اب دانہ عزت کی جگہ پر پہنچے گا اور بھس باڑے میں، دانہ کو انسان کھائیں گے اور بھس کو جانور، دانہ بڑی قیمت پر بکے گا اور بھس معمولی قیمت پر، ایسے ہی اگلی زندگی میں خیر وشر الگ کردئے جائیں گے، ایک عزت کی جگہ پر پہنچے گا اور ایک ذلت کی جگہ پر، ایک کی بڑی قیمت ہوگی اور دوسرا بے قیمت، اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا﴾: جن لوگوں نے اللہ کے نازل کئے ہوئے دین کو قبول نہیں کیا ان کو گروہ گروہ بنا کر دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔ ﴿وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا﴾: اور جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے حکم کے مطابق زندگی گزارتے ہیں ان کو بھی گروہ گروہ بنا کر باغ کی طرف لے جایا جائے گا، سورۂ یٰس میں ہے: ﴿وَامْتَازُوْا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾: اے بدکارو! آج نیکوکاروں سے جدا ہوجاؤ، آج نیکوکار جنت میں جائیں گے اور بدکار جہنم میں، اب دونوں رلے ملے نہیں رہیں گے، ﴿لَا يَسْتَوِيْ أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ﴾: آگ والے اور باغ والے برابر نہیں ہوسکتے، دونوں میں کیا فرق ہے؟ ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ﴾: باغ والے ہی کامیاب ہونے والے ہیں، مقصد کو پانے والے ہیں، یہ آدھا مضمون ہے، باقی آدھا مخاطب کے فہم پر اعتماد کرکے چھوڑ دیا گیا ہے جب باغ والے ہی کامیاب ہیں تو آگ والے ہی ناکام ہیں۔

آخرت کی کامیابی کے لئے محنت

اس دنیا میں گنتی کے کچھ لوگ ہیں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مقصد نہیں، مگر اکثریت اس دنیا کو بامقصد جانتی ہے، عیسائی دوزخ اور جنت کو مانتے ہیں، وہ جتنی محنتیں کرسکتے ہیں جنت کو پانے کے لئے اور دوزخ سے بچنے کے لئے کرتے ہیں، یہودیوں، ہندوؤں اور بدھسٹوں کا بھی یہی حال ہے وہ سب جنت اور دوزخ کو مانتے ہیں اور جنت کو پانے کے لئے اور جہنم سے بچنے کے لئے ساری زندگی ہم سے زیادہ محنتیں کرتے ہیں، قرآن کریم اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا میں ہر شخص جس کامیابی کا خواہش مند ہے وہ کامیابی

باغ والوں کے لئے ہے، ﴿أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُوْنَ﴾: باغ والے ہی کامیاب ہونے والے ہیں، جو آگ میں جائیں گے وہ کامیاب نہیں ہونگے۔

خیر وشر کا سنگم

اللہ تعالی نے انسان کو ایسی سطح پر پیدا کیا ہے جو خیر وشر کا سنگم ہے، اس نقطے میں خیر وشر دونوں ملے ہوئے ہیں، پھر انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ اس سطح سے اوپر اٹھے اور اپنے آپ کو اتنا اونچا لے جائے کہ کرّوبی بھی پیچھے رہ جائیں، اور اپنے آپ کو اس سطح سے نیچے گرانے کا بھی اختیار دیا ہے، نیچے گر کر انسان اپنے آپ کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتا ہے، اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا﴾: قسم ہے نفس کی اور اس کو درست بنانے کی، اللہ پاک ہماری روح کی قسم کھا رہے ہیں کہ ہم نے انسان کا نفس نہایت درست بنایا ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا﴾: اللہ نے نفس کو شاندار بنا کر اس کی بدکاریاں اور نیکوکاریاں اس کو الہام کیں، یہی وہ سطح ہے جس پر اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا ہے، یہی وہ خیر وشر کا سنگم ہے: ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾: بالیقین کامیاب ہوا وہ جس نے نفس کو ستھرا کیا: ﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾: اور بالیقین ٹوٹے میں رہا وہ جس نے اس کو میلا کر دیا، گندہ کر دیا، یہی نفس کو اٹھانا اور گرانا ہے، پھر اللہ نے نفس کو گرانے کی مثال دی ہے: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوَاهَا﴾: ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا، قوم نے ایک چٹان کو نامزد کر کے کہا: اگر آپ اس چٹان میں سے اونٹنی نکال کر دکھائیں تو ہم آپ کی بات مان لیں، نہیں تو نہیں مانیں گے، ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا، ایمان لانا نہیں لیکن دہلا حضرت صالح کے سر رکھنا ہے کہ تم نے معجزہ نہیں دکھایا اس لئے ہم ایمان نہیں لائے، حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی، دعا کرتے ہی چٹان تڑخی اور اس کے دو حصے ہو گئے اور اندر سے ایسی اونٹنی نکلی جو دس مہینے کی گابھن تھی اور بیاہنے کو ہو رہی تھی، چنانچہ اس نے سب کے سامنے بچہ جنا، قوم نے ایک اونٹنی مانگی تھی اللہ نے دو نکال کر دکھائیں، اور ابھی نر اندر ہے، مگر قوم ایمان نہیں لائی، حضرت صالحؑ نے قوم سے کہا: جب تک تم اس اونٹنی کو نہیں ستاؤ گے دنیا میں پنپتے رہو گے اور جس دن تم نے اس کو بری نیت سے ہاتھ لگایا تمہاری خیر نہیں، اور حضرت صالحؑ نے یہ طے کیا کہ ایک دن تمہارے

جانور گاؤں کے کنویں پر پانی پئیں اور ایک دن یہ اونٹنی اکیلی پانی پیئے، پانی کی اس تقسیم کے ساتھ زمانہ چلتا رہا، ایک دن قوم نے میٹنگ کی کہ یہ اونٹنی تو ہمارے لئے دردسر بن گئی لہٰذا یہ کانٹا بیچ میں سے نکالنا چاہئے، ایک شخص تیار ہوا کہ اس اونٹنی کو میں قتل کروں گا، اس میٹنگ کی بھنک حضرت صالحؑ کو پڑ گئی، صالح علیہ السلام نے قوم کو سمجھایا اور ڈرایا کہ جس دن تم نے اس اونٹنی کو ہاتھ لگایا تمہاری خیر نہیں ہوگی، قرآن کہتا ہے: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوَاهَا إِذِ انْبَعَثَ أَشْقَاهَا﴾: یاد کرو اس وقت کو جب قوم کا سب سے بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا، ﴿فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيَاهَا﴾ اللہ کے رسول نے قوم سے کہا: بچو تم اللہ کی اونٹنی سے اور اس کی پانی پینے کی باری سے، اس کی باری میں دخل مت دو ﴿فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا﴾: انھوں نے اللہ کے رسول کو جھٹلایا اور اس آدمی نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، قتل کر دیا، وہ اونٹنی پانی پینے جا رہی تھی کہ اس نے پیچھے سے پیروں پر تلوار ماری جس سے اس کی کونچیں کٹ گئیں اور جب جانور کی کونچیں کٹ جاتی ہیں تو وہ چل نہیں سکتا وہ بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھا بیٹھا مر جاتا ہے، جب انہوں نے اونٹنی کو زخمی کیا تو صالحؑ نے قوم سے کہا کہ تمہیں تین دن کی مہلت ہے، تین دن کے بعد عذاب آئے گا: ﴿فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوَّاهَا﴾: پس اللہ نے ان پر ان کے گناہ کی وجہ سے عذاب ڈالا، پھر سب کو ملیا میٹ کر دیا، ان میں سے ایک بھی نہیں بچا ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا﴾: اور اللہ کو اس واقعہ کے انجام کا کوئی ڈر نہیں، اگر سارے ہلاک ہو جائیں تو ہوتے رہیں، اللہ کے یہاں کیا کمی آئے گی؟

قرآن پچھلی کتابوں کی اصلاح کرتا ہے

قرآن کریم پچھلی کتابوں میں جو گڑبڑ ہوئی ہے اس کی بھی اصلاح جگہ جگہ کرتا ہے، جیسے بائبل میں لکھا ہے: جب حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا اور کشتی والوں کے علاوہ سب غرقاب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ جائزہ لینے کے لئے زمین پر اترے کہ میں نے جو عذاب بھیجا تھا اس کا انجام کیا ہوا؟ گویا اللہ کو کچھ پتا ہی نہیں! ساری زمین پر گھوم کر جب اللہ نے دیکھا کہ ساری زمین تباہ ہو گئی ہے، کوئی چیز نہیں بچی تو اللہ تعالیٰ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر بہت روئے اور یہ عہد کیا کہ آئندہ ایسا عذاب نہیں بھیجوں گا، العیاذ باللہ! اللہ تعالی کی شان میں کیا

باتیں لکھ رکھی ہیں، قرآن کریم اس کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا﴾: اللہ کو ان کے ہلاک ہونے کا کچھ ڈر نہیں، یہ مثال ہے اس سطح سے نیچے اپنے آپ کو گرانے کی، ثمود نیچے گرتے گرتے اتنے نیچے گر گئے کہ انہوں نے کسی چیز کی پرواہ نہیں کی، اپنی تباہی کی بھی پرواہ نہیں کی، جب آدمی گرتا ہے تو اسے اپنا نفع نقصان یاد نہیں رہتا۔

اور جب انسان اس سطح سے اپنے آپ کو اوپر اٹھاتا ہے تو کہاں تک پہنچتا ہے؟

عیاں در دیدہ می گنجد نہاں در سینہ می گنجد ❁ مگر مرد آفاقی در دو عالم نمی گنجد

محسوسات (نظر آنے والی چیزیں) آنکھ کی پتلی میں سما جاتی ہیں، آپ پہاڑ کے سامنے کھڑے ہوں، دوسرا آدمی آپ کی آنکھ میں سارا پہاڑ دیکھ لے گا، اور معنویات (عقل سے سمجھی جانے والی چیزیں) آدمی کے دل و دماغ میں سما جاتی ہیں، مگر وہ شخص جس نے اپنے آپ کو اونچا اٹھایا ہے وہ اتنا پھیل جاتا ہے کہ اس کی سمائی کے لئے دنیا و آخرت کی پہنائی ناکافی ہو جاتی ہے، کرّوبی بھی اس سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

خاص فرشتوں سے خاص انسان اور عام فرشتوں عام انسان افضل ہیں

فرشتوں میں خاص فرشتے بھی ہیں اور عام بھی، خاص فرشتے جیسے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل، حضرت عزرائیل علیہم السلام وغیرہ، بقیہ عام فرشتے ہیں، اسی طرح پر انسانوں میں خاص انسان بھی ہیں اور عام انسان بھی، جیسے انبیاء صحابہ اولیاء سب خاص انسان ہیں، بقیہ عام انسان ہیں، اور مسئلہ یہ ہے کہ خواص بشر خواص ملائکہ سے افضل ہیں، یعنی انبیاء افضل ہیں حضرت جبرئیل حضرت میکائیل علیہما السلام وغیرہ سے اور عام مؤمنین سے خواص ملائکہ افضل ہیں، حضرت جبرئیل حضرت میکائیل علیہما السلام وغیرہم عام انسانوں سے افضل ہیں اور عام فرشتوں سے عام مؤمنین افضل ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ انسان جب اپنے آپ کو اونچا اٹھاتا ہے تو اس کی سمائی کے لئے دونوں دنیا ناکافی ہو جاتی ہیں۔

جنت میں مؤمن عورتوں کا مقام

جیسے جنت میں دو قسم کی عورتیں ہونگی، ایک جنت کی مخصوص عورتیں جن کو ہم 'حور' کہتے ہیں اور ایک اس دنیا کی مؤمن عورتیں جو ایمان لاتی ہیں، زندگی بھر نیک اعمال کرتی ہیں، نفس

سے اور شیاطین سے مقابلہ کرتی ہیں، اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوتا ہے یہ جنتی عورتیں ہیں یہ جو دنیا کی مؤمن عورتیں جنت میں جائیں گی ان کا مقام و مرتبہ حوروں سے بڑھا ہوا ہوگا، ان عورتوں نے ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ اپنے آپ کو اٹھایا تو حوریں پیچھے رہ گئیں ان کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہ رہی، تو اگر آدمی اس سطح سے اپنے آپ کو اونچا اٹھائے تو جنت المعلی تک پہنچ سکتا ہے اور نیچے گرائے تو اسفل السافلین میں پہنچ جائے گا، یہی مضمون اللہ نے اس آیت میں سمجھایا ہے کہ آگ والے اور باغ والے برابر نہیں، ایک ترقی کرتا ہوا جنت المعلی تک پہنچے گا، دوسرا گرتا ہوا اسفل السافلین تک پہنچ جائے گا، یہ ایک مضمون مکمل ہوا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے دوسرا مضمون بیان کیا ہے اور وہی اصل سمجھانا ہے، اگلی آیت میں اللہ تعالی نے قرآن مجید کا ذکر کیا ہے، پہلے مضمون کے بعد فوراً قرآن کریم کا ذکر کیوں کیا؟ اس لئے کیا کہ اگر کوئی شخص اپنے آپ کو اس سطح سے اٹھانا چاہے جس سطح پر اللہ تعالی نے اس کو پیدا کیا ہے، یا اگلی زندگی میں کامیاب ہونا چاہے تو اسے قرآن کریم کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی، قرآن کریم کی رہنمائی کے بغیر وہ اپنے آپ کو اونچا نہیں اٹھا سکتا، ورنہ عیسائی بھی اپنے آپ کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہودی، سادھو سنت وغیرہ بھی بہت محنت کرتے ہیں، مگر وہ جتنا اونچا اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا ہی نیچے گرتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس قرآن کی رہنمائی نہیں اور قرآن کریم سے مراد اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتابیں ہیں، ہر کتاب اپنے زمانہ میں جب وہ صحیح حالت میں تھی اسی رہنمائی کے لئے آئی تھی، اب ان سب کتابوں کا دور گذر گیا اور وہ کتابیں اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہیں، آج صرف قرآن کریم اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اس لئے اس کی رہنمائی ضروری ہے اس کے علاوہ کسی اور کتاب کی رہنمائی کافی نہیں، یہ مضمون اللہ پاک اگلی آیت میں بیان فرما رہے ہیں مگر قرآن کریم کا یہ انداز ہے کہ جب وہ کوئی مضمون بیان کرتا ہے تو اس کے جلو میں بہت سے مضامین چلتے ہیں، فرمایا: ﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ﴾: اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے آسمان اور زمین کے درمیان جو ٹھوس اور سخت سے سخت مخلوق نظر آتی ہے وہ یہی پتھر اور پہاڑ ہیں، تشبیہ دیتے ہیں تو پتھر سے دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ دل پتھر ہو گیا! اللہ فرماتے ہیں: اگر ہم

اس قرآن کو ایسی سخت مخلوق پر نازل کرتے تو آپ دو باتیں دیکھتے: ﴿لَرَأَيْتَهٗ خَاشِعًا﴾: آپ دیکھتے کہ پہاڑ سہم گیا ہے، جب کوئی خوفناک چیز سامنے آتی ہے تو آدمی ڈر جاتا ہے، سہم جاتا ہے، اس کیفیت کا نام خشوع ہے ﴿مُتَصَدِّعًا مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾: اور آپ دیکھتے کہ پہاڑ اللہ کے ڈر سے پھٹ گئے ہیں، ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ﴾: اور ہم یہ عجیب مضامین بیان کرتے ہیں لوگوں کے فائدے کے لئے، اور اوپر جو مضمون بیان کیا گیا ہے یہ بھی عجیب مضمون ہے اور لوگوں کے فائدے کے لئے بیان کیا ہے ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾: تاکہ لوگ سوچیں اور غور کریں کہ اللہ نے کیا بیان کیا؟ اللہ نے یہ بیان کیا کہ قرآن کریم جو اتنا پر تاثیر کلام ہے کہ اگر پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ سہم جاتا اور اللہ کے ڈر سے پھٹ جاتا لیکن اگر انسان اس سے فائدہ اٹھانا نہ چاہے تو قرآن بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، انسان کا دل جب سختی پر آتا ہے تو پتھر بھی اس کے سامنے جھک مارتا ہے، اور جب انسان کا دل متوجہ ہو، وہ اللہ کی نصیحتوں کو قبول کرنا چاہے تو قرآن کی نصیحتیں کارگر ہوں گی اس کے بغیر کارگر نہیں ہوں گی قرآن کریم میں ایک اور جگہ یہی مضمون بیان کیا گیا ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ﴾: اگر ہم ایسا قرآن نازل کرتے جس سے پہاڑ چلنے لگتے، آیت پڑھ کر پھونک ماری اور پہاڑ ایک ملک سے دوسرے ملک چلا گیا یا غائب ہوگیا ﴿أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ﴾: یا زمین طے ہونے لگے، آیت پڑھی اور امریکہ سے انڈیا دو منٹ میں پہنچ گیا ﴿أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى﴾: یا قرآن کے ذریعے مردے بات کرنے لگیں، آیت پڑھ کر پھونک ماری مردہ زندہ ہوگیا، اگر ہم ایسا پر تاثیر قرآن نازل کرتے تو بھی یہ کفار نہ مانتے وہ قرآن کی تاثیر تسلیم کرنے کے بجائے کہہ دیتے کہ تم نے ہم پر جادو کر دیا ہے، حضرت رکانہ ہجرت سے پہلے جنگل میں جانور چرا رہے تھے، ادھر سے حضور ﷺ کا گزر ہوا، حضور ﷺ نے ان کو جنگل میں دین کی دعوت دی، انہوں نے کہا محمد! تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، میں تو ایک بات جانوں، میں ہوں پہلوان، آپ میرے ساتھ کشتی لڑیں اگر آپ نے مجھے پچھاڑ دیا تو میں آپ کی بات مان لونگا، حضور ﷺ نے فرمایا: چلو یہ بھی کرلو، کشتی ہوئی اور حضورؐ نے آنکھ جھپکتے رکانہ کو چت کر دیا، مٹی جھاڑتے ہوئے حضرت رکانہ کہنے لگے: یہ اتفاقاً ہوگیا ایک مرتبہ اور موقعہ دو،

دوسری مرتبہ کشتی ہوئی حضورؐ نے پھر چت کر دیا، حضرت رکانہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: محمد! تم نے مجھ پر جادو کر دیا، اور ایمان نہیں لائے، پھر ایک وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے سینہ کھولا، نور ہدایت دل میں اترا پھر وہ ہجرت کے بعد ایمان لائے اور مدینہ آئے، تو جس کو ماننا نہیں وہ ہزار بہانے تلاش کرلیتا ہے قرآن کریم جیسا کلام بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، لیکن اگر انسان کا دل متوجہ ہو اور وہ نصیحت قبول کرنا چاہے تو اب قرآن اس کے دل پر اثر ڈالے گا ورنہ اوپر سے بادل کی طرح گذر جائے گا، یہ مضمون اللہ تعالیٰ نے پہلے والے مضمون کے بعد جو ذکر کیا ہے اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ اگر تمہیں باغ والے بننا ہے، جنت والے بننا ہے آخرت میں کامیاب ہونا ہے تو اس دنیا میں تمہیں قرآن کریم کی رہنمائی کے مطابق زندگی گزارنی ہے، اگر اس کے مطابق زندگی گزاروگے تو کامیاب ہوؤگے اور اگر اس سے ہٹ کر زندگی گزاروگے تو آخرت میں باغ والے نہیں آگ والے بن جاؤگے۔

آج قرآن کریم کا سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے دنیا کی ہر زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، آپ ترقی یافتہ ملک کے پڑھے لکھے لوگ ہیں، اپنی زندگیوں میں سے ایک حصہ قرآن پڑھنے کے لئے نکالیں، قرآن کے الفاظ صحیح کریں، ناظرہ پڑھیں، تجوید سے پڑھیں، اس کے ترجمہ کو پڑھیں، اس کو سمجھیں، اس میں غور وفکر کریں مگر اپنی عقل کا گھوڑا نہ دوڑائیں، صحابہ کو قرآن سمجھنے کے لئے حضور ﷺ کی رہنمائی کی ضرورت تھی پس کیا ما وشما کو ضرورت نہیں؟ اگر عقل کا گھوڑا دوڑاؤگے تو یہ گھوڑا ٹھوکر کھائے گا اور ایسی ٹھوکر کھائے گا کہ منہ کی کھانی پڑے گی، صحابہ کے زمانہ سے جو تفسیریں چلی آرہی ہیں ان پر اعتماد کرو، ان کا مطالعہ کرو، ذہن بناؤ یہ دنیا کی زندگی آنکھ جھپکنے کے برابر ہے، آج ہے کل نہیں، چلتے چلتے موت آجاتی ہے، سمجھدار وہ ہے جو وقت پر اپنی زندگی سے فائدہ اٹھالے، وقت گزر جانے کے بعد، زندگی بیت جانے کے بعد کف افسوس ملنے سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ حضرات کو بھی توفیق عنایت فرمائیں کہ ہم اپنی زندگیوں کی قدر کریں، قرآن کی ہدایت کے مطابق زندگیاں گزاریں اور دنیا میں رہتے ہوئے ہمیں آخرت کا ہوش آجائے آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.

۱۳

نبوت سے انسان کو کیوں سرفراز کیا گیا؟

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِيْ إِلَيْهِمْ فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

بزرگو اور بھائیو! یہ قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے جو سورۂ نحل میں آئی ہیں، اس آیت میں اللہ عزوجل نے مشرکین کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے جب دعوئ نبوت کیا تو مشرکین نے کہا: آپؐ ہمارے جیسے ایک انسان ہیں، آپؐ میں کیا سُرخاب کا پر لگ رہا ہے جو اللہ نے آپؐ کو نبوت سے سرفراز کیا؟ اللہ کے یہاں فرشتوں کی کمی نہیں اگر اللہ کو رسول بھیجنا تھا تو کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے، آپ کو ہی رسول بنا کر کیوں بھیجا؟

یہ مشرکین کا ایک اعتراض تھا، قرآنِ کریم میں جگہ جگہ مختلف انداز سے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے تا کہ انسان کو رسالت کے ساتھ سرفراز کرنے کی وجہ مشرکین کے سمجھ میں آئے، ان آیات میں بھی مشرکین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے اور قرآنِ کریم کا یہ انداز ہے کہ اصل مسئلہ کے ساتھ ضمناً اور بھی مسائل بیان کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِيْ إِلَيْهِمْ﴾: اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے مگر مردوں کو جن کی طرف ہم وحی بھیجتے ہیں، یعنی جب سے نبوت و رسالت کا سلسلہ شروع ہوا ہے ہمیشہ انسان ہی رسول بن کر آئے ہیں، اور مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں، نہ کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر آیا اور نہ کبھی کوئی عورت رسول بن کر آئی۔

عورتوں کو بھاری ذمہ داری سے سبکدوش رکھا گیا ہے

کبھی کوئی عورت رسول بن کر نہیں آئی یہ بات ضمناً آئی ہے۔ اور عورتوں کو رسالت سے

سرفراز اس لئے نہیں کیا گیا کہ ان میں نبوت کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت نہیں، عورت صنف نازک ہے، ناتواں اور کمزور ہے اور نبوت و رسالت کی ذمہ داری بھاری ذمہ داری ہے، اس لئے اللہ نے ان پر کرم فرمایا اور ان کے ناتواں کندھوں پر یہ بھاری ذمہ داری نہیں رکھی، جیسے جہاد عورتوں پر فرض نہیں، کیونکہ جہاد پتہ مار کام ہے، جب میدانِ کارزار گرم ہوتا ہے تو بڑے بڑے سورماؤں کے پتّے پانی ہوتے ہیں، اور کلیجہ منہ کو آتا ہے، غرض جہاد بڑا صبر آزما اور مشکل کام ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر جہاد فرض نہیں کیا۔

اسی طرح رسالت کا کام بھی بڑا سخت کام ہے، آپ آنحضور ﷺ کی مکی زندگی پڑھیں کن احوال سے آپؐ کو گذرنا پڑا ہے، مدنی دور کی آٹھ سالہ تاریخ فتح مکہ تک کی پڑھیں کوئی رات آپؐ نے چین اور سکون سے نہیں گذاری، اتنا بھاری اور سخت کام عورتوں کے بس کا نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں، حضرت نوح علیہ السلام کی تاریخ پڑھیں جو احوال ان حضرات پر گذرے ہیں کیا عورت ان کا تحمل کر سکتی ہے؟ اللہ نے ان پر بڑا کرم فرمایا، ان کی کمزوری کو ملحوظ رکھ کر ان پر نہ جہاد فرض کیا نہ نبوت کی ذمہ داری ان کو اوڑھائی۔

اہل الذکر سے یہود و نصاریٰ اور مسلمان علماء مراد ہیں

بہر حال یہ مسئلہ ضمناً آیا ہے کہ عورتوں کو نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا، ہمیشہ مردوں ہی کو رسول بنایا گیا، کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا، یہ مشرکین کے اعتراض کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾: اگر یہ بات کہ ہمیشہ مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں تمہیں معلوم نہ ہو تو اہل الذکر یعنی یہود و نصاریٰ کے علماء سے پوچھو، جزیرۃ العرب میں یہودی بڑی تعداد میں آباد تھے، مدینہ منورہ پورا یہودیوں سے بھرا پڑا تھا، اور نصاریٰ بھی آباد تھے خود مکہ معظّمہ میں عیسائی تھے، ورقہ بن نوفل جن کے پاس حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آنحضور ﷺ کو لے گئی تھیں وہ عیسائی تھے، اور انجیل کا عربی میں ترجمہ کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہود و نصاریٰ اہل کتاب

ہیں، ان کے پاس توریت وانجیل کا علم ہے، وہ ان کو پڑھتے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں اگر تم یہ بات کہ ہمیشہ مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں نہیں جانتے تو اہل کتاب یہود ونصاری سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ ہمیشہ مرد ہی رسول بن کر آئے ہیں، کبھی کوئی فرشتہ رسول بن کر نہیں آیا۔

اس آیتِ پاک میں اللہ عزوجل نے یہود ونصاری کو 'اہل کتاب' نہیں کہا، 'اہل الذکر' کہا قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ میں بڑے بڑے مسائل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ 'اہل الکتاب' فرماتے تو آیت یہود ونصاری کے ساتھ خاص ہوجاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل الذکر عام لفظ استعمال کیا ہے، پس توریت والے بھی، انجیل والے بھی، زبور والے بھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں والے بھی، حضرت نوح علیہ السلام کے صحیفوں والے بھی، حتی کہ قرآنِ کریم کے جاننے والے بھی سب اس آیت کا مصداق ہیں، کیونکہ قرآنِ کریم بھی 'الذکر' ہے اور اللہ کی تمام کتابیں جو آسمان سے نازل ہوئی ہیں 'الذکر' ہیں، اس لئے سب آسمانی کتابوں کے جاننے والے آیتِ کریمہ کا مصداق ہیں۔

قرآن وحدیث اوران سے مستنبط ہونے والے مسائل کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے لی ہے

اور سورۂ حجر میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾: ہم نے الذکر یعنی قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے القرآن کے بجائے الذکر فرمایا جو عام ہے، اگر اللہ تعالیٰ إنا نحن نزلنا القرآن: فرماتے تو آیت خاص ہوجاتی، مگر اللہ نے عام لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ علماء فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے۔ احادیث شریفہ کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے، اور قرآن وحدیث سے جو دین مستنبط ہوتا ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے، بلکہ قرآن وحدیث اور فقہ پر عمل کرنے والی جماعت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ نے لی ہے، یہ سب الذکر میں درجہ بدرجہ داخل ہیں۔

ایک جماعت جو ہمیشہ حق پر قائم رہے گی

پہلا درجہ قرآنِ کریم کا ہے، اس کے حرف حرف کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے، پھر احادیث شریفہ کا درجہ ہے، لوگوں نے صحیح حدیثوں کے ساتھ غلط حدیثیں ملائیں تو اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال کار اور علماء ومحدثین پیدا کیے جنھوں نے چھان پھٹک کر گیہوں الگ کردیئے اور کنکر الگ کردیئے، صحیح حدیثوں کو الگ کردیا اور گھڑی ہوئی حدیثوں کو الگ کردیا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حدیثوں کی حفاظت فرمائی، اسی طرح قرآن وحدیث سے مستنبط ہونے والے فقہی مسائل کو بھی علماء نے نکھارا، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لاتزال طائفة من أمتي ظاهرين على الحق لايضرهم من خذلهم**: میری امت کا ایک گروہ قیامت تک صحیح دین پر قائم رہے گا، اللہ اس کی حفاظت فرمائیں گے۔ قیامت تک کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا کہ اہل حق ختم ہوجائیں، تمام مسلمان گمراہ ہوجائیں، کوئی بھی حق پر باقی نہ رہے، ایسا وقت قیامت تک نہیں آئے گا، اللہ تعالیٰ اہل حق کی حفاظت فرمائیں گے، اور صحیح دین پر عمل کرنے والے ہمیشہ موجود رہیں گے، خواہ وہ مٹھی بھر کیوں نہ ہوں، کسی کی مخالفت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی، وہ حق پر ثابت قدم رہیں گے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے الذکر کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ اور الذکر: القرآن سے عام ہے، اس میں قرآن، حدیث، فقہ اور ان پر عمل کرنے والی امت سب داخل ہیں، لہٰذا قرآن کے محافظ بھی اللہ ہیں، حدیثوں کے محافظ بھی اللہ ہیں، فقہ کے محافظ بھی اللہ ہیں، اور ان پر عمل کرنے والی جماعت کے محافظ بھی اللہ ہیں، اور یہ سب آیتِ کریمہ کا درجہ بدرجہ مصداق ہیں، اور آیتِ کریمہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا میں سبھی مسلمان ہمیشہ حق پر رہیں گے، کوئی گمراہ نہیں ہوگا، بلکہ اہل حق بھی رہیں گے اور اہل باطل بھی، اور اہل حق دلائل سے غالب رہیں گے، ان کو کوئی زیر نہیں کرسکے گا۔

دینی مسائل جاننا اور نہ جانتے ہوں تو پوچھنا فرض ہے

اور اس آیتِ کریمہ سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اگر کوئی دین کی کوئی بات نہیں جانتا تو علماء کرام

سے پوچھنا فرض ہے، بعض لوگ مسئلہ جانتے نہیں اور کسی عالم سے پوچھتے بھی نہیں، اس لئے عمل بھی نہیں کرتے، وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہیں کہ قیامت میں اللہ سے کہہ دیں گے کہ پروردگار! ہمیں پتا نہیں تھا، اس لئے ہم نے عمل نہیں کیا، یہ عذر چلنے والا نہیں، دنیوی ضرورت کی چیزیں سب جانتے ہیں اور جاننے کے لئے محنتیں کرتے ہیں، پھر علماء سے پوچھ کر دین پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ اس لئے یہ عذر چلنے والا نہیں۔ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ دین کا علم رکھنے والے علماء سے ضروری باتیں دریافت کرے، لوگ ان سے مسائل سیکھیں، پھر ان پر عمل کریں۔

دین سکھانا علماء پر فرض ہے

اور علماء کا بھی فریضہ ہے کہ محنت کریں، لوگوں کو دین پہنچائیں۔ انہیں مسائل بتلائیں۔ نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: بلّغوا عنی ولو آیۃ: اس حدیث میں علماء پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اگر انہیں ایک بھی حکم شرعی معلوم ہے تو اسے دوسروں تک پہنچائیں، پس ذمہ داری دو طرفہ ہے، ایسا نہیں کہ علماء پر کوئی ذمہ داری نہیں، ساری ذمہ داری لوگوں کی ہے کہ پوچھیں، بلکہ علماء کی بھی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو دین پہنچائیں، انہیں اللہ ورسول کی مرضیات سے واقف کریں اور لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اپنی ضرورت کی باتیں علماء سے پوچھیں، ظاہر ہے میں تقریر میں وہی باتیں بیان کروں گا جو میرے خیال میں آپ لوگوں کے لئے ضروری ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کی ایسی ضروریات ہوں جو میرے ذہن میں نہ آئیں اور میں ان کو بیان نہ کروں، تو ان کو اپنی ضرورتیں کیسے معلوم ہونگی؟ اس کا صرف ایک راستہ ہے کہ پوچھیں، جب دونوں اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کریں گے تو ہر شخص کو دین سے واقفیت ہوگی اور دین پھیلے گا۔

سوال پانچ مقاصد سے کیا جاتا ہے

میرے بھائیو! لوگ پوچھتے ہیں اور خوب پوچھتے ہیں، مگر پانچ مقاصد سے پوچھتے ہیں، ان میں سے چار مقاصد غلط ہیں اور ایک مقصد صحیح ہے، وہ ایک مقصد جو صحیح ہے اگر اس مقصد

سے پوچھا جائے تو سوال کرنا بھی مفید ہے اور جواب دینا بھی مفید ہے، باقی چار مقاصد سے پوچھا جائے تو پوچھنا بھی بیکار ہے اور میرا بیان کرنا بھی لاحاصل ہے۔

۱- مبلغ علم جاننے کے لئے سوال کرنا

بعض لوگ مبلغ علم جاننے کے لئے سوال کرتے ہیں، وہ جاننا چاہتے ہیں کہ مولانا صاحب کتنے پانی میں ہیں، ان لوگوں کے پاس دو چار سوال ہوتے ہیں جو بھی نیا مولوی آتا ہے اس سے وہی سوال کرتے ہیں، ان کا مقصد دین جاننا نہیں، وہ اس کو پہلے سے جانتے ہیں بلکہ عالم صاحب کا امتحان کرنا مقصود ہے۔ ہندوستان میں دیہاتوں میں بعض بوڑھے بالکل ان پڑھ ہوتے ہیں، لیکن بزرگوں کے صحبت یافتہ ہوتے ہیں، انہیں مسائل کی جانکاری ہوتی ہے، اس لئے گاؤں میں جو بھی مولوی آتا ہے، اس سے وہی مسائل پوچھتے ہیں اس مقصد سے سوال وجواب بیکار اور لاحاصل ہیں۔

۲- ذہنی عیاشی کے لئے سوال کرنا

سوال کرنے کا دوسرا مقصد ذہنی عیاشی ہے یعنی ایسا سوال کرنا جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کنویں پر بلانے کے لئے جو لڑکی آئی تھی، وہ چھوٹی تھی یا بڑی؟ یہ بیکار سوال ہے، چھوٹی تھی تو کیا؟ بڑی تھی تو کیا؟ اصحاب کہف جو کتا ساتھ لے گئے تھے وہ کالا تھا یا بھورا؟ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جس چیونٹی سے بات کی تھی وہ مذکر تھی یا مؤنث؟ یہ بیکار سوالات ہیں، بعض لوگ ایسے ہی سوال کرتے ہیں، ان کا مقصد محض ذہنی عیاشی ہوتا ہے۔ ایسے فضول سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔

۳- گنجائش تلاش کرنے کے لئے سوال کرنا

اور بعض لوگوں کا مقصد سوال سے گنجائش تلاش کرنا ہوتا ہے، مسئلہ پوچھتے ہیں، خواہش کے مطابق جواب ملا تو ٹھیک ہے، ورنہ دوسرے مفتی سے پوچھیں گے، شاید کوئی گنجائش والی بات بتادے۔ میرے بھائیو! یہ دین پر عمل نہیں، خواہش پر عمل ہے۔

بات سمجھ میں نہ آئے تو دوبارہ پوچھے

ایک صاحب نے مجھ سے فون پر پوچھا کہ ایک شخص ایک مسئلہ کسی عالم سے یا مفتی سے پوچھ چکا ہے، اب وہ اس مسئلہ کو دوسرے مفتی یا عالم سے پوچھ سکتا ہے؟ میں نے کہا: دوسرے مفتی سے کیوں پوچھنا چاہتا ہے؟ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، میں نے کہا: اس کی دو صورتیں ہیں: ایک: پہلے مفتی نے یا عالم نے جو مسئلہ بتایا ہے اس میں کچھ تردد ہے، کیونکہ اس نے اس کے خلاف پڑھا ہے یا سنا ہے تو اس کو مفتی صاحب کی بات پر فوراً عمل نہیں کرنا چاہئے، بلکہ مزید تحقیق کرنی چاہئے۔ اور بہتر یہ ہے کہ پہلے ہی مفتی سے دوبارہ مسئلہ پوچھے اور جو اشکال ہو ان کے سامنے رکھے کہ میں نے فلاں کتاب میں یا فلاں حدیث میں اس طرح پڑھا ہے۔ اور اگر مفتی صاحب مسافر تھے اور چلے گئے تو دوسرے مفتی سے پوچھے اور اس کے سامنے دونوں باتیں رکھے کہ فلاں صاحب سے میں نے یہ مسئلہ پوچھا تھا انھوں نے یہ جواب دیا مگر میں نے فلاں کتاب میں یہ پڑھا ہے، پھر مفتی صاحب تحقیق کے بعد جو مسئلہ بتائیں اس پر عمل کرے۔

مسائل کی تحقیق کرنا اللہ کے نیک بندوں کی صفت ہے

سورۃ الفرقان میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا﴾: اللہ کے پیارے بندوں کی ایک صفت یہ ہے جب ان کو اللہ کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر اندھے بہرے ہوکر نہیں گرتے، بلکہ جو دینی مسائل ان کو بتائے جاتے ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، سمجھنے کے بعد مطمئن ہوکر ان پر عمل کرتے ہیں، پس اگر پوچھے ہوئے مسئلہ میں کوئی الجھن یا شک ہو تو اسے ضرور دوبارہ پوچھنا چاہئے۔

اور کبھی گنجائش تلاش کرنے کے لئے دوسرے مفتی سے مسئلہ پوچھتا ہے، پہلے مفتی نے ناجائز کہا ہے اس لئے دوسرے سے پوچھتا ہے کہ شاید وہ جائز کہہ دے اور کام بن جائے، اس نیت سے دوسرے سے پوچھنے کی اجازت نہیں۔

جب میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے فون رکھ دیا، میں یہ واقعہ سنا کر آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے ایک مرتبہ مسئلہ پوچھ لیا ہے پھر کسی وجہ سے مفتی صاحب کے بتائے ہوئے مسئلہ میں آپ کو کچھ تردد ہے تو ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ تحقیق کرو، آپ کو شریعت مطہرہ نے یہ حق دیا ہے، بلکہ اللہ کے محبوب بندوں کی یہ ایک خوبی ہے مگر چور دروازہ تلاش کرنا، گنجائش کی راہیں ڈھونڈھنا مؤمن کامل کا مزاج نہیں ہونا چاہئے، اللہ کے نیک بندوں کا مزاج تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ اللہ کا جو بھی حکم ہو اس پر عمل کرے، اور نفسانی خواہشات کے پیچھے نہ پڑے۔

۴- دوسروں کی خاطر مسئلہ پوچھنا

اور بعض لوگ اس لئے مسئلہ پوچھتے ہیں کہ دوسروں کو مسئلہ معلوم ہوجائے یعنی انہیں مسئلہ نہیں جاننا، وہ تو پہلے سے جانتے ہیں۔ میرے بھائیو! اس مقصد سے پوچھنا برا نہیں، مگر اچھا بھی نہیں، تم نے دوسروں کی ذمہ داری کیوں لی؟ ہر شخص کو اپنے فائدہ کے لئے پوچھنا چاہئے، دوسروں کے فائدے کے لئے پوچھنا کوئی اچھا مقصد نہیں، صحابہ کرام آنحضور ﷺ سے سوال کرتے تھے تو ہر صحابی اپنی ذات کو پیش نظر رکھ کر سوال کرتا تھا، پھر حضور اکرم ﷺ جو جواب دیتے تھے اس کا فائدہ سب کو پہنچتا تھا، لیکن پوچھنے والے کے پیش نظر یہ نہیں ہوتا تھا کہ حضور ﷺ جواب دیں اس کا فائدہ دوسروں کو پہنچے، اس مقصد کے لئے کبھی کسی صحابی نے سوال نہیں کیا، لیکن اگر کوئی کرے تو میں اس کو برا نہیں کہتا، اس لئے میں نے کہا کہ اس مقصد سے سوال کرنا نہ اچھا ہے نہ برا۔ غرض ان چار مقاصد سے سوال کرنا ٹھیک نہیں۔

۵- دین سیکھنے کے لئے سوال کرنا

اور ایک پانچواں مقصد ہے جو اس آیت کریمہ میں ہے: ﴿فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾: علم رکھنے والوں سے پوچھو، اگر تمہیں معلوم نہ ہو، پوچھ کر دین سیکھو اس پر عمل کرو، دین جاننے کی نیت سے اور عمل کی نیت سے پوچھنا بہترین مقصد ہے، اس آیتِ کریمہ میں اسی کا تذکرہ ہے (اس کے بعد سوالات کے پرچوں کے جوابات دیئے ہیں جو دوسری جگہ لئے جائیں گے)

۱۴

کامیابی ہدایت کی پیروی میں مضمر ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيَاةً طَيِّبَةً، وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

معزز خواتین! اللہ جل شانہ نے قرآنِ پاک کی اس آیت میں جو میں نے خطبہ میں پڑھی ہے، ایک ایسا مضمون بیان فرمایا ہے جو ہم سب کے لئے مردوں کے لئے بھی اور عورتوں کے لئے بھی بڑا قیمتی اور ضروری ہے، اس لئے خوب دھیان سے اس مضمون کو سمجھنا چاہئے، اور اللہ پاک نے جو ہدایت دی ہے اس کے مطابق اپنی زندگی بنانی چاہئے، اسی میں ہماری پریشانی کا حل ہے۔

آج دنیا میں ہر شخص پریشان ہے، الجھنوں اور افکار میں گھرا ہوا ہے، ایسے بندے بہت کم ہیں جو سکون واطمینان کا سانس لے رہے ہوں، جو مطمئن ہوں، خوش ہوں، شاداں وفرحاں ہوں ایسے بندے بہت کم ہیں، زیادہ تر لوگ پریشان ہیں اور سکون وراحت کے متلاشی ہیں، اس آیتِ کریمہ میں پریشانی کا حل بیان کیا گیا ہے، انسان کو ستھری، پاکیزہ اور امن واطمینان والی زندگی کس طرح میسر آسکتی ہے؟ کیا طریقۂ زندگی اختیار کیا جائے جس سے سکون والی زندگی نصیب ہو؟ اس لئے اس مضمون کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔

رنج وراحت ساتھ ساتھ

اللہ جل شانہ نے اس دنیا میں رنج وراحت ساتھ ساتھ پیدا کئے ہیں۔ اور آگے مرنے کے بعد جو زندگی آرہی ہے، آخرت کی زندگی، وہاں دونوں الگ الگ کردیئے جائیں گے، امن واطمینان کی جگہ جنت ہے اور رنج وغم، تکلیفوں اور مصیبتوں کی جگہ جہنم ہے، جنت میں

کوئی پریشانی نہیں، اور جہنم میں کوئی آرام نہیں، آخرت میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ کردی جائیں گی مگر اس دنیا میں یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں۔

اس کو ایک مثال سے سمجھیں: جب کھیت میں اناج بوتے ہیں تو شروع سے آخر تک غلہ اور گھاس رلے ملے رہتے ہیں، مثلاً گیہوں بویا تو شروع میں جو پودے نکلتے ہیں وہ محض گھاس ہوتے ہیں، وہ انسان کے کھانے کی چیز نہیں، پھر ایک خاص مقدار تک بڑھ جانے کے بعد ان پودوں پر بالیاں نکلتی ہیں، یہ بھی گھاس ہے، یہ بالیاں بھی انسان کے کھانے کی چیز نہیں، پھر ان بالیوں میں دانے پیدا ہوتے ہیں، یہ انسان کے کام کی چیز ہے، مگر ابھی وہ چارے کے ساتھ رلے ملے ہیں، پھر ایک وقت کے بعد گیہوں پک جاتا ہے پھر اس کو کاٹ لیا جاتا ہے، پھر کچھ دن یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے، گیہوں سوکھتے ہیں، پھر اسے گاہا جاتا ہے، پھر برسایا جاتا ہے تو دانہ ایک طرف ہوجاتا ہے اور بھوس الگ ہوجاتا ہے، اسی طرح اس دنیا میں اچھی بندیاں اور کافر عورتیں رلی ملی ہیں، مگر مقصود کائنات مؤمن عورتیں ہیں، قیامت کے دن ان کو الگ کرلیا جائے اور بھوس کو جدا کرلیا جائے گا﴿امْتَازُوْا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾: اے بدکارو! آج مؤمنین سے الگ ہوجاؤ، پھر مؤمن عورتیں جنت میں جائیں گی اور دوسری عورتیں جہنم رسید ہونگی۔

غرض: اس دنیا میں خیر وشر، رنج وراحت ایمان وکفر اچھے برے اعمال رلے ملے ہیں، پھر مرنے کے بعد سیدھا آخرت میں نہیں جانا درمیان میں عالم برزخ اور عالم قبر ہے، پہلے انسان وہاں جاتا ہے، اور وہاں انسان کو اس قابل بنایا جاتا ہے کہ آخرت میں منتقل کیا جاسکے، اور وہاں کے رنج وراحت اور خوشی غمی کو سہار سکے، پھر جب آدمی آخرت میں منتقل ہوگا تو کفر الگ کردیا جائے گا اور ایمان الگ، مؤمنین کو الگ کردیا جائے گا اور مشرکین کو الگ، اور میدانِ محشر میں اعلان ہوگا: ﴿وَامْتَازُوْا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ﴾: اے برے لوگو! ایک طرف ہوجاؤ، صالحین سے علاحدہ ہوجاؤ، قیامت کے دن سب چیزیں ایک دوسرے سے جدا ہوجاتی ہیں، اور راحتوں کی جگہ جنت ہے اور رنج کی جگہ جہنم، مگر اس دنیا میں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں، یہ دنیا راحتوں کی جگہ بھی ہے اور رنج کی جگہ بھی۔ جب دونوں چیزیں

ساتھ ساتھ ہیں تو راحت کی زندگی حاصل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو اللہ نے مقرر کیا ہے، اگر اللہ کا مقرر کیا ہوا طریقہ نہیں اپنائے گا تو مشقت کی زندگی گذارنی ہوگی، رنج وغم، الجھنیں اور پریشانیاں اس کے حصہ میں آئیں گی۔

جو ہدایت کی اتباع کرے گا وہ گمراہ اور پریشان نہیں ہوگا

قرآنِ کریم میں سولھویں پارے کے آخر سے دوسرے رکوع میں حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء رضی اللہ عنہا کو اسی زمین پر پیدا کیا گیا، پھر دونوں کو جنت میں بسایا گیا، اور دونوں سے کہا گیا: جہاں چاہو جنت میں رہو، جو چاہو کھاؤ، اور مزے کرو، یہاں کوئی پریشانی نہیں، نہ بھوک ہے نہ پیاس، نہ سردی ہے نہ گرمی، نہ الجھن ہے نہ فکر، نہ غم ہے نہ رنج، راحتیں ہی راحتیں ہیں۔ البتہ یہ ایک درخت ہے اس کے قریب مت جانا، ورنہ جنت میں نہیں رہ سکو گے، جنت سے نکلنا پڑے گا، دنیا میں جانا پڑے گا اور وہاں کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر ایک وقت کے بعد دونوں نے شیطان کے بہکانے سے وہ شجر ممنوع کھالیا۔

بعض لوگ پوچھتے ہیں: وہ درخت کونسا تھا، جس کے کھانے کی ممانعت تھی؟ جواب یہ ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کونسا درخت تھا، اس لئے کہ قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں کہ وہ کونسا درخت تھا۔ احادیث میں بھی وضاحت نہیں، اور قرآن وحدیث ہی سے ہم کوئی یقینی بات کہہ سکتے ہیں ان کے علاوہ یقینی بات جاننے کی کوئی صورت نہیں، اس لئے کہ یہ اس دنیا کی بات نہیں ہے، آخرت کی بات ہے، اور دوسری دنیا کی تفصیلات انسان اپنی عقل سے نہیں جان سکتا، قرآن وحدیث میں جتنی باتیں بیان کی گئی ہیں بس اتنی ہی باتیں ہم جان سکتے ہیں۔

اور لوگوں میں جو مشہور ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا اس کی کوئی اصل نہیں، بلکہ قرآنِ کریم میں جو لفظ آیا ہے اس سے یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے، قرآن میں لفظ شجرۃ آیا ہے، اور شجرۃ کے معنی ہیں: درخت۔ اور گیہوں کا پودا ہوتا ہے درخت نہیں ہوتا، اس لئے گیہوں والی بات بے پر کی کسی نے اڑائی ہے، اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ زیتون کا درخت تھا،

جس کے کھانے سے اللہ نے روکا تھا۔ واللہ اعلم

جب وہ درخت حضرت آدم وحواء نے کھالیا تو اللہ کا حکم پہنچا کہ زمین پر اترو، وہاں جا کر بسو، اب جنت میں نہیں رہ سکتے، اور قیامت تک تمہاری نسل وہیں رہے گی، اور میں پیچھے سے اپنی ہدایت بھیجوں گا، جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ مشقت میں پڑے گا ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى﴾ گمراہ: اردو کا لفظ ہے اور یہ دو لفظ ہیں: گم اور راہ، راہ کے معنی ہیں: راستہ، پس گمراہ کے معنی ہیں: راستہ گم کرنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ گمراہ نہیں ہوگا، راستہ نہیں بھولے گا یعنی جنت تمہارا اصلی وطن ہے، دوبارہ تمہیں اور تمہاری ذریت کو یہیں آنا ہے، مگر اب ایک خاص راستہ پر چل کر یہاں آنا ہے، وہ ہدایت میں بھیجوں گا، میرے بتائے ہوئے راستہ پر جو چلے گا وہ اپنے اصل وطن میں آئے گا، گمراہ نہیں ہوگا راستہ نہیں بھولے گا، سیدھا جنت میں آئے گا، اور جتنے دن دنیا میں رہے گا، راحت وآرام سے رہے گا، مشقت وتکلیف سے دوچار نہیں ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾: اور جو میری ہدایت سے روگردانی کرے گا، میری ہدایت کی اتباع نہیں کرے گا اس کے لئے تنگ گذران ہوگا، یعنی وہ دنیا میں پریشان پریشان رہے گا ﴿وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى﴾ اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے، ظاہر ہے جب اندھا ہوگا تو جنت کی راہ کہاں سے پائے گا، ہدایت سے اعراض کرنے والے کو نہ جنت ملے گی اور نہ دنیا میں راحت وسکون کی زندگی حاصل ہوگی۔

ایمان کے ساتھ ہدایت کی پیروی ضروری ہے

میری بہنو! یہ جو میں نے مضمون بیان کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کا اتباع ضروری ہے، صرف مان لینا کافی نہیں، جیسے ہم ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لائیں اور مان لیں کہ یہ بخار کی بہترین دواء ہے، اور اس پر دلائل بھی قائم کردیں مگر دواء الماری میں

رکھ دیں تو چاہے وہ کتنی ہی مفید دواء ہو اس سے بخار نہیں اترے گا۔ بخار اس دوا کو پینے سے جائے گا، دوا پینے کے بعد ہی راحت ملے گی، اسی طرح محض ہدایت کو مان لینے سے فائدہ نہیں ہوگا، پورا فائدہ اس ہدایت کی اتباع اور پیروی سے ہوگا۔

بعض عورتیں اور کچھ مرد ایسا سوچتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں پھر پریشان کیوں ہیں؟ ایسا مرد زیادہ سوچتے ہیں، عورتیں کم سوچتی ہیں، کیونکہ عورتوں کے مزاج میں اللہ نے سادگی رکھی ہے، نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے: **علیکم بدین العجائز**: بوڑھی عورتوں کا دین مضبوط پکڑو، بوڑھی عورت زیادہ گہرائی میں نہیں اترتی، وہ موٹی موٹی باتیں جانتی ہے اور ان پر عمل کرتی ہے، وہ دین پر مضبوط جمی رہتی ہے، زیادہ کھود کرید نہیں کرتی۔ اِدھر اُدھر ذہن کو نہیں دوڑاتی، ہر بات میں سوال کرنا کہ ایسا کیوں ہے؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ پریشان کرنے والا مزاج ہے، اور یہ بات مردوں کو زیادہ پیش آتی ہے، عورتیں اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتیں، یہ اللہ کا عورتوں پر خاص فضل ہے، مگر بہرحال کچھ عورتیں اور بہت سے مرد ایسا سوچتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں پھر پریشان کیوں ہیں؟

ہدایت اپنا کر ہی راحت ملے گی

میں اسی کا جواب دے رہا ہوں کہ بیشک ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں یقین ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اور اس کے پاک حبیب ﷺ نے قرآن وحدیث میں زندگی گذارنے کا جو طریقہ بتایا ہے وہ نہایت شاندار طریقۂ زندگی ہے یہ ہمارا یقین اور عقیدہ ہے، لیکن میری بہنو! یہ طریقہ تو قرآن میں ہے اور قرآن ہماری الماری میں ہے، ہماری زندگیوں میں قرآن نہیں ہے، جب تک وہ قرآن ہماری زندگیوں میں نہ آئے ہمیں راحت وآرام نہیں مل سکتا ہم یہ مانتے تو ہیں کہ قرآنِ کریم میں جینے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ سب سے زیادہ پرسکون اور اطمینان والا طریقہ ہے، مگر اس کے مطابق ہم نے اپنی زندگی ڈھالی نہیں، اس لئے خوب اچھی طرح یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ نے جو زندگی گذارنے کا طریقہ بتایا ہے اگر انسان اس طریقہ کے مطابق زندگی گذارے گا تو ہی پریشانیوں

سے نجات ملے گی، ہر حال میں انسان خوش رہے گا، بیماری میں بھی خوش رہے گا، تندرستی میں بھی خوش رہے گا، مالداری میں بھی خوش رہے گا، غریبی میں بھی خوش رہے گا، اور یہ خوش حال زندگی اس وقت میسر آئے گی جب ہماری زندگی اسلام کے مطابق ہوگی۔

اللہ جل شانہ نے اس آیت پاک میں یہی مضمون بیان فرمایا ہے: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾: جو بھی نیک کام کرے، نیک کام کرنے والا خواہ مرد ہو یا عورت، درانحالیکہ وہ ایمان والا ہو، ایمان کے ساتھ اس نے نیک کام کیا ہو، تو ہم ضرور اسے پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اور دنیا کی زندگی میں انھوں نے جو بہترین کام کئے ہیں ہم آخرت میں ان کا بہترین بدلہ دیں گے، کوتاہیاں نیک صالح بندوں سے بھی ہوجاتی ہیں، مردوں سے بھی اور عورتوں سے بھی ان کوتاہیوں سے اللہ درگذر فرمائیں گے، ان کو معاف فرمادیں گے اور نیک کاموں کا بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بھی حال بیان کیا ہے اور آخرت کا بھی، ایمان والوں کو جو نیک کام کریں گے دنیا میں پاکیزہ زندگی ملے گی، صاف ستھری زندگی ملے گی، امن واطمینان والی زندگی ملے گی، مردوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، اور آخرت میں نیک کاموں کا بہترین بدلہ ملے گا، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں اطمینان والی زندگی ان مردوں اور عورتوں کے لئے ہے جن کے پاس ایمان کی دولت ہے اور جو ایمان کے ساتھ نیک کام کرتے ہیں۔

ایمان کیا ہے؟

ایمان مفصل یہ ہے: **آمنتُ باللہ، وملائکتہ، وکتبہ، ورسلہ، والیوم الآخر، والبعث بعد الموت، والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ**: ان سات باتوں کو دل سے ماننے کا نام ایمان ہے، ہر ایک کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- اللہ کو ماننا، یعنی یہ ماننا کہ اس جہاں کو پیدا کرنے والا ایک خدا ہے، تنہا اسی ایک ذات نے کائنات کا یہ پورا نظام پیدا کیا ہے، یہ دنیا خود بخود پیدا نہیں ہوئی، دنیا میں بہت سے لوگ ہیں اور آپ کے امریکہ میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دنیا خود بخود پیدا

ہوگئی ہے، اور خود بخود چل رہی ہے، نہ اس کا پیدا کرنے والا کوئی ہے اور نہ چلانے والا۔ ڈارون جو برطانیہ کا ایک فلسفی ہے کہتا ہے کہ انسان پہلے بندر تھا، پھر انسان بن گیا، کافروں نے واہ واہ کی کہ کتنی شاندار بات کہی، حالانکہ اس نے مہمل اور بے عقلی کی بات کہی، کیونکہ بندر تو آج بھی دنیا میں ہیں، وہ انسان کیوں نہیں بن رہے؟ دراصل یہ بات اس لئے کہنی پڑی ہے کہ اللہ کو جو خالق و مالک اور سب کا پالنہار ہے اس کو نہ ماننا پڑے، اس نے سوچا نہیں کہ انسان بندر سے بنا تو بندر کہاں سے بنا؟ بات مٹی تک جائے گی تو اب سوال ہوگا کہ مٹی کس نے بنائی؟ پھر بات خالق و مالک پر جاکر رکے گی، پس پہلے ہی کیوں نہ مان لیا جائے کہ یہ کائنات اللہ نے پیدا کی ہے۔

غرض ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس کائنات کو اللہ نے بنایا ہے، یہ خود بخود نہیں بن گئی، اور ہمیں بھی اللہ نے پیدا کیا ہے، پھر پیدا کرنے کے بعد ہماری زندگی کا سامان کیا ہے، ہمیں جینے کا سلیقہ سکھلایا ہے، ہماری ضرورتیں پوری کی ہیں، پس ہم ہی پر نہیں تمام مخلوقات پر لازم ہے کہ صرف ایک اللہ کی پوجا کریں، اسی کی بندگی کریں، اللہ کے علاوہ کسی کی بھی عبادت نہ کریں، اللہ کے علاوہ کی عبادت کرنا اس کو پکارنا ہے اس سے مدد مانگنا ہے، اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اللہ وحدہ لاشریک لہ ہیں نہ ان کا کوئی شریک ہے، نہ ان کی کوئی ماں ہے نہ باپ، انہیں کسی نے نہیں جنا اور نہ انھوں نے کسی کو جنا ہے، وہ بے نیاز ہیں، ان کے برابر کوئی نہیں، وہ اکیلی ہستی ہیں، اس طرح اللہ کو ماننا ضروری ہے اور یہ سات چیزوں میں سے ایک چیز ہے، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

میری بہنو! غور کرو دنیا میں کچھ لوگ تو سرے سے اللہ کو نہیں مانتے اور کچھ لوگ اللہ کو مانتے ہیں مگر اس کے ساتھ اور بھی خدا مانتے ہیں، جیسے آپ کے اس ملک میں عیسائی اللہ کو مانتے ہیں مگر اللہ کے ساتھ دو اور خدا بھی مانتے ہیں وہ کہتے ہیں: تینوں مل کر ایک خدا ہیں، ہندوستان کے ہندو بھی اللہ کو مانتے ہیں، وہ اللہ کو پرمیشور، ایشور اور بھگوان کے نام سے پکارتے ہیں مگر ساتھ میں ہزاروں خدا اور بھی مانتے ہیں، اور مجوسی بھی دو خدا مانتے ہیں۔

میری بہنو! کسی کے ساتھ خدائی والا برتاؤ کرنا بھی اس کو خدا ماننا ہے، اور اس کو اللہ کا

شریک ٹھہرانا ہے، جیسے عیسائی اللہ کو مانتے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی خدا والا معاملہ کرتے ہیں، ان سے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں، ان کی عبادت کرتے ہیں، یہ ان کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، بعض مسلمان قبروں کا طواف کرتے ہیں، بزرگوں کی نذر و نیاز مانتے ہیں، قبروں پر چڑھاوا چڑھاتے ہیں، ان سے اپنی ضرورتیں مانگتے ہیں، یہ سب شرک ہے، اللہ کی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ بھی خدائی والا برتاؤ کرنا اس کو اللہ کا شریک ٹھہرانا ہے جو گناہ عظیم ہے۔

اللہ کے علاوہ کو سجدہ کرنا حرام ہے

ایک صحابی ہیں ان کا نام قیس بن سعد ہے وہ شام گئے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ اپنے مرزبان کو سجدہ کرتے ہیں، حضرت قیسؓ نے سوچا: اس مرزبان کی تو کوئی حیثیت نہیں، ہمارے حضور تو اللہ کے حبیب ہیں، خلاصۂ کائنات ہیں، سجدہ کے حقیقت میں وہی مستحق ہیں، جب یہ لوگ اپنے مرزبان کو سجدہ کرتے ہیں، اپنے بادشاہ کو سجدہ کرتے ہیں تو ہمیں بھی سید الاولین والآخرین کو سجدہ کرنا چاہئے، سب سے بڑے بادشاہ تو وہ ہیں۔ چنانچہ جب وہ مدینہ منورہ واپس آئے تو آنحضور ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے شام میں دیکھا وہ لوگ اپنے بادشاہ کو اور مرزبان کو سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ ان کی کچھ حقیقت نہیں، وہ معمولی انسان ہیں، اور آپؐ اللہ کے عظیم پیغمبر اور محبوب رب العالمین ہیں، حقیقت میں سجدہ کے مستحق آپؐ ہیں، آپؐ ہمیں حکم دیں کہ ہم آپؐ کو سجدہ کیا کریں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: بتاؤ جب میں دنیا میں نہیں رہونگا اور تم میری قبر سے گذروگے تو کیا میری قبر کو سجدہ کروگے؟ حضرت قیسؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! قبر کو ہم سجدہ نہیں کریں گے۔ صحابہ یہ بات جانتے تھے کہ قبر کو سجدہ کرنا قبر کی پوجا کرنا ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کی پوجا جائز نہیں، اس لئے حضرت قیسؓ نے کہا: یارسول اللہ! ہم آپ کی قبر کو سجدہ نہیں کریں گے، آنحضور ﷺ قبر اطہر میں زندہ ہیں، اگر آپؐ کی حیات میں آپؐ کو سجدہ جائز ہوتا تو قبر پر بھی آپؐ کو سجدہ جائز ہوتا، کیونکہ آپؐ قبر میں حیات ہیں، پھر جب آپؐ کی قبر پر سجدہ جائز نہیں تو دنیا میں بھی سجدہ جائز نہیں، اس لئے کہ دونوں زندگیاں آپ کے لئے یکساں ہیں، آپؐ دنیا میں بھی زندہ تھے اور قبر میں

بھی زندہ ہیں۔

تعظیم کی نیت سے بھی سجدہ کرنا جائز نہیں

پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ جائز ہوتا تو میں عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں، یعنی عورتوں پر شوہروں کا جو حق ہے وہ حق اتنا بڑا ہے کہ عورت اس کو ادا نہیں کرسکتی، وہ اپنے شوہر کی جتنی بھی تعظیم کرے کم ہے، اور عورتوں پر لازم ہے کہ وہ شرعی حدود میں رہ کر جتنی زیادہ سے زیادہ شوہر کی تعظیم کرسکتی ہوں کریں۔ اگر اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو عورت کو حکم ہوتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کرے، ظاہر ہے عورت جو اپنے شوہر کو سجدہ کرتی تو وہ عبادت کا سجدہ نہیں کرتی، بلکہ تعظیم کے لئے سجدہ کرتی، مگر نبی ﷺ نے اس کو بھی حرام کیا، معلوم ہوا کہ کسی کو تعظیمی سجدہ کرنا بھی جائز نہیں، یہ بھی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، اور گناہ کبیرہ ہے۔ اس لئے اللہ پر پختہ یقین رکھنا ہے، مزاروں، قبروں اور تعویذوں کے گورکھ دھندوں میں نہیں پڑنا، یہ کمزور ایمان کی علامت ہے، اپنے ایمان کو مضبوط کرنا ہے، تنہا ایک اللہ کو خالق و مالک اور پالنہار ماننا ہے، اسی کے سامنے رونا ہے، اسی سے مرادیں مانگنا ہے اور اسی کی عبادت کرنی ہے۔ اس کے علاوہ نہ کسی کی عبادت کرنی ہے، اور نہ کسی سے اپنی ضرورت مانگنی ہے، یہ ایمان کے لئے پہلی ضروری چیز ہے۔

۲- فرشتے نورانی مخلوق ہیں

فرشتوں کو بھی ماننا ضروری ہے، وہ اللہ کی ایک نورانی مخلوق ہیں، وہ نہ مرد ہیں نہ عورت، نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، اور نہ سوتے ہیں، ہمیشہ اللہ کا حکم بجالانے میں مصروف رہتے ہیں، کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، فرشتوں کو ماننا بھی ایمان کے لئے ضروری ہے۔

۳- تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے

اور تیسری چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے لوگوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے انبیاء کرام پر جو کتابیں نازل فرمائی ہیں ان سب پر ایمان لایا جائے، اگرچہ

عمل صرف قرآنِ کریم پر کرنا ہے، دوسری آسمانی کتابوں پر اب عمل جائز نہیں، کیونکہ قرآنِ مجید کے آجانے کے بعد وہ تمام کتابیں اور شریعتیں منسوخ ہوگئی ہیں، اس لئے اب صرف قرآنِ کریم پر عمل کرنا ضروری ہے، جیسے دنیا میں بہت حکومتیں ہیں اور سب کے اپنے قانون اور ضابطے ہیں، ہم ان کو مانتے ہیں مگر عمل اپنے ملک کے قانون پر کرتے ہیں۔ یہاں امریکہ کا جو قانون ہے اس پر آپ عمل کرتی ہیں، اور میں ہندوستان میں ہندوستان کے قانون پر عمل کرتا ہوں مگر ہم مانتے سب حکومتوں کو ہیں، اسی طرح اللہ کے یہاں سے جتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں سب کو ماننا ہے مگر عمل قرآن پر کرنا ہے، اس لئے کہ اب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا زمانہ چل رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں توریت پر عمل کرنا ضروری تھا، اس زمانہ کا وہی قانون تھا، پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو اب تورات پر عمل نہیں ہوگا، اب انجیل پر عمل ہوگا کیونکہ وہی اس زمانہ کا قانون ہے، پھر جب قرآن نازل ہوا تو اب انجیل پر بھی عمل نہیں ہوگا۔ اب قرآن پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ اسی کا زمانہ چل رہا ہے مگر سب آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، ایمان کے لئے یہ بھی شرط ہے۔

۴- تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام سے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک جتنے انبیاء آئے ہیں ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اللہ جل شانہ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے بے شمار انبیاء بھیجے ہیں، بعض روایتوں میں ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار آئی ہے۔ اور تین سو تیرہ رسول آئے ہیں اور ایک سو چار کتابیں نازل ہوئی ہیں۔ ان تمام انبیاء پر، رسولوں پر، اور کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی بھی ایک نبی، یا رسول یا کتاب کا انکار کفر ہے، مگر عمل اسی نبی کی شریعت پر ہوگا جس کا زمانہ چل رہا ہے، اور یہ سید الاولین والآخرین کا زمانہ ہے پس قرآن پر عمل ہوگا، دیگر آسمانی کتابوں پر عمل نہیں ہوگا، مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔

فرشتوں پر، گذشتہ کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

یہ چاروں چیزیں یعنی اللہ پر ایمان لانا، فرشتوں پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا

اورانبیاء پر ایمان لانا ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ چاروں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے جو ہمارے خالق ومالک ہیں یہ کائنات ہمارے فائدے کے لئے بنائی ہے، پھر اللہ نے ہمارے لئے فرشتوں کے ذریعہ ہدایت بھیجی ہے، اللہ کے یہاں سے جو کتابیں آئی ہیں وہ فرشتوں کے ذریعہ آئی ہیں۔ اگر ہم فرشتوں کا وجود تسلیم نہیں کریں گے تو وحی، نبی اور کتابوں کو کس طرح مانیں گے؟ وحی، آسمانی کتابیں اور انبیاء کو ماننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بیچ کی کڑی یعنی فرشتوں کو مانیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں کسی بندے سے براہ راست گفتگو نہیں کرتے، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طور پر ان سے براہ راست بات کی تھی، اسی طرح حضور اقدس ﷺ کی بھی خصوصیت ہے کہ معراج میں اللہ عزوجل نے ان سے براہ راست بات کی ہے۔ مگر عام طور پر اللہ تعالیٰ دنیا میں براہ راست کسی سے بات نہیں کرتے، فرشتے ہی اللہ کی وحی لے کر نبیوں کے پاس آتے ہیں اور فرشتے جو وحی لاتے ہیں انبیاء وہ وحی لوگوں کو پہنچاتے ہیں، اسی وحی کا نام آسمانی کتابیں ہیں۔

غرض: یہ چاروں ایک سلسلہ کی کڑی ہیں، ان چاروں میں سے اگر ایک کو بھی نہیں مانیں گے تو ایمان باقی نہیں رہے گا۔

۵-دنیا کا ایک آخری دن ہے

پانچویں چیز یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ چلتی نہیں رہے گی بلکہ اس دنیا کا ایک آخری دن آئے گا، جس پر پہنچ کر یہ دنیا ختم ہوجائے گی، پھر قیامت کے بعد دوسری دنیا میں منتقل ہونا ہوگا، یہ عقیدہ تو کافروں کا ہے کہ بس یہی دنیا سب کچھ ہے ﴿وَقَالُوْا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاةُ الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾: کافر کہتے ہیں: بس دنیا کی یہ زندگی ہی زندگی ہے، آگے کوئی دوسری زندگی نہیں، ہم کھاتے ہیں، پیتے ہیں، پلتے بڑھتے ہیں اور بوڑھے ہوکر مرجاتے ہیں، آگے قصہ ختم۔ اب دوسری کوئی زندگی نہیں، اور یہ دنیا یونہی چلتی رہے گی، اس کا آخر نہیں ہے، لوگ یونہی آتے جاتے رہیں گے، اور دنیا چلتی رہے گی، ان کا یہ عقیدہ باطل

ہے، جس طرح ہم پیدا ہوئے ہیں اور ایک دن ہمیں ختم ہوجانا ہے، اسی طرح یہ دنیا بھی نو پید ہے، ہمیشہ سے نہیں ہے، اور اس کو بھی ایک دن ختم ہوجانا ہے، اس آخری دن کو جس میں اس دنیا کی بساط الٹ دی جائے گی **الیوم الآخر** کہتے ہیں، اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۶-مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے

اور چھٹا عقیدہ جس پر ایمان لانا ضروری ہے یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک دن ہمیں پھر زندہ ہونا ہے، اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اور جزاؤ سزا پانا ہے۔ کافر کا عقیدہ یہ ہے کہ دوبارہ زندہ نہیں ہونا، مر کر مٹی میں گل سڑ کر جانا ہے، یا جل کر راکھ ہوجانا ہے، مگر ان کا یہ عقیدہ باطل ہے، اس دنیا میں ہر شخص امتحان کے لئے پیدا کیا گیا ہے، یہ دنیا اس لئے بنائی گئی ہے کہ انسانوں کی جانچ ہو، کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون برے عمل کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایک دن اس کا رزلٹ آئے گا، وہ فیصلہ الیوم الآخر میں ہوگا، جب اس دنیا کا آخری دن آئے گا تو اول سے آخر تک ہر مخلوق کو زندہ کیا جائے گا، اور انسان کے اچھے برے اعمال کا حساب ہوگا، پھر ان کو جنت وجہنم میں جو آخری ٹھکانہ ہے پہنچا دیا جائے گا اور اس دنیا کا معاملہ ختم کردیا جائے گا۔

۷-تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہے

اور آخری چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ اچھی بری تقدیر ہے، اللہ نے اس کائنات کو بنانے سے پہلے ایک پلاننگ کی ہے، اس پلاننگ کے مطابق یہ دنیا وجود میں آئی ہے، اور اس کا نظام چل رہا ہے، اس پلاننگ کو ماننا بھی ضروری ہے، اور یہی بھلی بری تقدیر پر ایمان لانا ہے، تقدیر کی بہت تفصیل ہے اور وہ میں نے بار بار سمجھائی ہے، وقت بہت ہوچکا ہے، اس لئے میں اس کو دوہرا نہیں رہا، یہیں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

ملحوظہ: تقدیر کیا ہے؟ اور بھلی بری تقدیر کا مطلب کیا ہے؟ یہ مضمون علمی خطبات حصہ اول (ص:۲۱۸) میں آچکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

۱۵

انسانوں کے اعمال مختلف ہیں اس لئے جزاء بھی مختلف ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد:﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى○ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ○وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى○ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى○ فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى○وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى○وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى○ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾

بزرگو اور بھائیو! زمانہ ربڑ کی مثال ہے کھینچو تو لمبا ہو جاتا ہے چھوڑ دو تو سمٹ جاتا ہے وقت بھی ایسا ہی ہے کھینچو تو ہزار سال یا پچاس ہزار سال، چھوڑ دو تو ایک دن، اور وقت ماضی میں تو سکڑا ہوا ہے اور مستقبل میں کھینچا ہوا ہے جیسے ہم میں سے جو نوجوان ہیں وہ ذرا سوچیں کہ ان کا بچپن کتنے دن میں بیت گیا اور جو ادھیڑ ہیں ان سے پوچھو: تمہارا بچپن اور جوانی کتنے دنوں میں گذری ہے؟ اسی نوے سال کے چچا سے پوچھو تو وہ بھی یہی کہے گا کہ بیٹا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل ہم گلی ڈنڈا کھیلتے تھے، اس کے برخلاف آدمی جب بچہ ہوتا ہے تو سوچتا ہے: ابھی تو ہم جوان ہونگے، ادھیڑ ہونگے، بوڑھے ہونگے، ٹانگیں گھسیٹیں گے تب مریں گے، جوان بھی آگے آنے والے وقت کو ایسا ہی سمجھتا ہے، بہر حال مستقبل میں ہمیں اپنی عمر بہت لمبی نظر آتی ہے اور ماضی میں سکڑی ہوئی، ایسا اس لئے ہے کہ وہ ربڑ (وقت) آگے (مستقبل میں) کھینچا ہوا ہے اور جوں جوں وقت آگے بڑھتا ہے ربڑ پیچھے سے سمٹتا چلا جاتا ہے۔

وقت کو اللہ تعالیٰ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، وہ دو حصے ہیں: دن اور رات، دن رات کوئی الگ الگ نہیں ہیں بلکہ وقت کے دو حصے ہیں اور جب وقت کے دو حصے کئے گئے تو دن وجود میں آیا دن وجود میں آیا تو مہینہ وجود میں آیا، مہینہ وجود میں آیا تو سال وجود میں آیا، اور وقت کی دو حصوں میں یہ تقسیم ہماری دنیا میں ہے، دوسری دنیا میں دن رات نہیں، کیونکہ وہاں چاند سورج نہیں، اسی لئے وہاں وقت کھینچا نہیں جائے گا اور یہاں وقت کو کھینچنے کے

لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے دو حصے کر دئے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى﴾: قسم ہے رات کی جب وہ چھا جاتی ہے، جب رات چھا جاتی ہے تو عشا کا وقت شروع ہوتا ہے اور رات آئی مگر چھائی نہیں تو مغرب کا وقت ہے، اور جب رات کے آخر میں دن کی روشنی رات کے ساتھ ملی تو رات ختم، صبح صادق شروع ہوگئی، تو اللہ نے رات کی قسم کھائی ہے جب وہ چھا جائے ﴿وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى﴾: اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب روشن ہو جائے، صبح صادق پر سورج کی روشنی زمین پر آ جاتی ہے لیکن اس وقت تک وہ واضح روشنی نہیں ہوتی، سورج نکل آیا اب بھی اس کی روشنی واضح نہیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گذرا اور سورج اوپر چڑھ گیا اب دن خوب روشن ہو گیا، اللہ تعالیٰ اسی کی قسم کھا رہے ہیں۔

دوسری مثال لو، انسان ایک نفس ہے اور یہ مضمون قرآن میں کئی جگہ آیا ہے، وہ آیت پاک جو نکاح کے خطبہ میں پڑھی جاتی ہے اس میں بھی یہ مضمون ہے: ﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾: اے لوگو! اس پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا ہے، اس نفس کو بھی اللہ تعالیٰ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: مرد اور عورت، اللہ نے تیسری قسم کھائی: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى﴾: اور اللہ نے جو نر اور مادہ پیدا کئے ہیں ان کی قسم، اب میرے بھائیو! تھوڑی دیر غور کرو! اللہ نے ایک نفس کو مرد و عورت میں تقسیم کر کے دو حصے بنائے اور دونوں میں کتنے ہی فرق رکھ دیئے، جو کام مردوں کا ہے وہ عورت نہیں کر سکتی اور جو عورت کا ہے وہ مرد نہیں کر سکتا حالانکہ ایک ہی نفس سے دونوں پیدا ہوئے ہیں، ایسے ہی وقت کے دو حصے دن رات بنائے، دن کا کام دن کرے گا، رات کا کام رات کرے گی۔ دن رات کا کام کیا ہے؟ ﴿وَمِنْ رَّحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ﴾: اللہ نے اپنی رحمت سے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو، ﴿وَجَعَلَ النَّهَارَ مُبْصِرَةً﴾: اور اللہ نے دن کو دکھلانے والا بنایا، دن میں کاروبار کرو اور روزی کماؤ، کمانا دن کا کام ہے اور آرام کرنا رات کا کام ہے، جو آرام رات میں ملتا ہے دن میں کتنا ہی سو لو وہ آرام نہیں مل سکتا اور جو کمائی آدمی دن میں نشاط کے ساتھ کرتا ہے وہ رات میں نہیں کر سکتا حالانکہ دونوں ہی وقت کے حصے ہیں ﴿إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى﴾: تمہارے یعنی انسانوں کے اعمال مختلف ہیں جیسے

وقت کے دو حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں، جیسے نفس کے دو حصے ایک دوسرے سے الگ ہیں ایسے ہی تمہارے اعمال بھی مختلف ہیں۔

آگے فرمایا کہ تین کام یہ ہیں اور تین کام ان کے مقابل ہیں دیکھو ان کے درمیان کتنے فرق ہیں؟ ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾: کچھ بندے وہ ہیں جو اللہ کے لئے دیتے ہیں۔ أَعْطٰى: یعنی دوسروں کو دیتے ہیں، کسی سے مانگتے نہیں، مانگنے والا ہاتھ برا ہے اور دینے والا ہاتھ بہتر ہے اور جو حقیقی دینے والا ہے آدمی اسی سے تو مانگے نا ایرے غیرے کے سامنے ہاتھ پھیلائے اس سے برا اور کیا ہوسکتا ہے، بہرحال یہ لوگ مانگتے نہیں، بلکہ اللہ نے ان کو جو دیا ہے اس میں سے دوسروں کو دیتے ہیں۔ اور اگر ان کے پاس کچھ نہ ہو تو اگرچہ اوروں کو نہیں دیں گے مگر مانگیں گے بھی نہیں، حدیث شریف میں ہے حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ما تعُدُّون الفقر فیکم**: تم اپنے درمیان غریب اور محتاج کس کو سمجھتے ہو؟ لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ غریب ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ غریب نہیں، یہ لوگوں سے مانگے گا تو لوگ اسے دیں گے اور یہ اس سے صبح شام دو روٹی پیٹ بھر کے کھالے گا یہ غریب کہاں ہوا؟ آخر مالدار بھی تو دو ہی روٹی کھاتا ہے، باقی مال گھر میں یا بینک میں پڑا رہتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ غریب حقیقت میں وہ ہے جو کسی سے مانگتا نہیں اور اس کے پاس کچھ ہے بھی نہیں۔ مگر اس نے اپنی حالت ایسی بنا رکھی ہے کہ کوئی اس کو غریب نہیں سمجھتا اس لئے کوئی کچھ اس کو دیتا بھی نہیں، یہ ہے غریب، بہرحال اگر ان کے پاس کچھ نہ ہو تو مانگتے نہیں، اور کچھ ہو تو دوسروں کو دیتے ہیں، پس ان کا پہلا کام ہے: **أعطی** دوسرں کو دینا۔ اور دوسرا کام ہے: **اِتقی**: یعنی اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی کے دن گذارتا ہے، اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اور تیسرا کام ہے: ﴿وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴾: اور بہترین بات یعنی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی تصدیق کرتا ہے۔

ایک بندے کے تو یہ اعمال ہیں، ایماندار ہے لا الہ الا اللہ پر صرف زبانی جمع خرچ نہیں کرتا بلکہ دل کی گہرائی سے اس پر ایمان رکھتا ہے اور جب اس پر ایمان ہے تو اللہ سے ڈرتے ہوئے پرہیزگاری کی زندگی گذارتا ہے اور اللہ نے جو مال اسے دیا ہے اس میں سے دوسروں

کو دیتا ہے۔

دوسرے بندے کے اعمال: ﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾: دوسرا بندہ وہ ہے جو بخیلی کرتا ہے، اللہ کے دیئے ہوئے مال کو روکتا ہے، اللہ جو دیتے ہیں ہمیشہ ہمارے ہی نصیب کا نہیں دیتے دوسرے بندوں کو بھی ہمارے ساتھ جوڑتے ہیں اور ان کے نصیب کا بھی ہمیں دیتے ہیں، پس ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں ان کا حق دیں، جس کا جی چاہے اپنے اوپر یا دوسروں پر تجربہ کر کے دیکھ لے، جب تک میاں بیوی دو ہونگے آمدنی کم ہوگی اور جب بچے آنے شروع ہونگے آمدنی بڑھتی چلی جائے گی جتنے بچے ہونگے آمدنی بڑھتی چلی جائے گی کیونکہ یہ جو بچے دنیا میں آرہے ہیں یہ خالی تختی لے کر نہیں آرہے اپنی قسمت میں کچھ لکھوا کر آرہے ہیں اور یہی رزق باپ کے راستہ سے ان کو ملتا ہے، جب بچوں کی شادی ہوگی اور اپنا الگ گھر بسائیں گے تو ان کی قسمت کا رزق ان کو براہ راست ملے گا لیکن جب تک وہ باپ کے ماتحت ہیں تب تک اپنی قسمت میں لکھوا کر جو لائے ہیں وہ باپ کے واسطہ سے ان کو ملتا رہتا ہے۔ اسی طرح جو سخی داتا ہوتے ہیں جو غریبوں پر خرچ کرتے ہیں اللہ انہیں بے حساب دیتے ہیں، کیونکہ غریبوں تک ان کی قسمت کا رزق اس سخی داتا کے واسطہ سے پہنچتا ہے، قرآن کریم میں ہے: ﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾: تم جو بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہو اللہ اس کا عوض دیدیتے ہیں، پس جب ایسی بات ہے تو بخیلی کرنے کا مطلب کیا ہے؟ یہی کہ اللہ نے ہمیں غریبوں کو دینے کے لئے دیا اور ہم نے اسے روک لیا، یہ تو دوسروں کی قسمت پر ہم نے ڈاکہ ڈالا، تو ایک عمل تو اِس بندے کا یہ ہے کہ دوسروں تک ان کا حق نہیں پہنچاتا۔

دوسرا عمل ہے: **و استغنی**: اللہ سے بے نیاز بنتا ہے، اس کو اللہ کی کچھ نہیں پڑی، یعنی اگر کوئی کام اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگیا تو ہوگیا، باقی وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے کوئی کام نہیں کرتا، ایسے بندے کے اعمال میں اور اس بندے کے اعمال میں جو اپنے آپ کو اللہ کا محتاج سمجھتا ہے آسمان وزمین کا فرق ہوتا ہے، ایک بیوی جو شوہر کو شوہر سمجھتی ہے اس کی زندگی میں اور اس بیوی کی زندگی میں جو شوہر کو کچھ نہیں سمجھتی زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، اسی طرح

اپنے آپ کو اللہ کا محتاج سمجھنے والے بندے کے اعمال کے درمیان اور بے نیاز بننے والے بندے کے اعمال کے درمیان آسمان وزمین کا فرق ہوتا ہے۔

اور تیسرا کام اس بندے کا ہے: ﴿وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴾: کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو نہیں مانتا۔ بعض لوگ دونوں اجزاء جھٹلاتے ہیں جیسے ہندو، وہ لا الہ الا اللہ بھی نہیں مانتے، وہ مندروں میں جن کی پوجا کرتے ہیں وہ سب اللہ کے علاوہ معبود ہیں، اور بعض لوگ لا الہ الا اللہ کو مانتے ہیں محمد رسول اللہ کو نہیں مانتے جیسے یہود ونصاری لا الہ الا اللہ کو مانتے ہیں، سکھ بھی لا الہ الا اللہ کو مانتے ہیں وہ کسی کی پوجا نہیں کرتے، مگر محمد رسول اللہ کو نہیں مانتے، محمد رسول اللہ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ جس نبی کا زمانہ چل رہا ہے اس پر اور اس سے پہلے والے انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ بہر حال کلمہ حسنی کو جو مانتا ہے اس کی زندگی اور کلمہ حسنی کو جو نہیں مانتا اس کی زندگی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور اگر زندگیاں مختلف نہ ہوں تو پھر اس کلمہ کو ماننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

الغرض میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ تین کام پہلے والے ہیں یعنی اللہ کے لئے دینا، اللہ سے ڈرتے رہنا اور کلمہ حسنی کی تصدیق کرنا، یہ تین کام انسان ہی کرتے ہیں فرشتے نہیں کرتے، اور دوسرے تین کام ہیں: بخل کرنا، اللہ کی کوئی پرواہ نہ کرنا اور کلمہ حسنی کو جھٹلانا یہ بھی اللہ کے بندے ہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالی نے انسانوں کے اعمال میں فرق رکھا ہے، اور جب اعمال میں فرق ہے تو نتیجہ میں بھی فرق ہوگا، جب دو طالب علموں نے دو پرچے مختلف لکھے ہیں تو نمبر بھی لامحالہ الگ الگ آئیں گے، ایک اوپر جائے گا تو دوسرا نیچے آئے گا اور جب نتیجہ الگ ہے تو انجام بھی الگ ہے ایک کا انجام جنت ہے، اور ایک کا انجام جہنم، دونوں کا انجام ایک کیسے ہوسکتا ہے؟

پوری کائنات کے خالق ومالک اللہ تعالی ہیں، ہر چیز وہی پیدا کر رہے ہیں یہ جو تین اچھے کام کر رہا ہے یہ بھی اللہ پیدا کر رہے ہیں اور یہ جو تین برے کام کر رہا ہے یہ بھی اللہ پیدا کر رہے ہیں لیکن اُس کے کام اللہ کو پسند ہیں اور اِس کے کام اللہ کو پسند نہیں اور جنت اور جہنم کے فیصلے اللہ کی پسند اور ناپسند پر ہونگے باقی دونوں کے اعمال اللہ ہی پیدا کر رہے ہیں۔

عام فہم بات ہے کہ یہ پوری کائنات اللہ کی ہے، اور اللہ کی کائنات میں اللہ کے علاوہ کوئی اور پیدا کرنے والا نہیں ہوسکتا، اگر ہوسکتا ہے تو پھر یہ اللہ کی کائنات کہاں رہی؟ اس لئے جو کچھ بھی پیدا ہو رہا ہے چاہے وہ اچھا ہو یا برا اللہ ہی پیدا کر رہے ہیں مگر کچھ کام اللہ کو پسند ہیں اور کچھ کام ناپسند۔ اللہ کو کیا پسند ہے اور کیا پسند نہیں؟ یہ خود اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے۔ ﴿إِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾: اگر تم اللہ کا انکار کرو تو اللہ کو تمہاری کچھ نہیں پڑی اور اللہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری کو پسند نہیں کرتے۔ ﴿وَإِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ﴾: اور اگر تم اللہ کے شکر گذار بندے بنو تو اللہ اس کو تمہارے لئے پسند فرماتے ہیں، اور پسند اور ناپسند پر جزا وسزا کے فیصلے ہونگے کیونکہ خلق (پیدا کرنا) خالق کی طرف سے ایک عمل ہوتا ہے، مخلوق کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا، ہم معدوم تھے اللہ نے جب چاہا ہمیں پیدا کر دیا ہمارا اس میں کیا دخل ہے؟ خلق میں ابتداء خالق کی طرف سے ہوتی ہے مخلوق کی طرف سے کوئی دخل نہیں ہوتا اور اللہ کی پسند ناپسند میں ابتداء اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی مخلوق کی طرف سے ہوتی ہے، مخلوق نے یہ کام کیا تو اللہ نے پسند کیا، مخلوق نے دوسری طرح کا کام کیا تو اللہ نے ناپسند کیا، اسی کا نام جزوی اختیار ہے اور اسی جزوی اختیار کی بنیاد پر آخرت میں جزا وسزا کے فیصلے ہونگے، جب کوئی بندہ اپنے جزوی اختیار سے برائی کرے گا تو پیدا اس کو اللہ تعالی کریں گے، ایسے ہی جب کوئی بندہ اپنے جزوی اختیار سے نیک کام کرے گا تو پیدا اس کو بھی اللہ تعالی کریں گے البتہ برائی کرنے پر سزا ملے گی اگرچہ پیدا اس برائی کو اللہ نے کیا ہے، اور نیکی کرنے پر جزائے خیر ملے گی اگرچہ پیدا اس کو بھی اللہ نے کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى﴾: جس شخص نے اپنے مال میں سے دوسروں کو دیا اور اللہ سے ڈرتے ڈرتے زندگی گذاری اور کلمہ حسنی کی تصدیق کی تو آسان کر دیتے ہیں ہم اس کے لئے ان آسان کاموں کو، یہ جو نیکی والے کام ہیں، نہایت آسان ہیں، ان کو اللہ تعالی عمل کرنے والوں کے لئے اور آسان کر دیتے ہیں۔ اور وہ جو دوسرے تین برے کام ہیں ان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى﴾: جس نے بخیلی کی اور اللہ سے

بے نیاز بنا اور کلمہ حسنی کو جھٹلاتا رہا تو یہ تینوں کام اگرچہ نہایت مشکل کام ہیں لیکن اللہ تعالی ان کو بھی آسان کردیتے ہیں، ﴿زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ﴾ اللہ فرماتے ہیں: ہم نے لوگوں کے لئے ان کے اعمال مزین کررکھے ہیں، ان کو برائی کا احساس نہیں ہوتا، بہرحال بندہ جس لائن پر چلنا چاہے گا اللہ دستگیری کریں گے اور وہ جو کام کرنا چاہے گا اللہ اسے پیدا فرمادیں گے۔

میرے بھائیو! بات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ بڑا قیمتی وقت گذر رہا ہے اور ہم پونے بارہ بجے یہاں بیٹھے ہیں اور یہ ہماری بہنیں بیٹھی ہیں تو یہاں کیا لڈو بٹ رہے ہیں جو بیٹھے ہیں، اللہ کے دین کی باتیں سمجھنے کے لئے اور ان پر عمل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں، اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں ان بندوں میں شامل کیا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گذارتے ہیں، اللہ سے بے نیاز نہیں بنتے، ایسے بندے شراب خانوں اور کلبوں میں ہونگے۔ یہاں اللہ کے محتاج بندے اور بندیاں بیٹھی ہیں، یہ ماہ مبارک ہے، اعمال حسنہ کا بہترین سیزن ہے، میرے بھائیو اور میری بہنو! ہر نیک کام کرنے کی کوشش کرو، گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں، ماہ مبارک پورا ہورہا ہے اس لئے جو بھی نیک کام کرسکتے ہو کرو، اس مہینہ میں نفل فرض کے برابر ہوجاتا ہے، اعمال حسنہ سے اس مہینہ کو بھر دو۔ اللہ تعالی مجھے بھی اور آپ حضرات کو بھی زیادہ سے زیادہ اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

﴿۱۶﴾

آخرت کی کامیابی دس کاموں سے ہے

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾

معزز خواتین اور اسلامی بہنیں! اللہ جل شانہ نے ہم انسانوں کو پیدا کیا اور پیدا کرکے ہماری تمام ضرورتیں مہیا فرمائیں، اور ہماری ہی نہیں بلکہ اللہ نے جو بھی مخلوق پیدا کی ہے پیدا کرکے اس کی سب ضرورتیں مہیا فرمائی ہیں، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿الَّذِي أَعْطَى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَى﴾ اللہ وہ ہیں جنہوں نے ہر چیز کو بنایا پھر اسے راستہ دکھایا، اس ضابطہ کے مطابق اللہ نے ہم انسانوں کو بھی پیدا کیا اور پیدا کرنے کے بعد ہماری سب ضرورتیں مہیا فرمائیں۔

انسان کی دو ضرورتیں

انسان نام ہے دو چیزوں کا، ایک جسم کا اور ایک روح کا، کچھ ضرورتیں انسان کی روح کی ہیں اور کچھ انسان کے جسم کی، جیسے کھانا پینا سونا جاگنا گرمی سردی سے بچنا جسم کی ضرورتیں ہیں، روح کو نہ سردی لگتی ہے نہ گرمی، نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس، یہ ساری ضرورتیں جسم کی ہیں اور روح کی صرف ایک ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ روح اپنے خالق ومالک کو پہچانے اگر روح اللہ کو نہیں پہچانتی تو اس روح میں اور جانوروں کی روح میں کوئی فرق نہیں بلکہ بعض

اعتبار سے جانوروں کی روحیں اچھی ہیں اُس انسان کی روح سے جو اللہ کو نہیں پہچانتا ﴿أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ کافر جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی برے ہیں، کافر دیکھنے میں تو شاندار انسان ہیں پھر جانوروں جیسے کس بات میں ہو گئے؟ اور جانوروں سے بھی برے کس بات میں ہو گئے؟ اس کا جواب اللہ نے اسی آیت میں دیا ہے کہ ان کافروں کی روحیں اللہ کو نہیں پہچانتی اور جب ان کی روحیں اللہ کو نہیں پہچانتی تو اس روح میں اور جانور کی روح میں کیا فرق ہے؟

غرض روح کی ضرورت صرف ایک ہے اور وہ ہے اللہ کو پہچاننا، پھر جب روح نے اللہ کو پہچان لیا تو پہچاننے کے بعد اس کے کچھ تقاضے ہیں، یہ تقاضے بھی روح کی ضرورتیں ہیں، جب ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ ہمارے خالق ومالک ہیں تو اب عبادت بھی ان ہی کی کرنی ہوگی، یہ عبادت روح کی ضرورت ہے، اسی طرح جب ہم نے جان لیا کہ اللہ ہمارے مالک ہمارے پالنہار ہیں تو اب ان کا ہر حکم ماننا ضروری ہے، یہ اطاعت وفرماں برداری بھی روح کی ضرورت ہے، اسی لئے یہ مسئلہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب تک کوئی انسان اسلام قبول نہ کرے فروع کا مکلّف نہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ کا حکم اسے نہیں دیا جاتا، کیونکہ ان کا نمبر بعد میں ہے پہلے اللہ کو پہچانو پہچاننے کے بعد اس کے تقاضے شروع ہونگے، فی الحال تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ اللہ کو پہچانے، اور ان پر ایمان لائے، کیونکہ انسان کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ کی پہچان کرادی گئی ہے، اللہ کی پہچان کرانے کے بعد انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

کائنات انسان کی جسم کی ضرورت کے لئے ہے

غرض انسان کی دو ضرورتیں ہیں، ایک جسم کی اور ایک روح کی، جسم کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اللہ تعالی نے یہ کائنات پیدا کی ہے، آسمان، زمین چاند، سورج، سمندر، ہوا، درندے، پرندے، چوپائے وغیرہ جو بھی مخلوقات ہیں یہ سب انسان کے جسم کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہیں، حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: **الدُّنیا خلقت لکم وإنکم خلقتم للآخرة**: دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو، اس حدیث

سے معلوم ہوا کا دنیا کا ذرہ ذرہ انسان کے جسم کی ضرورت پورا کرنے کے لئے ہے۔

انبیاء کی بعثت روح کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے

اور روح کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اللہ تعالی نے ہر زمانہ میں انبیاء بھیجے اور ان پر آسمان سے وحیاں نازل کیں، کتابیں نازل کیں، ان کتابوں میں اللہ تعالی نے انسان کو اپنی پہچان کروائی، اور اللہ کی طرف سے احکامات دیئے گئے کہ انسان کو ان چیزوں پر عمل کرنا ہے اور ان چیزوں سے بچنا ہے، یہ جو اللہ کی جانب سے وحیاں نازل ہوئیں، کتابیں نازل ہوئیں یہ سب انسان کی روح کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہیں۔

اسلام اللہ کی نعمت ہے

آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ہمارے نبی ﷺ کے زمانہ تک ایک لاکھ سے زیادہ نبی اور رسول آئے اور سو سے زیادہ اللہ کی کتابیں نازل ہوئیں اور مختلف وقتوں میں ان کتابوں نے انسان کی روح کی غذا مہیا کی، انسان کی روح کو سنوارنے کا کام کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ تمام رسولوں کے سردار حضرت محمد مصطفی ﷺ کو اللہ نے بھیجا اور آپؐ پر اپنی سب سے اہم کتاب قرآن کریم نازل فرمائی جو قیامت تک دنیا میں موجود رہے گی اور تمام انسانوں کی رہنمائی کرتی رہے گی، اس قرآن کی جب تکمیل ہونے کو آئی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:
﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا﴾: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور میں نے اپنی نعمت تمہارے لئے پوری کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو دین ہونے کے اعتبار سے پسند کر لیا، یعنی اللہ کی نعمت پوری کی پوری انسان کو پہنچ چکی اور یہ نعمت ہے: اسلام، اور یہ بہت بڑی نعمت ہے یہ عظیم الشان نعمت اللہ نے مکمل اپنے بندوں کو دیدی، مگر آج دنیا میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس نعمت سے محروم ہیں، جو اس نعمت کی قدر نہیں جانتے، انہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں ایک نعمت اسلام بھی ہے جو اللہ کا دین ہے، اس کے ماننے میں دنیا وآخرت کی بھلائیاں ہیں

مگر ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے، ان کے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے ان کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں وہ اللہ کی اس روشنی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اللہ نے ہم بندوں اور بندیوں کو ان لوگوں میں شامل فرمایا ہے جنہوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے دین کو قبول کیا ہے۔

آدمی پکا مسلمان ہو تو پریشان نہیں ہوتا

ہم نے اللہ کے فضل سے ایمان و اسلام کو قبول کر لیا ہے مگر قبول کرنے کے بعد بہت سی باتوں میں ہم اسلام کے احکام پر نہیں چلتے شیطان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، اُن غلط راہوں پر چلتے ہیں جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور پریشان ہیں، حالانکہ مسلمان کبھی پریشان نہیں ہوتا، اگر وہ سچا پکا مسلمان ہے تو کبھی پریشان نہیں ہوگا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان بیمار نہیں ہوگا، بیمار تو ہوگا، لیکن بیمار ہونا اور ہے اور بیماری میں پریشان ہونا اور ہے، مسلمان کبھی بیمار ہو کر پریشان نہیں ہوتا، اگر بیمار ہو کر پریشان ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ایمان کمزور ہے، اس کا اسلام کمزور ہے، ورنہ بیمار تو اللہ کے نبی بھی ہوتے تھے، اللہ کے نبیوں میں ایک نبی: حضرت ایوب علیہ السلام بہت بڑے پیغمبر ہیں، وہ سخت بیمار ہوئے تھے اور ایک لمبے عرصے تک بیمار رہے تھے مگر انہوں نے ایسا صبر کیا کہ ان کا صبر آج ضرب المثل ہے۔ غرض حضرت ایوب سخت بیمار ضرور ہوئے تھے مگر پریشان نہیں ہوئے تھے۔

میں نے جو کہا کہ مسلمان پریشان نہیں ہوتا اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مسلمان غریب نہیں ہوتا بلکہ وہ چاہے جتنا بھی غریب ہو پریشان نہیں ہوتا، غریبی میں پریشان وہی ہوگا جس کا ایمان و اسلام کمزور ہوگا، ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زندگی کے احوال حدیثوں میں آئے ہیں ان احوال کو اگر ہم پڑھیں یا سنیں تو آج شاید دنیا میں کوئی مسلمان ایسا ہوگا جو ان حالات سے دوچار ہو، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور ﷺ کے گھر میں دو دو مہینے ایسے گذر جاتے تھے کہ چولھا نہیں جلتا تھا، لوگوں نے پوچھا!

جب دو دو مہینے چولھا نہیں جلتا تھا تو آپ لوگ کھاتے کیا تھے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: کھجوریں اور دودھ! کھجوریں کھالیں اور پانی پی لیا، یا بکریوں کا دودھ آگیا تو وہ پی لیا، یہی دو چیزیں خوراک ہوتی تھیں اور دو دو مہینے اس طرح گزر جاتے تھے کہ گھر میں پکانے کے لئے نہ گوشت ہوتا تھا نہ سبزی نہ آٹا، حضور ﷺ اس حال میں رہے مگر اس حال میں بھی آپ کو کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔

غزوۂ خندق میں جب خندق کھودی جا رہی تھی تو صحابہ کا بھوک سے یہ حال تھا کہ انہوں نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھے تھے، جب بھوک بڑھ جاتی ہے تو پیٹ میں گڑھا پڑ جاتا ہے اور مشقت کا کام کرنا ہو تو عرب میں ایک خاص قسم کا پتھر ہوتا تھا جس کو پیٹ پر رکھ کر کپڑا کس کر باندھ دیتے تھے جس سے وہ گھڑا ابھر جاتا تھا اور مشقت کا کام کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی صحابہ سے جب بھوک برداشت نہ ہوئی تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! بھوک سے ہمارا برا حال ہے، اور سب نے کپڑے اٹھا کر اپنے پیٹ دکھائے، سب کے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے تھے، حضور ﷺ کے پاس کونسا کھانا تھا جو آپ سب کو کھلا کر پیٹ بھر دیتے؟ حضورؐ نے بھی کپڑا اٹھایا اور اپنا پیٹ دکھایا، لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہوئے ہیں، یعنی صحابہ جتنے بھوکے تھے حضورؐ ان سے زیادہ بھوکے تھے، جب صحابہ نے یہ منظر دیکھا تو ڈھارس بندھ گئی اور ہمت آگئی کہ حضورؐ جو ہم سے زیادہ بھوکے ہیں وہ پھاوڑا اور کدال لے کر مٹی کھود رہے ہیں اور مٹی ڈھو کر خندق سے باہر لے جا رہے ہیں پھر ہم بھوک میں کام کیوں نہیں کر سکتے، جا کر سارے کام میں لگ گئے۔

یہ سارا منظر حضرت جابر بن عبد اللہؓ نے دیکھا تو ان سے برداشت نہ ہوا، وہ رخصت لے کر گھر گئے اور جا کر بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کھانے کے لئے کچھ ہے؟ بیوی نے کہا: تین کلو جو ہیں! حضرت جابرؓ نے کہا: جلدی سے چکی پر بیٹھ جاؤ اور ان کو پیسو! گھر میں بکری کا ایک بچہ تھا، حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کیا اور صاف کر کے گھر والوں کو دیا اور کہا کہ کھانا تیار کرو، میں حضور ﷺ کو بلا کر لاتا ہوں۔

جب حضرت جابرؓ چلے تو بیوی نے کہا دیکھو حضورؐ کو دعوت دینے جا رہے ہو مجھے رسوا

مت کرنا، یعنی اتنے مہمان نہ بلالانا کہ کھانا کم پڑ جائے، حضرت جابرؓ نے کہا: ٹھیک ہے اور انہوں نے جا کر حضورؐ کے کان میں کہا یا رسول اللہ! میں نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا ہے اور تین کلو جو ہیں ان کو پیسوا کر آیا ہوں لہٰذا آپ اور دس آدمی آپ کے ساتھ جن کو آپ پسند کریں تشریف لے چلیں، یہ بات سنتے ہی حضور ﷺ نے اعلان کر دیا کہ لوگو! جابر کے یہاں دعوت ہے، سب جابر کے گھر پہنچو! پھر حضورؐ نے حضرت جابرؓ سے کہا کہ تم جلدی گھر پہنچو، ہم پیچھے آرہے ہیں اور گھر جا کر ایک ہدایت تو یہ دو کہ جو گوشت کی ہانڈی پک رہی ہے وہ ہانڈی جب تک میں نہ آؤں چولھے پر سے نہ اتاری جائے اور دوسری ہدایت یہ دی کہ جب آٹا تیار ہو جائے تو روٹی پکانا شروع نہ کریں، خیر حضرت جابرؓ گھبرائے ہوئے جلدی جلدی گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ حضورؐ نے تو ساری خندق میں اعلان کر دیا ہے اور سات سو آدمی کھانے کے لئے آرہے ہیں، حضرت جابرؓ کی بیوی کا ایمان دیکھو، پہلے تو انہوں نے کہا تھا کہ اتنے مہمان نہ بلالانا کہ گھر بدنام ہو جائے اور میں رسوا ہو جاؤں مگر اب کہا کہ کیا آپ نے حضور پاک کو بتا دیا تھا کہ کھانا کتنا ہے؟ حضرت جابرؓ نے کہا: ہاں بتا دیا تھا! اہلیہ کہنے لگیں: اب کوئی پریشانی کی بات نہیں، اب حضورؐ نے دعوت دی ہے تو وہ جانیں اور اللہ جانیں!

تھوڑی دیر میں سات سو آدمی گھر پہنچ گئے، کوئی ایک دن کا بھوکا تھا کوئی دو دن کا کوئی تین دن کا، حضور ﷺ جب تشریف لائے تو آپ نے اپنا لعاب ہانڈی میں ڈالا اور اس کو ڈھانک دیا، اور جو آٹا گوندھ کر تیار کیا گیا تھا اس میں بھی آپ نے لعاب ڈالا اور آٹے کو کپڑے سے ڈھک دیا اور فرمایا: محلّہ میں سے دس عورتوں کو روٹی پکانے کے لئے بلاؤ اور اس کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈالو اور آٹا نکالو کپڑا مت ہٹانا، ہانڈی میں سے ذرا سا ڈھکنا ہٹاؤ اور سالن نکالو، پورا ڈھکنا مت کھولنا، چنانچہ دس عورتیں دس چولھوں پر روٹی پکانے کے لئے بیٹھ گئیں، روٹیاں پکتی رہیں اور سالن نکلتا رہا اور سات سو آدمی پیٹ بھر کر کھا کر چلے گئے، جب تمام لوگ کھا کر چلے گئے تو حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: ہم نے کپڑا اٹھایا تو میں یہ نہیں بتا سکتا کہ پہلے آٹا زیادہ تھا یا اب، ہانڈی کھولی تو میں یہ نہیں بتا سکتا کہ پہلے سالن زیادہ تھا یا اب، اس واقعہ میں دیکھئے کہ حضور اور صحابہ پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے خندق میں کام کر رہے ہیں

مگر انہیں غریبی اور بھوک سے کوئی پریشانی نہیں پس غریبی الگ مسئلہ ہے اور اس میں پریشان ہو جانا الگ مسئلہ ہے۔

مسلمان پریشان نہیں ہوتا اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مسلمان مقروض نہیں ہوتا، ہوتا ہے! مگر اسے قرضے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، حضور ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے ہیں تو آپ پر ایک یہودی کا قرضہ تھا، اس سے حضور پاک ﷺ نے گھر کے خرچہ کے لئے جو خریدے تھے اور مقروض ہونے کی حالت میں حضور دنیا سے تشریف لے گئے، پھر حضور کے گھر والوں نے دکان کا قرضہ ادا کر کے آپ کی ذرہ چھڑائی، اس طرح صحابہ بھی بڑے بڑے قرضے چھوڑ کر گئے ہیں مگر انہیں قرضے میں کوئی پریشانی نہیں تھی، آج ہمارے ذمہ ہزار دس ہزار قرضہ آجائے تو اتنے پریشان ہو جاتے ہیں کہ کوئی حد نہیں، لیکن صحابہ پریشان نہیں ہوتے تھے، ایک صحابی ہیں: زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، جب ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ بیٹا مجھ پر بہت قرضے ہیں، اور میں جانتا ہوں کہ تو وہ قرضے ادا نہیں کر سکتا، لیکن میرے مرنے کے بعد تین سال تک اعلان کرنا اور کوئی بھی قرضہ مانگنے آئے اس سے تفصیل نہ پوچھنا ادا کر دینا، اور اگر کوئی بڑا قرضہ مانگنے کے لئے آئے جسے تو چکا نہ سکے تو دو رکعت نماز پڑھنا پھر دعا کرنا کہ اے زبیر کے رب! یہ قرضہ مانگنے والا آیا ہے، میرے بس میں قرضہ ادا کرنا نہیں آپ انتظام فرما دیں۔

اس طرح لاکھوں کا قرضہ چھوڑ کر جا رہے ہیں، پیچھے نہ کوئی کاروبار ہے نہ کوئی جائداد بس اللہ پر اعتماد ہے کہ میرا پروردگار میرا قرضہ ادا کر دے گا اور اللہ پاک نے ان کا قرضہ ادا بھی کر دیا، میں اس تفصیل میں نہیں جاتا کہ وہ کس طرح ادا ہوا۔

ان تمام مثالوں سے آپ سمجھ گئی ہونگی کہ مسلمان بیمار بھی ہوتا ہے، مقروض بھی ہوتا ہے، غریب بھی ہوتا ہے، مسلمان پر یہ سارے احوال آتے ہیں، یہ بات نہیں ہوتی کہ مسلمان ہونے کے بعد اس پر حالات نہیں آتے، سب حالات آئیں گے مگر کسی حال میں مسلمان پریشان نہیں ہوگا، آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ہم ذرا ذرا سی بات پر بے حد پریشان ہو جاتے ہیں، یہ صورت حال اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسلام کی قدر

نہیں کی، ہم مسلمان تو ہیں لیکن اسلام کی، قرآن کی، حدیث کی تعلیمات پر سو فیصد عمل کرنے والے نہیں۔

ہم ایسے دائرے میں ہیں جس کے چاروں طرف آگ ہے

سوال ہوتا ہے کہ ہم سو فیصد دین پر عمل کرنے والے کیوں نہیں رہے؟ ہمارے کچھ احوال ہی ایسے ہیں۔ ہم ایسے ماحول میں رہ رہے ہیں جس کے چاروں طرف بے حیائیاں اور گناہ کے سامان ہیں، ایک آدمی جس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہو اور بیچ میں ایک گول دائرہ ہو جس میں آگ نہ ہو اور وہ آدمی اس دائرہ میں ہو اور کہتا ہو کہ میرے دائرہ میں آگ نہیں اس لئے مجھے کوئی فکر نہیں، ٹھیک ہے تیرے دائرہ میں آگ نہیں لیکن تیرے چاروں طرف تو آگ لگی ہوئی ہے، اس دائرہ میں بیٹھ کر تو آگ کی مضرتوں سے بچ نہیں سکتا، اس آگ کا دھواں تجھے پہنچے گا، اس کی لپٹ تجھے پہنچے گی، اس کے شرارے تجھے پہنچیں گے، آگ کی ساری مصیبتیں تجھ کو پہنچیں گی، میری بہنو اور بھائیو! ہمارے چاروں طرف آگ لگ رہی ہے جس نے ہمیں شریعت پر پورا عمل کرنے والا باقی نہیں رکھا، سب سے بڑی آگ ٹی وی ہے جس پر سینکڑوں چینل چلتے ہیں، یہ ہماری نگاہوں کے سامنے آگ کا وہ لاوا ہے جس کو ماں بیٹی ساتھ مل کر دیکھتے ہیں، بھائی بہن ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں، باپ بیٹی ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں، ماں بیٹا ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں، یہ سارے فحش مناظر ہمارے گھر کے سب افراد یکھتے ہیں پھر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگیوں میں پریشانیاں نہ آئیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ پریشانیوں کا سامان تو ہم نے خود کر رکھا ہے۔

ہمارے گھروں میں روز اخبار آتا ہے اور کوئی بھی اخبار اٹھا لو، چھوٹا یا بڑا گندی تصاویر اس میں ضرور ہونگی، ان گندی تصاویر کو گھر میں ہر ایک دیکھ رہا ہے پس گھر کے ماحول میں شرم وحیا کہاں رہے گی؟ بے حیائی اور بے شرمی پیدا ہونی ہی ہے، گھر سے باہر نکلے تو جگہ جگہ عورتوں کی ننگی تصویریں لگی ہیں اور عورتیں اس پر فخر کرتی ہیں کہ دیکھو ہماری تصویر کتنی شاندار ہے، جب چوبیس گھنٹے مردوں اور عورتوں کے سامنے یہ ننگی تصویریں آئیں گی تو وہ ان کے دماغوں میں بھر

جائیں گی، اب وہ نماز پڑھیں گے تو نماز کے اندر بھی دماغوں میں یہ تصویریں ہونگی، سوئیں گے تو بھی یہ دماغوں میں بھری ہوئی ہونگی، یہ سب مثالیں میں اس بات کی دے رہا ہوں کہ آدمی اپنے دائرہ کے اندر ہے جہاں آگ نہیں ہے، مگر چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے، یہ دائرہ مذہب اسلام کا ہے، اسلام حفاظت کا ایک دائرہ ہے مگر اس دائرہ کے چاروں طرف جو آگ لگی ہوئی ہے وہ ہماری پریشانیوں کا سبب ہے، ہماری ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی، ہر لائن میں سب پریشان ہیں حالانکہ مسلمان تو امن واطمینان میں ہوتا ہے مگر ہمیں امن واطمینان نصیب نہیں کیونکہ ہم مسلمان تو ہیں یعنی ایک خاص دائرہ میں ہیں مگر اس دائرہ کے چاروں طرف فواحش ہیں، غداریاں ہیں، غیبتیں ہیں، حرص ہے، خودغرضیاں ہیں، بدنظریاں ہیں، ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ان مضرتوں نے ہمارے امن واطمینان کو غارت کر دیا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ ہم اپنی زندگیوں میں امن واطمینان کیسے لائیں؟

جواب: ہمیں باہر کی مضرتوں سے بچنے کے لئے دو کام کرنے ہونگے:

ایک: چاروں طرف جو بے حیائیاں ہیں ان کو دور ہٹائیں، جب تک ہم یہ بے حیائیاں دور نہیں ہٹائیں گے ہماری زندگیوں میں سکون اور چین نہیں آئے گا، ہمیں اسلام کی برکات نہیں ملیں گی۔

دوسرے: اللہ کے احکام کی تعمیل کریں، ہم اسلام کے جس دائرہ میں ہیں اس دائرہ میں اللہ کے کچھ احکام ہیں جو اللہ نے ہمیں دے رکھے ہیں، ان احکام کی تعمیل کی جائے، اگر ہم تعمیل نہیں کریں گے تو ہماری زندگیوں میں سکون واطمینان نہیں ہوگا، یہ اللہ کے احکام کی تعمیل نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بیٹا باپ کو باپ نہیں سمجھتا، اور بیوی میاں کو میاں نہیں سمجھتی، مسلمانوں میں وہ گھرانے جہاں اسلامی قدریں ہیں وہ تو پھر بھی غنیمت ہیں لیکن جو گھر ماڈرن ہوگئے ہیں ان گھروں میں شوہر بیوی کو بیوی نہیں سمجھتا اور بیوی شوہر کو شوہر نہیں سمجھتی، نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹے کے دل میں ماں باپ کا احترام نہیں رہا وہ ماں باپ کو ماں باپ نہیں سمجھتا۔

اللہ کی دو نعمتیں

میاں بیوی کے درمیان اللہ نے دو نعمتیں رکھی ہیں، ہمارے گھر ان دو نعمتوں سے محروم ہیں، وہ دو نعمتیں کیا ہیں؟ ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ ان دو نعمتوں میں سے ایک ہے: محبت، یعنی بیوی کو شوہر سے محبت ہو اور شوہر کو بیوی سے، اور دوسری نعمت ہے رحمت، یعنی بیوی شوہر پر مہربان ہو، اور شوہر بیوی پر، جیسے ماں اپنے بچوں پر مہربان ہوتی ہے، اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ نے میاں بیوی کے درمیان بھی مہربانی رکھی ہے، ان دو نعمتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جب مرد دنیا کے کاروبار سے تھک کر پریشان ہو کر گھر پہنچتا ہے تو بیوی کو دیکھتے ہی اس کی ساری پریشانی دور ہو جاتی ہے، اللہ نے فرمایا: ﴿لِتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا﴾: ہم نے تمہارے جوڑے اس لئے بنائے ہیں کہ تمہیں اپنے جوڑے کے پاس جا کر سکون ملے، عورت کو مرد سے اور مرد کو عورت سے سکون ملتا ہے، الحمد للہ آج بھی بہت سے گھر ہیں جن میں یہ نعمتیں ہیں مگر بہت سے گھر ایسے بھی ہیں جن میں یہ نعمتیں نہیں، وہ گھر زبردستی چل رہے ہیں، کہیں مرد بیوی کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے اور کہیں بیوی مرد کو دیکھ کر، یہ صورت حال ان نعمتوں کے ہمارے گھروں سے رخصت ہو جانے کی وجہ سے ہے اس لئے ہماری زندگیاں جنت کا نمونہ نہیں رہیں، جہنم کی بھٹی بن کر رہ گئی ہیں۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے گھروں میں یہ نعمتیں کیوں نہیں رہیں؟ ان کے ختم ہونے کے کیا اسباب ہیں؟

جواب: ختم ہونے کے بہت سے اسباب ہیں، ان میں سے ایک سبب میاں بیوی کے دلوں میں ایک دوسرے کے احترام کا باقی نہ رہنا ہے، نہ بیوی کے دل میں شوہر کا احترام ہے نہ شوہر کے دل میں بیوی کی محبت ہے، ایک دوسرے کو بلائیں گے تو انگریزوں کے طریقے پر بلائیں گے، بیوی شوہر کو اس کا نام لے کر بلائے گی اور شوہر بیوی کو اس کا نام لے کر، یہ جو ایک دوسرے کو نام سے بلانا ہے یہ دلوں سے احترام ختم کرتا ہے اور پھر بلائیں گے بھی تو بے ادبی کے ساتھ، ایسی صورت میں احترام کہاں باقی رہے گا، اگر تھوڑا بہت ہوگا تو وہ بھی رخصت ہو

جائے گا۔

ایک دوسرے کو بلانے کا اسلامی طریقہ

حضور ﷺ کی بیویاں کبھی حضور کو نام لے کر نہیں بلاتی تھیں، یَا مُحَمَّدُ کہہ کر نہیں بلاتی تھیں بلکہ یا رسول اللہ کہہ کر بلاتی تھیں، صحابہ کرام میں بھی کنیتیں تھیں، جیسے ہندوستان میں آج بھی کنیتیں چلتی ہیں، لڑکا یا لڑکی کا نام لے کر پکارتے ہیں: فلاں کے ابا! فلاں کی امی! نام لے کر نہیں پکارتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو یا رسول اللہ کہتی تھیں مگر حضورؐ حضرت عائشہؓ کو کیا کہیں؟ ان کے تو کوئی بچہ نہیں تھا، چنانچہ حضورؐ نے فرمایا کہ تمہاری بڑی بہن کا جو لڑکا ہے عبد اللہ اس کے ذریعہ تم کنیت رکھ لو، چنانچہ حضرت عائشہؓ کی کنیت ''عبد اللہ کی ماں'' تھی، میری بہنو! اگر زندگیوں کو خوش گوار بنانا چاہتی ہو تو یہ طریقہ آج سے شروع کردو، میاں بیوی کو نام لے کر نہ پکارے بلکہ بیوی کے لئے کوئی احترام والا لفظ استعمال کرے اور عورت شوہر کے لئے تعظیم والا لفظ استعمال کرے جب ایک دوسرے کے لئے احترام والا لفظ استعمال کریں گے تو دلوں میں محبت پیدا ہوگی۔

بے پردگی سے اسلام کی برکت ختم ہوتی ہے

محبت ختم کرنے والے اسباب میں سے ایک سبب بے پردگی ہے، یہ پردگی بھی ہماری زندگیوں کو برباد کرنے والی ہے، ہمارے معاشرہ کو خراب کرنے والی ہے، بے پردگی کے ساتھ آپ اسلام کی برکتیں حاصل نہیں کر سکتے، یہ تو کافروں کے معاشرہ کی چیز ہے، ہم اگر اپنی زندگیوں میں کافروں والی باتیں اپنائیں گے تو ہماری زندگیوں میں اسلام کی برکتیں کہاں سے آئیں گی؟ اسلام کی برکتیں اگر چاہتے ہو تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾: اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں یعنی قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کر کے دلوں کو امن وسکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے، لیکن اگر ہم خود ہی اپنی زندگیوں کو عذاب بنانا چاہیں، ہم ہی اپنی زندگیوں میں تلخیاں گھولنا چاہیں تو اس کا کوئی علاج اسلام کے پاس نہیں۔

خطبہ میں جو آیت پاک میں نے پڑھی تھی اب اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں، کوئی موقع آئے گا تو انشاء اللہ اس کی تفصیل بھی کروں گا، اس آیت میں اللہ پاک نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جو مرد اور جو عورتیں دس کام کریں گے مرنے کے بعد آخرت میں اللہ تعالی نے ان کے لئے دو چیزیں تیار کر رکھی ہیں ایک بخشش، یعنی اللہ تعالی ان کے تمام گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دیں گے، دوسرے: اجر، یعنی دنیا میں جو نیک کام انہوں نے کئے ہیں اس کا بہت بڑا بدلہ اللہ تعالی عنایت فرمائیں گے۔ وہ دس کام کیا ہیں؟

۱- ﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ﴾: اسلام کے کام کرنے والے مرد اور اسلام کے کام کرنے والی عورتیں، پہلی چیز ہے اعمال اسلام کرنا، اعمال اسلام پانچ ہیں، پہلا عمل ہے: زبان سے کلمہ طیبہ پڑھنا، دوسرا: پانچ وقت کی نمازیں پابندی سے پڑھنا، تیسرا: اللہ نے جو مال دیا ہے اس کا حساب کرکے پوری زکوۃ دینا، چوتھے: رمضان کے روزے رکھنا، پانچویں: اللہ نے اگر پیسہ دیا ہے اور حج کر سکتی ہے تو حج کرنا، یہ پانچ کام اسلامی اعمال ہیں، ہر مسلمان کے لئے یہ کام ضروری ہیں۔

۲- ﴿وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾: ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں ایمان نام ہے عقیدوں کا جن کے ماننے سے آدمی مؤمن قرار دیا جاتا ہے، اگر اس کے عقیدے صحیح ہیں تو وہ پکا سچا مسلمان ہے اور اگر عقیدے گڑبڑ ہیں تو اس کا ایمان گڑبڑ ہے۔

۳- ﴿وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ﴾: فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، فرماں بردار کے معنی ہیں اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے والا۔

۴- ﴿وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ﴾: سچے مرد اور سچی عورتیں، یعنی جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے، نہ صرف جھوٹ نہیں بولتے بلکہ معاشرہ میں جس کو جھوٹ نہیں سمجھا جاتا وہ بھی نہیں بولتے، جیسے مٹھی میں کچھ نہیں اور بچہ کو جھوٹ موٹ ٹوفی کے بہانے بلا رہی ہے ایسا بھی یہ لوگ نہیں کرتے۔

۵- ﴿وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ﴾: صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، جب بھی کوئی پریشانی یا مصیبت پیش آتی ہے تو بے قابو نہیں ہوتے، اللہ پر اعتماد اور بھروسہ

رکھتے ہیں کہ جس اللہ نے اس پریشانی کو بھیجا ہے وہ اس کو دور بھی کر سکتا ہے۔

۶- ﴿وَالْخَاشِعِيْنَ وَالْخَاشِعَاتِ﴾: اللہ سے ڈرنے والے مرد اور اللہ سے ڈرنے والی عورتیں، اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں۔

۷- ﴿وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ﴾: اللہ کے راستہ میں خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، زکوۃ دینا بھی خیرات ہے، صدقۂ فطر دینا بھی خیرات ہے، نفلی خیرات بھی خیرات ہے، سب اس آیت کریمہ کے تحت ہیں۔

۸- ﴿وَالصَّائِمِيْنَ وَالصَّائِمَاتِ﴾: روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، فرض روزے اور نفل روزے سب اس میں شامل ہیں، مگر عورتوں کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر شوہر گھر پر موجود ہو، سفر میں گیا ہوا نہ ہو تو عورت نفل روزہ شوہر کی اجازت سے رکھے، چاہے صراحۃً اجازت ہو یا دلالۃً۔

۹- ﴿وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ﴾: اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے مرد اور عورت کا دل بے غبار رہتا ہے۔

۱۰- ﴿وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتِ﴾: بہت زیادہ اللہ کو یاد کرنے والے مرد اور بہت زیادہ اللہ کو یاد کرنے والی عورتیں،

یہ دس باتیں جن میں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اللہ نے آخرت میں دو چیزیں تیار کر رکھی ہیں: ایک: بخشش اور معافی، دوسرے: دنیا میں جو نیک کام کئے ہیں اس کا بہت بڑا بدلہ اور اجر: ﴿أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيْمًا﴾

میری بہنو! یہ دس کام جو اس آیت میں بیان کئے گئے ہیں ان کو ذہن میں رکھ کر ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو، انشاء اللہ دنیا میں چین وسکون ملے گا اور آخرت میں سدابہار نعمتیں ملیں گی، اللہ تعالی ہم سب کو اعمال اسلام پر مضبوط فرمائیں، ہماری زندگیوں کو راحت وسکون والی زندگیاں بنائیں، آمین یا رب العالمین۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

۱۷

مودودی جماعت کی پانچ گمراہیاں

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ۝﴾

بزرگو اور بھائیو! آج میں چاہتا ہوں کہ آپ کو جناب سید ابوالاعلی مودودی صاحب اور ان کی جماعت: جماعت اسلامی کی حقیقت سمجھاؤں، لوگ عام طور پر اس سے واقف نہیں، اور ہر ایک کے بس میں اسے سمجھانا بھی نہیں، اس لئے آج کی آخری مجلس میں (۱) اس موضوع پر مختصر کلام کرنا چاہتا ہوں، لیکن جو باتیں بیان کروں گا وہ بنیادی باتیں ہونگی اس لئے آپ ان کو بغور سنیں، جس کی سمجھ میں آئے وہ قبول کرے، نہ سمجھ میں آئے تو اس دنیا میں کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

مودودی جماعت کی بنیادی گمراہیاں پانچ ہیں:

۱- صحابہ معیارِ حق نہیں

سید ابوالاعلی مودودی صاحب ہماری جماعت کے ایک فرد تھے شروع میں ہمارے سارے آدمی ان کے ساتھ تھے۔ پھر ہمارا اور ان کا اختلاف کہاں سے شروع ہوا اس کو سمجھنا ہے۔ سید ابوالاعلی مودودی صاحب باقاعدہ دین پڑھے ہوئے نہیں تھے، انگریزی بھی انھوں

(۱) نیویارک کی ایک بڑی مسجد میں حضرت والا کا دس دن کا پروگرام تھا، روزانہ عشاء کے بعد بیان ہوتا تھا، بیان کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ چلتا تھا، لوگ بار بار جماعت اسلامی کے بارے میں دریافت کرتے تھے، حضرت جواب دیتے تھے کہ یہ تفصیلی موضوع ہے، کسی وقت سمجھاؤں گا، چنانچہ آخری دن اسی موضوع پر تقریر فرمائی ہے ۱۲

نے باقاعدہ نہیں پڑھی تھی، لیکن غضب کے ذہین تھے، انھوں نے اپنی محنت سے انگریزی بھی سیکھی، عربی بھی سیکھی، اور شروع میں جمعیۃ علماء ہند کے اخبار الجمعیۃ کے ایڈیٹر رہے، اس زمانہ میں جمعیۃ کے صدر مفتی کفایت اللہ صاحبؒ تھے، کہتے ہیں: انھوں نے مفتی صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے، ایڈیٹری کے زمانہ میں انھوں نے الجہاد فی الاسلام لکھی، اور سب لوگوں نے اسے بہت پسند کیا، پھر وہ الجمعیۃ کی ایڈیٹری چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں جا کر انھوں نے ترجمان القرآن کے نام سے ماہانہ رسالہ نکالا اور اس میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی، چنانچہ مودودی صاحب نے بھی آزادی کے موضوع پر زوردار تحریریں لکھیں اور دوسرے بڑے علماء جیسے مولانا علی میاں ندوی، مولانا منظور نعمانی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا بختیاری مدارسی وغیرہ حضرات بھی ان کے رسالہ میں تحریریں لکھ رہے تھے، پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے طے کیا کہ مجھے اپنی ایک علاحدہ جماعت بنانی ہے، اور اس سلسلے میں پہلا اجلاس انھوں نے دہلی میں بلایا، اس اجتماع میں ہمارے علماء مولانا منظور نعمانی، مولانا علی میاں ندوی، مولانا بختیاری اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ شریک ہوئے، اس اجلاس میں مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور اس کا دستور اساسی پیش کیا۔ جس کی پہلی دفعہ تھی: اس جماعت کا نام 'جماعت اسلامی' ہوگا، سب سے پہلے اس پر مناقشہ ہوا کہ جماعتِ اسلامی کا کیا مطلب؟ اس جماعت میں جو نہیں ہے کیا وہ مسلمان نہیں ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے اس کی وضاحت کی کہ نہیں یہ مطلب نہیں، یہ تو بس ایک رمزی نام ہے۔ بہرحال اس پہلی دفعہ پر اختلاف ہوا مگر کوئی زیادہ اختلاف نہیں ہوا۔ دوسری دفعہ آئی: اس میں یہ تھا کہ جو بھی اس جماعت میں شامل ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی کی ذہنی غلامی نہیں کرے گا۔ یہ لفظ ذہنی غلامی مہمل تھا، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کے لئے لفظ ذہنی غلامی استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا، لیکن چلو، جب یہ دوسری دفعہ پیش ہوئی تو اس پر سخت اختلاف ہوا، لوگوں نے پوچھا: صحابہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کیا صحابہ کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ سب سے پہلے کھڑا ہوا اور لمبی بحثیں ہوئیں، ان بحثوں کے بعد یہ سب

اکابر ان سے الگ ہوگئے اور سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے اس وقت کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے اس جماعت کی گرفت کی کہ صحابہ کے بارے میں اپنی پوزیشن واضح کرو، ان کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟ یہ دفعہ آج تک ان کے دستور میں چلی آرہی ہے مگر آج تک انھوں نے صحابہ کے بارے میں اپنی پوزیشن واضح نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم صحابہ پر کہاں تنقید کرتے ہیں؟ اکابر نے کہا کہ تم کیچڑ اچھالتے ہو یا نہیں، تنقید کرتے ہو یا نہیں، یہ تو بعد کی بات ہے پہلے یہ بتاؤ کہ صحابہ کا اجماع حجت ہے یا نہیں؟ آج تک انھوں نے نہ ہاں کی نہ نا! یہی وہ معرکۃ الآراء بحث ہے کہ صحابہ معیار حق ہیں یا نہیں؟ اگر وہ صحابہ کو حجت مانتے ہیں تو ان کو دستور میں ایک جملہ بڑھا دینے میں کیا پریشانی تھی، مگر انھوں نے آج تک نہیں بڑھایا۔ اس دن سے ہمارا اور ان کا اختلاف شروع ہوا اور وہ اہل السنۃ والجماعۃ سے نکل گئے کیونکہ وہ جماعۃ یعنی صحابہ کے اجماع کو حجت نہیں مانتے، لہٰذا ان کا اور ہمارا اختلاف ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ سے شروع ہوا، ہمارا راستہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، اور اس کے سب سے پہلے مصداق صحابہ کرام ہیں، انہی کا راستہ ہم نے اختیار کیا ہے، جماعتِ اسلامی والوں نے ان کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ایک اختلاف تو ہمارا اور ان کا یہ ہوا کہ وہ صحابہ کے اجماع کو حجت نہیں مانتے اور ہم مانتے ہیں، اس لئے وہ الجماعۃ میں نہیں رہے۔ یہ ایک بات ہی ان کی گمراہی کے لئے کافی ہے۔

۲- دین کا 'کیلا' حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے

اسلام کی تعلیمات بہت پھیلی ہوئی ہے، سارا قرآن بھرا پڑا ہے، ساری حدیثیں بھری پڑی ہیں، ان دونوں کی تفصیلات سے ساری فقہ بھری پڑی ہے، مگر قطب الرحی بتاؤ کیا ہے؟ قطب الرحی: چکی کا کیلا جس پر چکی کا اوپر کا پاٹ گھومتا ہے۔ اسلام کا قطب الرحی کیا ہے؟ نبی پاک ﷺ کے زمانہ سے آج تک پوری امت یہ سمجھتی آئی ہے کہ وہ قطب الرحی: رضوان من اللہ: ہے یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا۔ قرآنِ کریم میں ہے ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ، وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ (التوبہ:۷۲): اللہ نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے وعدہ کیا ہے ایسے باغات کا جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں، وہ ان باغات میں ہمیشہ رہیں گے، اور اللہ نے ان سے ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ستھرے گھروں کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ کی خوشنودی ان سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾: سب نعمتوں سے بڑھ کر اللہ کی خوشنودی ہے۔ سورۂ یونس میں ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوْا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ (آیت:۲۶) جن لوگوں نے اچھے کام کئے ہیں، ان کے لئے اچھا گھر ہے اور کچھ مزید بھی ہے۔ جنت اور اس کی ساری نعمتیں تو مل گئیں، مزید کیا ہے؟ حدیث شریف میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ جب سب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جنتیوں سے خطاب فرمائیں گے کہ میرے بندو! تمہیں جو نعمتیں میں نے عطا کی ہیں کیا تم ان پر خوش ہو؟ سب جنتی کہیں گے کہ پروردگار عالم! ہم خوش ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے تمہارے لئے ایک نعمت چھپا رکھی ہے، ابھی میں نے تمہیں وہ نعمت نہیں دی، جنتی سوچیں گے کہ ساری نعمتیں تو ہمیں میسر ہیں پھر وہ کونسی نعمت باقی ہے جو اللہ نے ابھی تک نہیں دی، تو جنتی عرض کریں گے کہ پروردگار عالم! وہ نعمت کونسی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ وہ نعمت یہ ہے کہ میں آج اعلان کرتا ہوں کہ تمام جنتیوں سے میں خوش ہوگیا ایسا خوش ہونا کہ اب میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہونگا، حدیث شریف میں ہے جب یہ اعلان ہوگا تو مؤمنین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا، اللہ کی خوشنودی کے سامنے جنت کی تمام نعمتوں کو وہ ہیچ تصور کریں گے۔ معلوم ہوا کہ سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضامندی ہے، آپ نے نماز پڑھی اور اللہ راضی ہوئے تو آپ کی نماز کا فائدہ ہے اور اگر آپ نے نماز پڑھی اور اس میں دکھلاوا کیا، اور دنیا نے دیکھ لیا، سن لیا، مگر اللہ راضی نہیں ہوئے تو وہ نماز نمازی کے منہ پر ماردی جائے گی، یہی حال زکوٰۃ کا ہے یہی حال روزہ کا ہے، یہی حال حج کا ہے، یہی حال تمام بندگیوں کا ہے کہ اگر ہماری بندگیوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگئے تو ہم کامیاب ہیں اور اگر اللہ کو خوش نہیں کر سکے تو ہمارے لئے کامیابی نہیں۔ بہر حال پوری امت حضور ﷺ

کے زمانہ سے آج تک یہ سمجھتی آرہی ہے کہ اسلام کی چکی کا کیلا جس پر تمام احکام گھوم رہے ہیں ﴿رِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ﴾ ہے یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اب مودودی صاحب آئے، انھوں نے وہ کیلا نکال دیا اور ایک نیا کیلا فٹ کیا۔ وہ نیا کیلا کیا ہے؟ اقامتِ دین۔ یہ تو ان کی خوبصورت تعبیر ہے، مگر اقامتِ دین کا مطلب اپنے اندر دین قائم کرنا یا دین پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنا نہیں ہے، اقامتِ دین کا مطلب ہے دنیا میں خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا یہ انھوں نے نیا کیلا چڑھایا اور سارے احکام اس پر گھمادیئے، چنانچہ انھوں نے کہا یہ جو جماعت کی نماز ہے وہ فوجی پریڈ ہے۔ اللہ کی خوشنودی والی بات گئی، نماز فوجی پریڈ بن گئی۔ زکوٰۃ قومی فنڈ ہے، اسی لئے وہ زکوٰۃ کو ہر کام میں استعمال کرتے ہیں کیونکہ فنڈ تو ہر چیز میں استعمال ہوتا ہے جیسے گورنمنٹ کا فنڈ ہر چیز میں استعمال ہوتا ہے۔ روزہ فوج کی بھوکے رہنے کی ریہرسل ہے اور حج انٹرنیشنل کانفرنس ہے۔ یہ سب تعبیریں انھیں کی چھوٹی بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔ ہر چیز میں سے انھوں نے اللہ کو خوش کرنے کی بات نکال دی اور حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی بات شامل کردی۔

کیا حکومت الٰہیہ قائم کرنا فرض نہیں؟

ایک سوال: کیا حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا اللہ نے حکم نہیں دیا؟ بیشک دیا ہے، حکومت الٰہیہ قائم کرنا فرض ہے مگر وہ اسلام کی جڑ نہیں بلکہ وہ اسلام کے درخت کی ایک شاخ ہے، جیسے نماز احکام اسلام کی ایک شاخ ہے، زکوٰۃ، روزہ، حج، تلاوت قرآن وغیرہ بے شمار شاخیں ہیں۔ حدیث شریف میں ہے: الإيمان بضع وسبعون شعبة: ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، ان شاخوں میں سے ایک شاخ حکومت الٰہیہ قائم کرنا بھی ہے، جہاں حالات سازگار ہوں، حکومت الٰہیہ قائم کی جاسکتی ہو، وہاں مسلمانوں پر فرض ہے کہ حکومت الٰہیہ قائم کریں، لیکن وہ دین کی بنیاد نہیں۔ مگر مودودی صاحب نے اس شاخ کو کاٹ کر اسلام کے درخت کی جڑ اور تنا بنادیا اور سارے احکام اسلامی اس تنے پر گھمادیئے، انھوں نے کسی کتاب میں یہ جملہ لکھا ہے کہ وہ انبیاء جو پوری زندگی دین کی محنتیں کرتے رہے اور دنیا میں حکومت

الٰہیہ قائم نہ کرسکے وہ دنیا سے اپنے مشن میں ناکام گئے۔ توبہ! کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے ہیں ان میں سے کتنوں نے حکومت الٰہیہ قائم کی ہے؟ پانچ دس کی مثال آپ دے سکتے ہیں، باقی تو دین کی محنتیں کرتے کرتے چلے گئے، ان کے لئے حالات سازگار نہیں ہوئے، حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے مواقع میسر نہیں آئے تو کیا وہ انبیاء دنیا سے ناکام گئے؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب کیلا انھوں نے حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا کردیا تو اب جو زندگی بھر محنتیں کرکے بھی حکومت الٰہیہ قائم نہ کرسکا وہ تو ناکام ہی نظر آئے گا! اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود مودودی صاحب بھی ناکام گئے، وہ بھی اپنی زندگی میں حکومتِ الٰہیہ قائم نہ کرسکے حتی کہ زندگی بھر عورت کی امارت کی تردید کرتے رہے اور آخر میں فاطمہ جناح کی تائید کی مگر اس کو جتوانہ سکے اور خود بھی حکومت الٰہیہ قائم کئے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کی فکر ہے مگر
اپنے اندر دین قائم کرنے کی فکر نہیں

آج جماعت اسلامی میں جو لوگ ہیں ان کی زندگی پر سرسری نظر ڈالیں تو آپ پائیں گے کہ ان کو نمازوں سے کوئی دلچسپی نہیں، روزوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کا لباس اسلامی نہیں، ان کے چہرے اسلامی نہیں، البتہ صبح سے شام تک سیاسی سرگرمیوں کے لئے دوڑ دھوپ کریں گے مگر نماز کا وقت آئے گا تو مسجد میں نظر نہیں آئیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بڑے حضرت نے اسلام کی چکی کا کیلا ہی بدل دیا ہے، حضور ﷺ کے زمانہ سے آج تک پوری امت یہی سمجھتی آئی ہے کہ اسلام کا کیلا رضوان من اللہ ہے، اگر آپ کی عبادتوں سے، آپ کے معاملات سے، آپ کی معاشرت واخلاق سے اللہ خوش ہیں تو آپ کامیاب ہیں اور جہاں حالات سازگار ہوں وہاں حکومت الٰہیہ قائم کرنا بھی مسلمانوں پر فرض ہے اس کا ہمیں انکار نہیں، اسی لئے جب انھوں نے الجہاد فی الاسلام لکھی تو ہمارے اکابر نے منہ بھر کر اس کی تعریف کی۔ پس یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھالیجئے کہ خلافتِ الٰہیہ قائم کرنا وہاں فرض ہے جہاں حالات سازگار ہوں، حضور ﷺ مکہ معظمہ میں تیرہ سال رہے،

کوئی خلافتِ الٰہیہ قائم نہیں کی، مدینہ منورہ آنے کے بعد جب ایک اجتماعیت اور مرکزیت حاصل ہوئی تو پھر آہستہ آہستہ حکومت قائم ہونی شروع ہوئی۔ الغرض دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ سارے مودودی لیٹریچر کا خلاصہ حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے، اللہ کی خوشنودی کا ان کے یہاں کوئی تصور نہیں۔

۳۔ تصوف چنیا بیگم ہے

دین تین چیزوں کا نام ہے، اور تینوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، چولی کے بغیر دامن نہیں ہوسکتا اور دامن کے بغیر چولی بے معنی ہے۔ وہ تین چیزیں کیا ہیں؟ ایک مرتبہ نبی پاک ﷺ صحابہ کے ایک مجمع میں تشریف فرما تھے اور مجلس چل رہی تھی کہ اچانک کوئی صاحب مسجد میں داخل ہوئے، نہایت اجلے کپڑے پہنے ہوئے، بال کالے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی نہا کر آرہے ہیں، مجمع چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور حضور ﷺ کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھے اور سوال کرنے شروع کئے: ما الإيمان؟ ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: چھ چیزوں کو دل سے قبول کرنے کا نام ایمان ہے، یہ باتیں ایمان مفصل میں لی گئی ہیں۔ انھوں نے دوسرا سوال کیا: ما الإسلام؟ اسلام کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: پانچ اعمال کا نام اسلام ہے۔ تیسرا سوال کیا: ما الإحسان؟ نکوکردن کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کو دیکھتے ہوئے عبادت کرو، اور اگر تم اللہ کو نہیں دیکھ رہے تو اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ بس یہ مؤمن کی زندگی کا خلاصہ ہے اور انہی تین چیزوں کا مجموعہ دین کہلاتا ہے اور ان کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے، اسی ایمان کو مدرسوں میں علم کلام کے نام سے پڑھایا جاتا ہے، اور اسلام کو فقہ کے نام سے پڑھایا جاتا ہے، اور احسان: تصوف کا نام ہے اور تصوف تصحیح نیت کا نام ہے اور یہی احسان یا تصوف ایمان (عقائد) اور اسلام (اعمال) کی جان ہے، اگر عقائد میں نیت صحیح نہ رہے تو وہ نفاق اعتقادی ہے، اعمال میں نیت صحیح نہ رہے تو وہ شرک خفی ہے، الغرض یہ تینوں چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ اب مودودی صاحب آئے، انھوں نے ایمان واسلام کو تو مان لیا مگر تصوف کے بارے میں کہا کہ یہ چنیا بیگم ہے، افیم ہے، جس

چیز کو اللہ کے رسول نے ایمان واسلام کے ساتھ لازم ملزوم کر کے بیان کیا ہے اس کو جناب عالی نے چنیا بیگم قرار دیدیا۔ اور یہ نظریہ صرف انہی کا نہیں، غیر مقلد بھی یہی کہتے ہیں کہ تصوف ایک بھوت ہے جو لوگوں پر چڑھ جاتا ہے۔ اللہ غنی! قرآنِ کریم میں جس کے تذکرے ہیں، حدیثوں میں جس کے تذکرے ہیں وہ چنیا بیگم اور بھوت قرار دیدیا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ جن کو یہ غیر مقلد اور مودودی بھی بڑا مانتے ہیں، انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں احسان پر اتنا لمبا باب باندھا ہے کہ اس کی شرح رحمۃ اللہ الواسعہ میں تین سو صفحے میں آئی ہے۔ بہر حال اس جماعت کی تیسری گمراہی یہ ہے کہ احسان اور تصوف کو نہیں مانتے، اس کو چنیا بیگم (افیم) قرار دیتے ہیں۔ پس جس چیز کا قرآن وحدیث میں اتنا صاف تذکرہ آیا ہے اس کا اگر کوئی انکار کرے تو وہ اہل حق میں سے کیسے ہوگا؟

۴۔ دین ہم خود سمجھیں گے!

قرآن میں حضور ﷺ کے بارے میں آیا ہے: ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ حضور ﷺ صحابہ کو قرآن وحدیث سکھلاتے ہیں، قرآن وحدیث کا نام ہی دین ہے، صحابہ نے قرآن وحدیث تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعین کو، اس طرح دین سیکھنے کا سلسلہ چلتے چلتے ہم تک پہنچا۔ مودودی صاحب نے اسلاف سے دین فہمی کا یہ سلسلہ کاٹ دیا اور کہا کہ دین سمجھنے کے لئے اسلاف سے تعلق قائم کرنے کی ضرورت نہیں، دین ہم خود سمجھیں گے، قرآن وحدیث ہم خود سمجھیں گے، وہ ماڈرن اسلام کے داعی ہیں، تیرہ سو سال سے اسلاف نے دین کو جس طریقہ پر سمجھا ہے وہ اولڈ اسلام ہے اور ماڈرن اسلام کہاں سے آئے گا؟ اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کا اسلاف سے جو طریقہ چلا آرہا ہے ہم اسے نہ لیں بلکہ ہم قرآن وحدیث کو خود سمجھیں۔ یہ سب سے بڑی گمراہی ہے، اس سے بڑی گمراہی کوئی نہیں ہوسکتی۔ میرے بھائیو! قرآن وحدیث ماڈرن ہیں یا اولڈ؟ اولڈ ہیں، آج بھی مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن ہے اور ایک ہاتھ میں حدیث ہے، ان دونوں کے ہوتے ہوئے ماڈرن اسلام کہاں سے آئے گا؟ ہاں اگر ماڈرن قرآن لائیں، ماڈرن حدیثیں

لائیں تو ماڈرن اسلام بھی آسکتا ہے، لیکن یہ قرآن وحدیث تو چودہ سو سال پرانے ہیں ان میں سے مارڈن اسلام کیسے نکلے گا؟! ان میں سے ماڈرن اسلام نکالنے کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ قرآن کی من مانی تفسیر کریں، حدیثوں کی من مانی تشریح کریں اور ماڈرن اسلام نکال لیں۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کے ساتھ یہ ظلم کیا کہ اسلاف سے قرآن سیکھنے کی ضرورت نہیں، چند نوجوان، چند ڈاکٹر، چند پروفیسر بیٹھ جاتے ہیں اور جو سمجھ میں آئے تشریح کرتے ہیں، بلکہ اب تو عورتیں بھی بیٹھ جاتی ہیں۔ اور بے دھڑک من مانی تفسیر کرتی ہیں۔

الغرض قرآن وحدیث کے سمجھنے کے لئے اسلاف سے جو تسلسل چلا آرہا تھا وہ تسلسل انھوں نے کاٹ دیا، اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے نئی تشریح کی اور یوں ماڈرن اسلام نکال کر لے آئے۔ ماڈرن اسلام چاہئے تھا تو نیا قرآن نازل کرتے، نئی حدیثیں گڑھتے۔ ان کی یہ گمراہی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک گمراہی ہے۔

۵- بالا دستی عقل کو حاصل ہے یا نقل کو؟

اللہ نے ہمیں عقل دی ہے، اور استعمال کرنے کے لئے دی ہے، کھوپا کھانے کے لئے نہیں دی۔ اور اللہ نے نبوت کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے اور کتابیں نازل کی ہیں، اور آخری کتاب قرآن کریم ہے، اور اس کی تبیین وتشریح حدیثیں ہیں، یہ ہے نقل۔ اس نقل کے بھیجنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ صرف عقل سے مسئلہ حل نہیں کرسکتے، آپ عقل سے کھیتی کرسکتے ہیں، بزنس کرسکتے ہیں، ایٹم بم بناسکتے ہیں، ہوائی جہاز بناسکتے ہیں، دنیا کے سارے کام کرسکتے ہیں لیکن اللہ کی پسند اور ناپسند کو عقل سے نہیں جان سکتے، جنت میں لے جانے والے اعمال کونسے ہیں اور جہنم میں لے جانے والے اعمال کونسے ہیں؟ آپ اس کو عقل سے طے نہیں کرسکتے، اگر عقل سے یہ مسائل طے ہوسکتے تھے تو جیسے کھیتی سکھانے کے لئے، بزنس سکھانے کے لئے اور صنعت سکھانے کے لئے کوئی نبی نہیں آیا دین سکھانے کے لئے بھی کسی نبی کی ضرورت نہیں تھی، لوگ اپنی عقل سے خود ہی دین تجویز کرلیتے، مگر چونکہ یہ کام صرف عقل سے نہیں کیا جاسکتا اس لئے اللہ نے عقل کے ساتھ ہمیں نقل بھی دی۔ اب بتاؤ اس

عقل اور نقل میں توازن کیسے قائم کیا جائے؟ دونوں برابر تو ہو نہیں سکتے۔ عقل اوپر ہے اور نقل نیچے، یعنی عقل جو کہے وہی نقل کا مطلب لیا جائے۔ یہ مودودیوں کا ذہن ہے، ان کے نزدیک آیت کا مطلب جوان کی عقل کہے بس وہی صحیح ہے، جوان کی عقل کہے وہی حدیث کا مطلب ہے، اور چودہ سو سال سے یہ چلا آرہا ہے کہ نقل اوپر ہے اور عقل اس کے نیچے، اللہ نے عقل نقل کو سمجھنے کے لئے دی ہے، آپ اس عقل کی مدد سے قرآن وحدیث کو سمجھیں مگر اس کو قرآن وحدیث پر حاکم نہ بنائیں، قرآن وحدیث کو اُس روشنی میں سمجھا جائے گا جو حضور ﷺ کے زمانہ سے چلی آرہی ہے اگر آپ کی عقل آیت اور حدیث کا وہ مطلب سمجھتی ہے جو مطلب حضور ﷺ اور صحابہ کے زمانہ سے چلا آرہا ہے تو سبحان اللہ! اور اگر آپ کی عقل کوتاہ ہے تو آپ عقل کے پیچھے نہیں چلیں گے بلکہ نقل کی پیروی کریں گے اور نقل کا جو مطلب چودہ سو سال سے سمجھا جارہا ہے اسی کو لیں گے۔ مودودی صاحب نے عقل کو نقل سے اوپر کردیا اور کہا کہ جو مطلب ہماری عقل میں آئے گا بس وہی مطلب صحیح ہے، اسی کو ہم لیں گے۔ یہی مزاج ماضی میں معتزلہ کا رہا ہے، اور یہی مزاج آج مودودیوں کا ہے۔

مودودی حضرات کی یہ وہ پانچ گمراہیاں ہیں جو میں نے مختصراً آپ حضرات کے سامنے رکھی ہیں، میں تفصیل میں نہیں گیا کیونکہ آگے سفر درپیش ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں راہ حق دکھائیں اور اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

۱۸

حجۃ اللہ البالغہ سے فائدہ کیسے اٹھائیں؟

تمہید: حضرت مولانا مفتی یوسف ساچا صاحب دامت برکاتہم کے دولت کدہ پر (بروز پیر مورخہ ۱۴ر شعبان ۱۴۳۱ھ مطابق ۲۶ر جولائی ۲۰۱۰ عیسوی) حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) دامت برکاتہم تشریف لائے، اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ہم چند دوستوں نے ان سے حجۃ اللہ البالغہ کے بارے میں ابتدائی معلومات بیان کرنے کی درخواست کی۔ حضرت محترم نے درخواست بصد خوشی قبول فرمائی اور مذکورہ تاریخ میں گیارہ بجے صبح سے قبل الظہر ایک بج کر پچاس منٹ تک موصوف نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے سلسلہ میں ابتدائی معلومات پر مشتمل تقریر فرمائی، چونکہ موصوف حجۃ اللہ البالغہ کے شارح ہیں اور آپ کی شرح کو ہندو پاک کے ممتاز علماء کرام نے سراہا ہے، اس لئے ہمیں اس سلسلہ کی معلومات جاننے کا شوق پیدا ہوا اور اس مقصد کے پیش نظر گذارش کی گئی، سامعین کی تعداد تقریباً ساٹھ ستر تھی، جو سب علماء تھے، پیر کا دن اور صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے اکثر علماء مصروفیت اور مشغولیت کی بنا پر شرکت سے معذور رہے، حضرت موصوف نے اہم باتیں ہمارے سامنے بیان فرمائیں جن کو اسی وقت ریکارڈ کرلیا گیا، بعد میں ان کو کاغذ پر نقل کیا گیا۔ الحمد للہ علی ذلک۔ یوسف احمد پٹیل ماما قاسمی عفی عنہ مقیم باٹلی (برطانیہ)

تقریر کا آغاز

خطبۂ مسنونہ کے بعد: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۝﴾

واجب الاحترام علمائے کرام! مجھے آج تقریر کے لئے موضوع یہ دیا گیا ہے کہ امام الہند حضرت اقدس شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ کی مشہور زمانہ، مایۂ ناز کتاب: **حجة الله البالغة** کے سلسلہ میں کچھ باتیں عرض کروں۔

آپ سبھی حضرات جانتے ہیں کہ حجۃ اللہ البالغہ ایک دقیق کتاب ہے، مگر دقیق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس سے پردہ نہیں اٹھایا جاسکتا، اس کو حل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو سمجھنے کے لئے محنت کرنی پڑے گی۔ عام کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے جتنی محنت درکار ہوتی ہے اتنی محنت اس کتاب کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے محنت شاقہ کرنی پڑے گی، جبھی کتاب سمجھ میں آئے گی۔

جیسے ایک حدیث ہے: **أَرْبَعٌ فِىْ أُمَّتِىْ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، لَنْ يَّدَعَهُنَّ النَّاسُ، النِّيَاحَةُ، والطعنُ فى الأَحْسَاب، والْعَدْوىٰ: أَجْرَبَ بعيرٌ فأجرب مأةَ بعيرٍ، مَنْ أَجْرَبَ البعيرَ الأولَّ؟ وَالْأَنْوَاءُ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كِذَا وَكَذَا** (ترمذی شریف حدیث:۸۸۲)

ترجمہ: میری امت میں جاہلیت کی چار باتیں ایسی ہیں جنھیں لوگ ہرگز نہیں چھوڑیں گے (۱) نوحہ کرنا، مرنے والے کا ماتم کرنا (۲) خاندان پر اعتراض کرنا (۳) یہ اعتقاد رکھنا کہ ایک کی بیماری دوسرے کو لگتی ہے، لوگ کہتے ہیں: ایک اونٹ کو کھجلی ہوئی تو سب کو ہوگئی، ان سے پوچھو: پہلے اونٹ کو کھجلی کہاں سے لگی (۴) پچھتّروں کا عقیدہ کہ فلاں پچھتر لگا تو بارش ہوئی۔

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب امت ان باتوں کو نہیں چھوڑے گی تو یہ باتیں چلنے دی جائیں، ان کے ازالے کے لئے محنت نہ کی جائے، بلکہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مصلحین امت ان چار باتوں کو امت میں سے نکالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں، کسی بھی طریقے سے ان چار باتوں کو امت میں سے ختم کریں، جیسے کپڑے پر داغ لگ جاتا ہے تو دھوتے ہیں اور چائے گر جاتی ہے تو اس کو ہر ممکن طریقہ سے زائل کرتے ہیں، اسی طرح یہ چار خرابیاں امت میں ایسی ہیں جو آسانی سے نکلنے والی نہیں، پس مصلحین امت کی ذمہ داری ہے کہ ان کے پیچھے خصوصی محنت کریں، اور کسی بھی طرح امت میں سے ان چار باتوں کو نکالیں۔

اسی طرح میں عرض کرتا ہوں کہ حجۃ اللہ البالغہ دقیق کتاب ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو یہ کہہ کر چھوڑ دو کہ یہ ہمارے بس کا روگ نہیں! ارے بھائی! انسان نے لکھی ہے، ہم ایسی کتاب لکھ نہیں سکتے تو سمجھ تو سکتے ہیں، مگر عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ سپر ڈال دیتے ہیں، ہمت ہار جاتے ہیں، کہتے ہیں: یہ کتاب بہت مشکل ہے، چیدہ چیدہ حضرات ہی اس کا مطالعہ کرتے ہیں، عام طور پر لوگوں نے اس کو چھوڑ رکھا ہے، پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ موقوف کر دیا ہے، اس طرح اس کتاب کا جو عظیم فائدہ تھا اس سے امت محروم ہوگئی، اس لئے میں نے قرآن کی جو پہلی وحی ہے اس کی پانچ آیتیں پڑھی ہیں، پہلے یہ پانچ آیتیں سمجھ لی جائیں تو بات آگے بڑھائی جائے گی۔

پڑھنے کی اہمیت

قرآنِ کریم کی پہلی وحی میں دو اقرأ ہیں، ایک: ناخواندہ کا اقرأ ہے اور ایک: خواندہ کا، ناخواندہ کے اقرأ کی آخری حد ہے، مگر خواندہ کا اقرأ غیر محدود ہے، زندگی کے آخری سانس تک پڑھنا چاہئے۔ جب یہ دو اقرأ جمع ہوں گے تبھی قلعہ فتح ہوگا، اگر کسی نے ایک اقرأ پر اکتفا کر لیا تو قلعہ فتح نہیں ہوگا۔

پہلی وحی کے مخاطب اول کون تھے؟ ناخواندہ لوگ! جو اپنے امی ہونے پر فخر کیا کرتے تھے، ان سے پہلی بات جو کہی گئی ہے اس سے پڑھنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ پھر پہلی وحی کا جو پہلا کلمہ ہے اس سے پڑھنے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

پہلی وحی کا پہلا کلمہ: پڑھ!

اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی کا پہلا کلمہ ہے پڑھ! فرمایا: ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾: پڑھ اس پروردگار کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا، جس نے تجھے نیست سے ہست کیا، اس کے نام کی مدد لے کر پڑھ وہ ضرور تجھے عالم بنادے گا۔ ذرا تو اپنی پیدائش کے مراحل کو سوچ، تجھے اللہ نے سات مراحل سے گذار کر انسان بنایا ہے، اور یہ ساتوں مراحل بے جان

مادہ ہیں، ان سات بے جان مادوں سے گذار کر تجھے اشرف المخلوقات بنایا، پس جو ہستی بے جان مادوں میں تبدیلیاں کر کے اشرف المخلوقات بناسکتی ہے وہ تجھ جاہل ناخواندہ کو اگر تو اس کے نام کی مدد سے پڑھے تو مختلف مراحل سے گذار کر عالم نہیں بناسکتی؟ ضرور بناسکتی ہے، پس تو پڑھنے کے لئے کمر کس لے۔

تخلیقِ انسانی کے سات مراحل

تخلیقِ انسانی کے سات مراحل کا تذکرہ اٹھارہویں پارے کے پہلے رکوع میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اُن آیات میں انسان کی تخلیق کے سات مراحل کا بیان ہے، وہ سات مراحل کیا ہیں؟ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو مٹی سے بنایا، پھر مٹی کا ست (جوہر) نکالا، ایک ہی آیت میں دو مرحلوں کا ذکر ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِيْنٍ﴾: مٹی کے جوہر سے ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ مٹی کا جوہر کیا ہے، ہم مٹی سے پیدا ہونے والی غذائیں کھاتے ہیں، ان غذاؤں سے ہمارے بدن میں خون بنتا ہے، یہ خون مٹی کا سلالہ اور جوہر ہے ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ﴾: پھر ہم نے اس جوہر کو نطفہ بنایا، یہ تیسرا مرحلہ ہے، ہمارے بدن میں جو خون ہے اس سے خاص جوہر نکالا جاتا ہے، وہ مادہ بنتا ہے، اس مادے کو اللہ تعالیٰ رحم مادر میں پہنچاتے ہیں اور حمل ٹھہرتا ہے، حمل ٹھہرنے کے بعد بچہ دانی کا منہ بند ہو جاتا ہے، نہ باہر کی کوئی چیز اندر جاسکتی ہے اور نہ اندر کی کوئی چیز باہر آسکتی ہے، یہی قرار مکین: اطمینان سے نطفہ کے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ انسان کی تخلیق کے یہ تین مرحلے ہوئے، مٹی، مٹی کا جوہر (خون) اور مادہ۔

بچہ دانی میں جا کر وہ مادہ چالیس دن میں علقة (خون بستہ) بن جاتا ہے۔ یہ چوتھا مرحلہ ہے جو بیچ کا مرحلہ ہے، جب سات مرحلے ہیں تو بیچ میں کوئی نہ کوئی مرحلہ ضرور ہوگا، پھر اس کے بعد علقة: مضغة (بوٹی) بنتا ہے پھر اس مضغہ میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے۔ یہ کل سات مرحلے ہوئے اور یہ ساتوں مرحلے بے جان مادہ ہیں ان سات مراحل سے گذار کر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی مخلوق بنادی جس سے بہتر اور اشرف

مخلوق کوئی نہیں، بڑی برکت والی ہے وہ ذات جو احسن الخالقین ہے۔

ان سات مرحلوں میں سے بیچ کے مرحلہ کا ذکر فرماتے ہیں: ﴿خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾: اللہ نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا، اس پروردگار کے نام کی مدد سے پڑھ وہ تجھ جاہل ناخواندہ کو عالم بنادے گا۔ یہ پہلا اقرأ ہے جو ناخواندہ کا اقرأ ہے، وہ الف باء سے شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ آدمی میں استعداد پیدا ہوجائے، جب تک استعداد پیدا نہ ہو پڑھتا رہے، دورہ پڑھ کر یہ نہ سمجھ لے کہ میں فارغ ہوگیا۔

دوسرا اِقْرَأْ

پھر دوسرا اقرأ شروع ہوتا ہے اور غور کرو انداز بیان کیسے بدل رہا ہے، فرمایا: ﴿اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾: پڑھ اور تیرا پروردگار بڑا کریم (سخی) ہے، اس کے یہاں فضل کی کمی نہیں، جتنا پڑھے گا اتنا بڑھے گا۔ وہ تجھے بے حساب علم دے گا۔

یہ خواندہ کا اقرأ ہے اور اس کی کم سے کم مقدار متعین ہے، مطالعہ کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد یہ مرحلہ شروع ہوتا ہے، اور اس کی آخری حد کوئی نہیں۔ کائنات میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ نے رسالہ تحذیر الناس میں ایک حدیث لکھی ہے: عُلِّمْتُ علمَ الأولین والآخرین: مجھے اگلوں اور پچھلوں کا علم دیا گیا ہے، پوری کائنات کے پاس جتنا علم ہے اتنا حضور ﷺ کو دیا گیا ہے، ایسی ہستی کو اللہ نے دعا سکھلائی ہے: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾: آپؐ دعا کیجئے کہ اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما، اتنا علم رکھنے والا بھی مامور ہے کہ وہ علم میں اضافہ کی دعا کرے، معلوم ہوا کہ علم کی کوئی حد نہیں۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: ﴿الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ تیرا پروردگار وہ ہے جو قلم کے ذریعہ علم سکھاتا ہے، پہلے استاذ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتا ہے پھر قلم کے ذریعہ یعنی اگلوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھتا ہے، اس طرح ﴿عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾: اللہ تعالیٰ انسان کو وہ علوم سکھاتے ہیں جو وہ نہیں جانتا یعنی جو اس نے مدرسہ کی زندگی میں نہیں جانے وہ علوم

اب ذاتی مطالعہ سے حاصل کرے گا۔

دورِ تنزل

مگر اب تنزل کا زمانہ آگیا ہے۔ طلبہ کے پڑھنے میں بھی اور اساتذہ کے پڑھنے میں بھی، طلبہ استعداد بننے سے پہلے فارغ ہوجاتے ہیں، اور اساتذہ عربی کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتے، وہ سمجھتے ہیں کہ اردو شرحوں سے کام چل جائے گا، حالانکہ مصادر اصلیہ کا مطالعہ کئے بغیر علم میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا، اس لئے میں نے یہ آیات کریمہ پڑھیں تاکہ ہم اپنی کمی دور کریں، اگر ہم نے اپنی کمی دور کرلی تو پھر ہمیں حجۃ اللہ البالغہ کسی سے پڑھنے کی ضرورت نہیں، یہ تو دوسرے اقرأ میں آتی ہے، ہر ایک کو یہ کتاب خود پڑھنی ہے، مگر پڑھے گا وہی جو پہلے مرحلہ کے اقرأ سے کامیاب گذرا ہے، اگر پہلے مرحلہ سے کامیاب نہیں گذرا تو نہ خود مطالعہ کرسکتا ہے نہ اس کو پڑھانے سے کچھ حاصل ہوگا، میں نے یہ کتاب حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ سے پڑھی ہے۔ حضرت کثیر الاسفار تھے، صرف چند ابواب ہم نے حضرت سے پڑھے ہیں مگر اس سے کتاب کا اندازہ ہوگیا اور ہم نے طے کرلیا کہ اس کتاب کو حل کرکے چھوڑیں گے الحمد للہ وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوگیا، کتاب حل کرلی، بلکہ شرح بھی لکھ دی۔

شاہ صاحب کی دور بینی

حضرت حکیم الاسلام قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مستقبل میں جو محسوسات کا دور شروع ہونے والا تھا اس کو پہلے سے محسوس کرلیا تھا، حضرت شاہ صاحبؒ کا زمانہ عقلیت پسندی کا زمانہ تھا، مگر شاہ صاحب کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ آگے محسوسات کا دور آرہا ہے، سائنس کا دور آرہا ہے، ہر بات محسوس کرکے امت کے سامنے پیش کرنی ہوگی۔ اب یہ دور شروع ہوچکا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ اسی دور کے لئے لکھی ہے، اور اس میں ایسے افکار پیش کئے ہیں جن کی روشنی میں تمام مسائل شرعیہ کو محسوس بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے، یورپ اور امریکہ تو ترقی یافتہ ممالک ہیں، یہاں بچے بھی ہر بات کی

وجہ پوچھتے ہیں، ابھی اس نے ہوش کے ناخن بھی نہیں لئے، مگر مسائل شرعیہ کے بارے میں پوچھتا ہے: ایسا کیوں ہے؟ یعنی مسئلہ کو محسوس کرکے سمجھاؤ، تبھی وہ سمجھے گا ورنہ نہیں سمجھے گا۔

بیت اللہ کی چھت نہ دیکھنے کی وجہ

ٹورنٹو کی مسجد دارالسلام میں ایک باپ اپنے بچہ کو لے کر آیا، بچے کی عمر مشکل سے دس گیارہ سال رہی ہوگی، اس کا باپ کہنے لگا: اس بچہ کا ایک سوال ہے، آپ اس کا جواب دیں۔ میں نے پوچھا: پیارے! تیرا کیا سوال ہے؟ اس نے کہا: میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ جو شخص کعبہ شریف کے اندر جائے وہ چھت کی طرف نہ دیکھے، ایسا کیوں ہے؟ چھت کی طرف کیوں نہیں دیکھ سکتا؟ میں نے اس سے پوچھا: کعبہ شریف کے اندر کیوں جاتے ہیں؟ وہ بچہ تھا کیا جواب دیتا! اس لئے میں نے اسے بتایا کہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے لئے جاتے ہیں، عبادت کرنے کے لئے جاتے ہیں، پھر میں نے اس سے پوچھا: پرانی عمارتیں (آثار قدیمہ) دیکھنے کے لئے اسکول کے بچے کیوں جاتے ہیں؟ اس نے کہا: عمارت دیکھنے کے لئے جاتے ہیں کہ کیسی ہے؟ کس چیز سے بنی ہے؟ اب میں نے اس کو سمجھایا کہ کعبہ شریف تمام عمارتوں سے پرانی عمارت ہے، مگر اس کے اندر جانا آثار قدیمہ دیکھنے کے لئے جانا نہیں ہے، اندر جانا عبادت کے لئے ہے، اللہ جتنی توفیق دیں نماز پڑھنی چاہئے اور نماز پڑھ کر نکل آنا چاہئے، دیواریں دیکھنا، چھت دیکھنا وغیرہ تو آثارِ قدیمہ کی عمارتوں میں ہوتا ہے، اور دیوار دیکھنے کی ممانعت اس لئے نہیں کی کہ اس پر تو ضرور ہی نظر پڑے گی، اس سے نظر بچا نہیں سکتے، اور چھت کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ بچہ سمجھ گیا، اور مطمئن ہوکر چلا گیا، کیونکہ میں نے محسوس بنا کر بات پیش کی تھی، اس لئے وہ آسانی سے سمجھ گیا۔

اسی طرح ایک نوجوان میرے پاس آیا، یہ بھی ٹورنٹو کا واقعہ ہے، اس نے سوال کیا: دو نمازیں: ظہر اور عصر خاموش کیوں ہیں؟ اور تین نمازیں: مغرب، عشاء اور فجر جہری کیوں ہیں؟ یہ ایک دقیق مسئلہ تھا، ہمارے طلبہ بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے، وہ تو کالج میں پڑھنے والا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: آپ کی شادی ہوئی ہے؟ اس نے کہا: ہاں! میں نے کہا: تم

میاں بیوی گپ کب کرتے ہو؟ دن میں یا رات میں؟ اس نے کہا: رات میں، دن میں تو ضروری باتیں کرتے ہیں، میں نے کہا: آپ کے سوال کا یہی جواب ہے، دن کو اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ زیادہ باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا، اسی لئے سنیما، تھیٹر اور گانے بجانے کے پروگرام رات میں ہوتے ہیں کیونکہ رات کی فطرت میں اللہ نے انبساط رکھا ہے اور دن کی فطرت میں انقباض اور جب طبیعت میں انقباض ہوتا ہے تو نہ سنانے کو جی چاہتا ہے نہ سننے کو، اس لئے دن کی نمازیں خاموش ہیں، اور رات میں طبیعت میں انبساط ہوتا ہے سنانے کو بھی جی چاہتا ہے اور سننے کو بھی، اس لئے رات کی نمازیں جہری ہیں۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ دن کی فطرت میں انقباض اور رات کی فطرت میں انبساط کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دن کو اللہ تعالیٰ نے معاش کا وقت بنایا ہے، اگر اس میں انبساط رکھا جاتا تو آدمی ٹی وی دیکھتا رہتا، گاتا بجاتا رہتا، بیوی سے گپ کرتا رہتا۔ نہ جوب (کام) پر جاتا نہ شوپ (دوکان) پر، اس لئے اس میں انقباض رکھا تا کہ آدمی صبح اٹھ کر نہا دھو کر نوکری پر پہنچ جائے یا دوکان کھول کر بیٹھ جائے، اور رات میں کوئی دھندا نہیں، وہ سونے کے لئے ہے، اس لئے رات میں انبساط رکھا۔ اور شریعت نے انقباض وانبساط کا احکام میں لحاظ رکھا، اسی لئے دن کی نمازوں کو سری اور رات کی نمازوں کو جہری کردیا۔

اس نے سوال کیا: پھر جمعہ اور عیدین میں جہری قرأت کیوں ہے؟ میں نے اس سے پوچھا: آپ کے یہاں روز زفاف ہوتا ہے یا نہیں؟ شادی کے بعد رخصتی دن میں عمل میں آتی ہے یا نہیں؟ اس نے کہا: دن میں بھی عمل میں آتی ہے (یورپ اور امریکہ میں دن میں بھی رخصتی ہوتی ہے) میں نے کہا: جب رخصتی دن میں ہو اور روزِ زفاف ہو تو پہلی ملاقات میں میاں بیوی گپ کرتے ہیں یا نہیں؟ اس نے کہا: کرتے ہیں، میں نے کہا: یہی آپ کے سوال کا جواب ہے، اس نے کہا: میں سمجھا نہیں۔ میں نے کہا: یہ موقع کی بات ہے اور خاص موقعوں کے احکام الگ ہوتے ہیں، جمعہ کے دن اور عید کے دن آدمی نہاتا ہے، نئے یا دھلے ہوئے کپڑے پہنتا ہے، خوشبو لگاتا ہے اور بڑے اجتماع میں پہنچتا ہے۔ ایسے موقعہ پر طبیعت میں انبساط پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے قرآن زور سے پڑھا جاتا ہے۔

یہ دقیق ترین مسئلہ تھا مگر میں نے اس کو محسوس بنادیا تو اس کی سمجھ میں آگیا، یہ سب حجۃ اللہ کی برکت ہے، حجۃ اللہ میں یہ مسئلہ نہیں آیا، مگر پڑھتے پڑھاتے ایک مزاج بن گیا، اب شریعت کا کوئی مسئلہ ہو میں اس کو محسوس بنا کر پیش کرسکتا ہوں۔

غرض حکیم الاسلام نے فرمایا: شاہ صاحب کو ڈیڑھ سوسال پہلے یہ بات محسوس ہوگئی تھی کہ اب عقلیت کا دور ختم ہونے والا ہے اور سائنس کا دور شروع ہونے والا ہے، جس میں معنویات کو محسوس بنا کر پیش کرنا ہوگا، اس لئے شاہ صاحب نے حجۃ اللہ لکھی تا کہ دوسوسال کے بعد جب یہ دور شروع ہو، علماء امت اس قابل ہوجائیں کہ وہ ہر مسئلہ کو محسوسات کے دائرہ میں لاکر افہام وتفہیم کرسکیں۔

مشکل کتاب کو حل کرنے کا طریقہ

اگر آپ کوئی گہرا فن اور گہری کتاب سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ شاہ صاحبؒ نے یہ بتایا ہے کہ پہلے اس کے آلات جمع کریں، کسی بھی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے جو ابتدائی معلومات درکار ہوتی ہیں ان کو جمع کریں، پھر تدریجاً آگے بڑھیں، ایک دم چھلانگ نہ لگائیں، مثلاً: حجۃ اللہ میں ایک مضمون ہے، اس میں ہے کہ واقعات سلسلۂ مُعِدَّات ہیں، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے مُعِدّ کو سمجھنا پڑے گا، اس کے بغیر یہ بات نہیں سمجھ سکتے، غور کریں کہ یہ کس فن کی بات ہے؟ یہ منطق کی اصطلاح ہے، منطق کی کتابوں میں معدّ وہ چیز ہے جو موجود ہوکر فنا ہوجائے تب اگلا فرد وجود میں آئے، جیسے میرا ایک قدم وجود میں آیا، پھر دوسرا قدم کب وجود میں آئے گا؟ جب میں پچھلا پیر اٹھا کر آگے رکھونگا تب دوسرا قدم وجود میں آئے گا، اب پچھلا قدم ختم ہوگیا، اور دوسرا قدم وجود میں آگیا، اسی طرح اعداد (گنتی) بھی سلسلہ معدات ہیں، چھ میں ایک ملائیں گے تب سات بنیں گے، اب چھ ختم ہوگئے اور سات وجود میں آگئے، اسی طرح سات میں ایک ملایا تو آٹھ بنا، اب سات ختم ہوگیا اور آٹھ وجود میں آگیا۔

غرض لفظ یا اصطلاح جس فن کی ہے اس فن میں جا کر جب تک معنی متعین نہیں کریں گے پلّے کچھ نہیں پڑے گا، اس لئے شاہ صاحب نے فرمایا کہ جب کوئی مشکل مضمون ہو یا

مشکل کتاب ہو اور آپ اس کو سمجھنا چاہیں تو پہلے اس کے آلات مہیا کریں، جو تمہیدی باتیں ضروری ہیں ان کو پہلے حاصل کریں، پھر تدریجاً آگے بڑھیں۔ تدریج سے ذہن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اور رفتہ رفتہ آدمی مجتہد بن جاتا ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ رات میں سوتے نہیں تھے، سوچتے تھے اور جب کوئی دقیق مسئلہ حل ہوتا تو صحن میں گھومتے تھے، اور خوش ہوکر فرماتے: بادشاہوں کے لڑکوں کو یہ نعمت کہاں حاصل! امین و مامون کو یہ نعمت کہاں حاصل! بہت خوش ہوتے تھے۔

معلوم ہوا کہ سوچنا بھی ایک مطالعہ ہے، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہ اللہ جب درس کے لئے آتے تو پہلے وضو کرتے، عمامہ باندھتے، پھر تپائی پر رکھ کر ترمذی شریف کھولتے اور جو ابواب پڑھانے ہوتے ان کو ایک نظر دیکھتے، پھر کتاب بند کر کے دس منٹ سوچتے، پھر پڑھانے کے لئے چل دیتے، یہ سر جھکا کر بیٹھنا ہی ان کا مطالعہ تھا کیونکہ موادتو سارا دماغ میں اکٹھا ہوتا ہی تھا، صرف ترتیب دینے کی ضرورت تھی کہ مسئلہ کو کس انداز سے بیان کرنا ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ کے مقدمہ میں لکھا ہے: **وكذلك كلُّ علم يَتَراءٰى بادیَ الرأی: أن البحث عنه مستحيلٌ، و الاحاطةَ به ممتنعةٌ، ثم إذا ارْتِيْضَ بأَدَوَاتِهِ، وَتُدُرِّجَ فی فهم مقدِّماته حصل التمكُّن فيه، وتيسر تأسيس مبانيه، وتفريعُ فروعه وذويه**: اسی طرح ہر فن سرسری نظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بحث کرنا ممکن نہیں، اور اس کا احاطہ کرنا محال ہے، مگر جب اس کے اوزاروں کے ذریعہ اس کو سدھالیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی تمہیدی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جماؤ حاصل ہوجاتا ہے، اور اس کی بنیادوں کو قائم کرنا اور اس کی جزئیات ومتعلقات کی تفریع کرنا آسان ہوجاتا ہے (رحمۃ اللہ ۱:۱۲۱)

حجۃ اللہ مشکل کیوں ہے؟

اور حجۃ اللہ دو وجہ سے مشکل ہے، ایک: اس میں ایجاز (اختصار) ہے اور جب بھی کلام

میں ایجاز ہوتا ہے بات مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔ دوم: مضامین بہت بلند ہیں، میں نے رحمۃ اللہ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ شاہ صاحبؒ عرش پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ ان مضامین کو فرش پر لانا مشکل ہوتا ہے، جب تک ان کی اصطلاحات حل نہ کی جائیں، ان کے انداز بیان سے واقفیت پیدا نہ کی جائے مضمون سمجھ میں نہیں آتا۔

حجۃ اللہ کیسے سمجھیں؟

مگر اب حجۃ اللہ کا سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے، آپ رحمۃ اللہ الواسعہ لے کر بیٹھیں اور ایک مقدار متعین کریں کہ مجھے روزانہ ایک مسئلہ پڑھنا ہے یا تین صفحے پڑھنے ہیں، اس سے زیادہ نہ پڑھیں، اس کو اپنی کاپی میں دوسرے لفظوں میں لکھیں، لمبے مضمون کو مختصر کریں اور چوبیس گھنٹے اس مضمون کو دماغ میں گھمائیں، ساتھیوں سے مذاکرہ کا موقعہ ملے تو مذاکرہ کریں، ساتھی نہ ملیں تو چند تپائیاں سامنے رکھ کر تقریر کریں، اس سے مضمون یاد بھی ہوگا اور ذہن میں بھی بیٹھے گا۔

البتہ حجۃ اللہ کی دو قسمیں ہیں: قسم اول میں سات مباحث ہیں اور ہر مبحث میں متعدد ابواب ہیں، اگر کوئی ان سات مباحث پر قابو پالے تو شریعت کا ہر مسئلہ حل کرسکتا ہے، ہر مسئلہ کا راز اور حکمت پا سکتا ہے۔ حجۃ اللہ میں اُس مسئلہ کا ہونا ضروری نہیں، اور قسم ثانی میں حضرت نے مشکوٰۃ شریف کو سامنے رکھ کر اسی ترتیب سے حدیثیں لکھی ہیں اور حدیثوں میں جو حکم آیا ہے اس کا راز بیان کیا ہے اس کی حکمت بیان کی ہے۔

قسم ثانی کا سمجھنا آسان ہے، کہیں کہیں کوئی بات مشکل آجاتی ہے، ورنہ وہ بہت آسان ہے، ہر پڑھا لکھا آدمی اس کو سمجھ سکتا ہے، پس جو حضرات حجۃ اللہ کا مطالعہ کریں وہ پہلے قسم ثانی پڑھیں، جب اس سے فارغ ہوں تو قسم اول شروع کریں، رحمۃ اللہ میں میں نے اس کی ایک مثال دی ہے۔ ایک ماہر باورچی ہے، اس کے پاس پلاؤ پکانے کا ایک فارمولہ ہے، مگر مجمع میں باورچی اس فارمولہ کو بتائے تو ضروری نہیں کہ ہر آدمی اس فارمولہ کے مطابق پلاؤ پکالے، کوئی کامیاب ہوسکتا ہے اور کوئی ناکام۔ لیکن اگر وہ باورچی پلاؤ پکا کر سب کے سامنے

پلیٹوں میں کھانا سجادے تو پھر کیا دیر ہے؟ ہاتھ بڑھائے اور کھانا شروع کرے۔ پہلی قسم میں حضرت نے اصول وضوابط بیان کئے ہیں اور اصول وضوابط ہمیشہ نظری ہوتے ہیں اور نظری چیزوں کا سمجھنا دشوار ہوتا ہے اس لئے قسم اول کا سمجھنا دشوار ہے، اور قسم ثانی میں حدیثوں کو سامنے رکھ کر ان میں جو احکام آئے ہیں ان کے اسرار وحکم بیان کئے ہیں، یعنی اصول وضوابط کے مطابق حدیث میں مذکور احکام کے اسرار وحکم بیان کر کے کھانا سامنے کر دیا ہے، اب کیا کمی ہے آگے بڑھو اور خوانِ نعمت سے فائدہ اٹھاؤ۔

حجۃ اللہ کے ہم پلہ کوئی کتاب نہیں

حجۃ اللہ کے انداز پر اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن حجۃ اللہ کے ہم پلہ کوئی کتاب نہیں، حضرت تھانویؒ کی **المصالح العقلية في الأحكام النقلية** ہے، اس میں صرف احکام کی حکمتیں ہیں کہ یہ حکم کیوں ہے؟ وضوء میں چار فرض کیوں ہیں؟ اطراف کیوں دھوئے جاتے ہیں؟ لیکن اس میں کوئی ایسا فارمولہ نہیں کہ وہ ہم جان لیں تو خود شریعت کے احکام کی حکمت نکال لیں، اور حجۃ اللہ میں آدھی کتاب میں ایسے ہی فارمولے بیان کئے ہیں۔ علامہ حسین جسر رحمہ اللہ نے بھی عقائد میں ایک کتاب لکھی ہے، انھوں نے بھی احکام کی علتیں بیان کی ہیں، مگر فارمولہ بیان نہیں کیا، الغرض جو بھی کتاب اس باب میں لکھی گئی ہے وہ حجۃ اللہ کے ہم پلہ نہیں، حجۃ اللہ پہلی اور آخری کتاب ہے، اس میں جہاں احکام کی حکمتیں بیان کی گئی ہیں وہیں اصول اور ضابطے بھی بیان کئے گئے ہیں۔

نظام الاوقات بنانا ضروری ہے

مگر ہمارے فضلاء پر احساس کمتری چھایا ہوا ہے وہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے، بھائیو! کب تک سننے کے محتاج رہوگے، پڑھنا شروع کرو، دس سال تک کانوں سے علم حاصل کیا اب آنکھوں کو استعمال کرو، اور اس کے ذریعہ علم حاصل کرو، کہتے ہیں: اجی وقت نہیں، فرصت نہیں، بھائی! جب آپ چاہیں گے وقت بھی نکل آئے گا اور فرصت بھی مل جائے گی۔ اپنا

حساب کرو، ہم کم از کم چار گھنٹے فضولیات میں ضائع کرتے ہیں، اِدھر کھڑے ہیں، اُدھر باتیں کررہے ہیں، خواہ مخواہ مس کال ماررہے ہیں، پیسہ بھی برباد کررہے ہیں اور وقت بھی ضائع کررہے ہیں، ہمیں چاہئے کہ وقت کی حفاظت کریں، وقت کو بچا کر پڑھنے کا نظام بنائیں۔ نظام الاوقات بنائے بغیر کچھ نہیں ہوگا، طے کرلیں کہ فلاں وقت یہ کرنا ہے اور فلاں وقت وہ، رات کو دس بجے سے بارہ بجے تک ضرور پڑھنا ہے، اور یہ پڑھنا ہے، اور اس طرح پڑھنا ہے، کچھ بھی ہوجائے پڑھنا ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ کا واقعہ ہے: ایک مرتبہ ان کے استاذ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب تھانہ بھون آئے، حضرت تھانویؒ بہت خوش ہوئے اور زور کی دعوت کی، کھانے کے بعد مجلس میں بیٹھے۔ حضرت تھانویؒ نے عرض کیا: حضرت! اس وقت میرا بیان القرآن لکھنے کا معمول ہے اگر اجازت ہو تو میں لکھنے کے لئے چلا جاؤں؟ حضرت نے فرمایا: بالکل جاؤ اور لکھو! حضرت تھانوی چلے گئے، اور دس منٹ کے بعد آ گئے، حضرت نے پوچھا: کیوں آگئے؟ کہنے لگے: حضرت! میں نے اپنا معمول پورا کرلیا، اور چونکہ آپ تشریف فرما ہیں اس لئے لکھنے کو جی نہیں چاہتا، دس منٹ لکھا اور معمول پورا کرلیا، اس طرح آدمی نظام الاوقات بنائے تو کامیابی حاصل ہوتی ہے، یہ نہیں کہ کسی دن موقع ملا تو پڑھ لیا اور سات دن ناغہ کردیا۔ اب آٹھویں دن پڑھنے کو جی نہیں چاہے گا، اس لئے ایک وقت مقرر کرکے مطالعہ میں لگ جاؤ اور پابندی سے لگے رہو تو استعداد بڑھے گی، دماغ میں معلومات جمع ہونگی، اور رفتہ رفتہ دین کا علم پکا ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حجۃ اللہ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا أن الحمدللہ رب العالمین.

۱۹

جھگڑا کھڑا کرنے والی چھ باتیں

(تمسخر کرنا، طعنہ دینا، برا لقب رکھنا، بدگمانی کرنا، ٹوہ میں لگنا، غیبت کرنا)

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَايَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِنْهُمْ، وَلَا نَسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ، وَلَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ، وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ، وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ ○ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِنَ الظَّنِّ، إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ، وَلَا تَجَسَّسُوْا، وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ، وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ﴾ (الحجرات ۱۱و۱۲)

بزرگو اور بھائیو! میں نے آپ کے سامنے جو آیات پاک پڑھی ہیں وہ سورۂ حجرات کی ہیں، ان میں تھوڑا اوپر سے مضمون شروع ہورہا ہے اگر دو مسلمان آپس میں لڑیں، وہ دو فرد ہوں، دو قبیلے ہوں، یا دو جماعتیں تو ان میں صلح کرادو۔

فرد بھی جماعت ہوسکتا ہے

آپ کہیں گے کہ زید اور عمر تو دو جماعتیں نہیں ہیں، جواب یہ ہے کہ ایک آدمی بھی جماعت ہوسکتا ہے، قرآنِ کریم میں ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا﴾: (النحل ۱۲۰) حضرت ابراہیم ایک انجمن تھے، ایک امت تھے، حضرت تو فرد تھے پھر بھی قرآن نے ان کو أمة کہا ہے، کیونکہ جو بھی نبی، رسول اور مصلح آتا ہے جب وہ محنت شروع کرتا ہے تو اکیلا نہیں رہتا لوگ قافلہ میں جڑتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس کے متبعین کہلاتے ہیں، اس لیڈر کے نام

سے ایک جماعت بن جاتی ہے۔لڑائیوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ شروع میں دو آدمی لڑتے ہیں پھر ان کے حمایتی کھڑے ہو جاتے ہیں اور دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ جو بڑی بڑی لڑائیاں ہوئی ہیں وہ دو شخصوں سے شروع ہوئی ہیں۔

اوس وخزرج کی ڈیڑھ سوسالہ جنگ کی وجہ

انصار کے دو قبیلے تھے: اوس اور خزرج، ان کے درمیان ڈیڑھ سو سال تک جنگ چلی ہے، اور یہ جنگ اس بات پر شروع ہوئی تھی کہ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر کسی سے بات کر رہا تھا اور دوسرا آدمی بھی وہاں کھڑا تھا، گھوڑے نے دم جھٹکی، اس کے بال کھڑے ہوئے شخص کے منہ پر لگے، اس نے چاقو نکالا اور گھوڑے کی دم کاٹ ڈی، سوار اترا اور اس نے آدمی کو کاٹ ڈالا۔ یہاں سے لڑائی شروع ہوئی اور ڈیڑھ سو سال تک چلی۔ یہ لڑائی نبی پاک ﷺ کی بعثت کی برکت سے ختم ہوئی اور دونوں قبیلے شیر وشکر بن گئے، قرآن کریم نے اس احسان کا تذکرہ کیا ہے ﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾ اللہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے اوس وخزرج کے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا ﴿لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ﴾ اگر آپ زمین کی ساری دولت خرچ کر دیتے تو بھی آپ ان کے دلوں کو جوڑ نہیں سکتے تھے ﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ﴾ (الانفال ۶۳) مگر اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑ دیا۔

اوس وخزرج کی لڑائی حضور ﷺ کی بعثت کی تمہید تھی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک عجیب نکتہ بیان کیا ہے اور یہ حدیث بخاری میں آئی ہے، فرماتی ہیں کہ اوس وخزرج کے درمیان جو ڈیڑھ سو سال تک لڑائی چلی وہ حضور ﷺ کی بعثت کی تمہید تھی۔ کیسے؟ عرب میں جتنے مضبوط اور بڑے قبیلے تھے ان میں سے کوئی حضور کو اپنے یہاں لے جانے کے لئے تیار نہیں تھا، حضور ﷺ نے متعدد قبیلوں کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا، طائف تو خود تشریف لے گئے کہ مکہ تو ساتھ دیتا نہیں تم ہی ساتھ دو، وہ ساتھ تو کیا دیتے اوباشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا جنھوں نے اتنے پتھر مارے کہ حضور ﷺ کی ایڑیاں لہولہان ہوگئیں۔ خیر طائف سے نکلے تو سوچا کہ کہاں جائیں؟ چونکہ رات ہوگئی

تھی اس لئے آپ ایک باغ میں رک گئے، وہاں دو واقعے پیش آئے: ایک: ملک الجبال: یعنی پہاڑوں کے انتظام پر جو فرشتہ مقرر ہے وہ حاضر ہوا اور اللہ کی طرف سے سلام عرض کیا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ طائف والوں نے جو برتاؤ کیا وہ اللہ کے سامنے ہے اور اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو طائف کے دو طرف کے پہاڑوں کو ملا دوں اور سب کو بیچ میں کچل دوں، آپ نے جواب دیا: بارگاہ خداوندی میں میرا سلام پیش ہو، اور یہ عرض کیا جائے کہ میری قوم مجھے جانتی نہیں، اس لئے میرے ساتھ انھوں نے ایسا برتاؤ کیا ہے، میری اللہ سے دعا ہے کہ میری اس قوم کو ہدایت نصیب ہو!

جنات کا ایمان لانا حضور کی تسلی کے لئے تھا

اس باغ میں دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ حضور ﷺ نے یہاں رات میں آرام فرمایا، فجر کی نماز آپ حضرت بلال اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ پڑھ رہے تھے، اچانک جنات کا ایک وفد یہاں سے گذرا، ان کے کانوں میں قرآن کی آواز پڑی وہ رک گئے اور قرآن کریم سنا اور سن کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نزول کی وجہ سے ہمارے اوپر پہرہ لگا ہے، اور اپنی قوم میں جا کر انھوں نے اُسی انداز سے جس انداز سے آج کل رپورٹ لکھی جاتی ہے، ایک مفصل رپورٹ پیش کی جو سورۂ جن میں ہے، اللہ نے نماز کے بعد حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ جنات کا ایک وفد قرآن سن کر اور متاثر ہو کر گیا ہے اور ایمان لے آیا ہے، اور انھوں نے جو رپورٹ پیش کی ہے اس میں پوری قوم کو ایمان کی دعوت دی ہے، یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی تھی کہ طائف والوں نے اگر آپ کی بات نہیں مانی تو اللہ نے ایک دوسری امت کھڑی کر دی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے جنات آسمانوں کے اوپر جنت تک جاتے تھے، پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا تو جنات کا داخلہ آسمان سے اوپر بند کر دیا گیا، لیکن آسمان تک جنات برابر جاتے رہے، جب قرآنِ کریم کا نزول شروع ہوا تو آسمانوں کے قریب جانے پر بھی پابندی لگ گئی، سیکورٹی کھڑی کر دی گئی ـــــــ قرآنِ کریم کا نزول

مکمل ہونے کے بعد سیکورٹی اب بھی باقی ہے یا اٹھادی گئی؟ معلوم نہیں کیونکہ اس بارے میں کوئی نص نہیں ـــــ اب اگر کوئی جن آسمان کے قریب جاتا ہے تو وہاں سے میزائل داغا جاتا ہے، جس سے کبھی وہ بالکل بھسم ہو جاتا ہے اور کبھی خبطی ہو جاتا ہے۔

جب یہ نئی صورتِ حال پیش آئی تو جنات کی اتھارٹی نے کانفرنس بلائی، یہ کانفرنس اتنی بڑی تھی کہ زمین پر منعقد نہ ہو کر سمندر پر منعقد ہوئی، اس میں یہ مسئلہ زیر غور آیا کہ دنیا میں ایسی کیا نئی بات پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے ہم پر پہرہ لگا ہے؟ اس بات کو جاننے کے لئے انھوں نے زمین کے چپہ چپہ میں وفود بھیجے، ایک وفد تہامہ کے لئے بھی تھا، جس میں مکہ معظّمہ آتا ہے اور یہ وفد نصیبین کا رہنے والا تھا، یہ وفد اس علاقہ کا سروے کرتے ہوئے صبح کے قریب یہاں سے گذرا اور حضور ﷺ کو فجر کی نماز میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو کھڑا ہوگیا اور قرآن سن کر چلا گیا، اس کا تذکرہ سورۂ احقاف میں ہے ﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ﴾ پھر انھوں نے جاکر رپورٹ پیش کی۔

ڈیوٹی کے درمیان دوسرا کام کرنا اصول کے خلاف ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ لوگ ایمان لے آئے تھے اور جاکر قوم کو دین کی دعوت دی تو حضور ﷺ سے مل کر کیوں نہیں گئے؟ جواب: قاعدہ یہی ہے، کسی شخص کو کوئی کام سونپا جائے پھر وہ کام ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، بھیجنے والے کے پاس آکر مطلع کرنا چاہئے۔
ایک مرتبہ صحابہ کی میٹنگ بیٹھی، اس میں یہ اختلافی مسئلہ زیر غور آیا کہ اگر کوئی اپنی بیوی سے صحبت کرے اور انزال نہ ہو تو غسل واجب ہوگا یا نہیں؟ بعض نے کہا: واجب ہوگا، بعض نے کہا: واجب نہیں ہوگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ بدری صحابہ اس میں اختلاف کریں گے تو آگے امت کا کیا حال ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ مسئلہ حضور ﷺ کی بیویوں سے پوچھنا چاہئے کہ اس میں حضور کا عمل کیا تھا؟ حضرت عمرؓ نے کہا: ٹھیک ہے، اور اس سلسلے میں ایک آدمی انھوں نے اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا انھوں نے جواب دیا: میرے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آیا، اس آدمی نے

واپس آکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا۔ پھر اسی آدمی کو حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا، حضرت عائشہؓ نے جواب دیا: میرے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا ہے اور ہم نے غسل کیا ہے۔ اس آدمی نے واپس آکر جواب حضرت عمرؓ کو بتایا، جب حضور ﷺ کا عمل سامنے آیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا: حضور کا عمل آگیا ہے اب اس کے خلاف کوئی فتوی نہ دے، چنانچہ اس وقت سے اس مسئلہ میں اجماع ہوگیا۔

مجھے اس واقعہ میں یہ بتانا ہے کہ آدمی کو پہلے حضرت حفصہؓ کے پاس بھیجا، جب وہاں سے جواب معلوم نہ ہوا تو اس کو دیگر ازواج مطہرات کے پاس خود ہی چلا جانا چاہئے تھا مگر نہیں گیا، جب اسے دوبارہ حضرت عائشہؓ کے پاس بھیجا گیا تبھی گیا۔ اسی طرح جنات کا یہ وفد آن ڈیوٹی تھا، اور ڈیوٹی پوری کرنے سے پہلے دوسرا کام کرنا اصول کے خلاف ہے، چنانچہ یہ وفد اس وقت نہیں ملا، دوسرے وقت میں یہی نصیبین کے جنات بار بار حضور ﷺ کی خدمت میں آئے ہیں۔ جب انھوں نے رپورٹ پیش کی تو کانفرنس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ یہی وہ کلام ہے جس کے نزول کی وجہ سے یہ سیکورٹی قائم کی گئی ہے۔

بہر حال کوئی قبیلہ حضور ﷺ کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوا، مگر انصار خود بڑھ کر گئے اور حضور نے اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کیا کہ دین کا کام کرنے میں تم میری مدد کرو، وہ فوراً تیار ہوگئے۔ فوراً کیوں تیار ہوئے؟ ڈیڑھ سو سال سے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے، اور مدینہ کے یہودی ان پر ایسے چھا گئے تھے کہ جینا ان کے لئے مشکل ہوگیا تھا، یہودی ان کے بچوں اور عورتوں کو گروی رکھ کر قرضے دیا کرتے تھے، جب ان یہودیوں سے چھٹنے کی کوئی شکل نہیں رہی تو ان دونوں قبیلوں نے سوچا کہ ان سے نجات پانے کا بس ایک ہی راستہ ہے کہ ان نبی صاحب کو لے آؤ، اور اپنے اختلاف کو بھلا کر ان کے ساتھ مل کر بل اور قوت پیدا کرو، تو ہی ہم ان یہودیوں سے لوہا لے سکیں گے، یوں وہ لوگ حضور ﷺ کو دعوت دے کر مدینہ لائے، اللہ نے اسی کا احسان جتایا ہے کہ یہ دونوں قبیلے جو ایک ہوئے ہیں وہ اللہ کے ایک کرنے سے ایک ہوئے ہیں۔

خیر بات کہیں سے کہیں چلی گئی، میں تو یہ بتا رہا تھا کہ فرد بھی جماعت بن جاتا ہے، اس

لئے مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑیں تو پہلی فرصت میں ان کے درمیان صلح کراؤ، پھر اس سلسلے کے تفصیلی احکام ہیں۔

لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟

اس کے بعد یہ مضمون شروع ہوتا ہے کہ لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟ وہ سوراخ کہاں ہے جس سے پانی رس کر آتا ہے، چنانچہ اگلی آیت میں لڑائیاں کھڑی کرنے والے تین اسباب کا بیان ہے: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَايَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِنْهُمْ، وَلَا نَسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ، وَلَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ، وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ، وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ اس آیت میں تین حکم دیئے گئے ہیں، پہلا حکم: تمام مسلمانوں کو، خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، یہ دیا ہے کہ تمسخر مت کرو، ٹھٹھا مخول مت کرو۔

مزاح سنت ہے، مذاق ٹھیک نہیں اور ٹھٹھا حرام ہے

ٹھٹھا سب سے اوپر کا درجہ ہے، اس سے نیچے مذاق ہے اور مذاق سے نیچے مزاح ہے، مزاح سنت ہے، مذاق پسندیدہ نہیں، اور ٹھٹھا ممنوع ہے۔ مزاح کے لئے اردو میں لفظ ہے: دل لگی، یعنی ایسی بات کرنا جس سے دل خوش ہو اور تکلیف کسی کو نہ پہنچے، حضور ﷺ نے صحابہ سے اور صحابہ نے حضورؐ سے مزاح فرمایا ہے، اور حدیثوں میں اس کے بہت سے واقعات آئے ہیں، چونکہ دل لگی میں کسی کو تکلیف پہنچانا نہیں ہوتا بس سامنے والے کا دل خوش کرنا مقصد ہوتا ہے اس لئے اس میں کوئی حرج نہیں، مزاح سے اوپر کا درجہ ہے: مذاق، عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ نہیں، عربی میں لفظ مذاق ہے مگر اس کے معنی چکھنے کے ہیں، بہر حال مذاق: مزاح اور ٹھٹھے کے بیچ کا درجہ ہے جیسے اساءۃ مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کے بیچ کا درجہ ہے، مکروہ تحریمی تو حرام ہوتا ہے اور مکروہ تنزیہی خلاف اولیٰ، ان دونوں کے بیچ میں اساءۃ کا درجہ ہے جس کا مطلب ہے: برا کرنا۔ حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو وضو کا طریقہ سکھایا، اس کے بعد فرمایا: فمن زاد أو نقص فقد أساء وظلم: جس نے تین بار سے

زیادہ دھویا یا کم دھویا، اس نے یقیناً برا کیا، اور اپنا ہی نقصان کیا، زاد کے ساتھ أساء ہے اور ظلم کا تعلق نقص کے ساتھ ہے، کیونکہ ایک دفعہ دھونا تو واجب ہے دوسری دفعہ دھونا چھوٹی سنت ہے اور تیسری دفعہ دھونا بڑی سنت ہے، پس جس نے تین دفعہ سے کم دھویا تو اپنا ہی نقصان کیا کہ بڑی سنت کا ثواب نہ پا کر چھوٹی سنت کا ثواب پایا، اور اگر تین مرتبہ سے زیادہ دھویا تو اس نے برا کیا، یہی برا کرنا مکروہ تحریمی اور مکروہ تنزیہی کے درمیان کا درجہ ہے، کیونکہ چار مرتبہ دھونا مکروہ تحریمی یعنی حرام نہیں اور چار مرتبہ دھونا مکروہ تنزیہی یعنی خلاف اولیٰ بھی نہیں، ان دونوں کے بیچ کا درجہ ہے یعنی برا ہے۔ ایسے ہی مذاق بیچ کا درجہ ہے، اس میں بعض دفعہ سامنے والے کو کچھ تکلیف پہنچ جاتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ سوری! میں مذاق کر رہا تھا، مذاق میں سوری کیوں کہنا پڑا؟ معلوم ہوا کہ مذاق میں تکلیف بھی پہنچتی ہے۔

الغرض مزاح تو سنت ہے مگر مذاق ٹھیک نہیں، پھر اس سے اوپر کا درجہ تمسخر کا ہے جس کا آیتِ کریمہ میں ذکر ہے، فرمایا: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَايَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسٰى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِنْهُمْ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، ٹھٹھا نہ کریں کچھ لوگ دوسرے لوگوں کا، ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ جن کا ٹھٹھا کیا جا رہا ہے وہ بہتر ہوں ان ٹھٹھا کرنے والوں سے ﴿وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰى أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ﴾ اسی طرح کچھ عورتیں دوسری عورتوں کا ٹھٹھا نہ کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ عورتیں جن کا ٹھٹھا کیا جا رہا ہے وہ اللہ کے یہاں بہتر ہوں ان عورتوں سے جو ٹھٹھا کر رہی ہیں۔

عورت اور مرد دو الگ الگ صنفیں ہیں

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مردوں اور عورتوں میں پردہ ہے، اگر پردہ نہ ہوتا جیسا کہ آج کل غیروں کا معاشرہ ہے تو اس معاشرہ میں مرد عورتوں کا، اور عورتیں مردوں کا بھی ٹھٹھا کرتیں۔ یہ سمجھنے کا نکتہ ہے، اگر معاشرہ میں پردہ نہ ہو، دونوں الگ الگ نہ ہوں، تو یہ کہنا کہ مرد مردوں کا ٹھٹھا نہ کریں اور عورتیں عورتوں کا ٹھٹھا نہ کریں، اس تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں تھی، جب دونوں مل کر ایک سوسائٹی ہیں تو مرد عورتوں کا بھی ٹھٹھا کر سکتے ہیں اور عورتیں مردوں کی بھی تھیکڑی اڑا سکتی ہیں، لیکن نہیں! قرآن حکم دیتا ہے کہ مرد مردوں کا ٹھٹھا نہ کریں

اور عورتیں عورتوں کا ٹھٹھا نہ کریں، معلوم ہوا کہ ان دونوں صنفوں کے درمیان اتنی بے تکلفی نہیں ہونی چاہئے کہ ایک دوسرے کے ٹھٹھے کی نوبت آئے، رہے محرم تو ان کے ساتھ ٹھٹھے کا کوئی سوال نہیں، ماں بیٹے کے ساتھ کیا ٹھٹھا کرے گی؟ بہن بھائی کے ساتھ کیا ٹھٹھا کرے گی؟ یہ تو اجنبیوں میں چلتا ہے۔

ٹھٹھا کیوں نہ کریں؟ ٹھٹھے کی ممانعت کیوں ہے؟ اس کی دلیل اسی میں ہے، پس یہ آیت **قضیۃ قیاساتھا معھا** کے قبیل سے ہے، یعنی وہ بات جس کی دلیل اسی کے ساتھ ہے۔ ٹھٹھا ہمیشہ وہ کرتا ہے جو اپنے کو بہتر سمجھتا ہے، اور اس کا کرتا ہے جس کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے، کوئی بندہ اپنے باپ کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کرتا، کوئی بیٹی اپنی ماں کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کرتی، کوئی شاگرد اور مرید اپنے استاذ اور پیر کے ساتھ ٹھٹھا نہیں کرتا، کیونکہ یہ سب ان کو اپنے سے بہتر سمجھتے ہیں، جہاں بھی ٹھٹھا ہوتا ہے اس کے پیچھے یہ ذہن کام کرتا ہے کہ میں اچھا اور یہ مجھ سے کمتر، قرآن نے کہا کہ بہتر اور کمتر کا فیصلہ تو اللہ کے یہاں ہوگا، اس دنیا میں تو کوئی یہ بات جان ہی نہیں سکتا کہ بہتر کون ہے؟ پس ٹھٹھے کی جو بنیاد تھی اس کو ڈھا دیا کہ تم کیا جانو کہ کون بہتر ہے اور کون کمتر؟ ہوسکتا ہے کہ جن کا ٹھٹھا کیا جا رہا ہے وہ بہتر ہوں اور ٹھٹھا کرنے والے کمتر ہوں۔

﴿وَلَا تَلْمِزُوْا أَنْفُسَكُمْ﴾ اور اپنے لوگوں کو طعنے مت دو، یہ بھی جھگڑا کھڑا کرتا ہے اور طعنہ دینا ٹھٹھا کرنے سے بھی اوپر کی برائی ہے، اور اوپر کا درجہ ہے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْأَلْقَابِ﴾ اور ایک دوسرے کے برے نام مت رکھو، اس سے جھگڑا تو کھڑا ہوتا ہی ہے، دوسرا نقصان ہے: ﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ﴾ ایمان کے بعد برا نام لگانا بہت بری بات ہے، یعنی کسی مؤمن کے لئے برا لفظ استعمال کرنے سے زیادہ بری بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ طعنہ تو ایک وقتی چیز ہے، اور اس کا نام ہی برا رکھ دیا تو یہ طعنہ اس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے لگ گیا۔ ارے کیا کر رہا ہے گدھے! یہ طعنہ ہے اور اگر اس کا نام ہی گدھا رکھ دیا تو یہ اس سے بھی اوپر کا درجہ ہے۔

برا لقب نہیں رکھنا چاہئے لیکن اگر وہ چل پڑے تو کیا کرے؟

برا سرنیم (عرف) رکھنے کی بیماری انسانوں میں قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے، ایسا لقب

رکھنا جس میں برائی نہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن جس میں برائی ہو اس کے ذریعہ لقب نہیں رکھنا چاہئے، قرآن نے منع کیا ہے، لیکن اگر کوئی ایسا برا لفظ کسی بھی وجہ سے چل پڑے اور اتنا مشہور ہوجائے کہ وہ لفظ بولے بغیر وہ شخص پہچانا نہ جائے تو پھر مسئلہ یہ ہے کہ اس عیب دار لفظ کا استعمال جائز ہے، جیسے بڑے محدثین میں ایک سلیمان اعمش ہیں، اعمش کے معنی ہیں: چندھیا عبدالرحمٰن اعرج بھی ہیں، اعرج کے معنی ہیں: لنگڑا، اب اگر ہم ان کے نام کے ساتھ اعمش اور اعرج نہ لگائیں تو ہمارا طالب علم پہچان نہیں سکتا کہ یہ کون راوی ہے؟ پس اگر کوئی لقب کسی کے ساتھ ایسا خاص ہوجائے کہ لقب لگائے بغیر وہ پہچانا نہ جائے تو پھر وہ سرنیم بن جاتا ہے، اور جب کوئی برا لفظ سرنیم بن جائے تو اس میں سے برائی ختم ہوجاتی ہے، اور آدمی خود اپنے لئے بھی اپنا سرنیم بے تکلف استعمال کرتا ہے جیسے ابھی ایک بڑے عالم گذرے ہیں: شیخ عبدالفتاح ابوغدہ، غدہ کے معنی ہیں گانٹھ اور رسولی۔ ان کے باپ دادا میں کسی کے گانٹھ نکلی ہوگی اس لئے وہ ابوغدہ کہلائے، پھر یہ لقب بن کر ان کے خاندان میں چل پڑا اور شیخ عبدالفتاح خود بھی اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو بے تکلف ابوغدہ لکھا کرتے تھے، کیونکہ اس کے بغیر وہ پہچانے نہیں جاسکتے تھے، غرض لقب اگر ایسا مشہور ہوجائے تو اس کا استعمال جائز ہے، کیونکہ اب اس میں سے برائی کے معنی ختم ہوجاتے ہیں، لیکن شروع میں ایسا برا لقب رکھنا جائز نہیں یہ تین احکام ہیں جو جھگڑا کھڑا کرنے والے ہیں، ان اسباب سے بچیں گے تبھی جھگڑوں سے بچ سکیں گے، اور ان میں مؤمن کی ایذا رسانی بھی ہے، جس سے ہر آدمی کو بچنا چاہئے۔

اور اگر ان تین گناہوں میں سے کوئی گناہ ہوجائے تو قرآن نے کہا توبہ کرو ﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ اور جو توبہ نہیں کریں گے وہی حقیقت میں ظالم ہیں، انسان سے کوتاہیاں ہوجاتی ہیں، کوتاہی ہونے کے بعد شرمسار ہونا آدم علیہ السلام کی صفت ہے، اور کوتاہی ہونے کے بعد اس پر اڑ جانا شیطان کی صفت ہے، اس لئے اللہ نے فرمایا کہ ان تین کاموں میں سے کوئی کام اگر کسی سے ہوجائے تو توبہ کرو، اور جو توبہ نہیں کرے گا وہی ظالم ہے۔

توبہ کی حقیقت کیا ہے؟

توبہ کی حقیقت تین چیزیں ہیں: تینوں اکٹھا ہوں تو توبہ ہے ورنہ زبانی جمع خرچ ہے،

ایک: جو برائی ہوئی ہے اس پر ندامت کے آنسو بہانا۔ دوم: طے کر لینا کہ اب زندگی بھر یہ غلطی نہیں کروں گا، سوم: جو کچھ ہوا اس پر قول سے یا فعل سے اللہ سے معذرت چاہنا، معافی کا طلب گار رہنا، قول سے معافی مانگنے کے لئے تھوڑی تیاری کرنی پڑتی ہے، قرآن وحدیث میں اس کے لئے صلاۃ التوبہ رکھی ہے کہ توبہ سے پہلے کم از کم دو نفلیں پڑھو، پھر اللہ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھاؤ اور معافی مانگو، اللہ تعالیٰ ہاتھوں کو خالی واپس نہیں کریں گے، اور فعلی توبہ یہ ہے کہ آدمی زندگی کا ورق پلٹ دے پچھلی زندگی کو پلٹ کر دیکھے بھی نہیں۔ حدیث میں ہے:
الحج یهدم ما کان قبله: حج سابقہ برائیوں کو ڈھا دیتا ہے، مٹا دیتا ہے۔

یہاں ایک سوال ہے کہ کبیرہ گناہ تو توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، پھر حج سے کیسے معاف ہوگئے؟ علماء نے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ حج فعلی توبہ ہے، کیونکہ اس نے حج کے بعد زندگی کا ورق پلٹ دیا، علماء نے حج مقبول کی علامت یہی لکھی ہے کہ برا تھا نیک بن کر آیا، نیک تھا نکھر کر آیا، اگر ڈاڑھی منڈاتا ہوا گیا تھا اور ڈاڑھی منڈاتا ہوا واپس آیا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کے یہاں اس کا حج قبول نہیں ہوا، یہ علامت قرآن وحدیث میں نہیں ہے، علماء نے بیان کی ہے۔

غرض توبہ میں تین چیزیں ضروری ہیں: پہلے: گناہ پر پشیمانی، پھر: آئندہ نہ کرنے کا عہد، اور اگر خدانخواستہ دوبارہ گناہ ہوجائے تو پھر توبہ کرے، اور تیسرے: قول سے یا فعل سے اللہ سے معافی کا طلب گار رہنا۔ پس فرمایا کہ ان تین گناہوں میں سے کوئی گناہ اگر کسی سے ہوگیا تو توبہ کرے اور جو توبہ نہیں کرے گا اللہ کے یہاں وہی مجرم ہے۔ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے: **التائب من الذنب کمن لاذنب له:** آدمی اپنے گناہوں سے توبہ کرلے تو ایسا صاف ہوجاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

میرے بھائیو! یہ مبارک مہینہ چل رہا ہے اس میں اپنی ہر برائی سے توبہ کرو، جو ڈاڑھی منڈاتے ہیں وہ اس سے توبہ کریں، جو سود دیتے لیتے ہیں وہ اس سے توبہ کریں جو دوسروں کو ستاتے ہیں وہ اس سے توبہ کریں۔

اس کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی جھگڑے کے تین اسباب بیان کئے گئے ہیں:

ایک: بدگمانی کرنا، دوسرا: ٹوہ میں لگنا، تیسرے: غیبت کرنا۔ یہ تینوں چیزیں بھی جھگڑے کھڑے کرتی ہیں چنانچہ فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سے گمانوں سے بچو۔ جب بہت سے گمان کہا تو بعض گمانوں کا استثناء خود بخود ہوگیا، یعنی اللہ نے ہر گمان سے منع نہیں کیا، اگر ہر گمان سے منع کر دیا جاتا تو زندگی کا دائرہ بہت تنگ ہوجاتا، آدمی پریشان ہوجاتا اس لئے فرمایا: ﴿كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾: بہت سے گمانوں سے بچو۔ کیوں بچیں؟ ﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾: بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور تم کیا جانو کہ تم نے جو گمان باندھے ہیں ان میں سے کونسا گمان گناہ ہے اور کونسا نہیں، جب جانتے نہیں تو گمان کرنے سے بچو۔

گمان سو فیصد ممنوع نہیں، کچھ گمان جائز ہیں، حدیث میں ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: **من الحزم سوء الظن:** چوکنا پن بدگمانی ہے، پس بعض بدگمانی کو جائز رکھا ہے جیسے آپ نے نماز کے وقت جوتے اٹھا کر الماری میں رکھے اس بدگمانی سے کہ ہوسکتا ہے کوئی جوتے اٹھا کر لے جائے، اگرچہ آپ کے جوتے کبھی نہیں اٹھے، مگر اٹھتے دیر کیا لگتی ہے، پس آپ کا اس بدگمانی سے اپنے جوتے اٹھا کر رکھنا بھی چوکنا پن ہے، یہی احتیاط ہے، یہ بدگمانی جائز ہے، کیونکہ یہ کسی معین آدمی کے بارے میں بدگمانی نہیں، اور ایسی بدگمانی جائز ہے، پس حدیث سے بدگمانی کے جواز کی ایک شکل نکلی۔

میں اس کی ایک اور مثال دوں، آپ کوئی قیمتی سامان ڈاک سے بھیجنا چاہیں تو رجسٹری بھیجیں، کیوں؟ ہوسکتا ہے ڈاک ضائع ہوجائے، اور سامان قیمتی ہو تو حکومت ذمہ دار ہوگی، سادہ ڈاک میں حکومت کی ذمہ داری نہیں ہوتی، کوئی کہے میری ڈاک تو کبھی ضائع نہیں ہوئی، ٹھیک ہے، لیکن اگر ہوگئی تو؟ اس لئے احتیاط کی بات یہ ہے کہ قیمتی سامان رجسٹری ڈاک سے بھیجا جائے۔ بہرحال بعض گمانوں کا شریعت نے استثناء کیا ہے۔

حدیث: نبی پاک ﷺ کو ایک قبیلہ میں تقسیم کے لئے مال بھیجنا تھا، حضورؐ نے اسی قبیلہ کے ایک صحابی کو بلایا اور ان سے کہا کہ یہ مال لے جاؤ اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کردو، وہ تیار ہوگئے، ایک دوسرے صاحب کو پتہ چلا وہ ان کے پاس آئے اور ساتھ چلنے کی پیش کش کی،

پہلے صحابی نے سوچا اتنا سارا مال ہے، راستہ میں لوٹ کھسوٹ ہوتی رہتی ہے، یہ ساتھ رہیں گے تو ان کا تعاون ملے گا اور بوریت بھی کم ہوگی، وہ یہ سوچ کر حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا یا رسول اللہ! مجھے ایک ساتھی مل گیا ہے، آپؐ نے پوچھا: کون ہے؟ کہا: فلاں شخص ہے! آپؐ نے فرمایا: **أخاك البكري فلا تأمنه**: یہ عربی کا ایک محاورہ ہے، جس کے معنی ہیں: بکری قبیلہ کا کوئی بھی آدمی ہو اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے۔ خیر وہ دونوں چلے، یہ جو دوسرے صاحب تھے ان کے گاؤں سے پہلے کوئی گاؤں آیا انھوں نے کہا: بھائی ذرا تھوڑی دیر رک جاؤ، میری اس گاؤں میں کچھ رشتہ داری ہے، میں ابھی مل کر آیا، وہ رک گئے اور یہ اکیلے گاؤں میں چلے گئے، اِن کے جانے کے بعد اُن کو حضور ﷺ کا ارشاد یاد آیا کہ **أخاك البكري فلا تأمنه** وہ فوراً وہاں سے آگے بڑھ گئے، بہت دور گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کا ساتھی کچھ آدمی لے کر ان کے پیچھے آرہا ہے اور سب کے ہاتھ میں ہتھیار ہیں، چونکہ یہ کافی دور نکل گئے تھے اس لئے بچ گئے۔ پس حضورؐ نے جو جملہ ارشاد فرمایا تھا اس میں آپؐ نے بدگمان رہنے کی تعلیم دی تھی، معلوم ہوا کہ بعض گمان جائز ہیں۔

جائز ناجائز گمان پہچاننے کا طریقہ

رہی یہ بات کہ ہم کیسے جانیں کہ کونسا گمان گناہ ہے اور کونسا گناہ نہیں؟ جواب: گمان ایک بیج ہے، اس بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے، پھر اس پر پھول اور پھل آتے ہیں، پس جس گمان پر اچھے ثمرات مرتب ہوں وہ گناہ نہیں، اور جس پر برے ثمرات مرتب ہوں وہ گناہ ہے جیسے مدرسے سے ایک طالب علم فارغ ہوا ہم نے سوچا کہ اس کو مدرس رکھ لیا جائے یہ بہت آگے جائے گا، یہ اچھا گمان ہے، پھر ہمارا گمان پورا ہوا تو سبحان اللہ! نہیں ہوا تو کوئی حرج نہیں۔ یہ وہ گمان ہے جس سے اچھا پھل آیا، یا جیسے ہم نے ایک شخص کے بارے میں گمان کیا کہ یہ اگرچہ غریب ہے مگر ہمارا دشمن ہے اس لئے ہم اسے زکوٰۃ نہیں دیں گے، ارے بھائی جب وہ غریب ہے تو زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے؟ اور یہ جو تم کہتے ہو کہ وہ ہمارا دشمن ہے، یہ صرف تمہارا گمان ہے یا اس کی تمہارے پاس کوئی علامت اور دلیل ہے؟ دلیل تو نہیں ہے، پھر یہ تمہارا خالی گمان ہی گمان ہے، گاؤں میں یا رشتہ داریوں میں اس طرح کا گمان بہت

باندھا جاتا ہے، اور خیر کے کاموں میں بھی اس کا تعاون نہیں کرتے۔ یہ وہ گمان ہے جس پر برا پھل آیا، ایسا گمان گناہ ہے۔

الغرض وہ گمان جو کسی معین آدمی پر واقع نہ ہو یا واقع ہو مگر ثمرات اس پر اچھے مرتب ہوں تو وہ جائز ہے اور جو گمان کسی معین آدمی پر واقع ہو یا اس پر برے ثمرات مرتب ہوں وہ ناجائز ہے۔

پھر گمان کے بعد اگلا مرحلہ ہے: تجسس، ٹوہ اور سراغ لگانے کا ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ لوگوں کے احوال کا سراغ مت لگاؤ، ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے بدگمان ہو جاتا ہے، اور مخالف کی ہر بات کو برائی پر محمول کرتا ہے، پھر اس پر الزام لگانا شروع کرتا ہے اور اس کی ٹوہ میں لگ جاتا ہے کہ کوئی برائی کی بات ہاتھ لگے تو اس کو خوب اچھالے، کوئی بھید کی بات ہاتھ لگے تو اس پر حاشیے چڑھائے، اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کرے، اس لئے اس آیت میں بھید ٹٹولنے اور ٹوہ لگانے سے منع کیا، کیونکہ یہ بات اختلاف اور تفریق کو بڑھاوا دیتی ہے، اور بات لڑائی جھگڑے تک پہنچ جاتی ہے۔

پھر تجسس کے بعد اگلا مرحلہ غیبت کا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾: ایک دوسرے کی پیٹھ مت کاٹو، کسی کی برائیاں مت اچھالو، گندگی میں ڈھیلا پھینکنے سے کیا فائدہ؟ اس سے تو گندگی اچھلے گی۔

ہاں جہاں غیبت کا کچھ فائدہ ہو تو جائز ہے، علماء نے ایسی چھ جگہیں متعین کی ہیں جہاں غیبت جائز ہے، ان میں سے ایک جگہ ہے رجال حدیث پر جرح کرنا، کیونکہ اس کے بغیر دین کا محفوظ رکھنا محال ہے۔

پھر فرمایا: مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا گھناؤنا گناہ ہے جیسے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت نوچ کر کھائے، اس کو تو ہر شخص برا سمجھتا ہے، پھر کسی کی غیبت کیوں کرتا ہے؟ اللہ سے ڈرو، اس کی نصیحتوں پر کاربند رہو اور کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو صدق دل سے توبہ کرو، اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے معاف فرمادیں گے!

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين

۲۰

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو واقعات

(ستارہ پرستوں اور صنم پرستوں سے گفتگو)

خطبہ مسنونہ کے بعد: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ﴾

بزرگو اور بھائیو! آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ سورۂ انبیاء میں پڑھا گیا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے تین واقعے پہلے گذرے ہیں اور ایک واقعہ آگے آئے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے یہ پانچ واقعات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اور قرآن کریم چونکہ واقعات کی کتاب نہیں اس لئے جس واقعہ کا جہاں موقع ہوتا ہے وہاں وہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے، سارے واقعات اکٹھا کرکے ایک سلسلہ بیان میں بیان نہیں کئے جاتے۔

نوح علیہ السلام آدم ثانی ہیں

حضرت آدم علیہ السلام انسانوں کے پہلے باپ ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام دوسرے، سورۂ صافات میں ہے ﴿وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ﴾: ہم نے ان کی اولاد کو باقی رہنے دیا یعنی اور کسی کی نسل نہیں چلی، طوفان میں سب غرق ہوگئے، یہ طوفان ساری دنیا میں نہیں آیا تھا صرف اس علاقہ میں آیا تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام رہتے تھے؟ حضرت آدم اور حضرت نوح علیہما السلام کے درمیان دس باپ ہیں، یہ سلسلۂ نسب بائبل میں ہے، سچ یا جھوٹ وہ جانیں، اور دس باپوں کی اولاد اتنی نہیں ہوسکتی کہ ان سے ساری زمین بھر جائے، پس معلوم ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام جہاں تھے وہی علاقہ انسانوں سے آباد تھا، وہاں طوفان آیا اور

سب انسان غرق ہوگئے، صرف کشتی میں جو اسّی مرد و زن تھے وہی بچے، پھر ان کی نسلیں چلیں، رفتہ رفتہ سب کی نسلیں منقطع ہوگئیں، حضرت نوح علیہ السلام کے جو تین بیٹے کشتی میں تھے انہی کی نسلیں آگے چلیں، اور آج دنیا کے تمام انسان نوحؑ کے ان تین بیٹوں کی اولاد ہیں، اس لئے حضرت نوحؑ آدم ثانی ہیں، دوسرے باپ ہیں، اسی بات کو سورۂ صافات کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ نوحؑ کی اولاد ہی کو ہم نے باقی رہنے والا بنایا۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ کا دور آیا، کتنے عرصہ بعد؟ معلوم نہیں، حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے درمیان کوئی عظیم الشان اولوالعزم پیغمبر مبعوث نہیں ہوئے، حضرت نوحؑ کے بعد جو بڑی شخصیت پیدا ہوئی وہ حضرت ابراہیمؑ کی تھی، حضرت ابراہیمؑ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آیا اور جو کتاب نازل ہوئی وہ آپ کی اولاد میں نازل ہوئی، ان کی یہ خصوصیت قرآن کریم میں ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمُ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ﴾: ابراہیمؑ کی نسل میں ہم نے نبوت اور کتاب گردانی، ایک سلسلہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے چلا، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت یوسف کے چار سو سال بعد حضرت موسیٰؑ ہوئے، پھر بنی اسرائیل آئے، بنی اسرائیل میں ایک لاکھ انبیاء آئے، اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاتم انبیاء بنی اسرائیل آئے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں، چونکہ ہمارے نبی حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں ہیں اور ملت ابراہیمی اور ملت اسماعیلی پر مبعوث ہوئے ہیں، اس لئے حضرت ابراہیم کے چند اہم واقعات قرآن میں آئے ہیں اور وہ پانچ واقعات ہیں۔

ستارہ پرست اور صنم پرست

حضرت ابراہیمؑ جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے وہ قوم دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی، کچھ لوگ ستاروں کو پوجتے تھے اور کچھ مورتیوں کو، ان دونوں کی طرف حضرت ابراہیمؑ

مبعوث کیئے گئے تھے، حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے ان لوگوں کو جو آسمان کے تاروں کو پوجتے تھے اللہ کی وحدانیت کیسے سمجھائی؟ کیا دلیل ان کے سامنے پیش کی؟ اور جو لوگ مورتیوں کو پوجتے تھے ان کو حضرت نے کس طرح اللہ کی وحدانیت اور معبودیت سمجھائی؟ اور بتوں کی بے ثباتی اور بے حیثیتی کس طرح ان کے ذہن نشیں کی؟ یہ دو واقعے ہیں، پھر جب قوم نے مندر کی مورتیوں کو توڑنے کا معاملہ نمرود کے سامنے رکھا جو خدائی کا دعوے دار تھا کہ ابراہیمؑ نے ہمارے بتوں کی گت بنائی ہے، اس وقت حضرت ابراہیمؑ کا اس بادشاہ کے ساتھ مناظرہ ہوا، یہ تیسرا واقعہ ہے، چوتھا واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو جہاں آج کعبہ ہے بسایا، پھر جب حضرت اسماعیلؑ بڑے ہوئے، باپ کی مدد کے قابل ہوئے تو دونوں نے مل کر کعبہ شریف تعمیر کیا، اور پانچواں واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا گیا کہ اپنے بیٹے کی قربانی کرو، چنانچہ انہوں نے حضرت اسماعیل کی قربانی کے سارے جتن کر لئے، پھر اللہ کی وحی آئی کہ تمہارا امتحان ہو گیا، قربانی مقصود نہیں، اور دنبہ بھیجا کہ اسماعیل کی جگہ اس کی قربانی کرو، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ دنبہ کی قربانی کی، اور یہ قربانی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں یادگار بن کر چلی اور آج تک وہ قربانی چل رہی ہے، حضرت اسحاق کی نسل یعنی یہود و نصاریٰ میں یہ قربانی نہیں، قربانی کی یہ سنت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہے اگرچہ بائبل نے اس قربانی کے واقعے میں حضرت اسماعیلؑ کا نام کاٹ کر حضرت اسحاق کا نام رکھ دیا ہے، یہ جھوٹ ہے، اگر حضرت اسحاق کی قربانی ہوئی ہوتی تو حضرت اسحاق کی نسل میں یہ یادگار کے طور باقی رہتی جبکہ یہود و نصاریٰ میں قربانی نہیں، یہ بائبل میں تحریف کی صاف دلیل ہے، بہر حال یہ پانچ واقعے قرآن کریم نے متفرق جگہوں پر بیان کئے ہیں، ان میں سے دو واقعات آج حافظوں نے پڑھے ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کی تھوڑی تفصیل آپ حضرات کے سامنے پیش کروں۔

ستارہ پرستوں سے گفتگو

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ ستاروں کو پوجتے تھے اور ستاروں کے

پجاری کسی ایک ستارہ کو نہیں پوجتے تھے، جیسے مورتیوں کے پجاری کسی ایک مورتی کو نہیں پوجتے، دسیوں بیسیوں مورتیوں کو پوجتے ہیں، ایسے ہی ستاروں کو پوجنے والے بھی کسی ایک ستارے کو نہیں پوجتے، کوئی کسی کو پوجتا ہے، کوئی دوسرے کو پوجتا ہے، حضرت ابراہیمؑ نے ان ستاروں کے پوجنے والوں سے سب سے پہلے چھوٹے ستارے کے بارے میں گفتگو کی ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ﴾ جب رات چھا گئی ﴿رَأَىٰ كَوْكَبًا﴾ تو حضرت ابراہیمؑ نے ایک ستارہ دیکھا، یہ کوئی ایسا ستارہ تھا جو رات کو گیارہ بارہ بجے نکلتا تھا کیونکہ آیت میں جَنَّ ہے یعنی رات چھا گئی، بہر حال دس گیارہ بجے کوئی ستارہ نکلا جس کو قوم پوجتی تھی تو حضرت ابراہیمؑ نے ان سے کہا: هٰذَا رَبِّيْ: یہ میرا پروردگار ہے، میرے عقیدے کے مطابق نہیں، تمہارے عقیدے کے مطابق، یعنی تم کہتے ہو کہ یہ خدا ہے اور سبھی انسانوں کا خدا ہے تو یہ میرا بھی خدا ہے، قوم نے کہا آج تو ابراہیم ڈھیلے پڑے ہیں، سمجھداری کی بات کر رہے ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ ستارہ ڈوب گیا تو حضرت نے کہا: ﴿لَا أُحِبُّ الْآفِلِيْنَ﴾: ڈوبنے والے خدا کو میں پسند نہیں کرتا، لہٰذا یہ میرا خدا نہیں ہو سکتا، اس کو عربی میں کہتے ہیں: **مماشاة مع الخصم**، جس سے مناظرہ ہو رہا ہے تھوڑی دیر اس کے ساتھ چلنا، طالب علموں میں ہم اس کی مثال یہ دیتے ہیں: تین طالب علموں نے طے کیا کہ چوتھے کو آج عصر کے بعد مارنا ہے، چنانچہ صبح سے یہ تینوں اس کے پیچھے لگ گئے، ایک نے کہا: یار گنا کھائے بہت دن ہو گئے، آج عصر کے بعد گنا کھانے چلیں گے، دوسرا ملا اس نے کہا: ارے یار تیرے پاس پیسے ہیں یا نہیں؟ گنا کھائے بہت دن ہو گئے ہیں، میرے پاس پیسے ہیں، میں کھلاؤں گا، بہر حال صبح سے تین چار مرتبہ اس سے ملے، اور عصر کے بعد چاروں چلے، راستہ میں گنا خریدا، اور کھاتے کھاتے جب شہر سے باہر گئے تو وہی گنا ڈنڈا بن گیا، صبح سے عصر تک میٹھی میٹھی باتیں کیں یہی **مماشاة مع الخصم** ہے اگر شروع سے دشمنی ظاہر کرتے تو وہ ساتھ آتا ہی نہیں، پھر پٹائی کیسے کرتے؟ اسی طرح اگر ستارہ نکلتے ہی کہتے کہ یہ میرا خدا نہیں، میں اس کو نہیں مانتا تو بات کیسے چلتی؟ ان پر حجت تام کیسے ہوتی، اس لئے **مماشاة مع الخصم** کی اور کہا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾ چنانچہ وہ قریب آئے پھر ستارہ ڈوبا تو حضرت نے صاف کہا: ﴿لَا أُحِبُّ الْآفِلِيْنَ﴾:

ایک پوئنٹ دماغوں میں بٹھا دیا کہ جو چھپ جائے، غائب ہو جائے وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟

پھر کسی اور رات چاند نکلا تو حضرت نے پھر قوم کے لوگوں سے کہا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ﴾: یہ میرا رب ہے، یعنی وہ ستارہ تو ڈوب گیا، اب یہ میرا رب ہے، پھر تھوڑے اور قریب آئے، جب چاند بھی اپنے وقت پر غروب ہو گیا تو حضرت نے فرمایا: دیکھو یہ بھی ڈوب گیا اور میں یہ پہلے بتلا چکا ہوں کہ ڈوبنے والا اور غائب ہونے والا خدا نہیں ہو سکتا، پھر خدا ہے کون؟ یہ بات خدا ہی بتائے گا دوسرا نہیں بتا سکتا، اگر اللہ کی طرف سے سمجھ نہ دی جائے تو آج کتنے بڑے بڑے پڑھے لکھے ہیں لیکن اللہ کے علاوہ دوسروں کی خدائی میں پھنسے ہوئے ہیں، پتھروں اور غیر اللہ کو پوج رہے ہیں، ایسا کیوں ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نکتہ سمجھایا: ﴿لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَأَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّالِّيْنَ﴾: اگر میرا پروردگار مجھے صحیح راستہ نہ دکھائے تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا، میں از خود اللہ کو نہیں پہچان سکتا، ایک اللہ کی معبودیت کا اقرار آدمی اپنی عقل سے نہیں کر سکتا، اللہ کی توفیق شامل حال ہو تو اس کی سمجھ میں بات آئے گی ورنہ نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالی نے پہلے انسان سے لے کر آخری پیغمبر تک کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء لا إلٰہ إلا اللہ کی تعلیم دینے کے لئے بھیجے، ان انبیاء نے آ کر محنتیں کیں پھر بھی انسانوں کی اکثریت آج تک اس بات کو نہیں سمجھی۔ بہر حال حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اگر میرا پروردگار مجھے صحیح راستہ نہ دکھائے تو میں گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔

پھر ایک وقت کے بعد سورج کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور کہا: ﴿هٰذَا رَبِّيْ، هٰذَا أَكْبَرُ﴾: یہ میرا پروردگار ہے اور اس سے بڑا کوئی ستارہ نہیں، اگر خدا ہے تو یہ ہو سکتا ہے پھر ایک وقت کے بعد سورج بھی ڈوب گیا، تب حضرت نے ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا: ﴿يَا قَوْمِ إِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾: جن ستاروں کو تم پوجتے ہو، خدا مانتے ہو میں ان سے بری اور بیزار ہوں، ان میں سے کوئی میرا خدا نہیں، ماننا نہ ماننا تو انسان کا اختیار ہے لیکن حضرت ان کو اس مرحلہ تک لے آئے کہ ان کی بولتی بند ہو گئی، حجت تام کر دی اور آدمی اتنا ہی کر سکتا ہے، کسی کو راہ راست پر لے آنا انسان کے بس کی بات نہیں، قرآن میں ہے: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ﴾: آپ جس کو چاہیں سیدھا راستہ دکھا دیں یہ ممکن

نہیں، اللہ جسے چاہیں اسے سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔

کائنات کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں

سوال: یہاں کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب تک اللہ توفیق نہیں دیں گے بات سمجھ میں نہیں آ سکتی، تو اگر کسی انسان کو ہدایت نہیں ملی تو اس میں اس کا قصور کیا ہے؟

جواب: پوری کائنات اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، پس کائنات کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی، اگر مخلوق کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر ہو جائے تو پھر اللہ اللہ کہاں رہے؟ قادر مطلق کہاں ہوئے؟ مخلوق بھی قادر ہو گئی لہٰذا مخلوق کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی، اور ہم جو چاہتے ہیں یہ بھی ہماری ایک حالت ہے اگر ہم چاہنے میں مختار ہوں تو پھر ہم بھی خدا ہو گئے کیونکہ ہمارا چاہنا ہمارے اختیار میں ہو گیا، یہ نہیں ہو سکتا، ہمارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے کے تابع ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَمَا تَشَاءُوْنَ إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾: تم چاہ نہیں سکتے جب تک اللہ نہ چاہیں، لہٰذا یہ بات تو بالکل طے ہو گئی کہ اللہ تعالی خالق ہیں اور ساری کائنات مخلوق ہے اور مخلوق کی کوئی حالت اللہ کی قدرت سے باہر نہیں ہو سکتی، مخلوق کا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے کے تابع ہے۔

جب ہمارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے کے تابع ہے تو پھر بھینس اور ہم میں کیا فرق رہا؟ بھینس کھونٹے سے کھل گئی، آبادی میں بھاگی ایک بچہ کو کچلا، دوسرے کو مارا، پہلی حالت اور دوسری حالت میں بھینس پر کوئی فرق نہیں پڑا، جس بے دردی سے اس نے پہلے بچے کو کچلا دوسرے کو بھی اسی طرح کچلا، تیسرا بچہ آیا تو وہ بھی کچلا گیا، پھر لوگوں نے بھینس کو پکڑا اور بچوں کے وارثین نے ڈنڈے بجانے شروع کئے، تھوڑی دیر تو لوگ خاموش رہے پھر کہیں گے: بھائی! کتنا مارو گے، جانور ہی تو ہے، اور کوئی مقدمہ بھینس پر نہیں کرتا۔ غرض تین بچے کچلنے کے باوجود بھینس کے دل کی حالت یکساں ہوگی، اس کے برخلاف انسان اگر بے خبری میں ...... جان بوجھ کر کوئی شریف آدمی ایسا کر ہی نہیں سکتا...... اس کی گاڑی کے نیچے کوئی بچہ آ جائے تو انسان کے قلب کا برا حال ہو جاتا ہے اور پھر سالوں ایسی غلطی اس سے دوبارہ نہیں

ہوتی، دور سے بچے کو دیکھ کر سنبھل جاتا ہے اور اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر بچے کو کچل دے تو لوگ اس کو پکڑ کر پہلے تو ماریں گے پھر کورٹ کی ذریعہ کیفر کردار کو پہنچائیں گے اور پھانسی دلوائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ انسان اور بھینس کے عمل میں یہ فرق کیوں ہے؟ جواب انسان کو اللہ نے اختیار دیا ہے مگر کسی بھی معاملہ کا پورا اختیار نہیں دیا بلکہ جزوی اختیار دیا ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہ کے پاس ایک شخص آیا اس نے یہی سوال کیا کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ حضرت نے جواب دیا: اختیار بھی رکھتا ہے اور مجبور بھی ہے، اس نے پوچھا: یہ کیسے؟ حضرت نے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ، کھڑا ہو گیا، فرمایا: ایک پیر اٹھالو، اٹھالیا، کہا: دوسرا بھی اٹھالو، کہنے لگا! دوسرا کیسے اٹھاؤں؟ حضرت نے فرمایا: دیکھو اتنا تمہارا اختیار ہے کہ بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک پیر اٹھالیا، یہاں تک تمہارا اختیار تھا اب آگے تم مجبور ہو، اسی طرح حضرت علیؓ نے سمجھایا کہ انسان کو جزوی اختیار دیا گیا ہے اور یہ جزوی اختیار اللہ نے انسان کو دیا ہے بھینس کو نہیں دیا اسی جہ سے انسان اور بھینس کا حال الگ الگ ہے۔

دور صحابہ کا ایک قصہ ہے، صحابہ کا لشکر جا رہا تھا ایک صحابی جن کا لقب سفینہ تھا کسی وجہ سے لشکر سے پیچھے رہ گئے چلتے چلتے رات ہو گئی اور لشکر نظر نہیں آ رہا، مغرب کے بعد پہاڑ سے ایک شیر اترا اور حضرت کی طرف بڑھا، جب قریب آیا تو حضرت نے اس سے کہا: **یا أبا الحارث تعال**: ائے ابوالحارث (شیر کی کنیت) یہاں آ، وہ قریب آیا تو حضرت نے اس سے کہا: میں رسول اللہ کا صحابی ہوں اور لشکر سے بچھڑ گیا ہوں، رات ہو گئی ہے مجھے لشکر میں پہنچا، اس نے گھوم کر اشارہ کیا کہ میرے اوپر سوار ہو جاؤ، حضرت بیٹھ گئے اور وہ یہ جا وہ جا، لشکر جب قریب آیا تو وہ رک گیا، حضرت اتر گئے اور وہ واپس لوٹ گیا، یہ کون شیر تھا جس نے اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا؟ اللہ جانے کون تھا!

دوسرا واقعہ سنو! غزوۂ احد میں جب شکست کی صورت بنی تو نبی پاک ﷺ ایک چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے، مگر وہ چٹان بہت اونچی تھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ گھوڑا بنے اور حضور ان کی پیٹھ پر چڑھے، پھر وہ کھڑے ہوئے تو حضورؐ ان کے کندھوں پر پیر رکھ کر چٹان پر چڑھے

اور حضورؐ نے فرمایا: **أَوْجَبَ طلحة**: طلحہ کے لئے جنت واجب ہو گئی، طلحہ یہ عمل کریں تو ان کے لئے جنت واجب ہو جائے اور وہ شیر پیٹھ پر بٹھا کر لشکر تک لا کر چھوڑے تو اس کا کوئی خاص تذکرہ نہ ہو کہ یہ شیر کون تھا؟ جنت اس کو ملی یا نہیں؟ ان دو میں فرق کیوں ہے؟ شیر نے جو کام کیا ہے وہ تکوینی نظام کے تحت کیا ہے اپنی مرضی سے نہیں کیا اور حضرت طلحہؓ نے جو کام کیا ہے اس میں ان کی مرضی کا دخل ہے، ان کا جزوی اختیار اس میں ہے تو ان کے لئے وہ عمل جنت کا موجب بن گیا اور تاریخ میں سنہرے حروف سے یہ واقعہ درج ہوا۔

یہ میں حیوان اور انسان کے درمیان فرق سمجھا رہا ہوں کہ حیوانات کو اللہ نے جزوی اختیار نہیں دیا اسی لئے بھینس کے دل پر تین بچے کچل دینے کے باوجود کوئی اثر نہیں ہوا اور انسان کی گاڑی کے نیچے اگر ایک بچہ آ جائے تو اس کا دل دہل جاتا ہے کہ خدایا مجھ سے یہ کیا ہو گیا، اور زندگی بھر وہ کانٹا اس کے دل سے نہیں نکلتا اور کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو لوگ اس کو پھانسی دلوا کر چھوڑتے ہیں کیونکہ انسان جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے جزوی اختیار سے کرتا ہے اور اسی جزوی اختیار پر آخرت میں جزاؤ سزا کا مدار ہے اسی طرح انسان ہدایت کے لئے جب یہ جزوی اختیار استعمال کرے گا تب اللہ تعالی ہدایت دیں گے، الغرض جب اللہ ہدایت دیتے ہیں تب ہدایت ملتی ہے اور اللہ کب دیتے ہیں؟ جب انسان جزوی اختیار سے ہدایت چاہتا ہے۔

بہرحال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے دوٹوک اعلان کیا: ﴿إِنِّي بَرِيْءٌ مِمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾: جن ستاروں کو تم اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک گردانتے ہو میرا ان سے کوئی تعلق نہیں، ان کو اس مرحلہ پر لائے کہ اب آگے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں رہی اسی حد تک انسان قائل کر سکتا ہے اس سے آگے انسان کے لئے لمحۂ فکریہ پیدا ہوا اور وہ کوشش کرے تو اللہ کی طرف سے فیضان کا دروازہ کھلتا ہے اور ہدایت نصیب ہوتی ہے۔

صنم پرستوں سے معاملہ

اور جو لوگ مورتی پوجا کرتے تھے ان میں حضرت کا باپ بھی تھا، وہ مہنت تھا، حضرت

نے اس مسئلہ پر اپنے باپ سے بھی گفتگو کی ہے جو سورۂ مریم میں آئی ہے، قوم کو بھی سمجھایا ہے مگر جب انسان کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں تو وہ پتھر کو خدا بنالیتا ہے، حضرت نے ایک دن قوم سے کہا: تمہارے ان خداؤں کی ایک دن میں گت بناؤں گا جب تم یہاں نہیں ہوؤ گے، بات گئی گزری ہوگئی، پھر ایک میلہ آیا جس میں سب کو جانا تھا تو باپ نے بیٹے سے کہا کہ ابراہیم تو بھی چل حضرت نے کہا: ﴿إِنِّي سَقِيمٌ﴾: میری طبیعت ناساز ہے، اور یہ بات ستاروں کو دیکھتے ہوئے کہی، لوگوں نے سمجھا کہ انہوں نے ستاروں کی چالیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہے فی الحال تو بیمار نہیں، آگے چل کر بیمار پڑیں گے، لوگوں نے ان کو چھوڑ دیا اور میلے میں چلے گئے، ان کے جانے کے بعد جب مندر خالی ہوگیا تو حضرت نے کلہاڑی لی اور سب کو مار مار کر زمین بوس کردیا اور جو سب سے بڑا بت تھا اس کو باقی رہنے دیا اور کلہاڑا اس کی گردن میں لٹکا دیا، تین دن کے بعد وہ لوگ آئے اور مندر کا حال دیکھا تو بڑا شور مچایا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کس نے کی؟ سب جانتے تھے کہ بستی میں صرف ابراہیم تھے اور وہ پچھلی بات بھی یاد آئی کہ ابراہیم نے ایک دن کہا تھا کہ جب تم یہاں نہیں ہوؤ گے تو میں ان کی گت بناؤں گا، لہٰذا یہ حرکت اسی کی ہے، چنانچہ لوگوں نے ان سے اس بارے میں پوچھا حضرت نے جواب دیا: ﴿بَلْ فَعَلَهُ﴾: بلکہ کیا ہے اس کو جس نے کیا ہے ﴿كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ﴾ یہ گروگھنٹال کلہاڑا لئے کھڑا ہے اس سے پوچھو یہ حرکت کس نے کی ہے؟ لوگ بھی سمجھتے تھے کہ یہ گرو نہ توڑ سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے، تو ان کی دماغوں کی چولیں ہل گئیں کہ ہم کسے پوچھتے ہیں: ﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰؤُلَاءِ يَنْطِقُوْنَ﴾: مگر کتے کی دم ٹیڑھی ہی رہی۔

ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں

چنانچہ وہ مقدمہ بادشاہ کے پاس لے گئے جو خود خدائی کا دعوے دار تھا، حضرت ابراہیمؑ دربار میں بلائے گئے، حضرت جب پہنچے تو بادشاہ نے سوال کیا کہ تم نے قوم کے خداؤں کو ڈھا دیا، پھر تمہارا خدا کون ہے؟ حضرت نے فرمایا: ﴿رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ﴾: میرا

پروردگار وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، بادشاہ نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کرتا ہوں اور فوراً ایک بے گناہ کی گردن اتار دی اور کہا: دیکھ میں نے مار دیا، اور ایسا ایک آدمی جس کی پھانسی کا فیصلہ ہو چکا تھا اس کو بلایا اور آزاد کردیا اور کہا: دیکھو یہ مرا ہوا تھا میں نے اس کو زندہ کردیا، حالانکہ جلانے اور مارنے کا یہ مطلب نہیں تھا، مگر اس خردماغ کو کون سمجھائے، اور مناظرہ میں گھری بات آجائے تو وہ کوئی زیادہ اچھا اثر نہیں چھوڑتی اس لئے حضرت نے اس دلیل کو چھوڑ کر دوسری دلیل پیش کی اور فرمایا: ﴿فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾: میرا پروردگار وہ ہے جو روزانہ مشرق سے سورج نکالتا ہے اگر تو کائنات کا پروردگار ہے تو آئندہ کل مغرب سے سورج نکال ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾: بادشاہ ہکا بکا رہ گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

ہمارا طالب علم کہتا ہے: بادشاہ جواب دے سکتا تھا کہ روزانہ مشرق سے سورج میں نکالتا ہوں، ابراہیم! تو اپنے خدا سے کہہ کہ آئندہ کل مغرب سے سورج نکالے، جب طالب علم یہ کہتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں: نمرود تیرے جتنا بے وقوف نہیں تھا اگر وہ ایسا کہتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیا دیر لگتی، وہ ہاتھ اٹھاتے کہ پروردگار! کل سورج مغرب سے نکلے! اللہ مغرب سے نکال دیتے، اللہ کے لئے کیا مشکل تھا؟ مگر وہ جانتا تھا کہ مشرق سے سورج میں نہیں نکالتا اور مغرب سے نکالنے کے لئے میں اس سے کہوں گا تو یہ دعا کرے گا اور سورج کل مغرب سے نکل آئے گا، ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ﴾: انبیاء کے مخالفین کو انبیاء کے سچے ہونے کا یقین ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ انکار کرتے ہیں، نمرود بھی دل میں سب کچھ سمجھ رہا تھا مگر وہ زبان سے انکار کر رہا تھا، وہ اتنا بڑا بے وقوف نہیں تھا کہ ایسی بات کہتا۔

دوواقعے جن کا نمرود کے واقعہ سے تعلق ہے

سورۂ بقرہ میں جہاں یہ واقعہ آیا ہے اس کے بعد کی دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دوواقعے اور ذکر کئے ہیں، ایک واقعہ: بنی اسرئیل کے ایک بزرگ کا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال تک مارے رکھا تھا، پھر سوسال بعد ان کو زندہ کیا اور ان کے سامنے ان کے گدھے کو بھی

زندہ کیا دوسرا واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ سے اطمینان قلب کے لئے سوال کیا تھا کہ اے میرے پروردگار! آپ مردوں کو زندہ کس طرح کریں گے؟ اللہ نے ان کو چار پرندے زندہ کر کے دکھائے کہ یوں زندہ کرونگا، یہ دونوں واقعات ذکر کر کے اللہ نے جلانے کی مثال دی ہے کہ نمرود اتنا کوڑھ مغز تھا کہ جلانے کی حقیقت نہیں سمجھا، جلانا اس کو نہیں کہتے کہ سزائے موت کے مجرم کو چھوڑ دیا جائے یہ جلانا نہیں، ہم نے بنی اسرائیل کے بزرگ اور ان کے گدھے کو جلایا یہ جلانا ہے اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے پرندوں کو جلایا یہ جلانا ہے۔

نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں کیوں ڈالا؟

خیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، وہ ہکا بکا رہ گیا، مثل ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچے، بلی کتے سے لوہا لے نہیں سکتی اس لئے کھمبے پر غصہ نکالتی ہے غصہ میں بادشاہ نے کہا! اے ابراہیم! میں تیری بات نہیں مانتا اور تو کہتا ہے کہ تیری بات نہ ماننے والا جہنم میں جائے گا اور ماننے والا جنت میں جائے گا، دیکھ تجھے میں جہنم میں ڈالوں گا اور میں خود جنت میں جاؤں گا، چنانچہ اس نے دو کام ایک ساتھ شروع کئے، ایک جنت بنانی شروع کی، دوسری حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کے لئے لکڑیاں جمع کیں، یہ لکڑیاں کوئی پانچ دس گٹھر نہیں تھیں، اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ پورے ملک نے چھ مہینے تک سوختہ جمع کیا پھر اس کو دہکایا گیا اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈالا گیا۔

سوال یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو جلانے کے لئے پانچ دس گٹھر کافی ہو جاتے ہیں، اتنا سارا سوختہ جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اتنا سارا سوختہ جمع کر کے بادشاہ نے جو آگ لگائی تھی یہ اس نے اپنے گمان میں جہنم تیار کی تھی جس میں ڈالنے کی دھمکی اس نے حضرت ابراہیمؑ کو دی تھی اور ڈالا بھی مگر اللہ کا آگ کو حکم پہنچا کہ ٹھنڈی ہو جا، چنانچہ وہ ان کے لئے گل و گلزار بن گئی اور یوں اس کا حضرت کو جہنم میں ڈالنے کا پلان فیل ہو گیا۔

اور حضرت کی اس بات کے جواب میں کہ میری بات ماننے والے ہی جنت میں جائیں

گے اس نے دنیا میں جنت تیار کی، جب وہ بن کر تیار ہو گئی تو بادشاہ کے اس میں جانے کی تاریخ مقرر ہوئی، اس سے پہلے کہ وہ دن آتا اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ بادشاہ کے ناک میں ایک مچھر گھس گیا اور دماغ میں چڑھ گیا اور بھیجا کھانے لگا جس سے اس کے سر میں درد شروع ہو گیا اور جنت میں جانے کا پروگرام مؤخر ہو گیا، مچھر بھیجا کھاتا رہا جس سے اس کی طبیعت دن بدن خراب ہوتی رہی، پہلے سر دبانے سے چین آتا تھا اب سر میں مکے پڑنے سے بھی چین نہ آتا، مکوں سے بھی کام نہ چلا تو جوتے مارے جانے لگے، ایک دن کسی منچلے نے پتھر اٹھا کر سر میں دے مارا اور قصہ ختم کر دیا اور جناب کی جنت دھری کی دھری رہ گئی، ایک نظر دیکھنے کی بھی حسرت پوری نہ ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ کے لئے اس کی بنائی ہوئی جہنم جنت بن گئی، برد و سلام بن گئی۔

آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہیں جلایا؟

اللہ کے کتنے ہی بندے ہیں جن کو آگ میں ڈالا گیا اور آگ نے سب کو جلا دیا، کسی کو بھی نہیں چھوڑا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے نہیں جلایا، یہ اللہ کے داعی اور اللہ کے دشمن کے درمیان مقابلہ تھا، حق و باطل کا فیصلہ پورے ملک کے سامنے آنا تھا، اگر آگ حضرت ابراہیمؑ کو جلا دیتی تو پورا ملک دھوکہ میں پڑ جاتا، اس لئے آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہیں جلایا تاکہ پورا ملک ان کے حق پر ہونے کو اور بادشاہ کے باطل پر ہونے کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے، اس کے بعد بھی جو لوگ ایمان نہ لائے وہ ہٹ دھرمی سے نہیں لائے، اس کے ذمہ دار وہ خود ہیں، لیکن بات سب نے سمجھ لی کہ حق پر ابراہیمؑ ہیں کہ اتنی بڑی آگ نے ان کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

مسائل

سورۂ فاتحہ کے ختم پرآمین کہنا

لوگوں میں ایک غلطی چل رہی ہے اس کی اصلاح ہونی چاہئے ،جب بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جائے سب کوآمین کہنی چاہئے ،ابھی میں نے سورۂ فاتحہ پڑھی کسی نے آمین نہیں کہی ،یہ ایک عام غلطی ہے اس کی اصلاح ہونی چاہئے۔

کبھی حفظ کے بچوں کا قرآن ختم ہوتا ہے وہ اپنا قرآن ختم کرکے الحمد شریف پڑھتا ہے پھر سورۂ بقرہ کا شروع کا حصہ پڑھتا ہے جب وہ الحمد شریف ختم کرتا ہے تو کوئی آمین نہیں کہتا ،پڑھنے والا بچہ بھی نہیں کہتا ،ہاں کبھی کہتا ہے جب کہ اس کو سکھایا گیا ہو لیکن مجمع میں سے کوئی نہیں کہتا ،کیونکہ ان کو بتایا نہیں گیا ،پس جاننا چاہئے کہ جب بھی سورۂ فاتحہ پڑھی جائے تو اس کے ختم پر پڑھنے والے کو بھی اور سننے والوں کو بھی آمین کہنی چاہئے۔

خطیب کی شہادت کے ساتھ شہادت دینا

ایسی ہی ایک غلطی اور ہے ،جب میں نے خطبہ پڑھا اور کہا أشهد أن لا إله إلا الله: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ،پس میں نے تو گواہی دی مگر آپ حضرات خاموش بیٹھے رہے ،آپ حضرات نے یہ گواہی نہیں دی ،یہ ٹھیک نہیں ،اذان میں سب گواہی دیتے ہیں ،جب مؤذن پکارتا ہے :أشهد أن لا إله إلا الله ،تو سننے والے کہتے ہیں :أشهد أن لا إله إلا لله ،مگر دوسرے مواقع میں کوئی نہیں کہتا حالانکہ دوسرے مواقع پر بھی کہنا چاہئے۔اور جواب دینے کے دو طریقے ہیں :مفصل اور مختصر ،پورا جملہ لوٹانا مفصل جواب ہے ، اور صرف و أنا :اور میں بھی (گواہی دیتا ہوں) یہ مختصر جواب ہے اور یہ بھی کافی ہے۔

بہر حال مقرر کی شہادت کے ساتھ ہر شخص کو شہادت دینی چاہئے ،پھر ایک شہادت لمبی

ہے اور ایک مختصر ،جس کا جی چاہے لمبا جواب دے اور جس کا جی چاہے مختصر جواب دے ،جمعہ کے دن خطیب کے سامنے اذان ہوتی ہے ،نبی پاک ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوتے تھے جب اذان ہوتی اور مؤذن کہتا :أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تو آپؐ جواب دیتے :وَأَنَا :اور میں (بھی گواہی دیتا ہوں) یہ مختصر جواب ہے اگر اس طرح گواہی دی جائے تو بھی کافی ہے۔

ہر مجلس کے ختم پر کفارۃ المجلس پڑھنا

ایسی ہی ایک غلطی اور ہے حدیث پاک میں ایک دعا آئی ہے جس کا نام کفارۃ المجلس ہے ،مجلس میں جو بھی لغو اور بے ہودہ باتیں ہوتی ہیں اگر مجلس کے ختم پر یہ دعا پڑھ لی جائے تو سب خطائیں معاف ہو جاتی ہیں ،مگر وہ دعا ایک جگہ کے لئے خاص ہو کر رہ گئی ہے جب فضائل کی کتابیں پڑھتے ہیں تو اہل مجلس کفارۃ المجلس پڑھتے ہیں :یہ ٹھیک کرتے ہیں حالانکہ اس مجلس میں کوئی لغو اور بے ہودہ بات نہیں ہوئی اور جہاں پڑھنی چاہئے وہاں نہیں پڑھتے اس دعا کی اصل جگہ وہ مجلس ہے جس میں لغو باتیں ہوئی ہوں ،ادھر ادھر کی باتیں ہوئی ہوں ، ایسی مجلس کے ختم پر ہر ایک کو یہ دعا پڑھنی چاہئے : سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ :اے اللہ آپ کی ذات پاک ہے اور آپ ہر کمال کے ساتھ متصف ہیں ،میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ،میں آپ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں ،یہ کفارۃ المجلس ہے ہر شخص کو ختم مجلس پر یہ ذکر کرنا چاہئے ،اس سے لغو باتیں معاف ہو جاتی ہیں۔

نبی اپنی ذات کی طرف بھی مبعوث ہوتا ہے

نبی جس طرح امت کی طرف مبعوث ہوتا ہے اپنی ذات کی طرف بھی مبعوث ہوتا ہے ، جیسے امت پر پانچ نمازیں فرض ہیں تو حضورؐ پر بھی فرض تھیں ،امت پر روزے فرض ہیں تو حضور ﷺ پر بھی فرض تھے ،امت پر حج فرض ہے تو حضورؐ پر بھی حج فرض تھا ،امت کے لئے ضروری ہے کہ توحید کی گواہی دے تو حضور ﷺ کے لئے بھی یہ گواہی ضروری تھی ،

امت کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کرے تو حضورؐ کے لئے بھی یہ بات ضروری تھی کہ آپؐ خود کو اللہ کا رسول مانیں، چنانچہ حضور جواب دیتے تھے کہ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

نبی کی دو حیثیتیں

نبی کی دو حیثیتیں ہیں، ایک اللہ کے نائب ہونے کی، دوسری اللہ کا بندہ ہونے کی، اللہ کے جو بھی احکام آتے ہیں: اللہ کے بندوں کے لئے آتے ہیں اور اللہ کے رسول اور انبیاء بھی اللہ کے بندے ہیں، پس اللہ کے یہاں سے جو احکام انبیاء نے لئے ہیں اور بندوں کو پہنچائے ہیں وہ احکام بندہ ہونے کی حیثیت سے خود نبی کے لئے بھی ہوتے ہیں، ایسا تو ہوسکتا ہے کہ کچھ احکام نبی کے لئے زائد ہوں مگر ایسا نہیں ہوتا کہ جو امت کے لئے احکام ہوں وہ نبی کے لئے نہ ہوں۔

سراً آمین کہنا افضل ہے

اور یہ بات بھی جاننا ضروری ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے وہ سراً کہنا افضل ہے، اگر زور سے کہیں تو جائز ہے لیکن آہستہ کہنا افضل ہے اور سب جگہ افضل ہے، جہاں بھی آمین کہیں آہستہ کہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جس طرح نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر آہستہ آمین کہنا افضل ہے اسی طرح ہر جگہ آہستہ آمین کہنا افضل ہے۔

مگر اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں، کبھی نماز میں قنوت نازلہ پڑھی جاتی ہے، خاص طور سے فجر میں، اس وقت آپ دیکھیں گے کہ حنفی بھی زور سے آمین کہتے ہیں، جب قنوت نازلہ میں زور سے آمین کہتے ہو تو سورۂ فاتحہ میں زور سے آمین کیوں نہیں کہتے؟ آمین ہمیشہ سراً کہنا افضل ہے، آمین دعا ہے اور دعا میں سر (آہستگی) افضل ہے۔

اسی طرح جب مجمع میں دعا مانگی جاتی ہے تو پورا مجمع آمین کہتا ہے، تبلیغی جماعت کے جلسہ میں آخر میں دعا ہوتی ہے، تو لوگ اتنی زور سے آمین کہتے ہیں کہ کان پڑی سنائی نہیں دیتی، یہ بھی صحیح نہیں، آمین آہستہ کہنا افضل ہے اور ہر جگہ آہستہ کہنا بہتر ہے۔

جہری قراءت کی حد

نماز میں قراءت کی دو صورتیں ہیں، سرّی اور جہری، سرّی قراءۃ کی کم سے کم مقدار تصحیح حروف ہے یعنی زبان حرکت کرے، مخارج پر لگے اور حرف ادا ہو، مگر آواز پیدا نہ ہو، اور زیادہ سے زیادہ کی تعریف ہے: إسماعُ نفسه: یعنی خود اپنا پڑھنا سنے۔ اور جہری قراءت کی تعریف ہے: إِسْمَاعُ غَيْرِهِ: غیر کو سنانا، یعنی دوسرا سنے، دائیں طرف والا سنے، بائیں طرف والا سنے، یہ جہری قراءت کا ادنی درجہ ہے اس سے نیچے کوئی درجہ نہیں، جہری نمازوں میں اگر اس سے کم جہر کرے گا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا کیونکہ وہ جہر (زور سے پڑھنا) نہیں۔ اور جہر کی زیادہ کی کوئی حد نہیں، بلکہ ﴿ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴾: بیشک آوازوں میں سب سے بری آواز گدھوں کی آواز ہے، اس لئے بے ضرورت جہر مفرط ٹھیک نہیں۔

پس بعض لوگ نماز پڑھتے ہیں اور ان کے ہونٹ ساکن ہوتے ہیں اس طرح پڑھنے سے یعنی دل میں پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی، کیونکہ ہونٹ نہیں ہل رہے، اس کا مطلب ہے زبان نہیں ہل رہی، زبان ہلے گی تو لامحالہ ہونٹ بھی ہلیں گے اور ڈاڑھی اگر شرعی ہو تو وہ بھی ہلے گی۔

اور بعض لوگ تکبیرات اور رکوع وسجود کے اذکار اتنی زور سے کہتے ہیں کہ دائیں بائیں والے سنتے ہیں، اور ان کی نمازوں میں خلل پڑتا ہے، یہ بھی غلط طریقہ ہے، یہ اذکار سراً سنت ہیں، اس لئے ان کو اتنا زور سے نہیں کہنا چاہئے کہ دائیں بائیں والے سنیں۔

شرعی ڈاڑھی کیا ہے

بعض لوگ فیشن والی ڈاڑھی رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم پر عمل کر رہے ہیں حالانکہ وہ اللہ کے حکم پر عمل نہیں کر رہے، وہ فیشن پر فریفتہ ہیں۔

شرعی ڈاڑھی کیا ہے؟ حضور ﷺ کے کتنی ڈاڑھی تھی؟ حدیث شریف میں ہے ایک مرتبہ طالب علموں نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ظہر اور عصر کی نماز میں قراءت ہے؟ حضرت عمارؓ نے فرمایا: جی ہاں! طالب علموں نے پوچھا: آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ ان نمازوں میں قراءت ہے؟ حضرتؓ نے فرمایا: یہ نمازیں جب حضورؐ پڑھاتے تھے تو آپؐ کی

ڈاڑھی ہلتی تھی، اس سے ہم نے سمجھا کہ آپ قراءت کررہے ہیں، آپ تجربہ کرکے دیکھیں کونسی ڈاڑھی ہلتی ہے؟ وہی ڈاڑھی ہلے گی جو شرعی ہے فیشن والی ڈاڑھی نہیں ہلے گی، مگر بالکل ڈاڑھی نہ ہونے سے یہ فیشن والی ڈاڑھی بھی اچھی ہے لیکن یہ شرعی ڈاڑھی نہیں، جب رکھنی ہے تو شریعت کا تقاضہ پورا کرو، ایک بندہ وہ ہے جو رکھتا ہی نہیں، اللہ نے توفیق نہیں دی، لیکن ایک بندہ وہ ہے جو ڈاڑھی رکھتا ہے پس اسے چاہئے کہ ڈھنگ سے رکھے، جب اس نے ہمت کرکے رکھ لی تو اتنی ہمت اور کرلے!

اور کچھ لوگ کہتے ہیں: ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں دکھاؤ؟ کیا ہر مسئلہ کا ذکر قرآن میں ہونا ضروری ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو حدیث کی کیا ضرورت تھی؟ فقہ کی کیا ضرورت تھی؟ میرے بھائیو! جان لو کہ دین کے تین مصادر ہیں: قرآن، حدیث اور فقہ۔ قرآن اصلِ اصول ہے اس کو متن کی حیثیت حاصل ہے، احادیث شریفہ اس کی شرح ہیں، اور فقہ دونوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، پس کوئی بات تینوں مصادر میں سے کسی بھی ایک مصدر میں ہو تو وہ پکی بات ہے، ہر مأخذ میں اس کا ہونا ضروری نہیں۔

تاہم ڈاڑھی کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے۔ سورہ طٰہٰ (آیت ۹۴) میں ہے ﴿لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي﴾ حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے بھائی موسیٰ علیہ السلام سے کہا: بھائی جان! آپ میری ڈاڑھی نہ پکڑیں! معلوم ہوا کہ حضرت ہارونؑ کی ڈاڑھی اتنی بڑی تھی کہ اس کو پکڑا جاسکتا تھا، فیشن والی ڈاڑھی کو مٹھی میں نہیں پکڑ سکتے، پھر وہ شرعی ڈاڑھی کیسے ہوسکتی ہے؟

سوتی موزوں پر مسح جائز نہیں

چاروں اماموں کے نزدیک سوتی موزوں پر مسح جائز نہیں اگر ان پر مسح کریگا تو وضو نہیں ہوگا، پس نماز نہیں ہوگی۔ اور شیعوں کے نزدیک پیروں کا دھونا نہیں ہے، ننگے پیروں پر مسح ہے، ان کے یہاں دو اعضاء (چہرہ اور ہاتھ) مغسول ہیں اور دو اعضاء (سر اور پاؤں) ممسوح ہیں، اور آج کل ایک نیا فرقہ نکلا ہے جو خود کو سلفی کہتا ہے ان کے نزدیک نائلون اور سوتی موزوں پر بھی مسح جائز ہے یہ لوگ درحقیقت غیر مقلد ہیں، اور چاروں ائمہ کہتے ہیں کہ خفین

پر یا خفین جیسے جورب پر مسح جائز ہے، حضور ﷺ کے زمانہ میں خفین تو چمڑے کے ہوتے تھے اور ایسے موزے آج بھی استعمال کئے جاتے ہیں، اور لفظ جورب فارسی سے بنا ہے۔ اس کی اصل 'گور پا' ہے یعنی پاؤں کی قبر، حضورؐ کے زمانہ میں جو جورب ہوتے تھے وہ خفین جیسے ہوتے تھے، پس جورب میں اگر تین شرطیں پائی جائیں تو ان پر مسح جائز ہے ورنہ نہیں، ایک: پنڈلی پر بغیر باندھے اپنے موٹاپے کی وجہ سے کھڑا رہے، دوسری: ان کو پہن کر بغیر جوتے چپل کے ایک فرسخ (تین میل) چلا جاسکے اور وہ پھٹیں نہ، تیسری: اگر اس پر پانی گرے تو پانی چھن کر اندر نہ جائے، یہ تین شرطیں جس جورب میں پائی جائیں اس پر مسح جائز ہے۔ اور سوتی اونی اور نائلون کے رائج موزوں میں ان میں سے کوئی شرط نہیں پائی جاتی اس لئے ان پر مسح جائز نہیں، اگر کوئی کرے گا تو اس کا وضو نہیں ہوگا۔

سوتی موزوں پر مسح کرنے والے کے پیچھے نماز نہیں ہوتی

اور جو مسائل طہارت کے باب سے ہیں یا نماز کی صحت وفساد سے متعلق ہیں ان میں اگر مقتدی کو معلوم ہو کہ اس کے امام نے ایسا عمل کیا ہے جس سے اس کا وضوء ٹوٹ گیا ہے تو اس کے پیچھے اس مقتدی کی نماز نہیں ہوگی، اور جن کو معلوم نہیں ان کی نماز ہوجائے گی، مثلاً ایک حنفی ہے اس نے وضوء کے بعد اپنی بیوی کو ہاتھ لگایا، ایک شافعی نے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھا کہ وضوء کے بعد اس نے اپنی بیوی کو ہاتھ لگایا ہے اور نیا وضوء کئے بغیر نماز پڑھانے کے لئے کھڑا ہوگیا ہے تو اس امام کے پیچھے اس شافعی مقتدی کی نماز نہیں ہوگی، کیونکہ اس مقتدی کے عقیدے میں امام کا وضوء نہیں اور جب اس کے عقیدے میں امام کا وضوء نہیں تو اس کے پیچھے اس کی نماز کیسے ہوگی؟ دوسری مثال: ایک شافعی کی نکسیر پھوٹی، اور اس نے وضوء کئے بغیر نماز پڑھائی ایک حنفی نے اپنی آنکھ سے یہ بات دیکھی تو اس حنفی کی اس شافعی امام کے پیچھے نماز درست نہیں، کیونکہ مقتدی کے اعتقاد میں امام باوضوء نہیں، اسی طرح اگر کوئی سلفی نائلون کے موزوں پر مسح کرکے نماز پڑھائے تو جس نے اس کو مسح کرتے دیکھا ہے اس کی نماز نہیں ہوگی، یہ تقلید کا مسئلہ نہیں ہے اعتقاد کا مسئلہ ہے، جب مقتدی کے اعتقاد میں امام کا وضوء نہیں

تواس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز نہیں ہوگی، حضرت تھانوی قدس سرہ کا واقعہ ہے: حضرت نے کانپور میں ایک اہلِ حدیث عالم کے پیچھے ظہر کی نماز پڑھی، عصر کا وقت ہوا تو اس اہلِ حدیث نے وضوء کیا اور سوتی موزوں پر مسح کیا، یہ دیکھ کر حضرت تھانویؒ نے ظہر کی نماز کا اعادہ کیا کیونکہ جب وہ عصر میں سوتی موزوں پر مسح کر رہا ہے تو ممکن ہے اس نے ظہر میں بھی مسح کر کے نماز پڑھائی ہو۔

دعا میں توسل جائز ہے واجب نہیں

تین چیزوں سے توسل کیا جاتا ہے، دو میں اتفاق ہے اور ایک میں اختلاف ہے:

ایک: اپنے نیک اعمال سے توسل کرنا جیسے قرآن کریم ختم کیا قرآن ختم کرنا ایک نیک عمل ہے، اب اگر کوئی اس سے توسل کرے اور کہے: اے اللہ! میں نے آپ کا کلام پاک پورا کیا ہے اسکے وسیلہ سے یعنی اس کی برکت سے میری دعا قبول فرما تو یہ توسل بالاتفاق جائز ہے۔

دوسرا: زندہ نیک آدمی کا توسل کرنا جیسے ایک صاحب نیک بندے ہیں، اب اگر کوئی یوں دعا کرے کہ اے اللہ! آپ کا یہ نیک بندہ ہے اس کے وسیلہ سے یعنی اس کی برکت سے میری دعا قبول فرما، تو یہ بھی بالاجماع جائز ہے۔

تیسرا: مردہ نیک بندہ کا توسل کرنا، اللہ کا ایک نیک بندہ دنیا سے گذر گیا، اور اس کا ایمان پر دنیا سے گذرنا یقینی ہے، جیسے ہمارے آقا دنیا سے گذر گئے آپؐ بالیقین اللہ کے نیک بندے تھے، اب اگر کوئی دعا کرے کہ اے اللہ! نبی پاک ﷺ کے وسیلہ سے یعنی برکت سے میری دعا قبول فرما تو یہ توسل نجدی اور غیر مقلدین کے نزدیک ناجائز ہے، اور چاروں ائمہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے، ایسا توسل اگرچہ واجب نہیں مگر حرام بھی نہیں، اور نجدی اور غیر مقلدین توسل کی اس قسم کو حرام کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بخاری شریف میں روایت ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ بارش نہیں ہورہی تھی، حضرت عمرؓ نے استسقاء کی نماز پڑھائی، نماز کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا اے اللہ! جب تک آپ کے رسول دنیا میں تھے تو ہم ان کا توسل کرتے تھے، اب حضورؐ دنیا میں

نہیں رہے یہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ ہمارے درمیان موجود ہیں ہم ان کا توسل کرتے ہیں کہ ہمیں بارش عطا فرما، **اللهم إنا كنا نتوسل إليك بنبينا فتسقينا، وإنا نتوسل إليك بعم نبينا فاسقنا** (بخاری:۱۰۱۰)

یہ حضرات کہتے ہیں: اگر وفات کے بعد بھی نیک آدمی کا توسل جائز ہوتا تو حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کا توسل کیوں نہیں کیا؟ حضرت عباس کا توسل کیوں کیا، جو زندہ تھے، معلوم ہوا کہ مرے ہوئے نیک آدمی کا توسل جائز نہیں، توسل زندہ نیک آدمی کا ہی ہوسکتا ہے۔

اور چاروں ائمہ کے ماننے والے کہتے ہیں کہ بخاری شریف کی یہ روایت مختصر ہے، پوری روایت بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں ہے، اس میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا: اے اللہ! جب تک حضور ﷺ دنیا میں زندہ تھے حضور ﷺ دعا کرتے تھے اور آپؐ ہمیں بارش عطا فرماتے تھے، اب حضور ﷺ نہیں رہے البتہ ہمارے درمیان حضور ﷺ کے چچا ہیں، ہم ان سے دعا کراتے ہیں، پھر حضرت عباسؓ سے کہا: آیئے اور دعا فرمایئے! اور حضرت عمرؓ پیچھے ہٹ گئے اور حضرت عباسؓ نے دعا کروائی اور مجمع نے آمین کہی، حضرت عباسؓ نے اس موقعہ پر جو دعا کی تھی وہ بھی عمدۃ القاری میں موجود ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہاں توسل دعا کرانے کے معنی میں ہے اور ظاہر ہے جب حضور ﷺ دنیا میں نہیں رہے تو حضور ﷺ سے دعا کیسے کرائیں گے؟ آج بھی ایسے مواقع پر مجمع میں جو سب سے نیک آدمی ہوتا ہے اسی سے دعا کراتے ہیں اور مجمع آمین کہتا ہے۔

اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ زندہ نیک آدمی کا توسل بالاتفاق جائز ہے جبکہ وہ کسی بھی وقت گمراہ ہوسکتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: إِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ: زندہ کسی بھی وقت فتنہ کا شکار ہوسکتا ہے، یعنی کسی بھی وقت گمراہ ہوسکتا ہے، جب اس کا توسل جائز ہے تو جو بالیقین ایمان پر گذر گیا جیسے حضور ﷺ ان کا توسل کیوں جائز نہیں! مگر یہ بات یاد رہے کہ توسل صرف جائز ہے، فرض واجب یا مستحب نہیں، اس لئے یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں، لوگ عام طور پر توسل نہیں کرتے، کسی خاص موقع پر ہی توسل کرتے ہیں مگر

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ اس لئے چھیڑا تھا کہ بدعتی توسل کو فرض قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک بزرگوں کے توسل کے بغیر دعا قبول نہیں ہوتی، اس لئے علامہ ابن تیمیہ کے موقف میں شدت آگئی اور انہوں نے حضور ﷺ کے توسل کو بھی ناجائز کہدیا، یہ بات ان کی مزاجی شدت کا نتیجہ تھی۔

نصف شعبان کی عبادت

پندرہ شعبان کے سلسلہ میں چار باتیں صحیح ہیں:

ایک: اس رات میں اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دیں اپنی گھر میں انفرادی عبادتیں کرنا، مگر ہم نے اس رات کو ہنگاموں کی رات بنادیا ہے، مسجدوں اور قبرستانوں میں اکٹھا ہوتے ہیں کھاتے پیتے اور شور کرتے ہیں یہ سب غلط ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، اس رات میں نفلیں پڑھنی چاہئیں، اور پوری رات پڑھنی ضروری نہیں، جتنی اللہ توفیق دے گھر میں پڑھے، یہ انفرادی عمل ہے اجتماعی عمل نہیں۔

دوسری: اگلے دن روزہ رکھے، یہ روزہ مستحب ہے۔

تیسری: اس رات میں اپنے لئے اپنے مرحومین کے لئے اور پوری امت کیلئے دعائے مغفرت کرے اس کیلئے قبرستان جانا ضروری نہیں، اس رات میں نبی ﷺ قبرستان ضرور گئے ہیں مگر چپکے سے گئے ہیں حضرت عائشہؓ کو اتفاقاً پتہ چل گیا تھا نیز حضور ﷺ نے امت کو اس رات میں قبرستان جانے کا کوئی حکم بھی نہیں دیا، اس لئے ہمارے یہاں جو تماشے ہوتے ہیں وہ سب غلط ہیں۔

چوتھی بات: جن دو شخصوں کے درمیان لڑائی جھگڑا اور اختلاف ہو وہ اس رات میں صلح صفائی کرلیں، اگر صلح صفائی نہیں کریں گے تو بخشش نہیں ہوگی۔

یہ چار کام اس رات میں ضعیف احادیث سے ثابت ہیں اور ضعیف کا لحاظ اس وقت نہیں ہوتا جب سامنے صحیح حدیث موجود ہو، صحیح کے مقابل ضعیف حدیث کو نہیں لیا جاتا، لیکن اگر کسی مسئلہ میں ضعیف حدیث ہی ہو اس کے مقابل صحیح حدیث نہ ہو تو ضعیف حدیث لی جاتی

ہے، اور ایسا یہی ایک مسئلہ نہیں ہے بہت سے مسائل ہیں جن کی حدیثیں ضعیف ہیں اور ضعیف احادیث سے مسئلے ثابت ہوئے ہیں، جیسے صلاۃ التسبیح کی گیارہ روایتیں ہیں اور سب ضعیف ہیں، مگر سلف کے زمانہ سے صلوٰۃ التسبیح کا رواج ہے۔

البتہ ضعیف حدیث سے واجب اور سنت کے درجہ کا عمل ثابت نہیں ہوگا استحباب کے درجے کا حکم ثابت ہوگا پس صلاۃ التسبیح پڑھنا مستحب ہے، ایسے ہی نصف شعبان کے بارے میں جو روایات ہیں وہ بھی ضعیف ہیں مگر ان سے استحباب کے درجہ کا عمل ثابت ہوسکتا ہے، پس احادیث میں مذکور چاروں کام مستحب ہونگے، شب براءت، اس کے اعمال اور اس کے فضائل کو بالکل بے اصل کہنا صحیح نہیں، البتہ سورۃ الدخان کی آیت تین: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ﴾ کا مصداق شب براءت نہیں، اس کا مصداق شب قدر ہے، کیونکہ قرآن شبِ قدر میں نازل ہوا ہے۔

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو کھا جاتا ہے

ایک بھائی پوچھ رہے ہیں: کچھ لوگ نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد گروپ بنا کر مسجد میں ایک طرف کھڑے ہوجاتے ہیں اور بلند آواز سے باتیں کرتے ہیں یہ کیسا ہے؟ اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: ایک حدیث میں حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح بھسم کردیتا ہے جس طرح آگ سوکھی ہوئی گھاس کو کھا جاتی ہے، سوکھی ہوئی گھاس کو آگ کی چنگاری دکھائی جائے تو لحہ بھر میں وہ گھاس کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے، اسی طرح مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا، نیک اعمال کو بھسم کردیتا ہے، اس کو اردو میں کہتے ہیں: ثواب ندارد گناہ لازم! آئے تھے مسجد میں ثواب کمانے، ملا کچھ نہیں، جو بیلنس تھا وہ بھی گیا۔ دوسری حدیث میں نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: بازاروں میں جس طرح شور وشغب کرتے ہیں مسجد میں اس طرح شور وشغب نہ کیا کرو، مگر یہاں (امریکہ میں) ایک مجبوری ہے، یہاں ہر شخص اپنے گھر میں محبوس ہے، ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوتی، تین چار نمازیں تو لوگ جوب (کام) پر پڑھتے ہیں، ایک آدھ نماز کے لئے مسجد آتے ہیں، اس

لئے چوبیس گھنٹے کی باتیں کر لیتے ہیں۔ یہ ان ممالک کی پریشانی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ نہ سانپ بچے نہ لاٹھی ٹوٹے۔

انگلینڈ والوں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے، ابھی یہاں (کینڈا میں) ایسا انتظام نہیں۔ انگلینڈ والوں نے یہ انتظام کیا ہے کہ مسجد کا خاص حصہ جہاں جماعت ہوتی ہے اس کو الگ کر دیا ہے، اور باہر کچھ حصہ چھوڑ دیا ہے، جو مسجد سے خارج ہے، نماز کے بعد جماعت خانہ بند ہو جاتا ہے، لوگ بیچ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، اس طرح مسجد کی بے حرمتی نہیں ہوتی، ایسا انتظام آپ حضرات بھی کریں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔

ڈاڑھی میں دو واجب الگ الگ ہیں

ڈاڑھی رکھنا واجب ہے اور ایک مشت رکھنا واجب ہے، یہ دو الگ الگ واجب ہیں، ایک شخص بالکل ڈاڑھی نہیں رکھتا، وہ دونوں واجب کا تارک ہے، اور ایک آدمی خشخشی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس نے ایک واجب پر عمل کیا کہ ڈاڑھی رکھی اور دوسرا واجب چھوڑ دیا، ایک مشت ڈاڑھی رکھنا بھی واجب ہے، اور ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کاٹ لینا سنت ہے، ڈاڑھی میں سنت ایک مٹھی ہے: اس کا یہی مطلب ہے، غیر مقلدین کا عمل سنت کے خلاف ہے، وہ ڈاڑھی جہاں تک جائے چھوڑے رہتے ہیں، مشت سے زائد کاٹتے نہیں، ان کا یہ عمل سنتِ نبوی کے خلاف ہے۔

ہر مسئلہ قرآن میں ہونا ضروری نہیں

ایک صاحب پوچھتے ہیں: حدیث شریف میں تو ڈاڑھی کا ذکر ہے، مگر کیا قرآن میں بھی ڈاڑھی کا ذکر ہے؟

جواب: ہر مسئلہ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں، فجر کی دو رکعتیں ہیں، بتاؤ قرآن میں کہاں ہے؟ ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں ہیں دکھاؤ قرآن میں کہاں ہے؟ مغرب کی تین رکعتیں ہیں، قرآن میں کہاں ہے؟ قرآن میں تو بس اتنا ہے کہ نماز کی پابندی کرو، اس کا اہتمام کرو، اور پانچ وقت کی نماز پڑھو، باقی تفصیل حدیثوں میں ہے، نماز میں کیا فرائض ہیں؟ کیا واجبات ہیں؟ کیا سنن و مستحبات اور آداب ہیں؟ کن چیزوں سے نماز فاسد ہوتی ہے؟

اور کونسی باتیں نماز کو مکروہ کرتی ہیں؟ یہ سب تفصیلات حدیثوں میں ہیں، ہر مسئلہ کا قرآن میں ہونا ضروری نہیں، شریعت کے اصول تین ہیں: قرآن، حدیث اور اجماع۔ اور دین کا مدار ان تینوں پر ہے، اگر ان میں سے کسی بھی ایک سے مسئلہ ثابت ہو جائے تو کافی ہے، ہر مسئلہ کی دلیل قرآن سے مانگنا صحیح نہیں۔

ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں

اور ڈاڑھی کا ذکر قرآن میں موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر گئے تو پیچھے بنی اسرائیل گمراہ ہو گئے، انھوں نے گوسالہ پرستی شروع کر دی، حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کو اس حرکت سے باز رکھنے کی پوری کشش کی مگر قوم باز نہیں آئی، حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر سے لوٹے اور اپنی قوم کو گمراہی میں پایا تو اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی سرزنش کی، انھوں نے خیال کیا کہ ہارون نے قوم کا خیال نہیں رکھا اس لئے وہ گمراہ ہوئی۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی، اس موقع پر حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا: ﴿لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ﴾: بھائی جان! میری ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ کر نہ کھینچیں، میں نے ایک مصلحت سے خاموشی اختیار کی تھی، معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی اتنی لمبی تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑ کر کھینچا، ظاہر ہے خشخشی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی نہیں جا سکتی، پس قرآن میں ڈاڑھی کا ذکر ہے، اور لمبی ڈاڑھی کا ذکر ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی لمبی ڈاڑھی تھی، اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی بھی ڈاڑھی لمبی تھی، حضرت عمارؓ سے سوال کیا گیا: آنحضور ﷺ ظہر اور عصر میں قراءت کرتے تھے؟ حضرت عمارؓ نے جواب دیا: جی ہاں، قراءت کرتے تھے، اور یہ بات اس طرح معلوم ہوئی کہ آپؐ کی ڈاڑھی ہلتی تھی، ظاہر ہے لمبی ڈاڑھی ملتی ہے، خشخشی ڈاڑھی نہیں ہلتی۔

مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا حرام ہے

بزرگو اور بھائیو! اس سے پہلے کہ میں ان آیات کی وضاحت کروں دو باتیں سمجھ لیں:

۱-آداب میں سے یہ ہے کہ اگر کسی کو صف میں کھل کر بیٹھنا ہے تو آگے بڑھ کر بیٹھے، پیچھے ہٹ کر نہ بیٹھے، پیچھے ہٹ کر بیٹھے گا تو پیچھے والے کے منہ سے اس کی پیٹھ لگے گی، اور ہوسکتا ہے یہ بات اسے ناگوار ہو، اور ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن کی ذرا سی تکلیف کا بھی خیال کرنا چاہئے، لہٰذا اگر کھل کر بیٹھنا ہے تو آگے بڑھ کر بیٹھے، اس صورت میں آپ کا منہ کسی کی پیٹھ سے لگے گا اور یہ آپ کا اپنا اختیار ہے۔

۲-ایک بھائی نے کہا ایک دوست اعتکاف میں بڑے زور سے خراٹے لیتے ہیں، جیسے ہیلی کوپٹر چل رہا ہو، ان کی وجہ سے دوسرے لوگ سو نہیں سکتے۔ ایسے بندہ کو اعتکاف میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔

میں اس کی مثال دوں، آپ حضرات دیکھتے ہیں: میں سارا مہینہ اس مسجد میں رہتا ہوں کسی کے گھر کھانے بھی نہیں جاتا، پس میں اپنے کمرہ میں رہنے کے بجائے اگر مسجد میں ایک مہینہ کے اعتکاف کی نیت کرلوں تو اس میں مجھے پریشانی کیا ہے؟ کچھ نہیں، مگر میں ایسا نہیں کرتا، آخری عشرہ میں بھی اعتکاف نہیں کرتا کیونکہ میرا قرآن بڑی عمر کا حفظ کیا ہوا ہے اس لئے مجھے رات میں پڑھنا ہوتا ہے اور یاد کرنے کے لئے زور سے پڑھنا پڑتا ہے، آہستہ پڑھوں گا تو یاد نہیں ہوگا، اب اگر میں اعتکاف میں بیٹھوں اور رات بھر زور سے پڑھوں، تو سونے والے کب سوئیں گے؟ ان کا خیال رکھنے کی وجہ سے میں اعتکاف میں نہیں بیٹھتا۔ اسی طرح ہر بندہ کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے عمل سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے کیونکہ اعتکاف سنت مؤکدہ ہے اور کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا حرام ہے۔ لہٰذا ایسا بندہ جس کو یہ بیماری ہو اس کو اعتکاف میں نہیں بیٹھنا چاہئے، لیکن اب جبکہ وہ بیٹھ چکے ہیں تو اس کا حل یہ ہے کہ وہ چت نہ لیٹیں، کروٹ پر لیٹیں، اور آس پاس والوں کو تاکید کردیں کہ اگر مجھے چت لیٹا ہوا پائیں تو جگادیں، کروٹ پر لیٹنے کی صورت میں خراٹے خود ہی بند ہوجائیں گے۔

حدیث: 'پڑھتا جا اور چڑھتا جا' کا مطلب

حدیث: جنت میں جنتی سے کہا جائے گا کہ قرآن پڑھتا جا اور درجات میں چڑھتا جا،

یہ حدیث صرف حافظ قرآن کے لئے نہیں ہے، یہ بات ہر قرآن پڑھنے والے سے کہی جائے گی، کیونکہ حدیث کے الفاظ ہیں: يُقَالُ لِقَارِئُ الْقُرْآن: قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا۔ حافظ القرآن نہیں ہے۔ قاری ألقرآن ہے، اور کسی روایت میں لصاحب القرآن ہے یعنی ہر قرآن والے سے کہا جائے گا، چاہے وہ ناظرہ پڑھتا ہو یا حفظ پڑھتا ہو، کہا جائے گا پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔

اور قرآن پڑھنے والا اور قرآن والا وہ شخص ہے جس کو قرآن سے خصوصی دلچسپی ہو، جو قرآن خوب پڑھتا ہو، بکثرت قرآن پڑھتا ہو، اس کو قرآن سے دلچسپی ہو، بعض مؤمنین کو بعض نیک کاموں سے خصوصی دلچسپی ہوتی ہے، کسی کو نفل نمازوں سے: وہ نماز والے ہیں، کسی کو خیر خیرات سے: وہ خیرات والے ہیں، کسی کو نفل روزوں سے، جن کے لئے جنت میں باب ریّان (سیرابی کا دراوزہ) ہوگا، کسی کو حج سے، کسی کو ذکر سے، اسی طرح جس کو قرآن کی تلاوت سے دلچسپی ہے وہ قرآن والا ہے، اس سے کہا جائے گا: پڑھتا جا اور چڑھتا جا!

اور لوگ سمجھتے ہیں کہ سیڑھی سے اوپر چڑھے گا، سیڑھی سے نہیں چڑھے گا ثواب، درجات اور علوم میں چڑھے گا، قرآن مجید کے عجائبات کبھی ختم ہونے والے نہیں، جنت میں بھی قرآن پڑھتے جائیں گے اور اس کے عجائبات کھلتے جائیں گے، یہانتک کہ وہ آخری آیت پر پہنچ جائے گا، اور قرآن کی کوئی آخری آیت نہیں، قرآن گول راؤنڈ ہے، جس مجلس میں ختم کرو اسی میں شروع کردو، اس لئے آخری آیت نہیں، پس تا ابد قرآن پڑھتا جائے گا اور درجات وعلوم میں چڑھتا جائے گا۔

ہر مخلوق اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے

سورۂ بنی اسرائیل (آیت ۴۴) میں اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾: اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ساتوں آسمان اور زمین اور وہ تمام مخلوقات جو آسمان وزمین میں ہیں ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ اور کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ کی پاکی بیان نہ کرتی ہو ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ مگر تم

ان کی پاکی بیان کرنے کو سمجھتے نہیں، ان کی بولی اور ہے اور تمہاری بولی اور، زبان کے اختلاف کی وجہ سے تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے، مگر وہ تسبیح کرتے ہیں۔

تسبیح کے معنی ہیں: پاکی بیان کرنا، یعنی اللہ عزوجل کا عیوب ونقائص سے پاک ہونا بیان کرنا اور تحمید کے معنی ہیں: خوبیوں کے ساتھ متصف کرنا، یعنی اللہ کے لئے تمام کمالات ثابت کرنا، اسی کو تسبیح وتحمید کہتے ہیں۔

پس ہر مخلوق اللہ کی تسبیح وتحمید کرتی ہے مگر ہم اس کو نہیں سمجھتے، ان کی زبان اور ہے اور ہماری زبان اور، اس لئے ہمیں ان کا بولنا ایک مسلسل آواز معلوم ہوتا ہے، انسان خود بھی ایک دوسرے کی باتیں نہیں سمجھتے، اردو جاننے والے فارسی بولنے والوں کی باتیں نہیں سمجھتے، فارسی والے عربی والوں کی باتیں نہیں سمجھتے، ان کو وہ ایک مسلسل آواز معلوم ہوتی ہے، اور ہر زبان حقیقت میں ایک مسلسل آواز ہے، پھر لوگوں نے اس کے ٹکڑے کرکے اصطلاحیں بنالی ہیں، یوں زبانیں وجود میں آتی ہیں، پس جس زبان کو ہم نہیں جانتے وہ اگر ہمارے سامنے بولی جائے گی تو وہ ہمیں ایک مسلسل آواز معلوم ہوگی، اس کو وہی سمجھے گا جو اس زبان کی اصطلاحیں جانتا ہے، برسات میں چاروں طرف مینڈک بولتے ہیں، اور عجیب منظر بن جاتا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ایک مسلسل آواز ہے حالانکہ وہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں، مگر ہم نہیں سمجھتے اس لئے کہ ہم ان کی زبان نہیں جانتے، حضرت سلیمان علیہ السلام جانوروں کی بولی جانتے تھے، چنانچہ وہ جانوروں کا بولنا سمجھتے تھے، ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو حکم دیا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو سمجھ لیا، اگر جانوروں کی بولی نہ ہوتی تو حضرت سلیمان علیہ السلام چیونٹی کی بات کیسے سمجھتے؟ معلوم ہوا کہ تمام جانوروں کی بولیاں ہیں اور جو سمجھ سکتا ہے وہ جان سکتا ہے کہ وہ جانور کیا کہہ رہے ہیں، اور ہم جنس جانور ایک دوسرے کی بولی سمجھتے ہیں، اور وہ اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح کرتے ہیں، یہ اس آیتِ کریمہ سے مفہوم ہوتا ہے۔

اور آیتِ کریمہ سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ کی ہدایت کا نور جانوروں سمیت کائنات کے ذرہ ذرہ کو پہنچا ہے۔ اس لئے وہ اللہ کی پاکی اور حمد بیان کرتے ہیں، اللہ کی پاکی اور خوبی وہی بیان کرے گا جسے ہدایت کی روشنی ملی ہے، کافر نہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور نہ

خوبی بیان کرتا ہے کیونکہ اس کو نور ہدایت نہیں ملا، تو وہ کیسے تسبیح وتحمید کرے گا، اور ہم اللہ کے فضل سے تسبیح وتحمید کرتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ کو پہچانتے ہیں اللہ نے ہمیں ہدایت کی روشنی بخشی ہے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے

اور سورۃ الحج کے دوسرے رکوع میں جو آیتِ سجدہ ہے —— میں اس کو پڑھ نہیں رہا، صرف ترجمہ کرتا ہوں، ترجمہ کرنے سے اور ترجمہ سننے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا، آیت تلاوت کرنے سے اور سننے سے سجدہ واجب ہوتا ہے —— اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اللہ کے لئے سجدہ کرتی ہیں تمام وہ چیزیں جو آسمانوں میں ہیں، اور تمام وہ چیزیں جو زمین میں ہیں۔ اور سورج، اور چاند، اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے ﴿وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ اور انسانوں میں سے بہت سے ﴿وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ﴾ اور انسانوں میں بہت سے وہ ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا یعنی وہ اللہ کو سجدہ نہیں کرتے۔

انسانوں میں تو تقسیم نکلی، بعض اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں اور بعض سجدہ نہیں کرتے، نہ تسبیح وتحمید کرتے ہیں، جنات کا بھی یہی حال ہے، ان میں بھی بعض اللہ کی تسبیح وتحمید اور سجدہ کرتے ہیں اور بعض نہیں کرتے، مگر ثقلین (جن وانس) کے علاوہ ہزاروں مخلوقات ہیں ان میں کوئی تقسیم نہیں، وہ تمام مخلوقات اللہ کی تسبیح وتحمید بھی کرتی ہیں اور اللہ کو سجدہ بھی کرتی ہیں۔

سجدہ اللہ کے ساتھ خاص ہے

سجدہ غایت درجہ کی عاجزی ہے اور وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ نماز میں چار ارکان ہیں، پہلا رکن قیام ہے، یعنی اللہ کے حضور میں سیدھا کھڑا ہونا، یہ عبادت ہے مگر یہ بات اللہ کے ساتھ خاص نہیں، طالب علم استاذ کے سامنے باادب کھڑا ہوسکتا ہے، نوکر سیٹھ کے سامنے باادب کھڑا ہوسکتا ہے، حالانکہ قیام یعنی کھڑا ہونا نماز کا ایک رکن ہے، اور عبادت ہے مگر یہ عبادت اللہ کے ساتھ خاص نہیں، اسی طرح نماز کا

ایک رکن قعدہ ہے یعنی کسی کے سامنے باادب دوزانو بیٹھنا، یہ بھی عبادت ہے، مگر یہ بات بھی اللہ کے ساتھ خاص نہیں، طالب علم استاذ کے سامنے دوزانو باادب بیٹھ سکتا ہے۔

مگر نماز میں دو رکن ایسے ہیں جو اللہ کے ساتھ خاص ہیں، وہ رکوع اور سجدہ ہیں، رکوع میں جھکنا ہوتا ہے اور غیر اللہ کے سامنے جھکنا جائز نہیں، مگر رکوع پورا جھکنا نہیں، آدھا جھکنا ہے، اس لئے اس میں زیادہ سختی نہیں، بعض لوگ علماء سے مصافحہ کرتے ہوئے جھکتے ہیں ہم ان کو سمجھاتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں، مصافحہ کرتے وقت سیدھا کھڑا رہنا چاہئے، جھکنا نہیں چاہئے، لیکن اگر کوئی جھک جائے تو شرک کا حکم نہیں لگائیں گے بلکہ اس کو سمجھائیں گے کہ مؤمن کا سر اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہئے، مگر سجدہ غایت درجہ کی عاجزی ہے، اس لئے وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں، اگر کوئی اللہ کے علاوہ کسی کو سجدہ کرے تو ہم اس کو شرک کہتے ہیں۔

مغل بادشاہوں کے دور میں بادشاہوں کو سجدے کئے جاتے تھے، آج بھی بہت سے جاہل مسلمان قبروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ اگر اس نے عبادت کی نیت سے سجدہ کیا ہے تو وہ مشرک اور کافر ہوگیا، اور تعظیماً سجدہ کیا ہے تو اس کا یہ فعل اگرچہ شرکیہ ہے، گناہ عظیم ہے مگر اس کو مشرک وکافر نہیں کہیں گے۔

اور انسانوں کا اور دیگر مخلوقات کا سجدہ ایک نہیں، سب کے سجدے الگ الگ ہیں، خود انسانوں کے سجدے مختلف ہیں، تندرست آدمی کا سجدہ اور ہے اور بیمار کا سجدہ اور ہے، نمازی تندرست ہے تو اس کا سجدہ یہ ہے کہ جسم کا طرف اعلیٰ یعنی سر کو طرف اسفل یعنی پیروں کے لیول پر لائے اور نمازی بیمار ہے اور اس طرح سجدہ نہیں کرسکتا تو سر سے اشارہ کرے یہی اس کا سجدہ ہے، اسی طرح ہر مخلوق کا سجدہ الگ ہے جو ان کے شایانِ شان ہے، مگر جس طرح ہم ان کی بولی نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کی تسبیح وتحمید نہیں سمجھتے، اسی طرح ان کے سجدے بھی نہیں سمجھتے۔ مگر قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ تمام مخلوق اللہ کو سجدہ کرتی ہے، اور تسبیح وتحمید میں لگی ہوئی ہے، مخلوقات میں سے کوئی ایسا نہیں جو نور ہدایت سے محروم ہو، صرف مکلّف مخلوق کے بہت سے افراد نور ہدایت سے محروم ہیں۔

افادات

علم ’پڑھنے‘ سے آتا ہے ’پڑنے‘ سے نہیں آتا

برطانیہ میں طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

طلبہ مدرسوں میں ’پڑھتے‘ کم ہیں، بس ’پڑتے‘ ہیں حالانکہ علم پڑھنے سے آتا ہے پڑنے سے نہیں آتا، زبردستی پڑھنے بٹھائیں تو پڑھ لیتے ہیں، مگر جب دل کا تقاضہ نہ ہو تو کہنے سے کیا فائدہ؟ حفظ کلاس میں جو بچے بیٹھتے ہیں وہ بھی اپنے شوق سے نہیں بیٹھتے، ان کو اگر چھٹی مل جائے تو فورا بھاگ کھڑے ہوں، وہ حفظ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے ماں باپ حفظ کرانا چاہتے ہیں، ان کو آخرت میں تاج پہننا ہے، وہ ان کو گھر میں ٹھہرنے نہیں دیتے، اور استاذ سختی کرتا ہے تو نوے فیصد بچے حفظ کرلیتے ہیں، سو بچوں میں سے نوے بچے حافظ ہوجاتے ہیں، پھر جب بچہ حافظ ہوگیا اور باپ مطمئن ہوگیا تو بچہ قرآن پڑھنا چھوڑ دیتا ہے صرف رمضانی حافظ ہوکر رہ جاتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے شوق سے حفظ نہیں کیا، اور جو شخص اپنے شوق سے حفظ کرتا ہے وہ اس نعمت کی قدر کرتا ہے، ہمیشہ اس کا ورد رکھتا ہے۔

پھر ابا چاہتا ہے کہ بچہ مولوی بن جائے تا کہ اس کی عاقبت سنور جائے، اب بچہ مرتا کیا نہ کرتا مولوی کلاس میں بیٹھ جاتا ہے، اور جب تک سات آٹھ سال پورے نہ ہوں اور وہ مولوی کی سند لا کر ابا کو نہ دکھائے ابا گھر میں ٹھہرنے نہیں دے گا، اور اب چونکہ وہ سیانا ہوگیا ہے اس لئے استاذ سختی نہیں کرسکتا، اور اگر اتفاق سے ملک کا قانون بھی بچہ کی طرف داری میں ہو تو پھر استاذ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا، اس لئے اب وہ مدرسہ میں پڑا رہتا ہے، مطالعہ کرے نہ کرے سبق میں آئے نہ آئے بیمار بن کر پڑ جائے، استاذ کچھ سختی نہیں کرسکتا۔

اور جو بچے اپنے لئے پڑھتے ہیں ان کی شان ہی نرالی ہوتی ہے، وہ جب وطن سے نکلتے ہیں تو پلٹ کر گھر کی طرف نہیں دیکھتے، اپنا مقصد پورا کرکے ہی گھر لوٹتے ہیں، اگرچہ دس

سال گذر جائیں، ماضی میں طلبہ کا یہی حال تھا، اور اب ہمارا طالب علم سال میں چار مرتبہ گھر جاتا ہے پس وہ ہمارے ابنائے قدیم کے درجہ کو کہاں پہنچ سکتا ہے؟

اساتذہ کی دریادلی

ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا:

اب ہمارے اساتذہ بہت دریادل ہوگئے ہیں، طالب علم پرچے میں کچھ لکھے یا نہ لکھے پاس کردیتے ہیں، اور طالب علم کو غلط فہمی کا شکار کردیتے ہیں، اس کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ جب بغیر محنت کئے پاس نمبر آجاتے ہیں تو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ روٹی ملے یوں تو کھیتی کرے کیوں؟ اور مہتمم صاحب بھی اس کو اگلے درجہ میں بڑھا دیتے ہیں، اس طرح اس کا ستیاناس ہوجاتا ہے، جب ایک درجہ غلط ہوگیا تو تا ثریا می رود دیوار کج! آگے کے درجات میں اور کچا ہوتا چلا جائے گا اور آخر میں کسی کام کا نہیں رہے گا۔

دولفظوں نے نقصان پہنچایا

مدرسہ سے نکلنے والوں کے لئے دو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں ایک: فارغ ہوگیا! جب اس نے خود کو فارغ سمجھ لیا تو آگے پڑھنے کا جو دوسرا مرحلہ ہے وہ پیش آتا ہی نہیں وہ دوسرا مرحلہ شروع کرتا ہی نہیں۔

دوسرا لفظ: فاضل یعنی علامۃ الدہر، اب آگے کوئی کمال منتظر نہیں رہا، سب کچھ اسے آگیا حالانکہ ابھی تو علم کی راہ میں قدم رکھا ہے۔ عرب ممالک کے لوگ یہ لفظ استعمال نہیں کرتے، ان کے یہاں فراغت اور فضیلت کا کوئی تصور نہیں، وہ لفظ خِرِّیج استعمال کرتے ہیں یعنی مدرسہ سے نکلا ہوا جس نے پڑھنے کا ایک مرحلہ پورا کرلیا اور دوسرے مرحلہ میں داخل ہوگیا، اگر ہمارا بھی یہی تصور بن جائے کہ ابھی ہم نے کچھ حاصل نہیں کیا، ابھی ہمارے اندر علم حاصل کرنے کی صرف استعداد بنی ہے، علم تو آگے آئے گا تو اگلی منزل آسان ہوجائے، اب وہ علم مطالعہ کے ذریعہ علم حاصل کرے گا۔

تصورات اثرانداز ہوتے ہیں

تصورات اچھے ہوں یا برے اثرانداز ہوتے ہیں، ایک استاذ تھے، کبھی چھٹی نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ طلبہ نے پلان بنایا کہ آج استاذ کو بیمار کرنا ہے، چنانچہ ایک طالب علم ان کے پاس آیا، سلام ومصافحہ کرکے کہنے لگا: حضرت آج آپ بیمار معلوم ہوتے ہیں! انہوں نے کہا: نہیں! مجھے کچھ نہیں ہوا، تھوڑی دیر کے بعد دوسرا آیا، اس نے بھی یہی کہا، حضرت! آج آپ کافی گرم معلوم ہوتے ہیں، انہوں نے جواب دیا: کیا ایسا ہے؟ ذہن نے بات قبول کرلی، تھوڑی دیر کے بعد تیسرا آیا اور کہا: حضرت! آج آپ کے ہاتھ گرم معلوم ہوتے ہیں، کہنے لگے، مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد چوتھا آیا اور کہا: حضرت! آج آپ کے ہاتھ بہت گرم ہیں، کہنے لگے: ہاں بخار ہوگیا ہے! اس طرح دس طلبہ ملے اور استاذ کو بیمار کردیا، ان کو واقعی بخار چڑھ گیا۔

غرض اچھے برے تصورات اثرانداز ہوتے ہیں اس لئے مدرسہ سے نکلنے والے طلبہ اگر تصور کریں کہ میری منزل ابھی دور ہے، مجھے کچھ نہیں آیا، مجھے ابھی مطالعہ سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے تو وہ منزل کی طرف رواں دواں رہے گا اور ایک دن حقیقی معنی میں عالم بنے گا، ورنہ جو کچھ حاصل کیا ہے وہ بھی چند دن میں بھول جائے گا اور کورا ہوجائے گا۔

طلبہ کے پڑھنے میں تین چیزیں شامل ہیں

طالب علم اگر پڑھنا چاہے تو اس کیلئے تین چیزیں ضروری ہیں:

ایک: مطالعہ کرکے سبق میں جائے، مطالعہ کا مطلب یہ ہے کہ آگے کا سبق دیکھ کر جائے کم سے کم تین مرتبہ عبارت پڑھے، خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ کام ضرور کرے، پھر حاشیہ بھی پڑھے چاہے ایک حرف سمجھ میں نہ آئے، اس کا نام مطالعہ ہے۔

دوسری چیز: جب سبق میں بیٹھے تو ہر بات سمجھ کر چھوڑے، درس میں سمجھ میں آجائے تو ٹھیک ہے، ورنہ سبق کے بعد استاذ سے رجوع کرے، پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو کسی اور کی

طرف رجوع کرے﴿فَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْم﴾سیر پر سوا سیر ہوتا ہے، بہر حال سبق سمجھ کر چھوڑے، بے سمجھے کبھی آگے نہ بڑھے۔

تیسری چیز: خواندہ یاد کرے، جو طالب علم خواندہ یاد نہیں کرتا وہ ہاتھوں میں سوراخ کر کے پانی پیتا ہے، جتنا بھی پانی ڈالا جائے گا سب نیچے چلا جائے گا، منھ تک نہیں پہنچے گا۔

آج کل طلبہ کا عجیب حال ہو گیا ہے، بعض تو درسگاہ میں بغیر کتاب کے آتے ہیں اور آ کر بیٹھے رہتے ہیں سمجھ میں آئے نہ آئے کوئی فکر نہیں، اور جب تک امتحان سر پر نہیں آتا خواندہ یاد نہیں کرتے، اور امتحان کے وقت یاد کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں، **إنما الأعمال بالنيات:** امتحان کے مقصد سے یاد کیا ہوا امتحان کے ساتھ چلا جاتا ہے، باقی رہنے والا علم وہی ہے جو علم کے مقصد سے حاصل کیا جائے، میری طالب علمی میں سال کے درمیان دو امتحان ہوتے تھے، سہ ماہی اور ششماہی، ہم امتحان کے بعد ایک ہفتہ کھیلتے تھے، آرام کرتے تھے، پھر سنجیدہ ہو جاتے تھے، سب کھیل بند کر دیتے تھے اور کتابوں کا تکرار شروع کر دیتے تھے، تکرار ہی سے کتاب یاد ہوتی ہے، اور اب جب تک امتحان سر پر سوار نہیں ہوتا طالب علم کتاب نہیں اٹھاتا۔

غرض: طالب علم کے پڑھنے میں مذکورہ تین چیزیں شامل ہیں اگر یہ تین چیزیں جمع ہوں تو وہ پڑھ رہا ہے ورنہ مدرسہ میں پڑا ہے۔

علماء کے پڑھنے میں تین چیزیں داخل ہیں

جو حضرات مدرسہ سے فارغ ہو چکے ہیں ان کو بھی آگے پڑھنا چاہئے، خواہ وہ کہیں پڑھاتے ہوں یا نہ پڑھاتے ہوں پڑھنا جاری رکھنا چاہئے، اور ان کے پڑھنے میں تین چیزیں شامل ہیں، اگر یہ تین چیزیں جمع ہیں تو پڑھنا ہے ورنہ وقت گذارنا ہے، جیسے لوگ بسوں میں، ٹرینوں میں، ہوائی جہازوں میں ناول لے کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد کیا ملتا ہے؟ کچھ بھی نہیں! بس وقت کٹ جاتا ہے، یہ پڑھنا نہیں، وقت گذارنا ہے، پڑھنا اس وقت ہے جب تین چیزیں جمع ہوں، وہ تین چیزیں کیا ہیں؟

پہلی چیز: صرف کسی کتاب کے متعلقات نہ دیکھے، بلکہ کتاب جس فن کی ہے وہ پورا فن

دیکھے، بہت سی باتیں کتاب کی شروح میں نہیں ہوتیں، اس لئے شروح سے کتاب حل نہیں ہوتی، اگر ہر کتاب شروح سے حل ہو جاتی تو نئی شرحوں کی ضرورت کیا تھی۔

اور پورا فن دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مثال کے طور پر آپ قدوری میں باب خیار الشرط کا مطالعہ کر رہے ہیں، یہ باب نیچے بہشتی زیور تک اور اوپر شامی، درمختار اور بدائع تک دیکھ ڈالیں یہ پورا فن دیکھنے کا طریقہ ہے، یہ نہیں کہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئے اور آخر تک دیکھ ڈالی، پھر کوئی دوسری کتاب پکڑ لی، مدرس کے لئے یہ طریقہ ٹھیک نہیں، اور اگر مدرس متعدد فنون پڑھاتا ہے تو ان میں سے ایک کتاب فن پڑھنے کے لئے منتخب کرے، باقی کتابیں متعلقات دیکھ کر پڑھاتا رہے، پھر دو تین سال میں جب وہ یہ فن دیکھ چکے تو دوسرا فن شروع کرے، جیسے کافیہ پڑھا رہا ہے تو نحو کا مطالعہ شروع کرے، نیچے چھوٹی اردو کی کتابیں اور اوپر شرح جامی تک مطالعہ کرے، یہ پڑھنا ہے اور کتاب کے صرف متعلقات دیکھنا پڑھانا کے لئے ہے پڑھنا نہیں، اور پڑھانے سے علم نہیں آتا پڑھنے سے علم آتا ہے۔

دوسری چیز: فن کے مطالعہ کے دوران کاپی بنا لے یا کتاب میں زائد ورق رکھ لے اور جہاں قیمتی بات ملے اس کو کاپی میں نقل کر لے یا اس کا خلاصہ لکھ لے، اگر اس طرح تجمیع نہیں کرے گا تو اس کی مثال لنگور کی سی ہے جو مکئی کے کھیت میں گھسا، جب کوئی شاندار بھٹا نظر آیا تو اسے توڑ کر بغل میں دبایا اور آگے بڑھا، دوسرا نظر آیا تو اس کو بھی توڑا، تیسرا نظر آیا تو اس کو بھی توڑا، یونہی توڑتا اور بغل میں دباتا چلا گیا، جب کھیت سے باہر نکلا تو اس کے بغل میں ایک بھی بھٹا نہیں، اسی طرح فن کے مطالعہ کے دوران آدمی بہت سی قیمتی باتوں پر گذرتا ہے، پس اگر تجمیع نہیں کرے گا تو بھول جائے گا کہ فلاں بات کونسی کتاب میں کہاں پڑھی تھی؟ پلّے کچھ نہیں رہے گا، اور ہر سال پورا فن نہیں پڑھ سکتا، اس لئے اگر آپ نے قیمتی باتیں جمع کر رکھی ہیں تو اگلے سال جب آپ پڑھائیں گے تو وہ تمام باتیں کام آئیں گی، غرض اساتذہ کے پڑھنے میں دوسری چیز تجمیع ہے۔

تیسری چیز: استنتاج ہے، جو کچھ پڑھا ہے اس میں غور کرے اور نئے نتیجے نکالے اگر استنتاج نہیں ہو گا تو علم ترقی نہیں کرے گا، آج علوم وفنون جہاں تک پہنچے ہیں وہ استنتاج ہی

کا نتیجہ ہے، ہر زمانہ کے لوگوں نے پچھلوں کے لکھے ہوئے مضامین میں غور کیا اور نئی نئی باتیں نکالیں اور فنون کو آگے بڑھایا، اگر ہم بھی اپنے پڑھے ہوئے کو سوچیں اور غور وفکر کریں تو نئے نئے نکتے آج بھی نکلیں گے زمانہ بانجھ نہیں ہوگیا، غرض اساتذہ کے پڑھنے میں تیسری چیز استنتاج ہے۔

چار اکابر کی کتابیں پڑھنے سے غبی بھی ذہین ہوجاتا ہے

حضرت حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ نے ایک بات بتائی تھی کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا: امت میں چار آدمی ایسے گذرے ہیں کہ اگر آدمی ان کی کتابوں سے مزاولت رکھے تو چاہے کتنا بھی غبی ہو ذہین ہوجاتا ہے، وہ چار حضرات یہ ہیں: (۱) مشہور صوفی بزرگ امام اکبر علامہ ابن عربی رحمہ اللہ (۲) حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ (۳) محدث دہلوی حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (۴) اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ۔

عرب ممالک میں بہت کتابیں چھپتی ہیں مگر ابن عربی کی کوئی کتاب نہیں چھپتی، کیونکہ وہ ان کو کافر اور مشرک کہتے ہیں، آج سے پچاس سال پہلے ابن عربی کی کسی کتاب کا وجود نہیں تھا میں نے دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ میں ان کی دو کتابوں کی زیارت کی تھی: فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم، اور کوشش کی تھی کہ کچھ سمجھ میں آئے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اگر ان کی کتابوں میں سے کوئی استاذ ہمیں تھوڑا سا پڑھا دیتا تو ہم اس کے سہارے آگے بڑھتے لیکن ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھائی گئی، نتیجہ میں ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا۔

دوسرے حضرت مجدد الف ثانی ہیں طالب علمی کے زمانہ میں ان کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی، چند چھوٹے چھوٹے رسالے ملتے تھے مگر ان کے مکتوبات دستیاب نہیں تھے، میں نے ان کی بھی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی، بعد میں جب مکتوبات ملے تو ان کا مطالعہ کیا۔

تیسرے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ ہیں ان کی کتاب: الفوز الکبیر ہم پڑھتے تھے، ہمارے اساتذہ کی زبان پر بھی بکثرت شاہ صاحبؒ کا نام آتا تھا، حجۃ اللہ بھی

پڑھائی جاتی تھی اور ان کی کئی کتابیں بازار میں مل جاتی تھیں۔

چوتھے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ ہیں جو ہمارے قریب ترین استاذ ہیں، ان کی سبھی کتابیں بازار میں ملتی تھیں اور اردو میں تھیں، اس لئے میں نے ان دونوں کو مطالعہ کے لئے خاص کرلیا، الفوز الکبیر پڑھی تو اتنا مزہ آیا کہ آپ اندازہ نہیں کرسکتے، اور جب حضرت حکیم الاسلامؒ سے حجۃ اللہ کے چند ابواب پڑھے تو اتنا مزہ آیا کہ میں نے طے کرلیا کہ شاہ صاحبؒ کو پڑھنا ہے، چنانچہ الفوز الکبیر پڑھی بھی اور پڑھائی بھی اور عربی میں شرح بھی لکھی، حجۃ اللہ کے بھی پیچھے لگا رہا تیس سال تک میں نے حجۃ اللہ کا مطالعہ کیا، جب بھی ذرا فرصت ملتی کتاب کھول لیتا اور صفحے دو صفحے پڑھ لیتا، پڑھتے پڑھتے ایک وقت آیا کہ اللہ نے ساری کتاب حل کرادی، پھر میں نے اس کی شرح لکھی: رحمۃ اللہ الواسعہ، فالحمد للہ علی ذلک۔

علوم عالیہ چھ اور علوم آلیہ غیر متعین ہیں

علوم شرعیہ چھ ہیں (۱) قرآن (۲) حدیث (۳) فقہ (۴) پھر قرآن سمجھنے کے لئے اصول تفسیر، اصول تفسیر کے بغیر آپ قرآن نہیں سمجھ سکتے (۵) اور حدیث کو سمجھنے کے لئے اصول حدیث، اصول حدیث کی رعایت کے بغیر آپ احادیث سے استفادہ نہیں کرسکتے (۶) اور قرآن وحدیث سے فقہ کیسے نکالنا ہے اس کیلئے اصول فقہ ہے، یہ چھ علوم مدارس اسلامیہ کی غرض وغایت ہیں، انہی کے لئے مدارس قائم کئے گئے ہیں، یہی چھ علوم: علوم عالیہ ہیں، باقی علوم: علوم آلیہ ہیں، یعنی علوم حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، جیسے صرف، نحو اور منطق علوم آلیہ ہیں اور سراجی کے لئے حساب جاننا ضروری ہے، پس حساب بھی علوم آلیہ میں آئے گا، پھر جب بچہ بڑا ہوگا تو ملک کے جس صوبہ میں رہتا ہے وہاں کی زبان جاننا ضروری ہے، اگر وہ انگریزی علاقہ میں رہتا ہے تو انگریزی ضروری ہے، ہندی کا علاقہ ہے تو ہندی، گجراتی کا علاقہ ہے تو گجراتی، کیونکہ علاقہ کی زبان نہیں جانے گا تو زندگی کیسے گزارے گا؟

اور آج دنیا اتنی چھوٹی ہوگئی ہے کہ ساری دنیا کے احوال آدمی کے سامنے آتے ہیں، اگر

طالب علم جغرافیہ نہیں جانتا تو بیچارہ دنیا سے ناواقف رہے گا، اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ فلاں شہر کہاں ہے؟ حالانکہ وہ اس کے ملک سے لگا ہوا ہے، پس جغرافیہ بھی علوم آلیہ میں آئیگا۔

تاریخ پڑھنا بھی ضروری ہے اس کے بغیر آدمی ترقی نہیں کرسکتا، الغرض علوم آلیہ کی فہرست متعین نہیں، زمانہ کے تقاضوں سے فہرست چھوٹی بڑی ہوسکتی ہے، پھر ہر آدمی کو اللہ نے ذہن الگ الگ دیا ہے، ایک درجہ پر سب کے اذہان نہیں ہوتے، ایک ذہین طالب علم کے لئے چار کتابیں کافی ہوتی ہیں، اور متوسط ذہن والے کو چھ کتابیں پڑھنی پڑتی ہیں، اور معمولی ذہن والے کو آٹھ کتابیں پڑھاتے ہیں تب جاکر وہ ذہین کی جگہ لیتا ہے، اس لئے علوم آلیہ کا نصاب متعین نہیں، اور اس کے پڑھنے کا وقت بھی ذہانت کے اعتبار سے کم وبیش ہوتا ہے۔

طلبہ کے پاس اپنی کتابیں ہونی چاہئیں

آج کل تعلیم میں جو کمزوری آئی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ طلبہ کے پاس اپنی کتاب نہیں ہوتی، آٹھ سال پڑھا مگر ایک بھی کتاب نہیں، ہمارے مدرسے طالب علم کے لئے ہر ضرورت مہیا کرتے ہیں، وظیفۂ پارچہ دیتے ہیں، وظیفۂ تیل دیتے ہیں، وظیفۂ پاپوش دیتے ہیں، مگر کتابیں نہیں دیتے، آج کونسا طالب علم ہے جو بغیر جوتے کے گھوم رہا ہے؟ کونسا طالب علم ہے جو ننگا گھوم رہا ہے؟ کونسا طالب علم ہے جو لالٹین میں تیل ڈال کر مطالعہ کرتا ہے؟ کوئی بھی نہیں! مگر اپنی کتاب کسی طالب علم کے پاس نہیں؟ میں نہیں کہتا کہ یہ وظیفے مت دو، ضرور دو !سب کچھ دو! مگر کتاب بھی تو دو! مالک بناؤ کتاب کا، البتہ شرط لگاسکتے ہو کہ طالب علم اتنے نمبر لائے گا تو یہ کتاب ملے گی، اس سے کم نمبر والے کو اپنی کتاب خود خریدنی ہوگی، اس سے ان کا حوصلہ بڑھے گا، لیکن بہت زیادہ نمبروں کی قید نہ لگائیں، مثلاً اوسط نمبر کی قید لگائیں تاکہ چند ہی طالب علم کتابوں سے محروم رہیں، باقی نمبروں کی شرط پوری کرلیں، مگر امتحان لینے والوں کو بھی پابند کرنا ہوگا کہ صحیح نمبر دیں اگر وہ دریادلی سے نمبر دیں گے تو شرط لگانا بیکار ہوجائے گا۔

الغرض مدارس کو دیگر وظائف کے ساتھ کتابیں بھی دینی چاہئیں، صرف پڑھنے کے لئے کتاب نہ دیں، مالک بنادیں، کیونکہ جب مدرسہ اس کو کتاب مستعار دے گا تو وہ اپنی

کتابیں خرید کر کیوں جمع کرے گا؟ کتابیں مستعار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ فضلاء میں کتابیں خریدنے کا شوق نہیں رہا، نہ رکھنے کا اور حفاظت کا سلیقہ ہے۔

کبھی الزامی جواب دینا مفید ہوتا ہے

ایک آدمی نے سوال کیا: دن کی نمازیں سری اور رات کی نمازیں جہری کیوں ہیں؟ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سنائی کہ طالب علموں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہی بات پوچھی تھی، حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب دیا: جو نمازیں حضور ﷺ نے ہمیں سرّی پڑھائی ہیں، ہم بھی وہ نمازیں سری پڑھاتے ہیں، اور جو نمازیں جہری پڑھائی ہیں ہم بھی وہ نمازیں جہری پڑھاتے ہیں۔

یہ حدیث سنا کر میں نے سائل سے پوچھا: بتاؤ دو نمازیں سری اور تین نمازیں جہری کیوں ہیں؟ یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ جانتے تھے یا نہیں؟ اگر نہیں جانتے تھے تو میرا علم حضرت ابو ہریرہؓ سے زیادہ نہیں، میں اس کو کہاں سے جانوں گا؟ اور اگر جانتے تھے تو کیوں نہیں بتایا؟ لامحالہ یہی کہنا ہوگا کہ طالب علموں کی علمی سطح اتنی بلند نہیں تھی کہ وہ اس سوال کا جواب سمجھ سکتے! پس کیا آپ حضرت ابو ہریرہؓ کے شاگردوں سے آگے ہیں؟ آپ کالج میں پڑھتے ہیں، علم دین برائے نام جانتے ہیں، اور وہ دین کے طالب علم تھے، حدیث کے طالب علم تھے، پس اگر میں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں؟ اور آپ کیا سمجھیں گے؟ وہ خاموش ہوگیا، یہ بولتی بند کرنے کا طریقہ ہے، اور یہ طریقہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا تھا، آپ پہلے الزامی جواب دیتے تھے اور بولتی بند کردیتے تھے۔ پھر تحقیقی جواب دیتے تھے، جب تک معترض کے دماغ کی کھڑکیاں بند نہ کردیں وہ جواب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، اس لئے پہلے الزامی جواب دے کر خاموش کردینا چاہئے، پھر صحیح بات بتاؤ تو وہ غور سے سنے گا اور سمجھے گا، ورنہ محنت رائگاں جائے گی۔

مدارس اسلامیہ کی برکت

انکلیشور (گجرات) کے ایک اجتماع میں فرمایا:

مدارس اسلامیہ کا وجود حفاظتِ دین کا بڑا ذریعہ ہے، یہ وہ اسلامی قلعے ہیں جو دین کی پناہ گاہ ہیں، جس جگہ مدارس اسلامیہ کا وجود نہیں وہاں جا کر دیکھیں اسلام کا کیا حال ہے، وہاں کی دینی حالت دیکھیں تو مدارس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ اسپین، تاشقند اور سمرقند (ازبکستان) کی حالت اسلام کی زبوں حالی کی منہ بولتی تصویر ہے، ہدایہ میں ایک جگہ ہے: **إن أعلام الإسلام فيها ظاهرة**: ازبکستان کے دیہاتوں میں بھی اسلام کے جھنڈے لہرا رہے ہیں، مگر اب وہاں کچھ نہیں، میں سمرقند تاشقند گیا ہوں، وہاں لوگ سلام کا جواب دینا بھی نہیں جانتے، مگر متحدہ ہندوستان (انڈیا، پاکستان اور بنگلہ دیش) کا نقشہ ان ممالک سے مختلف ہے۔ اور یہ برکت ہے مدارس اسلامیہ کی، جب اس ملک پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اہل اللہ کو الہام کیا کہ چندے کے مدارس قائم کئے جائیں، اب اس ملک میں اسلام کی حفاظت کی یہی صورت ہے، اس سے پہلے چندے کے مدارس کا کوئی تصور نہیں تھا، حکومت ادارے قائم کرتی تھی یا شخصی طور پر مدارس قائم ہوتے تھے، ایک ہی آدمی خرچہ چلاتا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے قومی مدارس کا ذہن بنایا تو مدارسِ اسلامیہ کا فروغ ہونا شروع ہوگیا، اب مدارسِ اسلامیہ بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ آپ کو آج جگہ جگہ مسجدیں آباد مل رہی ہیں، مسلمان دینی وضع قطع میں ہیں، بے شمار آپ کو علماء مل رہے ہیں، اسلام پر کوئی حملہ ہو مسلمان مدافعت کے لئے تیار ہیں، یہ نقشہ کیوں ہے؟ یہ مدارسِ اسلامیہ کی برکت ہے یہ دین اسلام کی حفاظت کے قلعے ہیں، لہٰذا آپ اس نعمت کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے اور زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کی کوشش کریں، ان شاء اللہ ہمارے لئے مفید ہوگا اور اگر یہ مدرسے خدانخواستہ نہ رہے تو پھر صورت حال وہی ہوگی جو دنیا میں ہوچکی ہے۔

نصاب طلبہ کے قابو میں نہیں آتا

واقعہ یہ ہے کہ مدارسِ عربیہ کا نصاب پوری طرح بچوں کے قابو میں نہیں آتا، اور اسی مسئلہ کو لے کر آج کا اجتماع منعقد کیا گیا ہے، خطبہ استقبالیہ میں اس کا تذکرہ ہے کہ آج طلبہ کی استعدادیں نہیں بن رہیں: اس کی وجہ کیا ہے؟ جاننا چاہئے کہ استعداد عربی پنجم تک بنتی ہے، پھر بوئے ہوئے درخت کا پھل کھانا ہے، استعداد بن گئی تو آگے طالب علم دیوار میں

سے علم نکال لے گا، کمزور استاذ سے بھی پڑھ کر کتاب سمجھ لے گا، اور اگر اس درجہ تک استعداد نہیں بنی تو آگے جھینکنا ہے، ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ بھی بخاری شریف پڑھا کر اس کو عالم نہیں بنا سکتے، بس وہ فارغ ہوکر رہ جائے گا کسی کام کا نہیں بنے گا، چنانچہ مسلسل آوازیں اٹھتی ہیں کہ طلبہ کو کسی کام کا بناؤ! مدارس کا نصاب بدلو، کچھ دنیا کی ضرورتیں نصاب میں شامل کرو، تاکہ طلبہ کسی کام کے بنیں!

مگر یہ مسئلہ کا حل نہیں، مجھے حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ (سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) کی بات یاد آئی، جب بھی نصاب میں تبدیلی کی بات آتی تو آپ فرماتے:

”مولوی صاحب! تعلیم کی خوبی تین باتوں کی مرہونِ منت ہے: ایک: استاذ کی مہارتِ فن، دوسری: طالب علم کی محنت، تیسری: نصاب کی عمدگی۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اساتذہ سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، وہ سر پھوڑ دیں گے، اور طلبہ سے بھی کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا، وہ بھڑوں کا چھتہ ہیں، اب رہ گیا بے زبان نصاب، کان پکڑ کر کبھی اِدھر کردیا کبھی اُدھر، مگر مسئلہ حل نہیں ہوتا“

یعنی نصاب تیسرے درجہ کی چیز ہے، پہلی چیز: اساتذہ کی مہارتِ فن ہے، پہلے اساتذہ ماہر فن ہوتے تھے تو طلبہ جید الاستعداد نکلتے تھے، اب اساتذہ ہی ناقص ہیں، خاص طور پر ابتدائی درجات کے اساتذہ جو استعداد سازی کا مرحلہ ہے، وہ ابھی فارغ ہوئے ہیں، خود ان کے قابو میں فن نہیں، وہ طلبہ کو صاحب فن کس طرح بنادیں گے، وہ ابتدائی کتابیں پڑھاتے ہیں اور پڑھا کر بھول جاتے ہیں، خود ان کو کتاب یاد نہیں ہوتی، وہ فن کے مسائل کا اجراء کیسے کرائیں گے؟

اور طلبہ کی اکثریت پڑھنے نہیں آتی، ماں باپ کے نیک جذبات سے مولوی بننے آتی ہے، اور مدرسہ میں پڑی رہتی ہے، پھر پڑھے بغیر اور کتاب یاد کئے بغیر استعداد کیسے بنے گی۔

اور عربی پنجم تک کا نصاب اتنا سمیٹ دیا گیا ہے اور مضامین کی اتنی بھرمار ہوگئی ہے کہ طالب علم یاد کرنا چاہے تو بھی یاد نہیں کرسکتا۔

پس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ ابتدائی نصاب بڑھایا جائے، پانچ سال کے چھ سال کئے جائیں، ابتدائی اساتذہ تجربہ کار ہوں، فن ان کے قابو میں ہو، اور طلباء کو بھی لایعنی مشاغل سے ہٹا کر پڑھنے میں لگایا جائے، ابتدائی درجات کا امتحان ہر ماہ لیا جائے اور اس پر ترغیب وترہیب کے نتائج مرتب ہوں تو کچھ امید باندھی جاسکتی ہے کہ پختہ استعداد والے طلبہ تیار ہوں۔

اور ہاں ایک بات یاد آئی: تعلیم میں تدریج ضروری ہے، نیچے کے درجے سے اوپر کے درجے میں حقیقی معنی میں 'کامیاب' چڑھے گا تبھی آگے کامیاب ہوگا، اور اگر بے استعداد ایک درجہ آگے بڑھ گیا تو ساری تعلیمی زندگی برباد ہوگئی، اب اگلے درجے میں نہ کچھ سمجھے گا، نہ اس کی محنت کا کچھ حاصل نکلے گا۔

مثلاً: اردو کی پختہ استعداد کے بغیر بچے کو فارسی میں لے لینا، یا فارسی کی ضروری استعداد کے بغیر عربی میں لے لینا، بچے کی زندگی کو تباہ کرنا ہے۔ خاص طور پر ان صوبوں کے بچے جن کی مادری زبان اردو نہیں، ان کو اردو خوب پڑھانی ضروری ہے، زبان رواں ہوجائے، بچہ بات سمجھ سکے اور سمجھا سکے اور اس کی املاء درست ہوجائے تبھی اس کو فارسی میں لیا جائے، اور اہل لسان کے بچے فارسی کم پڑھیں تو چلے گا، مگر غیر اہل لسان بچے اگر فارسی اچھی طرح نہیں پڑھیں گے تو وہ کبھی اردو میں کامیاب نہیں ہوسکتے، کیونکہ اردو میں لغات وتراکیب فارسی مستعمل ہیں، پس اہل لسان بچہ تو اپنی فطرت سے اردو سمجھ لے گا، مگر گجرات، مہاراشٹر، بنگال، آسام، تمل ناڈو اور کیرالہ کا بچہ فارسی پڑھے بغیر کبھی بھی اردو پر قادر نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح عربی اول جب تک بچے کے قابو میں نہ آجائے عربی دوم میں نہ لیا جائے، درجہ بدرجہ استعداد بنتی جائے گی اور بڑھتا جائے گا تو بچہ کامیاب ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اردو، فارسی اور عربی اول تا پنجم کی تعلیم میں سنجیدگی ہو، ہزل کی صورت نہ ہو، تبھی کسی مثبت نتیجہ کی امید کی جاسکتی ہے۔

نصاب میں تبدیلی کہاں کی جاسکتی ہے؟

مدارسِ عربیہ کا نصاب دو حصوں میں منقسم ہے: عالیہ اور آلیہ، یعنی مقصود بالذات اور مقصود

تک پہنچنے کا ذریعہ۔ صرف ونحو، انشاء، عربی زبان، منطق وغیرہ علوم آلیہ ہیں، اور قرآن (تفسیر) حدیث، فقہ، اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ عالیہ اور مقصود بالذات ہیں، علوم آلیہ پر مشتمل نصاب ہر وقت بدلا جاسکتا ہے، حسن سے احسن کی طرف بڑھا جاسکتا ہے، البتہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو کتابیں استعداد بنانے والی ہیں ان کو القط نہ کردیا جائے، جیسے منطق کے بارے میں اب عام تصور یہ ہے کہ یہ غیر ضروری فن ہے، حالانکہ یہ فن تشحیذِ اذہان کے لئے ہے، اس سے ذہن تیز ہوتا ہے، چھری میں دھار نہ ہو تو خربوزہ کیسے کٹے گا؟ اگر آپ کو منطق پسند نہیں تو اس کا متبادل تجویز کرو، جو ذہن میں جلا پیدا کرے، ذہن کی بالیدگی کے بغیر علوم عالیہ کو بخوبی نہیں سمجھا سکتا۔

اور علوم عالیہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، ہدایہ کا کیا بدل ہے؟ مختصر المعانی کا کیا بدل ہے؟ جلالین کا اور کتب حدیث کا کیا بدل ہے؟ البتہ یہ ضروری ہے کہ طالب علم کی استعداد ایسی بن جائے کہ وہ یہ کتابیں سمجھ سکے، اگر استعداد کچی رہے گی تو علوم عالیہ کی یہ کتابیں پڑھانا بے فائدہ ہوگا۔

علم کلام اور اسلامی مسائل

ابھی صدر استقبالیہ نے اپنے خطبہ میں کہا کہ شرح عقائد عذاب قبر سے پڑھانی چاہئے، کیونکہ اس سے پہلے جو مضامین ہیں وہ طلبہ کے قابو میں نہیں آتے، وہ بہت دقیق مضامین ہیں، ذات وصفات کی بحثیں طلبہ نہیں سمجھ سکتے۔

میرے بھائیو! عذاب قبر پر تو علم کلام ختم ہوجاتا ہے، اس کے بعد 'اسلامی مسائل' شروع ہوتے ہیں، اور وہ بدلتے رہتے ہیں ان کو پڑھانا علم کلام پڑھانا نہیں۔ اور شرح عقائد علم کلام میں ہے، پس اگر سابقہ ابحاث چھوڑ دیں گے تو آپ نے علم کلام نہیں پڑھایا، اور شرح عقائد کو نصاب میں رکھنے کا مقصد فوت کردیا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ علم کلام ذات وصفات کے مسائل کا نام ہے، اب عربوں نے نام بدل دیا ہے، وہ علم کلام کو علم التوحید والصفات کہتے ہیں، اور ابتک اس کو علم الکلام اس

لئے کہتے تھے کہ معتزلہ نے سب سے پہلے اللہ کی صفت کلام کی بحث چھیڑی تھی، وہ کہتے تھے کہ قرآن مخلوق (حادث) ہے یعنی یہ اللہ کی صفت نہیں ہے، امام اہل السنہ احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان کا رد کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق (قدیم) ہے، اللہ کی صفت حادث نہیں ہوسکتی، یہ بحث اتنی طویل ہوئی کہ پورے فن کا نام ہی علم الکلام پڑ گیا۔

بہرحال ذات وصفات کے مسائل کا نام علم العقائد ہے، اور ان کا بیان شرح عقائد میں عذابِ قبر پر پورا ہوجاتا ہے، پھر اسلامی مسائل کا بیان شروع ہوتا ہے۔ علم کلام میں مقصدی حیثیت سے صرف کائنات کے مبدا ومعاد سے بحث کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور معاد کے مسائل ہی زیر بحث آتے ہیں، مثلاً: خدا تعالیٰ کا اثبات، مسئلہ توحید، صفاتِ خداوندی کا بیان، صفاتِ سلبیہ کا تذکرہ، صفات نہ عینِ ذات ہیں نہ غیرِ ذات، صفتِ کلام کی بحث اور ضمناً قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا تذکرہ، رویت باری تعالیٰ کا مسئلہ، خلق افعال عباد کا تذکرہ، اور معاد کے سلسلہ میں برزخ کے احوال، جنت ودوزخ، حشر ونشر، جزاء وسزا کا بیان اور علاماتِ قیامت کا ذکر، بس یہی علم کلام کے مسائل ہیں۔

پھر اسلامی مسائل کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ اسلامی مسائل: وہ ہیں کہ مختلف الخیال اور مختلف المذاہب لوگوں کی باہمی گفتگو میں مذہب کی ضرورت، اس کی حقانیت اور ترجیح کے سلسلہ میں جو تاریخی، اخلاقی، تمدنی اور علمی مسائل زیر بحث آتے ہیں ان کے متعلق اسلام نے جو تعلیمات پیش کی ہیں ان کو زیر بحث لایا جائے تاکہ طلباء بابصیرت ہوں اور علمی گفتگو میں دوسروں کو متاثر کرسکیں، عذابِ قبر سے یہی اسلامی مسائل شروع ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل میرے ایک مقالہ میں ہے، جس کا عنوان ہے: ''فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید'' اور یہ مقالہ میری کتاب: ''اسلام تغیر پذیر دنیا میں'' میں شائع ہوا ہے۔

بہرحال شرح عقائد کا جو مشکل حصہ ہے وہی مقصود ہے، مگر وہ پختہ استعداد بنائے بغیر طلبہ کے قابو میں نہیں آسکتا، اور استعداد سازی کا عمل عربی پنجم تک ہوتا ہے، اس کے بعد تو بوئے ہوئے کا پھل کھانا ہے، اربابِ فکر اور مدارس کے ذمہ داران یہاں جمع ہیں ان کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ کمی جہاں آئی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کریں، ورنہ

یہ اجتماع بے فائدہ رہے گا۔

تکمیل کے درجات سے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی

ملت کے اکابر مدارس میں جو کمی آئی ہے اس کا علاج یہ سوچتے ہیں کہ دورہ کے بعد تکمیل کے چند درجات کھول دیئے جائیں تاکہ استعداد کے نقصان کی تلافی ہوجائے۔ تکمیل فقہ، دارالافتاء، تکمیل ادب، تکمیل تفسیر، تکمیل علوم، تخصص فی الحدیث اور تخصص فی الادب کے درجات شروع کئے جائیں تو درس نظامی کی تعلیم میں جو کمی آئی ہے اس کی تلافی ہوسکتی ہے، اور تکمیلات کا یہ عمل جامعات میں شروع بھی ہوگیا ہے۔ مگر تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس سے نقصان کی کوئی تلافی نہیں ہوتی، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آٹھ منزلہ عمارت ہے جو بوسیدہ ہوگئی ہے، اس کو مضبوط کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ اس پر تین چار منزلیں اور چڑھادی جائیں، اس سے تو عمارت اور کمزور ہوجائے گی، اس کا علاج تو بس یہی ہے کہ عمارت ازسرنو مضبوط بنائی جائے یا اس کی مرمت کرکے کسی قابل بنائی جائے، جب تک استعداد سازی کے مرحلہ کی طرف توجہ نہیں دے جائے گی، مسئلہ حل ہونے والا نہیں۔

دارالافتاؤں کی باڑ

آج کل ہمارے ملک میں اور پڑوس کے دونوں ملکوں میں دارالافتاؤں کی باڑ آئی ہوئی ہے، بلکہ اب نئے مدارس دارالافتاء سے شروع ہوتے ہیں اور داخلہ کے لئے کوئی استعداد ضروری نہیں، ہر فارغ داخلہ لے سکتا ہے اور چند ماہ میں مفتی بن جائے گا، اور خوش فہمی میں مبتلا ہوجائے گا کہ اسے سب کچھ آگیا۔ اور لوگ بھی اس سے مسائل پوچھنے لگیں گے اور وہ ضَلَّ وَأَضَلَّ کا مصداق بن جائے گا، مگر مدارس میں استعداد سازی پر محنت کرنے والا کوئی نہیں، اس مدرسہ کو چھوٹا مدرسہ سمجھا جاتا ہے، چندہ بھی اس کو کم ملتا ہے، اس لئے ہر شخص دورہ یا دارالافتاء کھول کر بیٹھ جاتا ہے، یہ جو طریقہ تیزی سے چل پڑا ہے: یہ بھی تباہی کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔

عصری درسگاہوں اور مدارس کے علوم میں فرق

عصری درسگاہوں (یونیورسٹیوں) میں محسوسات کا علم پڑھایا جاتا ہے اور وہ محدود ہے، طالب علم پڑھ کر نکلتا ہے اور کام شروع کردیتا ہے، پھر تجربات سے اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، اسے آگے کچھ نہیں پڑھنا، اور مدارس میں معنویات کا علم پڑھایا جاتا ہے اور وہ غیر محدود ہے، پس سارا علم مدارس میں نہیں پڑھایا جاسکتا، بلکہ علم حاصل کرنے کی استعداد بنائی جاتی ہے، جس سے زندگی بھر کام لینا ہے اور آگے پڑھنا ہے، اور ایک لمبے عرصے کے بعد مسائل کا ادراک ہوتا ہے، مگر اب تو لوگ فارغ اور فاضل ہوجاتے ہیں، آگے پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں اور ان کا حال اس نادان بچے کا ہوکر رہ جاتا ہے جس نے بچا ہوا تیل کٹورے کے پینڈے میں ڈلوایا تھا جس سے اصل کٹورے کا تیل بھی گر گیا تھا، کچھ ہی دنوں میں مدرسہ سے جو متاع لے کر آئے تھے وہ بھی بھول گئے، اور کٹورہ خالی رہ گیا۔